# سفینۂ غزل

## شبیر افضل جعفری

سخن کی تاب کہاں لاڈلے سوالوں کو
نگہ کے روپ میں لے جاؤں گا خیالوں کو

مرے غزال صفت کی مدھر مدھر آنکھیں
کہ جیسے نیند سے بھر دے کوئی پیالوں کو

یہ جل ترنگ ، یہ بیلا ، یہ میل میل جھنان
گھٹا نے جھوم کے لہرا دیا ہے بالوں کو

حسین مانگ کی جادو نگار جھلمل نے
بسا دیا ہے سیہ رات میں اجالوں کو

حیات چاندنی کی جھیل میں وضو کر کے
نکھارتی ہے ہوائی میں مہک والوں کو

جنوں میں وقت کی " زنجیرگی " سے گھبرا کر
[illegible] یاد کیا ہم نے گھنگھر بالوں کو

## نظیر محسن

(غالب سے معذرت کے ساتھ)

حسن گلزار ہے گلچیں کو خبر ہونے تک
رونق بزم ہے ساقی کی نظر ہونے تک

تیرگی رات کی بڑھتی رہی دھیرے دھیرے
دیپ جلتے رہے اشکوں کے سحر ہونے تک

ناخدا باد مخالف کی رفاقت ہی سہی
ہم پہ کیا گزرے گی ساحل پہ خبر ہونے تک

صبر بے تاب ارادوں کے تقاضے مت پوچھ
غم کو درکار ہے اک عمر اثر ہونے تک

ایک تقریب تبسم ہے مرا سوز دروں
راز کھل جائے نہ واں چشم کے تر ہونے تک

کس نے لوٹا تھا سر شام خیالوں کا نگر
کیسے گزری تھی شب غم پہ سحر ہونے تک

حوصلے ضبط کی منزل پہ مچل جاتے ہیں
"دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک"

****

انجمن ترقی اردو پاکستان

کا

پندرہ روزہ

# قومی زبان

نگران:

بابائے اردو

جلد ۔۔۔ ۱۷

شمارہ ۔۔۔ ۱

یکم جولائی سنہ ۱۹۶۰ء


## پنجاب یونی ورسٹی

## کے وائس چانسلر کی اردو بیزاری

معاصر "نوائے وقت" لاہور کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا کہ حال ہی میں لاہور کے چند معزز ماہرین تعلیم کا ایک وفد پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمت میں باریاب ہوا اور اس نے محترم وائس چانسلر سے یہ درخواست کی کہ بی۔اے کے نصاب میں اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔ وفد نے یہ عرضداشت پیش کرتے ہوئے جناب وائس چانسلر کی توجہ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے اس حصے کی طرف بھی مبذول کرائی جس میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ اعلا درجوں میں اردو کی تعلیم و تدریس کا بہتر اور معقول انتظام کیا جائے۔

اردو اس ملک کی قومی اور سرکاری زبان ہے اور یہ بھی اصولاً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آئندہ مغربی پاکستان کی یہی تعلیمی زبان کے علاوہ دفتری اور سرکاری زبان بھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی ایک روز کے اندر نہ ہوگی اور اس کے لئے ابھی سے تیاریاں کرنی ضروری ہوں گی، جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ڈگری کے درجوں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے اور یہ اس وقت تک ناقابل عمل ہے جب تک کہ ان درجوں میں اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے نشوونما کا موقع نہ دیا جائے۔ پنجاب اس وقت اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے اور زندہ دلان پنجاب نے اردو کے بنانے سنوارنے اور ترقی دینے میں جو قابل رشک خدمات انجام دی ہیں شاید ہی کوئی معقول اور انصاف پسند شخص اس سے انکار کر سکے

ہے کہ اسی پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے لاہور کے بہی خواہان اردو کے نمائندہ وفد کو جو جواب مرحمت فرمایا، وہ نہ صرف پنجاب کی قدیم روایت اور اس کی بے مثال اردو دوستی کے نیک جذبات کے منافی ہے، بلکہ وہ ہمارے تہذیبی اور قومی شعور اور ہمارے "ظرف" کی معاملہ فہمی پر خندہ زن بھی ہے۔ وائس چانسلر صاحب نے بہ کمال استغنا ارشاد فرمایا کہ وہ ڈگری کالجوں میں اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل کرنے پر آمادہ نہیں۔ انہوں نے یہ تجویزیں بھی مسترد کر دیں کہ انگریزی پرچے میں اردو ترجمے کی بھی مشق رکھی جائے، یا آرٹس اور سائنس کے امتحانی پرچوں میں کم سے کم دو سوالات کے جوابات اردو میں دیئے جائیں۔ معاصر "نوائے وقت" کے نامہ نگار کا بیان ہے کہ جب ارکان وفد نے اپنے مطالبے کے سلسلے میں مزید گفتگو کی تو وائس چانسلر صاحب نے "از راہ کرم" انہیں یہ نیک مشورہ دیا کہ "اگر حامیان اردو چاہیں تو اپنی اردو یونی ورسٹی الگ قائم کر لیں" انہوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "تعلیمی کمیشن میں ڈگری کے درجوں میں اردو کی تعلیم و تدریس کے معیار کو بلند کرنے کی جو سفارش کی گئی ہے وہ محض "زیب داستان" کے لئے ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کے خیالات ہیں یا کسی مجذوب کی بڑ ہے۔ جن لوگوں کو اپنی قومی زبان، اپنی ملکی تہذیب اور اپنے وطن کی ثقافت و روایات سے ہمدردی نہیں، کیا وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں علمی و تہذیبی اداروں کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا جائے؟ ہمیں توقع ہے کہ وزارت تعلیمات کے ارباب حل و عقد اس سوال پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ کیا غضب ہے کہ خود انگریز ماہرین تعلیم تو اس امر پر متفق ہیں کہ کسی قوم کی ذہنی و فکری نشو و نما کا بہترین ذریعہ خود اس قوم کی زبان ہو سکتی ہے، لیکن خود ہماری قوم کے ایسے بڑے بڑے "مولانا" وہ ... پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر صاحب ہیں، یہ چھوٹی سی بات بھی ماننے کے لئے آمادہ نہیں کہ بی اے اور بی ایس سی میں اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔

پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کا یہ فرمانا کہ "اگر حامیان اردو چاہیں تو اپنی اردو یونی ورسٹی الگ بنا لیں" مغربی پاکستان کے لوگوں کی قومی غیرت و حمیت کے لئے ایک چیلنج ہے۔ حامیان اردو کو وائس چانسلر صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ جو بات ان کے دل میں تھی وہ ان کی زبان پر آ گئی اور اب انہیں ہوا کا رخ معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے۔ ہم اپنے علم و تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے اردو کے بارے میں جن "زریں خیالات" کا اظہار کیا ہے وہ ان کی منفرد آواز نہیں بلکہ حکومت کی کلیدی اسامیوں پر اس وقت سرکاری ملازموں کا جو طبقہ متمکن ہے، اردو کے بارے میں اس کے خیالات بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں اور بہ ظاہر آثار ایسے نظر آ رہے ہیں کہ پاکستان اس وقت جس عبوری دور سے گزر رہا ہے لازماً اس کی منزل مقصود، اس پاکستان سے بالکل مختلف ہوگی، جو تقسیم ملک سے پہلے برعظیم کے مسلمانوں کے پیش نظر تھا۔



پاکستان بن چکا ہے، اور وہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے، وہ ترقی کر رہا ہے اور آئندہ بھی ترقی کرے گا، لیکن کیا یہ وہی پاکستان ہوگا جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی قومی و تہذیبی ورثے کا امین ہوگا اور ان کے شاندار ماضی کی شان دار روایات کا گہوارہ ہوگا اور جس پاکستان میں اردو ہندی کے نزاع کی گنجائش نہ ہوگی۔ بے شک اب ہمارے پاکستان میں اردو ہندی کا سوال ختم ہو چکا ہے لیکن اب یہاں اسے ایک دوسری حریف زبان سے [illegible] ہے، جو باوجود اس کے کہ ایک اجنبی اور غیر ملکی زبان ہے لیکن جس کی ترقی و فروغ کی تمنا ... [illegible] اور جس کی قوت، سطوت اور دبدبے کے سامنے اردو کا پرچم سرنگوں [illegible]

یہ صورت حال بڑی خطرناک اور تباہ کن ہے اس لئے ہم اپنے ملک کے ارباب فکر و دانش سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ انگریزی زبان کے روز افزوں غیر معتدل و غیر پسندیدہ اثر و نفوذ کا جائزہ لیں اور اس سے پہلے کہ بات قابو سے باہر ہو جائیں ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

# قابلِ تقلید مثال

شمالی ہند میں اردو یونی ورسٹی کے قیام کا تخیل، درحقیقت اس وقت سے نشو و نما پا رہا تھا جب حیدر آباد دکن میں "جامعہ عثمانیہ" کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر کو اورنگ آباد سے دہلی منتقل کرنے کے بعد ہی بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہٗ نے اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور ملک کی رائے عامہ کو اس کے لئے بیدار کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا لیکن تقسیم ملک سے یہ منصوبہ روبہ عمل نہ آسکا۔ کراچی آنے کے بعد پھر بابائے اردو مدظلہٗ نے اس دیار میں ایک اردو یونی ورسٹی کے قیام کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا جس کا پہلا زینہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے اردو کالج کا قیام تھا۔ اس کالج میں کئی سال جملہ علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے سے دی جا رہی ہے۔ بابائے اردو کا مقصد یہ نہ تھا کہ اردو ذریعۂ تعلیم سے ایک کالج بنا دیا جائے اور بس، اس سلسلے میں ان کے پیش نظر بہت بڑا منصوبہ ہے۔ وہ یہاں ایک ایسی اردو یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتے ہیں جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو اور جو حقیقی معنوں میں اہل پاکستان کی ذہنی اور [illegible] نشو و نما کا [illegible]۔ ان کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ مجوزہ اردو یونی ورسٹی ایک [illegible] جس میں ہمارے [illegible] کی تہذیب و ثقافت [illegible] علوم [illegible] اور

رعنائیوں سے جلوہ گر ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ مجوزہ اردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ایک ایڈہاک کمیٹی قائم ہو گئی ہے جس نے اردو یونی ورسٹی کے قیام کے منصوبے پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی مہم ابتدائی مصارف کے لئے کم از کم پانچ لاکھ روپوں کی فراہمی ہے اگرچہ ابھی ایڈہاک کمیٹی کی طرف سے رقم کی فراہمی کے لئے کوئی اپیل نہیں شائع کی گئی، لیکن بعض درد مند اور حساس لوگوں نے بطور خود اس کار خیر میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے اور چند روز پیشتر "بزم امروز" کراچی کے ننھے منوں کی طرف سے اسی سلسلے میں دو سو ستر روپے کی رقم اردو یونی ورسٹی فنڈ میں ایک سادہ مگر موثر تقریب میں پیش کی گئی۔ کراچی خدا کے فضل و کرم سے مال داروں اور سرمایہ داروں کی بستی ہے لیکن بمصداق

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

یہ سعادت "بزم امروز" کراچی کے معصوم نونہالوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی کہ وہ اجتماعی طور پر بابائے اردو کی خدمت میں اردو یونی ورسٹی کے لئے یہ رقم پیش کریں۔ سوال رقم کی کمی بیشی کا نہیں بلکہ اس بے غرض، نیک اور معصوم جذبے کو دیکھنا چاہئے جس نے بچوں کے دلوں میں اردو یونی ورسٹی فنڈ کی فراہمی کا عملی خیال پیدا کیا۔

ہمارے اس ملک اور خاص طور سے اس شہر کراچی میں [illegible] ایک اینگلو پاکستانی تہذیب و ثقافت جنم لے رہی ہے [illegible] معلوم ہے کہ یہ رو کہاں جا کر تھمے لیکن "بزم امروز" [illegible] کے نونہالوں نے مجوزہ اردو یونی ورسٹی فنڈ میں [illegible] ثابت کر دیا کہ ابھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور ابھی [illegible] میں کچھ چنگاریاں سلامت ہیں۔

[illegible] بڑے [illegible] سے سبق حاصل کریں۔

انور خواجہ

# تعلیمی کمیشن اور اردو کے مسائل

زرعی اصلاحات کے بعد تعلیمی کمیشن کی سفارشات انقلابی حکومت کا دوسرا کارنامہ ہے۔ یہ سفارشات بڑی محنت سے مرتب کی گئی ہیں اور اس کے لیے کمیشن کے اراکین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس سلسلے میں اردو کو تعلیمی زبان بنانے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا، مگر بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ کمیشن نے دوسرے تعلیمی نکات پر جس سنجیدگی اور ٹھوس انداز سے زور دیا، اس سے یہ اہم مسئلہ محروم رہا ہے۔ زبان کے اس غیر معمولی مسئلے کو کمیشن نے مطلوبہ اہمیت نہیں دی۔ کمیشن نے اپنی سفارشات میں اس بات کا اظہار ضرور کیا ہے کہ اردو کو ثانوی معیار تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی کی جگہ لینے میں اس کے لیے پندرہ سال کے عرصے کی قید لگا دی ہے۔ پندرہ سال کا عرصہ اس برق رفتار دنیا میں بہت ہی طویل مدت ہے۔ اس دوران میں ایک نئی نسل جوان ہو کر ملک کا نظم و نسق سنبھال لے گی یہ نئی نسل ذہنی اعتبار سے پوری پاکستانی ہوگی۔ اس کے باوجود وہ سوچنے کا انداز ایک غیر ملکی زبان میں متعین کرے گی۔ یہ یقینی امر ہے کہ جب وہ غیر ملکی زبان میں سوچے گی تو اس زبان کا قومی مزاج نفسیاتی طور پر اس پر اثر انداز ہوگا۔ تعلیمی کمیشن کے جن بنیادی نکات پر ان سفارشات کو استوار کیا ہے ان میں ایک اہم نکتہ وطن کی محبت بھی ہے۔ کمیشن نے کہا ہے کہ کوئی تعلیمی اصلاح اس وقت تک اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس تعلیم کے پروردہ افراد کے دلوں میں وطن کی گہری محبت موجزن نہ ہو۔ وطن کی محبت کوئی ایسا مبہم جذبہ نہیں، بلکہ جب تک کسی قوم اور ہر شہری کے دل میں اپنے وطن کی پرخلوص محبت، اپنے شاندار ماضی سے گہرا رابطہ، حال سے امید اور مستقبل سے اعتماد نہ ہو تو وہ قوم کبھی بام عروج تک نہیں پہنچ سکتی۔۔۔

حب الوطنی کا جذبہ ایک قوم کی استقامت میں سب سے اہم حصہ لیتا ہے اور حب الوطنی کے جذبے کو پوری طرح اجاگر کرنے کے لئے ایک یہ شرط بھی ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنی زبان میں سوچتا ہو اور اپنی زبان میں اظہار کرتا ہو۔ زبان ہی کسی قوم کے کلچر کی سب سے اہم اور پر اثر آواز ہوتی ہے زبان کے بغیر کوئی بھی قوم، قوم کے نام سے پکارے جانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ کمیشن نے نئے نظام تعلیم میں سائنس اور جدید ٹکنالوجی کے علوم کی ترقی پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ جدید علوم کی ترویج کے لئے چھ نئی یونی ورسٹیوں اور کئی اداروں کے قیام کے لئے منصوبے پیش کئے ہیں ان یونی ورسٹیوں کا بڑا مقصد سائنس کے اقتصادی اور تجارتی علوم کا فروغ ہے۔ کمیشن کا یہ اقدام قابل ستائش ہے، لیکن تعجب کی بات ہے کہ کمیشن نے قومی زبانوں کی ترقی و ترویج کے لئے کسی ایسی یونی ورسٹی یا ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب رپورٹ کے اس حصے کی طرف آئیے جس میں زبان کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔ تعلیمی کمیشن نے زبان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کا نچوڑ صرف ایک جملے میں آ سکتا ہے اردو کو مغربی پاکستان میں ثانوی معیار تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے، کالج میں اردو اور انگریزی زبانوں کو اختیاری مضمون کی حیثیت دی جائے اور جب ذریعہ تعلیم انگریزی سے اردو بنایا جائے تو نہایت احتیاط اور سنجیدگی

سے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے تاکہ تعلیم کے معیار پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑے۔ زبان کو ترقی دینے کے لئے ایک بورڈ بنایا جائے۔ اصطلاحات کی تدوین کی جائے۔ انسائیکلوپیڈیا اور دوسری معلوماتی کتب تالیف کی جائیں کمیشن کی یہ تجاویز قابل قدر ہیں لیکن ہماری رائے میں اتنا بڑا کام صرف ایک بورڈ انجام نہیں دے سکتا ہے جب جدید علوم کی ترویج و ترقی کے لئے ایک یونی ورسٹی کا ہونا لازمی ہے کمیشن کا یہ اولین فرض تھا کہ وہ زبان کے مسئلے کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتا۔ ملک کے دونوں حصوں میں اردو بنگالی یونی ورسٹیوں کے قیام کے منصوبے پیش کرتا۔ یہ کام باقاعدہ یونی ورسٹیوں کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے اصحاب انگریزی سے بے حد مرعوب ہیں۔ مرعوب ہونے کے کئی اسباب ہیں، سب سے بڑا سبب ہماری صد سالہ غلامی ہے جس کے اثرات سے ہم ابھی تک آزاد نہیں ہو سکے۔ دوسرا سبب یہ ہے، کہ انگریزی زبان اس وقت انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے تقریباً تمام جدید وقدیم علوم کا خزانہ اس میں محفوظ ہے اور بعض لوگ واقعی دیانت داری سے سوچتے ہیں کہ انگریزی سے بے تعلق ہوئے تو دنیا سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا حالانکہ مقصد صرف یہ ہے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم نہ رہے ور بطور زبان بدستور پڑھائی جائے۔ برتری اور وقار کا ایک جھوٹا احساس بھی انگریزی کا محافظ ہے۔ اس سے یہ بدعت شروع ہوئی ہے کہ بلا سوچے سمجھے انگریزی کے محاورے ترکیبیں وغیرہ اردو میں داخل ہو رہی ہیں حالاں کہ ہر ماہر لسانیات کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ صرف وہی زبان ترقی کر سکتی ہے جو بنیادی طور پر اپنے خمیر کے قریب رہے۔ ان ساری مشکلات پر اسی صورت میں قابو پایا جا سکتا ہے کہ ایک مشرقی یونیورسٹی قائم کی جائے اس میں اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور علاقائی زبانوں کے مختلف شعبے بھی ہوں۔ اس یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان دار الترجمہ قائم کیا جائے، اس یونی ورسٹی کے ذمے سب سے پہلا کام اردو کی ایک مفید اور مستند لغت ہو، حکومت نے پہلے ہی ایک ترقی اردو بورڈ قائم کر رکھا ہے جو اردو لغت کو ترتیب دے رہا ہے، اس کے علاوہ اردو، فارسی، اردو عربی، اردو پشتو، اردو سندھی، اردو بنگالی اردو ہندی وغیرہ کی لغات بھی ترتیب دی جائیں۔ اس وقت بازار میں اردو کی کوئی مستند لغت نہیں ہے۔

مجوزہ مشرقی یونی ورسٹی کا دوسرا بڑا شعبہ ایک وسیع اور عظیم دار الترجمہ کا قیام ہو۔ حیدرآباد دکن کے بے مثال دار الترجمہ نے جو کام انجام دیئے تھے ان کو سامنے رکھا جائے۔ اس دار الترجمے کا سب سے پہلا کام اصطلاحات کا ترجمہ ہو۔ یہ اصطلاحات عام فہم ہوں اور مشرقی زبانوں سے اخذ کی جائیں یا ایسی ہوں جو ان زبانوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ اب تک ہمارے ہاں جتنے ترجمے بھی ہوتے ہیں، اصطلاحات کے اختلاف کے سبب نہایت ناقص ہیں۔ ہر مترجم اپنی مرضی کے مطابق اصطلاح گھڑ لیتا ہے لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف سائنسی اور عمرانی علوم کی اصطلاحات میں تضاد ہے بلکہ ادبی اصطلاحات میں بھی جگہ جگہ اختلاف نظر آتا ہے۔

تعلیمی کمیشن نے اپنی سفارشات کے آخر میں رسم الخط کے مسئلے سے بھی بحث کی ہے لیکن اس نے رومن یا نسخ خط دونوں میں کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے ظاہر نہیں کی، صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا ہے کہ جب رسم الخط بنا لیا جائے گا تو ماہرین کی ایک کمیٹی اس کے عیوب و محاسن کو جانچنے کے لئے مقرر کی جائے گی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں یہ چاہتا ہوں کہ رسم الخط کے مسئلے پر بھی روشنی ڈال دیں۔ رسم الخط کا مسئلہ ہمارے ہاں جذبات کا شکار رہا ہے۔ بہرحال موجودہ نسخ ٹائپ میں سب سے بڑی مشکل کا سامنا چھپائی میں کرنا پڑتا ہے، خوب صورت ٹائپ رائٹر تو بن گئے ہیں لیکن ایسا ٹائپ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا جس کو ہم تمام پہلوؤں سے مفید پا کر تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں۔

اردو ٹائپ میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ایک ایک حرف

شکلوں میں جڑ کر ایک لفظ بنتا ہے بعض اوقات رومن کے چھ حروف جوڑنے میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اتنا ہی وقت پریس کے کارندوں کو اردو ٹائپ کا ایک حرف جوڑنے میں صرف کرنا پڑتا ہے اس لئے اردو ٹائپ پر محنت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس میں وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے اسی لئے ہمیں مجبوراً لیتھو کے فرسودہ طریقے کا سہارا لینا پڑتا ہے دوسری بڑی مشکل اعراب کا استعمال ہے۔ جس کی بنا پر ٹائپ میں ایک پوری سطر خالی چھوڑنی پڑتی ہے۔ اگر اعراب کے استعمال کو چھوڑ دیا جائے اور لغات، کتابوں اور ریڈیو کی مدد سے تلفظ کی اصلاح کی جائے تو ایک مصیبت سے چھٹکارا مل جائے گا۔ عربوں نے ٹائپ میں اعراب کا استعمال بالکل ترک کر دیا ہے صرف قرآن شریف کی چھپائی میں اس کا التزام کیا جاتا ہے۔ خط نسخ کے سلسلے میں صرف ہم ہی کو مشکلات درپیش نہیں ہیں۔ مصر اور ایران بھی ان سے دوچار ہیں۔ مصریوں نے عربی کا اچھا ٹائپ ایجاد کرنے والوں کے لئے انعام بھی مقرر کر رکھا ہے۔

اردو ٹائپ کے بارے میں بعض لوگوں نے بڑی کارآمد تجاویز پیش کی ہیں۔ محمد افضل سکریٹری ثانوی تعلیم بورڈ نے اس سلسلے میں خاصہ کام کیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب عنایت اللہ نے بڑے معقول مشورے دیئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر موجودہ حروف کو آدھی شکل میں ٹائپ کے لئے اپنا لیا جائے اور ہر جملے کو ایک پوری شکل کے حرف سے شروع کیا جائے جیسے انگریزی میں ہوتا ہے تو اردو ٹائپ کے لفظ جوڑنے میں آسانی بھی ہوگی اور رسم الخط کا حسن بھی برقرار رہے گا۔ یہ بات مسلم ہے کہ رومن رسم الخط بعض صورتوں میں نسخ سے بہتر ہے، لیکن ہمارے مزاج، روایات اور تہذیبی ورثے سے اس کا ہمارے نام بھی تعلق نہیں ہے پھر وہ ہمارے تلفظ کو کسی صورت میں بھی ادا نہیں کر سکے گا۔ اور ہماری زبان کی اصلی صورت مسخ ہو جائیگی۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے سارے علمی سرمائے کو رومن رسم الخط میں منتقل نہیں کر سکیں گے اور یوں وہ بھی نابود ہو جائے گا۔ بہرحال رومن رسم الخط کے شیدائیوں کو بنارڈ شا کی وصیت نہیں بھولنا چاہیے جس میں اس نے اپنی ساری جائداد انگریزی حروف تہجی کی اصلاح کے لئے وقف کر دی ہے۔ ہم اردو کی شیدائی وزارت تعلیم اور انقلابی حکومت سے اس بات کے متوقع ہیں کہ وہ رسم الخط کی اصلاح کے لئے جلد کوئی ٹھوس اور انقلابی قدم اٹھائے گی

---

بقیہ

## مراسلات

بسلسلہ ص ۳۴

آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر خندان دنداں نما والے مطلع میں غدر اور اس کے مابعد اثرات تو تلاش نہیں کئے جا سکتے لیکن اس وقت ہندوستان میں جو سیاسی استحکام مفقود تھا اور اس کی وجہ سے جو خانماں بربادی۔ تباہی۔ انتشار، پریشانی اور دوسری قسم کی آفتیں نازل ہو رہی تھیں بے شک ان اثرات کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر تاریخی ترتیب کے لحاظ سے کلام غالب کو تاریخی و سیاسی پس منظر کے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بہت جاندار نتائج نکل سکتے ہیں۔ ("گمنام" کراچی)

## اردو یونی ورسٹی

اس موضوع پر بابائے اردو کا گراں قدر مقالہ "قومی زبان" میں نظر سے گزرا۔ قبلہ مولوی صاحب نے جس مدلل انداز سے اردو یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت و اہمیت کو ذہن نشین کروایا ہے وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے۔ میں اس سے پہلے "اردو یونی ورسٹی" کو "دیوانے کا خواب" سمجھتا تھا لیکن یہ پڑھ کر میری آنکھیں کھلی ہیں اور میں نیک نیتی سے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر ہم نے اس یونی ورسٹی کے قیام میں بابائے اردو کی مدد نہ کی تو ہمارا تہذیب و ثقافتی سرمایہ کچھ ہی عرصے میں نیست و نابود ہو جائے گا اور ہمارے کردار کو ایسا نقصان پہنچے گا کہ جس کی تلافی ناممکن ہوگی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اردو یونی ورسٹی کے موضوع پر ملک کے ماہرین تعلیم اور اہل علم کو اظہار خیال کی

---

[illegible] (زر حمٰن طارق، کراچی)

سید جعفر طاہر

# حالی جادو بیاں

اس انقلاب پرور شاعر، عہد آفریں ادیب، اور با مذاق انشا پرداز کے حالات سے کون ہے جو نا واقف ہے؟ نام خواجہ الطاف حسین تخلص حالی، مقام ولادت پنجاب کا مشہور و معروف قصبہ پانی پت اور سال ولادت ١٨٣٧ء ہے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال ان کی نو عمری میں ہو گیا تھا ابھی آپ نو سال ہی کے تھے کہ والدہ کے دست شفقت سے بھی محروم ہو گئے مگر ایک زمانہ جانتا ہے کہ پانی پت (پنجاب) کا یہ دُرِ یتیم آسمانِ علم و ادب پر آفتاب ن کر چمکا انہوں نے جو کچھ لکھا اس سے صدیاں روشن رہیں گی ۔ الدین کے انتقال کے بعد آپ بھائی بہنوں کی آغوش الفت میں ـورش پاتے رہے ۔ خواجہ امداد حسین آپ کے برادر بزرگ تھے اور نسے مولانا کو خاص تعلق خاطر تھا ۔ یہ بزرگ نہ صرف ذوق شعری کھتے تھے بلکہ لکھتے بھی تھے۔ حالی کی ابتدائی تعلیم جس طرح کہ پرانے رانوں کا دستور تھا، گھر ہی پر ہوئی، آپ نے گھر پر قرآن پاک حفظ اور میر ممنون دہلوی کے بھانجے سید جعفر علی سے فارسی کی چند ابتدائی ابیں پڑھیں ۔ عربی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پڑھی تھی بستو سکے تھے کہ آپ کی شادی ہو گئی ۔ ابھی تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ یہ جوا سکے کندھے پر رکھا گیا۔ مگر گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی چلے اور ڈیڑھ سال تک وہاں پڑھتے رہے ۔ دہلی کے قیام میں میرزا

غالب کی علمی صحبتوں سے جی بھر کر فیضان حاصل کیا، پھر گھر لوٹ آئے ١٨٥٦ء میں ضلع حصار کی کلکٹری میں ایک قلیل مشاہرے پر ملازمت مل گئی ۔ مگر ابھی اطمینان خاطر نصیب نہ ہوا تھا کہ جنگ آزادی (١٨٥٧ء) چھڑ گئی۔ آپ نوکری چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ مگر اپنی طالب علمانہ زندگی کے مشاغل جاری رکھے تفسیر حدیث اور منطق و فلسفہ میں ذاتی محنت اور مطالعہ سے کافی آگاہی پیدا کر لی۔ ہنگامہ آزادی فرو ہوا تو آپ بھی تلاش معاش میں وطن سے نکلے جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب "گلشن بے خار" کی مصاحبت نصیب ہوئی اور آپ نے اس صاحب علم اور صاحب ذوق رئیس کی خدمت میں آٹھ سال نہایت عزت سے زندگی بسر کی۔ ایسے ثقہ اور سنجیدہ ادیب و شاعر کی مصاحبت نے حالی پر کافی اثر ڈالا ۔ مرزا غالب سے نواب شیفتہ کی بدولت اور وساطت سے عقیدت اور تعلقات میں مزید اضافہ ہوا ۔ شیفتہ کی وفات کے بعد حالی پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے، جہاں انہیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی زبان درست کرنا پڑتی تھی ۔ اس طرح وہ انگریزی ادب سے کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے گئے ۔ لاہور ہی میں انہیں اپنے انقلابی خیالات کے اظہار و اشاعت کا موقع ملا ۔ چنانچہ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے لئے انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ حالی کے مقدمہ کا

اور فنِ شعر میں ایک جدید طرز کے ایجاد کی آئینہ دار ہیں۔ لاہور سے ان کا تبادلہ دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرّسی پر ہوگیا اور یہاں بھی انہوں نے نئے طرز کی نظموں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہیں سرسید احمد خان سے شناسائی ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ خواجہ صاحب، سیّد کے حلقے کے ایک اہم رکن بن گئے۔ "مدوجزرِ اسلام" مشہور مسدس اور مولانا کا ایک بڑا ادبی کارنامہ سرسید کی فرمائش پر ہی لکھا گیا تھا۔ دہلی کے قیام میں "حیاتِ سعدی"، "حیاتِ جاوید"، "یادگارِ غالب" اور "مقدمہ شعر و شاعری" ایسے کارنامے سرانجام دیئے گئے۔ آخری عمر میں تصنیف و تالیف کے صلے میں سرکارِ دکن سے آپ کو سو روپے ماہوار وظیفہ ملنے لگا تھا۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد اینگلو عربک اسکول کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال فرمایا۔ مولانا نے اپنے آپ کو کبھی پنجابی نہیں کہا۔ ــ ــ ــ ــ ــ اگر پانی پت جغرافیائی لحاظ سے پنجاب میں نہ ہوتا تو میں انہیں شعرائے پنجاب میں شامل کرنے کی جسارت کبھی نہ کرتا۔

پاک سیرت، نیک طینت اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خاکساری اور فروتنی خمیر میں تھی۔ چھوٹوں کو بھی سروقد کھڑے ہو کر تعظیم دیتے تھے۔ مولانا بہت رقیق القلب تھے، دوسروں کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بلکہ جہاں تک اختیار میں ہوتا اس کو رفع کرنے کی کوشش فرماتے۔ حاجت مندوں کی مدد کرنے میں بڑے فیاض اور دریا دل واقع ہوئے تھے۔ مہمان نواز تھے اور جب کوئی ان کے ہاں آتا تو سچے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے۔ طبیعت بغض، حسد، رشک، کینہ، نفرت اور تعصب سے پاک تھی۔ جن لوگوں نے مولانا کی ذات پر ناگوار حملے کئے، ان سے بھی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ صاحبِ خلق ہوں تو ایسے ہوں۔ سرسید سے تعلقِ خاطر کی بنا پر کتنے مردود، مطرود اور مطعون قسم کے لوگوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کی شاعری بھی ہدفِ ملامت بن گئی مگر کیا مجال جو پیشانی پر کبھی بل بھی آیا ہو۔ مخالفتیں اس شان سے برداشت کیں کہ حاسدوں اور نکتہ چینوں کی زبانیں خود بخود بند ہوگئیں۔ ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں کہ "وہی لوگ جو انہیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے۔ ع

نقل تو بہت یاروں نے بچایا پر گئے اکثر مان ہیں

## کلام

مولانا مولوی محمد حسین آزاد نے جدید مشاعروں کی بنیاد ضرور رکھی مگر اس جدید دبستانِ شاعری کو کامیاب طور پر فروغ دینے کا سہرا حالی کے سر ہے۔ چاہتے تو رنگِ قدیم میں بھی بڑا نام پیدا کرتے تھے مگر پرانی روش سے کچھ ایسی محبت نہ تھی۔ دراصل وہ بھی غالب کی طرح بڑے جدت پسند واقع ہوئے تھے۔ غالب کو عام شاعروں کی تقلید ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور انہیں شروع ہی سے اس قسم کی شاعری سخت ناپسند تھی۔ لہٰذا شہر میں سب سے الگ دکان کھولی۔ مگر قدیم شاعری میں بھی ان کا مذاق نہایت بلند ہے۔ عامیانہ خیالات اور بازاری محاورات سے کلام پاک ہے گو اس دور کے کلام میں نہ تو شیفتہ کی طرح عاشقانہ رنگ گہرا ہے اور نہ ہی اس میں فلسفیانہ تعمق ہے مگر شیفتہ کی سنجیدگی اور شستہ مذاقی ضرور ہے لیکن حالی کی شاعری سرد، سپاٹ، خشک اور نانِ جویں کی طرح روکھی پھیکی بھی نہیں۔ البتہ جب ان کی نگاہوں نے کائنات کی وسعتوں اور حیات کی سنگینیوں اور تلخ حقیقتوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو ان کی شاعری کا مرکزی موضوع اخلاق اور تہذیب قرار پائے (حیاتِ سعدی اسی انہماک کا نتیجہ ہے) لیکن آپ جانتے ہیں ثقہ مضامین شاعری کی دنیا میں ذرا کم ہی پسند کئے جاتے ہیں۔ سعدی کا سازِ دربیان اور رنگینیٔ زبان نصیب ہو تو بات اور ہے، بہرحال انہوں نے بیداری قومی بیداری میں بڑا حصہ لیا اور بہا سے قومی احساسات کی تجدید و پرورش بھی کی۔ کلام بہت حد تک سادہ ہے مگر نیک خیالات

[illegible] زبان کی سلاست اور جذبات کی پاکیزگی بھی نمایاں ہے
خود ساختہ قسم کے زبان دانوں نے ان کے یہاں روزمرہ اور
محاورے کی غلطیاں بھی ڈھونڈ نکالی ہیں مگر ان کی عظمت میں کوئی
کمی نہیں آئی، پھر غلطی کون نہیں کرتا۔ دو چار محاوروں کا استعمال
بے جا ہو گیا تو کون سا آسمان پھٹ پڑا حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد
زبان داں ان کی شہرت سے جلتے تھے اور ان کے کلام کو ملک بھر
میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے برافروختہ ہوتے تھے۔ کلام
خشک سہی، مگر سادگی، سلاست اور صفائی کے معیار پر تولا اور
پرکھا جائے تو ان کے سخت ترین نقادوں کو بھی ان کے کلام کا معترف ہونا
پڑے گا۔ حالی کا کلام نامانوس لغات اور بعید از فہم ترکیبوں سے
پاک ہے۔ لطافت اور مسرت زائی کے شوق میں تہذیب و شرافت
کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ پھر وہ اپنی مسلسل اور مربوط نظموں
کی بدولت بھی اردو ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ حقائق نگاری
کی جو کوششیں انہوں نے کی ہیں وہ ان کے قابل قدر ادبی کارناموں
کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر یہ حالی ہی تھے جنہوں نے روزمرہ کے
موضوعات پر نظمیں لکھ کر نئے شاعروں کو فکر و فن کی نئی راہیں سجھائی
ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان کی عظمت کا راز بھی یہی ہے۔ غزلیں خصوصاً
قابل ملاحظہ ہیں۔ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری تنقیدی ادب پر نقش
اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

(لاہور کا دبستانِ شاعری)

پچھلے پچاس برسوں کے ادب کا صحیح اور بے لاگ [illegible]
یہ بحث سر آنکھوں پر، ورنہ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی [illegible]
وغیرہ کا ذکر ہو اور [illegible] مضمون کا عنوان ہو "اردو ادب [illegible]
نیا موڑ" عرف "روڈ کلوزڈ"

---

بقیہ
## اشراف کی زبان

(بسلسلہ [illegible])

مرزا غالب کی جدت پسند اور ایجاد طبیعت نے خطوط نویسی کے
کام کو بہت آسان کر دیا پھر بھی بعض وضعدار اشراف اپنی پچھلی
روش پر قائم رہے، ایسے خط کے القاب کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے جو [illegible]
ہم سے ایک نے اپنے بزرگ سید کرم فرما کو لکھا ہے۔

مجمع فضائل و فیوض، سر آمد کملائے عصر
قدوۃ الفضلاء، عمدۃ العلماء، التفات فرمائے مخلصان نیاز
آور دوستاں، عنایت گستر، مہر پرور، مصدر لطف و کرم خلاصۂ
خاندان مصطفوی و مرتضوی، معلی و مجتبی، مکرمی و محترمی
جناب مستطاب قبلہ و کعبہ سید صاحب دام اللہ اقبالکم!

ہم ان اشراف کی زبان کو سراپا تصنع اور تکلف کہیں،
خواہ ان کی وضعداریوں سے اختلاف کریں، لیکن اس میں شک
نہیں کہ اسی طبقے کی معاشرت کے خاکے میں ہم کچھ نقوش ملتے ہیں
جن سے ہم اپنی تہذیب اور شائستگی کے ایوان کو سجاتے ہیں۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان پشاور)

---

ابھی تو بیان ہے آنکھوں میں تم چلے آؤ
کہ پھر [illegible]

---

بقیہ
## اردو ادب کی تشکیل نو

(بسلسلہ [illegible])

[illegible]

# اردو ادب کی تشکیلِ نو

... اس موضوع پر جو بحث قومی زبان میں چل نکلی ہے اس سے متعلق میری نظروں سے ابھی دو مضامین ہی گزرے ہیں۔ ایک تو حضرت رفیق خاور کا (جو پہلا مضمون ہے اور جس کی بنا پر یہ بحث شروع ہوئی ہے) اور دوسرا جناب سید جعفر طاہر کا۔ ان دونوں مضامین کو پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک سوال بڑی شدّت سے ابھرا ہے۔ وہ سوال میں ان دونوں حضرات سے بھی پوچھنا چاہوں گا اور ان تمام صاحب نظر ادیبوں سے بھی جنہیں اس بحث سے دلچسپی ہے اور جو اس موضوع پر قلم اٹھانے کی سوچ رہے ہوں۔

وہ سوال بہت بنیادی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ بحث جا کس طرف رہی ہے؟ اور ان دونوں مضامین کا اپنے عنوان سے تعلق کیا ہے؟ یہ بحث اردو ادب نہیں، بلکہ اردو زبان کی تشکیل نو سے متعلق ہو کے رہ گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی ہم زبان اور ادب کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے لیکن تحقیق کے میدان میں ادب اور لسانیات الگ الگ علوم ہیں۔ ہم ایک ہی لاٹھی سے دونوں کو نہیں ہانک سکتے۔

حضرت رفیق خاور کا مضمون اگرچہ براہ راست لسانیات ہی سے متعلق نہیں ہے تاہم وہ اردو ادب کی تشکیل نو سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ یہ مضمون نہ ادھر کا ہے نہ اُدھر کا، اور اتنا ہی تشنہ ہے جتنا گذشتہ پچیس برسوں کا تنقیدی ادب، سید جعفر طاہر تو خیر سیدھے زبان کی بحث میں پڑ گئے۔

مجھے اس بحث کا جو رخ نظر آرہا ہے وہ ہمارے ہاں کے "کمرئہ صفائی ہفتے" سے کچھ زیادہ الگ نہیں ہے اور بہت جلد ہم سب اپنے اپنے قلمی جھاڑو سنبھالے اپنے دماغی کوڑے سر عام پھینکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جن دنوں علامہ کیفی حیات تھے، ان دنوں کی بات ہے کہ دہلی کی ایک ادبی انجمن میں تین روز تک ایک بحث بڑے زور و شور سے جاری رہی تھی کہ اردو ادب میں جمود ہے یا نہیں۔ یہ بحث سننے کے بعد میں نے اپنے ایک عالم و فاضل دوست سے پوچھا تھا، ـــــ "کیوں بھئی! اگر یہ لوگ اس نتیجے پر پہونچے کہ اردو ادب میں جمود ہے تو کیا یہ ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لیں گے؟ آئندہ لکھنا ترک کر دیں گے؟ یا کوئی پہاڑ کھودنا شروع کر دیں گے؟ اور اگر ان لوگوں نے یہ طے کر لیا کہ جمود نہیں ہے تو کیا ان کی تخلیقات ابدی قدروں کی حامل ہو جائیں گی؟

میرا مطلب یہ ہے کہ کیا اس قسم کی بحثوں سے کوئی جذبہ یا کوئی زبردست تحریک دل و دماغ تک پہنچنے لگتی ہے؟ ان بحثوں سے جو نتائج نکلتے ہیں، ان پر عمل کون کرتا ہے؟ اور کیا ان بحثوں کے بانی یا جنگجو قسم کے صلاح کار یا نام نہاد تنقیدی ستون کبھی

[illegible] اختیار کر لیے ہیں ۔ جہاں تک نئی تخلیق ادب کا تعلق ہے (تشکیل کا سوال تو بہت دُور رہا) ایسی بحثیں چند لوگوں کی دماغی قلابازیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں ۔ اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا کے مصداق آپ چند ہی مضامین میں دیکھ لیجے گا کہ کچھ شیر ببر جھاڑ کے غزل کے پیچھے پڑ جائیں گے اور اپنے ہر دعوے کی دلیل میں کسی نہ کسی غزل کا مصرع یا شعر دہراتے ہوئے نظر آئیں گے۔ آخر غزل پر دیے کھلے الفاظ میں تو ان دونوں مضامین ہی میں مواد موجود ہے ۔ کوئی "آتش نفس" درکار ہے جو اس خس و خاشاک کو دھواں بنا کر رکھ دے

اس موضوع پر ہاتھ گھما کر کان پکڑنے سے کچھ نہیں بنے گا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک جتنے تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں کیا وہ ۱۹۴۵ء سے آگے کے شعرا کا ذکر کرتے ہیں ؟ کیا ہر مضمون آج بھی جذبی، سردار جعفری، فیض، مجروح وغیرہ پہ آ کر ختم نہیں ہو جاتا ؟ کیا گذشتہ بیس برسوں میں ان لوگوں نے کوئی نیا ادبی شاہکار پیش کیا ہے ؟ کیا ان بیس برسوں میں اردو ادب میں ایسی کوئی آواز نہیں ابھری جس کا اعتراف میں دو جملے لکھے جا سکتے ؟ کیا اردو ادب کی تشکیل نو نئے فن کاروں کو نظر انداز کر کے ہوگی ؟ کیا ہم آج بھی ایمان داری سے اپنے اپنے سینوں پہ ہاتھ رکھ کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نقاد کسی سیاسی نظریے کے ہاتھوں بکے ہوئے نہیں ہیں ؟

کیا ہمارے ناقدین دیانت سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ بہترین ادبی تخلیقات بار رسالوں میں ایک خاص سیاسی نظریے کے نام نہاد ہم مضامین کو ترجیح نہیں دی جا رہی ؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے [illegible] (اور بھی [illegible] ہے کہ ۔

ب: ایڈیٹر سے اس کے اچھے مراسم نہیں ہیں ۔

ج: وہ اس سیاسی نظریے سے تعلق نہیں رکھتا جس سے ایڈیٹر منسلک ہے ۔

پھر ـــــ ؟ نتیجہ کیا ہوا ؟ وہی ڈھاک کے تین پات!

اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ اڈیٹر کی رائے تو حرفِ آخر ہوگی تو میں صاف کھلے الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آج کا ادیب علم و دانش میں کسی پرانے طرح سے کم ہی نہیں ہے بلکہ زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ اگر اس کی تخلیق یا رائے کو اس کے یقین و اعتماد پر نہیں پرکھا جا سکتا تو وہ بھی کسی دوسرے کی رائے کو حرف آخر تسلیم نہیں کرے گا ۔ اور پھر جب بات یہیں پہ ٹھہری کہ جس کے ہاتھ میں پرچہ ہے وہ خدا ہے تو کسی بھی ادبی تشکیل نو کی چیخ پکار سے مطلب کیا ہے ؟

کیا آج ۱۹۶۰ء میں ہم اس طرح ادب کی تشکیل [illegible] گے کہ ہر تیسرے پرچے میں غالب اور فیض کو ہم پلہ شاعر قرار دیا جائے ؟ ان دونوں کے اشعار کا موازنہ کیا جائے ؟ جب کہ [illegible] کی انتہا یہ ہے کہ فراق جیسے دیو قامت عظیم شاعر کو ایک طرف کر کے غزل کے میدان میں غالب کے بعد فیض کا نام لیا جائے تو ادبی قدریں بکواس ہیں ۔ جب عالم یہ ہو کہ گذشتہ تیس برسوں میں کسی لمبے ہاتھوں والے نقاد نے بھولے سے بھی عظیم فکر شاعر مرحوم میرزا یگانہ کا نام تک اپنے کسی مضمون میں نہیں لیا تو کسی ادبی تشکیل کی امید ہی کیا کی جا سکتی ہے ؟ اور یہ تشکیل کیا محض ایسے چند چھپے مضامین لکھنے سے ہو جائے گی ؟ جی نہیں ! میں بتاتا ہوں اس کے لئے کیا کرنا ہوگا ۔

گذشتہ بیس برسوں میں جتنے شعری ادبی اور تنقیدی مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کے [illegible]

[illegible] سے تو ایک زمین الٹ دیا جائے تو بہت سے اردو ادب کے نام نہاد
اور بزعم خویش نقادوں کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ جائے گا،
اور دوسرے یہ جو اس ترقی پسند طوفان میں بہتے پھرنے والے تیسرے
درجے کے تنکوں کو اردو ادب کے سفینے قرار دے دیا گیا تھا، یہ
محض ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا، یہ بات صاف ہو جائے گی۔

جب TOTALATARIAN انداز میں ادبی
تنظیمیں کی جاتی ہیں اور کی جا رہی ہیں اس وقت تو ننانوے فی صد
اردو مدیر اپنے گراں قدر اداریے میں ایسی تحریک کا خیر مقدم کرتے
ہیں ـــــ! ایسی تنظیمیں جہاں ایک سیاسی دھڑے کے "رگ من
تراجی مگویم" گاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس وقت ان ادیب
سیاسی شعبدہ بازوں کو ادبی سندیں بخشی جاتی ہیں، اس وقت تو
مدیروں کو ادیب کی شخصی آزادی خطرے میں نظر نہیں آتی لیکن اگر
کوئی حکومت چند غنڈوں کے اجتماع کو منتشر کرنے کے لئے طاقت کا
استعمال کرتی ہے تو ہماری ادبی دنیاؤں میں ایک واویلا مچ جاتا ہے اور
نظمیں یوں چھپتی ہیں جیسے اس حادثے کی خبر روزناموں میں ـــــ!
اگر کسی ان پڑھ جاہل مطلق ادیب کو اٹھتے بیٹھتے شراب نوشی اور عیاشی
کے امکانات مہیا نہیں ہوتے تو سماجی نظام قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے
لیکن کسی بدیشی ملک اور نظریئے کے سربراہ کے اعزاز میں گلا پھاڑ قسم
کی نظمیں اور اشعار کہتے وقت انہیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

۱۹۴۲ء سے لے کر اس وقت تک جب تک کہ مسٹر خروشچیف
نے اسٹالن کا مردہ بھری کونسل میں خراب نہیں کیا تھا، ہمارے
اردو ادیبوں نے اسٹالن کی تعریف میں رسالوں کے صفحے کے صفحے
کالے کر رکھے۔ یہی نہیں بلکہ سالانہ بہترین ادبی انتخابوں تک میں ایسی
نظمیں بکثرت پائی جاتی تھیں، لیکن جب ادھر سے ان کے دیوتا کوچ
کر گئے تو یہاں ادب والے ـــــ میری تو آنکھیں ہی ترس
گئیں کبھی ایسی نظم کے لئے جس میں اسٹالن کو ایشیا کا [illegible]
نہ جانے کیا کیا کہا جاتا تھا، اسٹالن کا باب ہی اردو ادب میں ختم ہو
گیا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسٹالن کیا ہمارا قومی رہنما تھا؟ اور
اگر ان ادیبوں کو اس سے اتنی ہی عقیدت تھی تو پھر ماسکو سے
جھاڑو پھرنے کے بعد کیوں نہ کسی مائی کے لال میں اتنی جسارت ہوئی
کہ اس کی تعریف میں نظمیں کہتا؟ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری حقیقت
کیا ہے؟

ایک سوال خاص طور پر ادیبوں سے میں پوچھوں گا کہ ۱۹۴۷ء
میں "خورشیدِ حریت" کے طلوع کے بعد آزادی کا ماتم ہزاروں نہیں
بلکہ لاکھوں نظموں میں کیا گیا۔ عجیب مذاق تھا کہ ہر نظم اس تان پہ
آ کر ختم ہوتی تھی کہ یہاں آزادیٔ تحریر و تقریر نہیں۔ سوچنے پہ پہرے
لگے ہوئے ہیں ـــــ غضب خدا کا کہ وہ نظمیں چھپ رہی ہیں، وہ
پرچے بدستور قائم ہیں، وہ ملک باز بدستور جی رہے ہیں، لیکن اس کا
کیا کیجے کہ ہمارے مدیروں نے کبھی خود سے اور اس شاعر سے یہ
سوال نہ کیا کہ یہاں اگر آزادیٔ تحریر و تقریر نہیں ہے، اگر فکر پر
پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں تو تم نے یہ نظم کہی کیسے، میں نے چھاپی کیسے؟

کیا اس سرزمین کے ادیب ـــــ جسے ہندوستان کہتے
ہیں، اس بات کا جواب دیں گے کہ آزادی کا ماتم تو انہوں نے جی بھر
کے منایا، لیکن جب چین نے ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر
قبضہ کر لیا تو کیا شدتِ غم سے ان کے ہاتھوں اور زبانوں کو لقوہ
مار گیا تھا؟ کیوں نہ کوئی نظم ادبی رسالوں میں نظر آئی؟

اور یہ جو آئے دن ہمارے چھوٹی قسم کے ادیب ہندوستان
کے چیخوف، پاکستان کے گورکی اور نہ جانے کیا کیا بنتے پھرتے
ہیں کیا اس قسم کی لغویات پر ہمارے نقادوں کے کان پر جوں تک
نہیں رینگی؟ کیا واقعی چیخوف، گورکی اور مجھے تو [illegible]

[illegible] اور ادیبوں کے صحیح نام بھی نہیں آتے) اتنے ہی گئے گزرے
ادیب کہ ان کے نام ہمارے ان ادیبوں پر ٹھیک اترتے ہیں جن کی
تحریریں پڑھنے کے بعد کچھ لکھنے تک کا جذبہ دل و دماغ سے مٹ جاتا
ہے؟ میں اپنے بھرپور مطالعے کے زور پر کہہ سکتا ہوں کہ ہم ذہنی
اور ادبی ایمان داری سے اتنے ہی دور ہیں جتنی ایک بانجھ عورت بچے
سے۔ اردو ادب کی تشکیل نو کے لئے لازم ہے کہ ان سب حرام زدگیوں
کی تلافی کی جائے۔

ان تمام باتوں سے صرف ایک ہی بات نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے
ہاں کس قسم کے ادب کو تقویت دی گئی ہے، اگر قارئین پسند فرمائیں
گے تو میں جلد ہی فیض، ساحر اور ان تمام ترقی پسندوں کی چیدہ
نظموں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دکھاؤں گا کہ ان کی کون سی نظم واقعی
بہترین تھی، لیکن اس کا کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا کہ کون سی نظم کس
گھٹے ہوئے جذبے کی غماز تھی، لیکن اسے کس طرح ہم نے اچھالا، اچھالنے
والے وہ نقاد تھے جو اس سیاسی نظام سے وابستہ تھے، جس کی پرچھائیاں
ان نظموں میں ملتی ہیں، واضح رہے کہ اگر کوئی ادبی تشکیل نو مقصود ہے
تو ہمیں ادب اور اخباری سیاست کو علاحدہ کرنا پڑے گا۔

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک شفیق، فاطمہ شعری (?)، کرار
نوری، سید رضی ترمذی، شہاب جعفری، اقبال مجید، بلراج مینرا،
رتن سنگھ، مخمور سعیدی، زکی، منظر ایلی (?)، عابد سہیل ـــــ
نام کہاں تک گنواؤں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں، یہ وہ مخلص شہیدان ادب
ہیں جنھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے چراغ فکر کو سینچا، لیکن صاحب کیا
الف سے ے تک کے کسی نقاد نے ان کی کسی بھی تخلیق کا دبے
لفظوں میں بھی اعتراف کیا ہے؟ اور اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ ابھی
ان کے بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے، تو پھر یہ ادبی
تشکیل نو کیا ہو رہی ہے؟ اگر یہی بات ہے تو پھر ان لکھنے والوں [illegible]

یورپ کے عظیم نقاد [illegible] گذشتہ
برسوں میں کئی نوجوانوں کی صلاحیتوں کا [illegible] اعتراف کیا ہے۔ [illegible]
پچیس برس کے کالن ولسن صرف "آؤٹ سائیڈر" لکھ کر [illegible]
شہرت کے مالک بن گئے، اور ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم "آؤٹ
سائیڈر" پڑھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ موضوع ہمارا تھا
فرنگیوں کا نہیں، لیکن ... ہائے اردو ادب ...
ہائے اردو مدیر ... جنھوں نے ماتم آزادی کے علاوہ
کسی دوسری تخلیق کو آگے نہ آنے دیا، اور اگر کوئی صاحب یہ
کہنے کی سوچ رہے ہوں کہ یہ جو نام میں نے اوپر گنوائے ہیں ان
میں ابھی صلاحیت نہیں ہے تو پھر سیدھی سی بات ہے کہ اب یہ
لوگ بھی پرانے لکھاڑیوں کے بارے میں تعریفی کلمات
نہیں پڑھیں گے، اور اس قسم کے جتنے "ادبی مضامین" ان کی
نظروں سے گزرتے ہیں، یہ لوگ ان کے لکھنے والوں کو [illegible]
دیتے ہیں اب وہ وقت لد گیا جب ایک سیاسی طوفان [illegible]
لے کر سینکڑوں بونے ہمارے سامنے کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ اب
دور آیا ہے جب اردو ادیب [illegible] علم اپنا لوہا منوائے گا نہ کہ
گروہوں میں شامل ہو کر، اگر کوئی ادبی تشکیل نو مقصود ہے تو سب سے پہلے
جتنے شاعروں اور ادیبوں کو غلط [illegible] یہ
ان سے چھین لی جائے۔ خدا کے لئے [illegible] کی اہمیت [illegible]
اعتراف کیجئے۔ ڈاکٹر آئن سٹائن، آرنلڈ ٹائن بی [illegible]
جی بی شا کے زمانے میں رہنے والے [illegible]
[illegible] VALUE [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مسٹر پیٹر ایوری استاد فارسی
کنگز کالج کیمبرج

# اقبال اور تصوف ایران

(لندن میں یوم اقبال کے اجلاس میں پڑھا گیا)

زمانہ جدید کے بلند پایہ مسلم مفکروں اور ادیبوں میں سے
سب برتر اور بلند مفکر اور ادیب علامہ اقبال کے بارے میں تقریر
کرنے کی مجھے دعوت دی گئی ہے اور آج یہ امر میرے لئے انتہائی اعزاز
کا باعث ہے۔ مگر میں یہاں پر اس بات کا بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ
علامہ اقبال کو انسان کے تعقل اور جذبات کا جس قدر گہرا اور وسیع
علم تھا اور ان کے افکار اور خیالات کی وسعت اور گہرائی اس قدر تھی
کہ اس سے واقفیت حاصل کرنا بذات خود ایک حوصلہ شکن امر ہے
اگرچہ وہ جس تقریر کے مستحق ہیں میں اپنے آپ کو اس کے قابل
نہیں سمجھتا۔

علامہ اقبال میں انسان کی ہر کیفیت کو سمجھنے کی عمیق صلاحیت
اور اس سے بھی زیادہ انہیں ابلاغ کی قوت حاصل تھی۔ تین
زبانوں اردو، فارسی اور انگریزی میں انہوں نے انتہائی خوبصورتی
سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اعلیٰ پائے کے مفکر ہونے کے
علاوہ ایک عظیم شاعر اور فنکار بھی تھے۔ علامہ وہ گوہر یکدانہ تھا جس
میں فلسفی اور شاعر کا نادر امتزاج تھا۔ انہوں نے ملٹن کی طرح
مفکر کے تعقل کا شعر کے ساتھ بے مثال امتزاج کر رکھا تھا۔ وہ دانش مندی کا
ایک پیکر تھے بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر تھے اور وہ دیکھتے ہم کسی چیز کو اپنی تلاش

تھے انہوں نے نوع انسانی کو ایک فلسفی کی نرمی مزاج اور ہمدردی اور ایک پیغمبر کے
وجدان کے ساتھ سمجھا۔

علامہ اقبال کے متعلق سب سے اہم اور قابل ذکر ان کا حرکی
فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ الغزالی اور مولانا جلال الدین رومی کے فلسفہ
سے مماثل ہے۔ عظیم ایرانی مفکر الغزالی اور بلند پایہ صوفی شاعر مولانا
رومی نے حرکی محبت کے فلسفے کی تبلیغ کی۔ ان کے نزدیک محبت کا عمل
یہ تھا کہ نوع انسانی کی راہ نمائی اسی طرز سے کی جائے جو اللہ کے مقصد
تخلیق کے قریب ہو۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ اس تصور کو غلط سمجھا گیا
اور اسے عزلت گزینی اور تنہائی پسندی کے ان تصورات کے ساتھ
گڈمڈ کر دیا گیا جو مشرق بعید سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تصورات کا تعلق
ریگزاروں اور چٹیل میدانوں کی بجائے زرخیز اور شاداب سرزمینوں
سے تھا جب کہ مسلم تہذیب انہی ہواؤں اور دشت و بیابان کی
پروردہ ہے۔ اگر آپ غور کریں تو ان مقامات پہاڑ اور انفعالی
تصورات کو اپنا نا خاصی انمل بے جوڑ سی بات ہے۔ چنانچہ
تصوف کو غلط طور پر انحطاط پسند طرز زندگی سمجھا گیا جس میں طالب
مطلوب کی ہستی میں کھو جانے کا خواہش مند ہوتا ہے تصوف میں
ذات جسے تصوف کی زبان میں نفس کہا جاتا ہے

[illegible] دیا گیا ہے جہاں پر تصوف کا مقصد سمجھا
گیا بلکہ فرض کر لیا گیا کہ پوری ذات کو ختم کر دینا ہی اس کی انتہا ہے
یہ نتیجہ اس حقیقت پر غور کیے بغیر نکالا گیا کہ تصوف کی تشکیل سنی مفکروں
اور شاعروں نے کی تھی جو بذات خود اصولاً اور عقیدتاً ذات انسانی کی
اہمیت کے قائل تھے اور اسے اللہ تعالیٰ کی بلند ترین تخلیق اور اللہ کی رضا سے
اعلیٰ سمجھتے تھے۔

یہ مفروضہ کہ تصوف کا مقصد ذات یا نفس کو ختم کرتا ہے اور
کل اور جزو میں حلول کر دیتا ہے۔ تصوف کے عملیاتی پہلو کی طرف
اشارہ کرتا ہے اور تصوف کی صحیح نوعیت اس طرح فراموش کر دی جاتی ہے
فریدالدین عطارؒ اور مولانا جلال الدین رومی نے جس حقیقی تصوف
کا تصور پیش کیا ہے اس کا مقصد ایران کے لوگوں کو تاریخ کے اس
موڑ پر حقیقت زندگی کا احساس دلانا تھا جب کہ مغلوں کی غارت گری
سے ایران کے قومی شعور میں خوف اور انفعال پیدا ہو رہے تھے، اہل
ایران اپنی اپنی ذات کے خول میں فرار ڈھونڈ کر مایوسی کی ایسی فضا
پیدا کر رہے تھے جو عمل اور قوت عمل کے لیے سم قاتل تھی۔

ہم میں سے بہت سے لوگ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ تصوف
ایک اہم روحانی اور ثقافتی تحریک کے علاوہ ایک سیاسی اور
معاشرتی تحریک بھی تھی۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں مشرق
میں ایران اور عراق کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر تصوف کے
اس پہلو کی چھاپ موجود ہے یہاں پر میں یہ اشارہ کرنا ضروری
سمجھتا ہوں کہ چنگیز خان کا پہلا حملہ ٹرانسکیشیا میں ۱۲۲۰ء میں
ہوا تھا۔

دسویں صدی میں بخارا اور سمرقند کے سامانی شہزادوں
کی جو شعر و شاعری کے دلدادہ تھے شکست کے بعد ایرانی عوام کے
ذہن پر انفعال اور مایوسی کے بادل چھا گئے۔ ایران کے بڑے بڑے
[illegible] صوفیا کا مقصد اس انفعال اور مایوسی کا ازالہ کرنا [illegible]
کی عظیم مذہبی عظمت ایران کا ایک ترجمہ ہے اس میں یہ کہا گیا
کہ ایران کی عظمت کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایران کے ان
عظیم شاعروں نے قومی شعور میں ایسا کردار ادا کرنے کی ضرورت پر
زور دیا تھا اور یہ شعور عظیم صوفی شاعروں کے ہاں بھی موجود ہے
صرف اس کا پیرایۂ اظہار مختلف ہے میرا مطلب یہاں ان شاعروں
شاعروں سے نہیں جن کی مثال عراق کے شاعروں سے دی جا سکتی
ہے بلکہ مقصود عطار اور جلال الدین رومی ہیں جنہوں نے محبت
کے ترانے گائے، ایسی محبت جو تغیر و ترقی اور عظمت کے لیے تھی
انہوں نے یہ سخت کوشی اور نفس کشی کا سبق دیا تا کہ وہ خدا سے کیے
گئے اقرار کو نبھا سکے۔ محبت میں ابریشم کی طرح نرمی کی تلقین کی،
ایک ایسی افہام و تفہیم کا چراغ جلایا، جس کے نور میں خود خدا کا
وجود عیاں ہو، اپنے ہم وطنوں اور اپنے جیسے انسانوں سے محبت
کرنے کی تلقین کی۔ قوم کے متعلق سوچنے اور اپنے زخموں پر مرہم
لگانے، زخمی، خوف زدہ اور بے قیادت عوام کی امداد کرنے اور
ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کا سبق سکھایا۔

تصوف کا یہ تصور ترک دنیا کے انسانی تصور کے بالکل
الٹ ہے اس انسانی تصور میں ترک دنیا کے ساتھ کسی وجد اور
عرفان کی تلاش وابستہ ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو غلطی سے ان [illegible]
کے ساتھ غلط طور پر وابستہ کیا گیا جس کی تخم ریزی ایران سے
چلی تھی اور یہ آج تک خصوصاً آج کے دن فارسی شاعری کی طرف
سے انسانیت کے نام پیغام کا اہم حصہ ہیں۔

اقبال کی فارسی ما بعد الطبیعیات سے [illegible]
[illegible] فارسی کا [illegible] فلسفہ [illegible] جلال الدین [illegible]
[illegible]

نے اس فلسفہ کو ہر حساب سے سمجھ کر اس کی تعبیر کی ہے اور یہ کہ
اس فلسفہ کو بہت کم لوگوں نے سمجھا۔ اقبال کا یہ دعویٰ درست ہے
کیوں کہ وہ خود مولانا روم اور الغزالی کے پائے کے مفکر تھے چناں چہ
فارسی ما بعد الطبیعیات سے اس تعلق کا انکار یقیناً اقبال بھی نہ کرتے
اس کے علاوہ مولانا روم اور الغزالی کی طرح اقبال بھی عوام کے
عقیدے کے ساتھ خود کو ایک پیغمبر اور بانیٔ ملت کی حیثیت سے وابستہ
کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے دیکھا کہ عوام منتشر ہیں ان میں مایوسی پھیل
رہی ہے جو ان کی قوت عمل کو بیکار کر دے گی چناں چہ ان کی سربلندی
کے لئے اقبال نے ان کے ایمان اور یقین کا احیاء کیا۔ انہوں نے اپنی
تعلیمات کی بنیاد قرآن پر رکھی۔ انہوں نے قرآن کی تعلیمات کا اعادہ
اور وضاحت کی کہ ایمان کا آغاز ذات یا خودی سے ہوتا ہے، اور
صرف خودی کے ذریعے ایمان ویقین کا حصول ہوسکتا ہے، اس کی
نشو ونما ہوسکتی ہے اور اسے پائدار بنایا جاسکتا ہے۔ قرآن پر بنائے
خودی رکھنے میں بھی علامہ اقبال اپنے عظیم ایرانی استادوں سے مماثلت
رکھتے ہیں، اور درحقیقت یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات کی بنیاد مشترک
ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کے پیغام کے حرکی تصور کے سلسلے میں
رومی اور اقبال ہم آواز ہیں۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ فارسی کے عظیم صوفیوں کے پاس
ایک پیغام تھا۔ یہ پیغام آج ہماری دنیا کے لئے بہت بڑی اہمیت کا حامل
ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں یہ واضح کرسکتا ہوں کہ اقبال کی تعلیمات کو سامنے
رکھ کر اگر اس پیغام کو دیکھا جائے تو اسے بہتر طریق پر سمجھا جاسکے گا۔
جو اسلام کے دیرینہ مفکروں کے افکار کی وضاحت کرتے ہیں انہیں
دوبارہ پیش کرتے ہیں، ان سے فیض حاصل کرتے ہیں اس کے ساتھ
ما بعد الطبیعیات کے مسلمان مفکروں کے غلط خیالات اور تعلیمات
کی تصحیح بھی کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ان کی تعلیمات کی حرکی صلاحیتوں
کو سمجھ لیا تھا اور ان صلاحیتوں سے بھی وہ آشنا تھے جو دنیا کے
دوسرے فلسفوں سے ہٹ کر تھیں۔ میں اس دلچسپ حقیقت کا ذکر
کرنا چاہتا ہوں کہ ان مسلم مفکروں نے اونچی زندگی کا ایک فلسفہ وضع
کیا ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہے اور ان کی سب سے پہلی بات رسول اللہ
کی وحی پر یقین ہے ان میں وہ دولخت روپ نہیں ملتے جو عموماً ایمان
اور فلسفہ کی علیحدگی کا باعث بنتے ہیں۔

اس سے پہلے ہم نے کہا تھا کہ علامہ اقبال کی ذات میں ایک
شاعر اور ایک فلاسفر کا غیر معمولی امتزاج ہے۔ اب ان کی ذات کی
ایک اور غیر معمولی صلاحیت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ صدیوں پیشتر
چند عظیم مسلمان مفکروں کے ساتھ وہ شدید مذہبی آدمی تھے لیکن اس
کے ساتھ ہی فلاسفر بھی تھے۔

مجھے یہاں یہ کہنا ہے کہ علامہ اقبال نے صرف ایران کے بڑے
بڑے صوفیوں کے فلسفۂ محبت کی تعبیر توضیح وتشہیر ہی نہیں کی بلکہ وہ
آج کی دنیا میں مذہب کی قوت اور اثر کے بڑے بڑے حامیوں میں سے
تھے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ آج کا سائنس جاننے والا آدمی بھی
صاحب ایمان ہوسکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آج جن سوالات
کے سامنے عقل انسانی کا عجز ظاہر ہوتا ہے اگر ایمان کو بھی اس کا ہمراہ
بنایا جائے تو اس طرح وہ صرف سرخرو ہی نہیں ہوتی بلکہ پختہ تر ہوجاتی
ہے اور اس طرح خدا کی محبت کے آئینہ میں انسانی خودی کی اس طرح
تعبیر ہوسکتی ہے جس طرح کہ مشیت ایزدی کو مقصود ہے۔

حرف بد را بر لب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت احترام آدمی — باخبر شو از مقام آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

سید اختر مسعود رضوی

# اشراف کی زبان

اس مختصر سے عرصے میں جب ہم دامانِ اردو کو طرح طرح
[illegible] بیش قیمت اور آبدار موتیوں سے مالا مال دیکھتے ہیں تو ایک مسرت
[illegible]ن حیرت ہوتی ہے۔ اس قیمتی ذخیرے کی فراہمی میں سماج کے مختلف
[illegible]وں نے حصہ لیا لیکن اس بیش بہا دولت کے سب سے نمایاں اور
[illegible]م حصہ دار اشراف ہیں۔ اشراف کا طبقہ اپنی معاشرت میں ایک
[illegible]س وضع کا پابند ہے جس کو وہ آئینِ شرافت سمجھتا ہے۔ زندگی کے
[illegible] شعبے میں اشراف کے مخصوص آداب ہیں جن پر وہ نہایت سختی سے
[illegible]ں پیرا رہتے ہیں، ان کی معاشرت ایک خاص تہذیب کی یادگار ہے
[illegible]س کو ہم درباری تہذیب کہہ سکتے ہیں، ان کی محفل میں بے باکی سے
[illegible]نا، بے تکلفی سے اٹھنا بیٹھنا، بلند آواز سے ہنسنا، مبتذل عبارات
[illegible]نا استعمال کرنا، ناشائستگی اور گنوارپن کی علامتیں ہیں، شرفاء
[illegible] نشست و برخاست اور گفتگو میں حفظِ مراتب کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے
[illegible]ہیں۔ انکسار و خاکساری ان کی بات بات سے ٹپکتی ہے۔ شائستگی
[illegible] آداب اور شائستگی گفتار ان پر ختم ہے جو شخص ان کی معاشرت کی
[illegible] نزاکتوں سے واقف نہ ہو [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جس کو وہ بغیر کسی شعوری کوشش کے خوش اسلوبی سے برتتے ہیں
آدابِ معاشرت میں تقریر و گفتگو کا بہت اہم مرتبہ ہے۔ اشراف نے
بھی اپنی زبان کی طرف خاص توجہ کی۔ ان کی زبان کی سب سے نمایاں
خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ عموماً وہی زبان بولتے ہیں جو تحریری
اور علمی زبان کہلاتی ہے۔ لیکن بہرحال گفتگو میں روزمرہ اور محاورہ
کی چاشنی ایک خاص لطف پیدا کرتی رہتی ہے۔ اپنی نجی زندگی
میں ضیافتوں میں، مزاج پرسی اور تعزیت کے موقعوں پر اشراف
کے طرزِ عمل اور اندازِ گفتگو کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

[illegible] ہم دوسرے تمام مفاد [illegible] شرفا [illegible]
باہمی تعلقات رکھتے ہیں کس طرح کھانا کھاتے ہیں لیکن یہ بات یاد
رکھیے کہ یوں تو یہ لوگ کیا خلوت کیا جلوت تکلف میں [illegible]
رہتے ہیں مگر کھانے پینے کے موقعوں پر خاص طور پر [illegible]
سے تکلف برتتے ہیں مگر کیا مجال کہ کوئی تکلف کرنے کا اعتراف
کرے بلکہ اگر کوئی اس طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرے تو فوراً
اور شائستگی کے ساتھ اس الزام کے خلاف پر زور احتجاج کرتے
ہیں اور تکلف سے اپنی بے زاری اور بریت کا اعلان کرتے ہیں
دسترخوان بچھا ہوا ہے [illegible]
[illegible] آپ کی [illegible]

پھر آپ واقف ہی ہیں کہ بندہ تکلف سے کوسوں دور بھاگتا ہے جو کچھ
چلتی روٹی، دال دلیہ میسر ہوگا حاضر کر دوں گا۔ لیکن یہاں دستر
خوان پر تو چلتی روٹی دال دلیہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہوگا بھی تو دستر
خوان پر بچھی ہوئی متعدد اور انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی
قابوں میں اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ کھانا شروع ہو چکا ہے نہایت
تیز سے بچے تُلے انداز میں کھایا جا رہا ہے، چھوٹے چھوٹے نوالے آہستگی
سے توڑے جا رہے ہیں اور دھیرے دھیرے چبائے جا رہے ہیں، کیا
مجال جو ذرا سی انگلی تر ہو جائے یا چبانے میں ذرا سی آواز نکلے یا منہ
بنے۔ بچپن ہی سے آداب دسترخوان کی سخت تربیت دی جاتی ہے،
میزبان قورمے کی قاب مہمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا ہے بسم اللہ
حضور آپ نے اس قاب کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ یہ آپ کی
نظر التفات کی بری طرح منتظر ہے، اشراف کے آداب دسترخوان
کے مطابق مہمان کھڑا ہو جاتا ہے اور آداب عرض کرتا ہوں تسلیمات
بجا لاتا ہوں، شکریہ، عنایت، نوازش کہتے ہوئے آہستگی سے
قاب سنبھال لیتا ہے اور پھر اپنی جگہ بیٹھ کر قاب سے حسب ضرورت
قورمہ اپنی پلیٹ میں منتقل کر لیتا ہے۔ کھانے کے دوران میں مہمان
برابر لذت اور مزے کی کبھی ٹھیک ٹھیک اور کبھی مبالغہ آمیز تعریف
کرتا ہے۔ ماشاء اللہ ہر چیز اتنی لذیذ اور خوش ذائقہ ہے کہ جی چاہتا
ہے اسی سے پیٹ بھر لو۔ اتنا مزے دار کھانا تو مدت سے نہیں کھایا
تھا، دل خوش ہو گیا لیکن جناب آپ نے میری گذارش کو قابل قبول
تصور نہ فرمایا میں نے عرض کیا تھا کہ کھانے میں تکلف نہ ہو آپ نے تو
بہت تکلف فرمایا۔

میزبان۔ کیا فرماتے ہیں جناب، مجھ کو شرمندہ نہ کیجئے،
آپ کی وجہ سے کوئی مخصوص اہتمام تو نہیں کیا ہے جو کچھ حاضر تھا پیش کر دیا
[illegible] مہمان پیٹ بھر کر کھا لیتا ہے اور میزبان [illegible] کی طرف
قاب بڑھاتا ہے تو مہمان مہذب طریقے سے کھانے سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے
اور میزبان کو یقین دلاتا ہے کہ بخدا اب میں پوری طرح شکم سیر ہو چکا ہوں
مرغ زیرے کی قسم جو ایک نوالے کی بھی گنجائش ہو حکیم شفاء الملک کو خبر ہو
جائے کہ میں نے معدے پر یہ مظالم ڈھائے ہیں تو وہ میرے علاج سے
یقیناً دست کش ہو جائیں۔ جب سے سوئے ہضم کی شکایت میں مبتلا ہوا
ہوں آج پہلی مرتبہ بدپرہیزی کی ہے اور صاحب کون کافر ہے جو
اتنے لذیذ کھانوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے۔ اپنے پیٹ کی کم ظرفی
اور تنگ دامنی کا صدمہ رہ جائے گا۔ اگر میں شاعر ہوتا تو ان مزیدار
کھانوں کی ہر قاب کا قصیدہ لکھتا۔ فی الحال مرزا غالب کا شعر قدرے
ترمیم کے ساتھ عرض ہے ؎

میری قسمت میں گر یہ دعوت تھی
پیٹ یا رب کئی دیئے ہوتے

میزبان: ۔ بھئی واہ واہ! کیا بات میں بات پیدا کی ہے الفاظ
میں ذرا سا رد و بدل کر کے آپ نے یہ شعر تو اپنا لیا! غرض میزبان
کو یقین ہو جاتا ہے کہ میرا معزز مہمان خوب شکم سیر ہو گیا۔ چنانچہ
کھیر کی پلیٹ آگے بڑھاتا ہے، آپ کو شیرینی کھانے کی قسم تھوڑی
کھیر تو ضرور نوش فرمائیے۔ مہمان بعض طبی موانع کی وجہ سے ٹالنا
چاہتا ہے لیکن بھونڈے پن سے نہیں۔ سبحان اللہ کھیر کتنی نظر فریب
معلوم ہو رہی ہے جیسے چاندنی سمٹ کر پلیٹ میں سما گئی ہو چاندی
کا ورق اور پستے کی ہوائیاں کس حسن و خوبی سے ترتیب دی ہیں کہ بس
دیکھ کر ہی لطف آ گیا۔ لوگ غلط تھوڑی کہتے ہیں کہ خوش سلیقگی
اور لطافت آپ کی ذات پر ختم ہے میرا خیال ہے کہ [illegible]
اس کے سینے میں گھونپنا اس کی نفاست و لطافت کا [illegible]
مجھے کھیر کھانا [illegible]
رہنے دیجئے لیکن میزبان [illegible]

آنسہ ارشد

# "رسالہ"

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کے قدم اور بھی مضبوط ہو گئے اس وقت اہل ہند خصوصاً مسلمان سخت زبوں حالی کا شکار تھے۔ ان کی خستہ حالی نے سرسید کے دل پر اثر کیا۔ اور انہوں نے اصلاح قوم کی غرض سے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا جس سے ملک میں ایک ذہنی انقلاب آنے لگا۔ اور ایک ایسی شعوری سطح استوار ہونے لگی جس پر تاریخ ہند کی آئندہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

سرسید کی تحریک نے جہاں دہلی۔ علی گڑھ۔ آگرہ اور لاہور جیسے بڑے بڑے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے علاقوں کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ [illegible]ء کی بات ہے کہ قصور (ضلع لاہور) کے چند دانش وروں نے اس تحریک سے متاثر ہو کر خدمت قوم و ملک کے لئے کچھ کام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور مل بیٹھ کر ایک انجمن قائم کی جس کی پالیسی بلا لحاظ مذہب و ملت قوم کی خدمت اور ان کی ترقی اصلاح و بہبود پر مبنی تھی۔ اس انجمن کا نام "انجمن مفید عام" رکھا گیا جس کے صدر منشی غلام نبی خاں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور اور نائب منشی قادر بخش تحصیلدار مقرر ہوئے۔

"انجمن مفید عام" وہ پہلی باقاعدہ جماعت ہے جس نے تعلیم و تربیت کے میدان میں وہ کار ہائے نمایاں سر انجام دیئے کہ خود گورنر پنجاب اور دیگر عہدیداران حکومت بھی اس کے معترف تھے۔ انجمن نے زنانہ اور مردانہ کئی اسکولوں کا اجراء کیا جن میں نہ صرف تمام علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ عملی تربیت کے لئے تجربہ گاہیں قائم تھیں۔ لڑکوں کو زراعت اور صنعت و حرفت میں تربیت دی جاتی تھی۔ اور لڑکیوں کو کشیدہ کاری، سوزن کاری اور دیگر امور خانہ داری سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ طلبہ کو محنت اور جاں فشانی سے کام کرنے کی عادت ڈالنے کے لئے وظیفے دیئے جاتے تھے اور انہیں پڑھانے کے لئے تجربہ کار اور منجھے ہوئے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

## رسالے کا اجرا

"رسالہ" انجمن کے قائم ہوتے ہی جاری ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد بند ہونے کا علم نہیں۔ یہ ایک کتابی شکل کا ماہ نامہ تھا۔ سرورق گہرے نیلے رنگ کا ہوتا تھا جس پر مطبع کے نام کے علاوہ سب سے اوپر فارسی کا یہ شعر تحریر ہوتا تھا ؎

حکمت طلب و بزرگی آموز
تا نگرند روزت از روز

اس کی ضخامت عام طور پر ۲۴ صفحے اور قیمت ساڑھے چار آنے ہوتی تھی۔ رسالہ "قادری پریس" سے شائع ہوتا تھا جو انجمن ہی کی ملکیت تھا۔ ادارت کے فرائض نہایت محنتی، لائق اور مشہور افراد کے سپرد تھے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر اور مہتمم حنیف الحق ادیب تھے جو اپنے وقت کے چند پایہ کے مضمون نگار، تجربہ کار صحافی اور ادیب تسلیم کئے جاتے تھے ان کا مشہور شاہکار "یادگار زمن" ہے جو کچھ عرصہ کے لئے [illegible]

وقت دہلی کی انجمن پھر سیف الحق کے ہاتھوں میں آگئی ۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ۔ انجمن مفید عام کا مقصد عوام الناس کو
علوم کی روشنی سے روشناس کرنا اور مختلف فنون کی تربیت دینا تھا ۔
اس چہ تعلیم و تربیت سے متعلق انجمن کی تمام کارروائیاں " رسالہ " میں
ماہ بہ ماہ آتی تھیں جن سے اس کی علمی و عملی سرگرمیوں کے بارے میں
حاصل معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ اس رسالے میں کئی طرح کے مضامین
شائع ہوتے تھے جنھیں علحدہ علحدہ درج ذیل کیا جاتا ہے ۔

# مضامین

## ١ ۔ علمی و ادبی

" رسالے " میں ہر علم پر لکھا جاتا تھا ۔ اس کا دائرہ عام لوگوں
مطالعہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بعض اوقات حساب اور جبر و مقابلہ
سوالات اور ان کے حل بھی پیش کیے جاتے تھے ۔ بے شک ریاضیات
شخص سے تعلق نہیں لیکن عوام الناس کی فلاح و بہبود کے علاوہ اس کا
مقصد ان نونہالان وطن کی آبیاری بھی تھا جو انجمن کے اور دوسرے
اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ سوالوں کی گتھیاں ماہر
انہ سلجھاتے تھے اور ان کے حل اس طرح پیش کیے جاتے تھے کہ رسالے
پر ریاضی کی کتاب کا اشتباہ ہوتا تھا ۔

جہاں تک تاریخ و جغرافیہ کا تعلق ہے اس میں بہت سی معلومات
دی جاتی تھیں ۔ اسلامی تاریخ کے سنہرے واقعات [illegible]
[illegible] رنگ میں بیان کیے جاتے ہیں ۔ دنیا کے مختلف ممالک کی جغرافیائی کیفیات
اور حالات ۔ [illegible] بے شمار معلومات
دی جاتی تھیں ۔ جہاں ہندوستان [illegible] کا ذکر آیا
[illegible]
[illegible]

کے کاروبار ، رسم و رواج ، بود و باش اور طرز معاشرت کی [illegible]
جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ اس کے علاوہ یورپ میں ترکی کی
کارگزاریاں اور روس و ترکی کے بدلتے ہوئے حالات کو نہایت سلجھے
ہوئے انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔

" فرہنگ لغات " کے تحت اردو اور فارسی کی گرامر کے تمام قواعد
اس طرح سمجھائے گئے ہیں کہ جسے پڑھ کر ہر آدمی گرامر کے نشیب و فراز
سے واقف ہو جاتا ہے ۔ اسم اور فعل کی ابتدائی گردانوں سے لے کر صرف
و نحو ، تراکیب ، اصطلاحات اور انشا پردازی کی بلندیوں تک تمام مدارج
اس سلیقے سے طے کیے گئے ہیں کہ بے اختیار مصنف کی محنت اور حسن بیان
پر داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔

جب علم طب پر قلم اٹھایا گیا ہے تو جسم انسانی کے جز و کل کی تفصیل
نبض شناسی ، احوال تغیرات مریض ، مرض کی جملہ اقسام مجربات و نسخہ جات
کی تیاری اور ترکیب استعمال غرض طب یونانی کے تمام رموز بڑی خوبی
سے سمجھائے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ رسالہ میں فلسفہ سے متعلق بھی اکثر
مضامین شائع ہوتے تھے ۔

پھر قانون کی باتیں بھی ایک بار نہیں بار بار ملتی ہیں جن میں کہ
ہندوستان کے قوانین کی دفعات درج کی گئی ہیں تاکہ لوگوں کو حکومت
کے اصول و ضوابط کا علم رہے ۔ " نیرنگ فرہنگ " کے زیر عنوان سائنس کی
درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا جس میں طبعیات و کیمیا [illegible]
[illegible]
٧ ۔ اشاعت [illegible] زبان [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اس کے علاوہ زبان دانی کے قیمتی اصول بھی لکھے جاتے تھے تاکہ لوگوں کو اردو سیکھنے میں آسانی رہے۔ ۔ ۔ ۔ روزمرہ محاورات اور ضرب الامثال اس کثرت سے دیے جاتے تھے کہ لغت کی ضرورت نہ رہتی تھی۔ اسی پر بس نہیں۔ رسالہ میں پولٹیکل اکانومی یعنی علم دولت سیاسیات۔ نجوم۔ تصویر کشی۔ معدنیات۔ پہاڑوں کی ساخت اور موجودات عالم کی تاریخ آفرینش جیسی پراز معلومات باتیں بھی کثرت سے شائع ہوتی تھیں اخلاقی اور اصلاحی مضامین کی بھی کمی نہیں تھی۔ بلکہ چند ایک شماروں کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ راست بازی۔ بدگمانی۔ اخلاق۔ اتفاق۔ جھوٹ کے نقصانات۔ شکر نعمت۔ ریاکاری۔ اور رنج و مصیبت کی قسم کے بے پناہ مضامین رسالہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ نگارشات زیادہ تر سرسید احمد خان۔ مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد جیسی منتخب روزگار شخصیتوں کی جگر سوزی کا نتیجہ ہیں جن کا "کھٹ مٹھا" انداز بیان ایک طرف تو شیرینیٔ الفاظ کی لذت بخشتا ہے اور دوسری طرف قلب و جگر میں طنز و طعن اور سوز و گداز کا نشتر چبھوتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں انہیں کا حصہ ہے۔

## ب ۔ فنی مضامین

انجمن مفید عام نے ایک ۔ ۔ اسکول بھی قائم کیا تھا جہاں طلبہ کو فنی تربیت دی جاتی تھی۔ اس اسکول کی تمام سرگرمیوں کی اطلاع اسی رسالے کے ذریعے خاص و عام تک پہنچائی جاتی تھی۔ چنانچہ رسالہ کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دست کاری اس زور شور سے ہوتی تھی کہ اس کی دور دور تک دھاک بیٹھ گئی تھی۔ مصنوعات متعلقہ فنی کپڑوں۔ فرنیچر۔ نجاری۔ چرم دوزی۔ چینی کے برتنوں وغیرہ [illegible] پر مشتمل تھی۔ جن کی نفاست کی تعریف کرتے ہوئے گورنر پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن نے کہا تھا۔

"اہل ہند کو یاد رکھنا چاہئے کہ سب سے پہلے صنعت و حرفت کا [illegible] پودا اسی غریب مجلس یعنی انجمن قصور نے لگایا ہے جس کی وجہ سے اس کے جملہ حامیوں کو مبارک باد دی جاتی ہے"

"رسالہ" میں نہ صرف جملہ مصنوعات کی بابت اطلاعات دی جاتی تھیں بلکہ ایسے مضامین بھی شائع ہوتے تھے جو عملی کام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں علم زراعت کی تمام ضروری باتیں مثلاً آلات کاشت کاری کی قسمیں اور ان کا استعمال۔ فصلوں کی اگائی اور کٹائی کے صحیح اوقات، پودوں کی نشو و نما اور دیکھ بھال سے متعلق ہدایات اور انہیں تباہ کن عناصر مثلاً جانوروں۔ پرندوں اور ٹڈی دل سے محفوظ رکھنے کے طریقے قلم بند کئے گئے ہیں۔ غرض اس رسالے کے جہاں دوسرے علوم کا پرچار کیا وہاں زراعت و کاشت کاری کی بھی کھل کر اشاعت کی اور اسے ترقی دینے اور مقبول عام بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

## تعلیم و تربیتِ نسواں

انیسویں صدی میں ہندوستان کی تعلیمی حالت پر نگاہ ڈالیں تو گھٹا ٹوپ اندھیرا دکھائی دیتا ہے اعلیٰ تعلیم کیا ذکر ادنیٰ مدارس ہی خال خال ملتے ہیں اور تعلیم نسواں تو چراغ لے کر بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی ۔۔۔۔ ایسے میں قصور جیسے چھوٹے سے قصبے میں مردوں کے ساتھ ساتھ زنانہ مدارس کی بنیاد رکھنا انجمن کا یقیناً نیک اقدام ہے گو اس مدرسے میں طالبات کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی لیکن جس خلوص نیت، تندہی اور بلند حوصلگی سے اس میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سے کار پردازان انجمن کے بلند عزائم کا پتہ چلتا ہے۔

مدرسے میں امور خانہ داری سے متعلق عملی ہدایات [illegible] کی تعلیم دی جاتی تھی اور طالبات کو [illegible]

ابال آیا۔ افسردہ دل اور پژمردہ دماغ میں جو متواتر
امراض کے حملوں سے کسی کام میں نہ رہے تھے ان سے
کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ شاعر
اپنا حال کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد اس انقلاب آفرین مسدس
کا آغاز اس شعر سے کیا جاتا ہے ۔

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

پھر سارا مسدس ایک ہی شمارے میں دے دیا گیا ہے۔ سوائے مسدس
"رسالہ" میں منظومات پر کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ ہاں ایک دو جگہ
اتفاق سے کچھ شعر ملتے ہیں۔ مثلاً

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے۔ ہم جہاں رہے

اور

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پہ
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی راز داں سے ہم

## خبریں اور اشتہارات

"رسالہ" گو ماہوار تھا لیکن واقفیت عامہ کے لئے اس میں
ملکی اندرونی و بیرونی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ لیکن ان کی نوعیت
دوسرے ہم عصر اخباروں اور رسالوں سے مختلف تھی کیوں کہ صرف وہی
خبریں طبع ہوتی تھیں۔ جو خصوصی طور پر طلبہ کے لئے سودمند ہوتی تھیں مثلاً
لفٹ براعظموں میں مستعمل زبانوں کی تعداد، ہندوستانی ریاستوں کے
[illegible] وفات۔ ایجادات اور اسی قسم کی دوسری معلومات [illegible]
[illegible] انتخاب پنجاب سے اخذ کی جاتی تھیں۔ جہاں تک اشتہارات کا تعلق ہے
[illegible] انجمن کے [illegible] تک ہی محدود تھے۔

## پالیسی

"رسالہ" کی پالیسی انجمن کی پالیسی تھی جو تعلیم و تربیت کے ایک
ہی محور کے گرد گھومتی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ حکومت وقت سے دوستانہ
تعلقات قائم کرنا اور اسے خوش رکھ کر مالی امداد حاصل کرنا بھی اس کا
منتہائے مقصود تھا۔

## مضمون نگار

یہ رسالہ خالص علمی و ادبی تھا۔ اس لئے اس کی عنان ادارت سیف الحق
ادیب اور مولوی فتح محمد بیگ جیسے مشہور مضمون نگاروں کے ہاتھوں میں تھی
سیف الحق کے متعلق پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ ایک تجربہ کار اہل قلم تھے،
مولوی فتح محمد بیگ بھی اپنے وقت کی ایک بلند شخصیت ہیں جنہیں
"امام فن مناظرہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ دوسرے قلم کاروں
میں نجم الہند سر سید احمد خاں۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا محمد حسین آزاد،
(جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے)۔ عبدالحکیم کلانوری مدرسہ
انجمن کے ہیڈ ماسٹر مولوی محمد دین اور مدرس پنڈت کنھیا لال صف اول میں
شمار ہوتے ہیں۔ یہ اصحاب اول سے آخر تک "رسالہ" پر چھائے رہے۔

**معیار**

اس رسالہ کے معیار کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہئے کہ اس کو ہندوستان
کی فخر روزگار ہستیوں کا علمی تعاون حاصل تھا یوں تو خود بھی یہ خالص
علمی نوعیت کا رسالہ تھا۔ لیکن ان بزرگوں کی کرم فرمائیوں نے سونے پہ
سہاگے کا کام کیا اور اسے ایسے چار چاند لگ گئے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس
کی شہرت کا دور دور تک ڈنکا بجنے لگا۔ رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ
(سابق) پنجاب میں سب سے پہلے سرسید تحریک کا [illegible] تہذیب الاخلاق [illegible]
[illegible]
تحریک کی حمایت [illegible]

# گردوپیش

## بی۔ اے کے نصاب میں اردو کو لازمی مضمون قرار دینے کا مطالبہ مسترد

### حامیان اردو اپنی الگ یونی ورسٹی قائم کرلیں" وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی کا جواب!

لاہور ۲۹ رمئی۔ پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے اردو کو انگریزی کی طرح بی اے کے نصاب میں لازمی مضمون کے طور پر شامل کرنے کا مطالبہ مسترد کر دیا ہے اور اردو کے حامیوں سے کہا ہے کہ وہ اردو کی الگ یونی ورسٹی قائم کرلیں۔ باوثوق ذرائع نے بتایا ہے کہ وائس چانسلر ڈگری کلاسز میں اردو کو وہ مقام دینے پر آمادہ نہیں ہوئے ہیں جس کا ذکر تعلیمی کمیشن کی سفارشات میں ہے۔ کمیشن کی رپورٹ کے صفحہ ۲۲ پر کہا گیا ہے کہ ڈگری کلاسز میں اردو کی تدریس کا بہترین انتظام ہونا چاہئے تاکہ یہ زبان اعلیٰ تعلیم کے درجوں میں بھی نشو و نما پا سکے۔ بیان کیا گیا ہے کہ وائس چانسلر کی توجہ کمیشن کے اس نقطۂ نظر کی جانب مبذول کرائی گئی تو انہوں نے کہا یہ باتیں محض زیب داستان ہیں۔

اردو کے جن حامیوں نے قومی زبان کی ترویج کے سلسلہ میں وائس چانسلر سے ملاقات کی تھی انہوں نے وائس چانسلر کا زاویہ نگاہ بتایا ہے کہ وہ ڈگری کالجوں میں اردو کو بطور لازمی مضمون قبول نہ کرنے کے علاوہ اس امر پر بھی آمادہ نہ ہوئے کہ انگریزی کے پرچے میں انگریزی کا کوئی نثری حصہ اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے لازمی طور پر رکھا جائے تاکہ ڈگری کالجوں کے طالب علموں کی استعداد ترجمہ کرنے میں بھی پیدا ہو سکے۔ اردو کے حامی وفد کا یہ مطالبہ بھی تسلیم نہیں کیا گیا کہ سائنس اور آرٹس کے تمام مضامین کے امتحانی پرچوں میں کم از کم دو سوالوں کا جواب اردو زبان میں دینا لازمی قرار دیا جائے۔

وائس چانسلر سے حامیان اردو کا جو وفد ملا تھا اس میں اسلامیہ کالج کے شعبہ فارسی کے سربراہ ڈاکٹر وحید قریشی، اسلامیہ کالج فار ومن کی وائس پرنسپل بیگم کاکاخیل۔ کوئین میری کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر صابر علی اور دار العلوم الشرقیہ کے پرنسپل آغا بیدار بخت شامل تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ حامیان اردو کا ایک وفد جس میں متذکرہ اصحاب کے علاوہ اسلامیہ کالج کے سابق پرنسپل خواجہ دل محمد اور کنیرڈ کالج کے شعبۂ فارسی کے سربراہ پروفیسر وحید الدین بھی ہوں گے، پروفیسر سراج الدین سکریٹری تعلیم سے ملاقات کے دوران اعلیٰ تعلیمی نصاب میں اردو زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے کی کوشش کرے گا۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳۰ رمئی)

#### علامہ وحشت کی چھٹی برسی

کلکتہ۔ بزم شاکری کلکتہ کے زیر اہتمام علامہ رضا علی وحشت کی

ابرسی ۱۰ رجون ۱۹۶۲ء کو دل کشا انسٹی ٹیوٹ دل کشا اسٹریٹ کلکتہ
اپنی روایتی شان سے منائی گئی۔

پروگرام کے مطابق ۴ بجے سے مغرب تک قرآن خوانی ہوئی،
از مغرب اور چائے نوشی کے لئے وقفہ کیا گیا اور پھر ۹ بجے سے تقاریر
در پروفیسر عبدالرحیم صاحب کی صدارت میں شروع ہوا سب سے پہلے
ب آغا محمود نشتر کاشمیری نے علامہ کے اخلاق و عادات پر تقریر کی اس کے
جناب مولانا خیر الانام صاحب نے علامہ کی ہمدردی، خلوص و محبت کا
ن فرمایا۔ پھر پروفیسر پرویز شاہدی نے علامہ کے شاعرانہ کمال اور
ہ کے مخصوص انداز سخن پر مختصر مگر جامع الفاظ میں روشنی ڈالی آخر میں
ور جناب پروفیسر عبدالرحیم صاحب نے علامہ سے متعلق اپنے تاثرات کا
ظہار فرمایا۔ ۱۱ بجے شب کو غیر طرحی مشاعرہ حضرت پرویز شاہدی کی صدارت
یں شروع ہوا علامہ وحشت کے کلام سے مشاعرے کا افتتاح کیا گیا۔
س کے بعد کم و بیش ۲۰ شعراء نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

## اردو یونی ورسٹی کے قیام کی اہمیت پر محترمہ ثریا حمید کی تقریر

لاہور ۹ رجون (نمایندہ قومی زبان) محترمہ ثریا حمید سکریٹری
انجمن ترقی اردو خواتین (لاہور) نے آج اسلامیہ گرلز ہائی اسکول کی
طالبات اور استانیوں کے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے اردو
یونی ورسٹی کے قیام کی اہمیت کو واضح کیا۔ انہوں نے تقریباً ایک گھنٹہ
تک تقریر کی اور حاضرین کو بتایا کہ موجودہ حالات میں اردو کے تحفظ و
بقا اور ہماری قومی تہذیب کے ارتقا کے لئے اردو یونی ورسٹی کا قیام
بہت ضروری ہے موصوفہ نے اس سلسلہ میں طالبات سے اپیل کی
کہ وہ بابائے اردو کا پیغام گھر گھر پہنچائیں اور اردو یونی ورسٹی کے قیام میں
ہر ممکن مدد دیں یہ جلسہ مسز زیدی ہیڈ مسٹرس اسلامیہ گرلز ہائی اسکول نے کیا تھا۔
ہمیں معلوم ہوا ہے کہ عنقریب اس اسکول کی طرف سے ایک کلچرل پروگرام ہوگا
اور ٹکٹ فروخت کئے جائیں گے جس کی آمدنی یونی ورسٹی فنڈ میں دی جائے گی۔

## پنجاب یونی ورسٹی کے لئے دو لاکھ کا عطیہ

لاہور ۲۴ رجون۔ آج شام میسرز حبیب بنک لمیٹڈ کی طرف سے
مسٹر عبدالحکیم نے ایک ایک لاکھ روپے کے دو چیک نئے یونی ورسٹی کیمپس
کے لئے بطور چندہ گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان کے حوالے کئے آج
شام گورنر نے صوبائی ترقیاتی مشاورتی کونسل کے ارکان کو چائے پر مدعو
کیا۔ اس تقریب میں دیگر اعلیٰ حکام کے علاوہ ناظم مارشل لا زون بی میجر جنرل
بختیار رانا۔ جی او سی لاہور ایریا۔ میجر جنرل سید غوث، پنجاب یونیورسٹی
کے حکام مسٹر جسٹس کیانی، جسٹس رحمان اور مقامی اخبارات کے مدیروں نے
شرکت کی۔ گورنر نے یہ دونوں چک پروفیسر ایم کرامت وائس چانسلر
پنجاب یونی ورسٹی کے حوالے کر دیئے یونیورسٹی کے پراجیکٹ ڈائرکٹر
کرنل شہباز خان نے گورنر کو بتایا کہ یہ رقم یونی ورسٹی کے شعبۂ اقتصادیات
کی تعمیر پر خرچ کی جائے گی اور اس کا نام حبیب بنک کے نام پر رکھا جا
گا۔ وائس چانسلر نے بتایا کہ حبیب بنک نے پہلے پانچ سال کے لئے ہر سال
ایک لاکھ روپیہ چندہ دینے کا وعدہ کیا ہے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ آئندہ
دو تین ماہ میں کیمپس کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا مطلوبہ زمین حاصل
کرلی گئی ہے۔

## اردو زبان میں سائنس کی مقبول کتابیں

لاہور ۱۹ رجون۔ کتابوں سے متعلق مشاورتی بورڈ نے اسکول کے
طلبہ کے لئے اردو میں سائنس کی مقبول کتابوں کی اشاعت کے لئے
بیس ہزار روپے کی رقم مختص کی ہے۔ یہ فیصلہ بورڈ کے سالانہ اجلاس میں
اردو کو مقبول بنانے اور سائنس کے متعلق اردو کی مقبول کتابوں کی اشاعت
کو فروغ دینے کے لئے کیا گیا ہے مشاورتی بورڈ کا ارادہ ہے کہ مصنفین سے
مسودات حاصل کئے جائیں اور ان میں تصویروں اور نقشوں کا اضافہ
کرکے انہیں شائع کیا جائے تاکہ طلبہ کیلئے قابل فہم بن سکیں بورڈ نے اسکول
کے لئے ایک سفری لائبریری تیار کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

## غالب ان سائی کلوپی ڈیا

### ایک اہم اپیل

"غالب ان سائی کلوپی ڈیا" کا کام میں نے تقسیم سے پہلے
ئے اردو کی بارگاہ علم و دانش میں شروع کیا تھا جب مجھے موصوف کی
بت کا شرف حاصل تھا اور جہاں ہر قسم کی علمی، ادبی صحبتیں میسر تھیں
ام بہت بڑا کام ہے جس کو میں تنہا کر رہا ہوں اور خدا کا شکر ہے، کہ
ت کچھ ہو چکا ہے اور "ان سائی کلوپی ڈیا" کا ایک باب، مرقع غالبؔ کے
سے شائع بھی کیا ہے جس میں مرزا صاحب کی تمام مروجہ تصویریں تاریخی
... اشارات کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

اس وقت ان ارباب علم و ادب کا تذکرہ مکمل کر رہا ہوں جن کے
ے سائے میں غالب کی عظمت کو بقائے دوام کی سند ملی ہے اس کے بعد
اصاحب کے فارسی اردو دواوین اور ان کی تصنیفات کے ابواب
کروں گا اسی طرح ان سائی کلوپی ڈیا کے تمام ابواب کو انشاء اللہ
کر کے علاحدہ علاحدہ پیش کروں گا۔

ارض پاک کے اہل علم اور غالب کے قدر شناس اصحاب سے میری
لی ہے کہ غالب سے متعلق ہر قسم کی معلومات ان سائی کلوپی ڈیا کے لئے
پہنچائیں میں ان سائی کلوپیڈیا میں ایسے تمام اصحاب کا شکریہ ادا
وں گا جو میرے ساتھ کسی قسم کا بھی تعاون کریں گے۔

ارض پاک کے اخبارات و رسائل کے مدیر صاحبان جس پرچے
یہ اپیل شائع کریں اس کی ایک کاپی مجھے ضرور بھیج دیں تاکہ معاونین کی
ست میں ان کے اسمائے گرامی درج کر لوں۔

(خادم) خیر بہوروی

دفتر غالب ان سائی کلوپی ڈیا

مقام بہوروا۔ ڈاکخانہ بیلتھرا روڈ

ضلع بلیا۔ یوپی، انڈیا

## نادر مطبوعات کی نمائش کا افتتاح

لاہور۔ ۱۶ جون۔ مولوی محمد شفیع (چیرمین اڈیٹوریل بورڈ ان سائی کلوپی ڈیا آف اسلام) نے آج صبح نادر مطبوعات کی ایک نمائش کا افتتاح کیا۔ یہ نمائش انجمن عربی فارسی اسلامیہ کالج سول لائنز کی طرف سے کالج کی لائبریری میں منعقد کی گئی ہے اس میں اردو، عربی فارسی کے بعض انتہائی قدیم اخبارات اور چغتائی کی تصویریں نمائش کے لئے رکھی گئی ہیں۔

نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے مولوی محمد شفیع نے کہا کہ مسلمانوں کو کتابوں سے محبت ورثے میں ملی ہے کیوں کہ ان کا مذہب ایک الہامی مذہب ہے اور اس کی بنیاد کتاب مقدس (قرآن) پر قائم ہے مولوی صاحب نے ایسی نمائشوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا یہ نمائشیں عوام کو ایسے مخطوطات اور مطبوعات دیکھنے کا موقع مہیا کرتی ہیں جو انفرادی ملکیت ہوتے ہیں۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر حمید احمد خان نے مہمانوں کو بتایا کہ یہ نمائش مسلمانوں کے ادبی اور فنی کمالات کی ایک ہزار سالہ مساعی کو پیش کرتی ہے۔

## اردو مشرقی پنجاب کی علاقائی زبان بنائی جائے

نئی دہلی، ۱۵ جون۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی پنجابی شاخ نے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد سے درخواست کی ہے کہ آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال میں لا کر اردو کو پنجاب کی ایک علاقائی زبان قرار دیدیں۔

اپنے مطالبے میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے مزید کہا ہے کہ اردو ابھی تک پنجاب کی سرکاری زبان ہے اور صوبے کے ۴۳ فی صدی لوگ اسے بولتے ہیں۔

## گورمانی پاکستان کی تاریخ لکھ رہے ہیں

لاہور۔ ۱۶ جون۔ نواب مشتاق احمد گورمانی جو مغربی پاکستان کے

گورنر رہ چکے ہیں۔ آج کل پاکستان کی تاریخ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں
انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ اپنی کتاب میں وہ خاص کر ان واقعات کو
قلم بند کریں گے جن سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ پاکستان بننے کے بعد
کے واقعات بھی اس میں شامل رہیں گے۔ نواب گورمانی نے کہا کہ ان کا یہ عقیدہ ہے
کہ پاکستان کا وجود میں آنا ایک نئی عالمی تحریک کا پہلا باب ہے اور اس وجہ
سے پاکستان کو دنیا میں ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے بتایا کہ
اپنی کتاب میں وہ قائد اعظم اور علامہ اقبال کے کچھ نادر خطوط بھی شامل
کر دیں گے۔ اس سلسلہ میں پاکستانی حکومت لندن کی انڈیا آفس لائبریری
سے کچھ ایسے خطوط کا عکسی چربہ لینے کا انتظام کر رہی ہے۔ نواب گورمانی
کی کتاب پاکستان کی ایک باقاعدہ تاریخ ہوگی اور اس لحاظ سے اس کے
مرتب ہونے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

## انڈیا آفس لائبریری کے متعلق لندن میں بات چیت

لاہور، ۱۴؍ جون۔ وزیر تعلیم مسٹر حبیب الرحمان نے آج یہاں بتایا
صدر محمد ایوب وزیر اعظم ہند مسٹر نہرو اور لارڈ ہوم نے دولت مشترکہ کی
گذشتہ کانفرنس کے موقع پر انڈیا آفس لائبریری کے مسئلے پر گفتگو کی تھی
وزیر تعلیم نے کہا کہ اس بات چیت میں کوئی فیصلہ تو نہیں ہوا تھا البتہ ایسا
تصفیہ تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو سب کے لئے قابل قبول ہو،
اس لائبریری کی تاریخی دستاویزات نقلیں پنجاب کے تاریخی ریسرچ کے مرکز کو
مہیا کی جائیں گی۔ مسٹر حبیب الرحمٰن نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ملک کی
سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والے بعض لوگ تاریخی دستاویزات جو ان کے قبضہ
میں ہیں حکومت کو حوالے کرنے میں پس و پیش کر رہے ہیں اسی طرح بعض لوگ
جو آئندہ نسلوں کے لئے ماضی کی تاریخ لکھنے کے اہل ہیں وقت کی ضرورت
پوری نہیں کر رہے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں وزیر تعلیم نے کہا کہ حکومت
پاکستان اور دیگر حکومتوں کے درمیان مذاکرات کر کے حکومت نے آئندہ نسلوں
کی رہنمائی کے لئے تحریری صورت دینے کا کام شروع کر دیا ہے۔

# رفتارِ ادب

## کچھ یادیں کچھ افسانے

مصنف — عارف حجازی

ضخامت — ۱۲۸ صفحات

قیمت — ۲ روپے ۸ آنے

ناشر: ادبیاتِ پاکستان ۸۰/ڈی گجرونالہ بلاک ۲ ناظم آباد۔ کراچی

زیرِ تبصرہ کتاب عارف حجازی کے ان گیارہ رپورتاژ پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً ماہ نامہ "ماہِ نو" کراچی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

رپورتاژ کی صنف اردو ادب میں حال ہی میں وارد ہوئی ہے لہٰذا اب تک اردو میں جو رپورتاژ لکھے گئے ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے برابر ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے رپورتاژ کو نہ افسانہ کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی اخباری نمائندے کی رپورٹ! یہ حقیقت کے غیر ادبی بیان اور افسانوی نگارشات کے درمیان کی ایک صنف ہے، یا یوں کہیے کہ ان دونوں کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ چونکہ یہ ابھی ایک نئی صنف ہے لہٰذا اس کے مستقبل کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ جن ادیبوں نے اس صنف میں سنجیدگی اور متانت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے قلم کی گل کاریاں دکھائی ہیں انہیں پڑھ کر اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اگر ہمارے بعض فن کار اس طرف خاص طور پر توجہ دیں تو افسانے کی طرح رپورتاژ بھی اردو نثر کی ایک اہم صنف بن سکتا ہے۔

عارف حجازی کے یہ گیارہ رپورتاژ پاکستان کے مختلف مقامات سے متعلق ہیں۔ انہیں اپنے وطن سے بڑی محبت ہے پاکستان کا ہر گوشہ ان کی نظر میں اپنی مثال آپ ہے اور رشکِ فردوسِ بریں سے کم نہیں۔ عارف حجازی کے طرزِ تحریر میں ایک ڈرامائی کیفیت پائی جاتی ہے وہ جس منظر کا نقشہ پیش کرتے ہیں، قاری کے ذہن میں اس کی حقیقی تصویر رقص کرنے لگتی ہے، کہیں کہیں تو قاری کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ خود مصنف کے ساتھ مختلف مقامات کی سیر کر رہا ہے۔



ان کی زبان بھی نہایت رواں، سلیس، صاف اور بامحاورہ ہے۔ اس میں بلا کی شگفتگی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔ ان رپورتاژوں میں دو خصوصیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ایک تو یہ ہے کہ پوری فضا مقامی رنگ میں رنگی ہوئی ہے دوسرے ان میں اسلاف کی عظمت کا احساس دلانے اور برصغیر ہندوپاک کی مٹتی ہوئی تہذیب اور تمدن کی نشان دہی کرنے کا خاص طور پر التزام کیا گیا ہے جسے پڑھ کر ہمیں اپنی رفتہ عظمت، ہماری مٹتی ہوئی تہذیب و تمدن، ہمارے پرانے کھنڈرات کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ وہ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ سائح یا قاری پر ان کا اصلاحی مقصد ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ امید ہے یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

(منظر [illegible])

# مراسلات

## غالب اور قومی شعور

اس عنوان سے "قومی زبان" کراچی کے سال رواں کے شمارہ نمبر ۹ میں مسٹر ظفر عظیم کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے اشعار غالب کے ذریعہ پتا لگانے کی کوشش کی ہے کہ "غالب اپنے عصر کے تغیرات اور ابتری کا خاصا شعور رکھتے تھے" اس کے بعد مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کا قومی شعور حسِ ملی اور حب الوطنی اتنی ہی شدید اور گہری تھی جتنی کسی بھی محب وطن اور قومی جاں بازکی ہو سکتی ہے۔ یہ مسئلہ تو خیر خود ایک مفصل مضمون کی گنجائش رکھتا ہے کہ غالب کا قومی شعور کیا تھا انہیں وطن کے تقاضوں کا کس حد تک احساس بلکہ علم تھا اور یہ کہ انہوں نے ایک وطن پرست شہری کی حیثیت سے کیا کیا۔ اس کا تذکرہ اس وقت چھوڑ دیجئے کہ ایک ادیب کی حیثیت سے اپنے فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ غالب اردو شاعری کی بہت قدآور شخصیت ہے۔ اسلوب اور فکر کے اعتبار سے اقبال سے پہلے تک کا کوئی شاعر غالب کو نہیں پہنچتا۔ ان باتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن جس وقت ہم سنجیدگی کے ساتھ کسی علمی اور ادبی سطح پر غالب کی حب الوطنی اور قومی شعور کا تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے، غالب کو مغلیہ سلطنت کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے کس درجہ عقیدت تھی۔ لال قلعہ جو ہر چند برائے نام سہی لیکن پھر بھی ایک محدود آزادی اور مغل سلطنت کی عظمت کا مدھم پڑتا ہوا نشان تھا، جس کی طرف ہر محب وطن ہندوستانی خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو ایک عقیدت کی نظر سے دیکھتا تھا غالب کو اس کی عظمت کا کیا پاس اور لحاظ تھا، اس پر تفصیل سے ایک الگ مضمون میں گفتگو ہوگی۔ میں اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے خدشات بلکہ اعتراضات کا سدباب کر دوں کہ غالب بحیثیت انسان اور وطن دوست ادیب کے خواہ کسی سطح پر بھی اتر آئیں ادب کی بارگاہ میں جو پُرعظمت اور پُرشکوہ مقام ان کی شاعری اور خطوط نے پیدا کیا ہے وہ اس مقام عظمت سے ایک انچ بھی نیچے نہیں گر سکتے۔

اس وقت مجھے مختصراً صرف یہ بات کہنی ہے کہ غالب کے سلسلہ میں بہت نمایاں تحقیقی کام ہو چکا ہے اور اس کا سلسلہ ابھی جاری ہے خطوط غالب کو بڑی حد تک صحت اور تحقیق کے ساتھ جناب غلام رسول صاحب مہر نے تاریخ وار مرتب کر دیا ہے کلام غالب کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے کا کام حیدر آباد کے عبداللطیف صاحب سے لے کر اکرام صاحب اور اب آخر میں نہایت ہی گراں قدر اور وقیع تحقیقی و علمی کارنامے کے طور پر جناب محترم سید امتیاز علی صاحب عرشی نے انجام دیا ہے۔ اس لئے محولہ بالا مضمون میں صاحب مضمون نے نہایت ہی عدم احتیاط بلکہ بے پرواہی سے کام لیا ہے انہوں نے دیوان غالب اٹھا کر جو اشعار یا غزلیں کہ اس زمانے کے سیاسی ماحول کے مطابق ڈھالا جا سکتا تھا وہ نقل کر دیئے اور اپنی عبارت میں لکھ دیا کہ ان سے غالب کے سیاسی شعور (غیر ملکی سامراج سے نفرت وغیرہ کے جذبات نمایاں طور پر ملتے ہیں یہ فقرے صاحب مضمون کے ہیں)۔

اب میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ صاحبِ مضمون نے غالب
ٖک غزل کا شعر لکھا ہے ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

شعر سے پہلے یہ تمہید لکھی ہے : مثلاً اس عہد کی ابتری اور انگریزی
ٖوں کے ہاتھوں سرفروشانِ آزادی کی گرفتاریوں اور سزاؤں
ٖعلق غالب کا خیال جاننا چاہتے ہوں تو ان کی وہ غزل پڑھئے
ٖمطلع ہے :

گذارش یہ ہے کہ اس غزل کا اگر مطلع ہی ہم صرف سرسری طور
ٖھ لیں تو اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے، مطلع اصل میں ہے :۔

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

ٖل دربار میں بہادر شاہ ظفر کے سامنے پڑھی گئی تھی اس لئے اس میں
ٖرشانِ آزادی کی دار و گیر کے پھندوں کو قد و گیسو کے سلسلے سے ملانا
ٖجرات کی بات ہے۔ غدر کا تو اس وقت خیال و خواب بھی نہیں تھا
دار و رسن والے شعر کے بعد مضمون نگار صاحب نے لکھا ہے: ۱۸۵۷ء
ٖنگ آزادی نے انگریزوں کے نمک خواروں اور باغیوں کو دو الگ
ٖخانوں میں بانٹ دیا تھا ..... اس حقیقت کی طرف غالب
ٖنے ایک شعر میں کیا بلیغ اشارہ کیا ہے ؎

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

ٖرہے کہ جب یہ غزل ہی غدر سے پہلے کہی گئی ہے تو یہ تاویل ہی بیکار
ٖاتی ہے۔ دوسری مثال دیکھئے۔ عظیم صاحب جنگِ آزادی کے
ٖلک واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : یہ واقعات ایسے نہ
ٖن کا اثر غالب پر نہ پڑتا ..... اس سلسلہ میں غالب کے یہ چند
اشعار ملاحظہ فرمایئے :۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز | گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر | زلف کی پھر سررشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال | ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

یہ پوری غزل غدر سے کم سے کم ۳۵، ۳۶ برس پہلے لکھی گئی تھی۔ کیوں کہ
یہ نسخۂ بھوپال کے آخیر میں درج ہے، اور نسخۂ بھوپال ۱۸۲۱ء میں مرتب
ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس سال کے آس پاس ہی یہ غزل لکھی گئی تھی۔
بہادر شاہ ظفر ۲۰ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت نشین ہوئے تھے۔ اس وقت
غدر اور اس کے حالات و عواقب و نتائج کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا
ہوتا، اس لئے یہ ساری تاویل بیکار ہو جاتی ہے۔
اس کے بعد مضمون نگار نے تحریر کیا ہے "۱۸۵۷ء میں غالب
اس عمر کو پہنچ چکے تھے کہ جنگ آزادی میں کوئی اہم رول ادا کرنا ان کے
بس کی بات نہیں تھی۔ اپنی اس مجبوری سے انہیں جو خجالت محسوس
ہو رہی تھی اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں : ؎

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے "

مزے کی بات یہ ہے کہ جب صبحِ وطن کی خندۂ دنداں نما سے غالب کو
خجالت ہوئی تھی تو ان کی عمر لگ بھگ چوبیس برس کے تھی۔ کیوں کہ
یہ غزل نسخۂ بھوپال کے متن میں موجود ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ
۱۸۲۱ء سے یقینی پہلے کہی گئی، اس لئے اس کے پس منظر میں بھی
کوئی تومی شعور نہیں دیکھا جا سکتا۔ مضمون نگار نے بہت کچھ غالب کے خطوط
سے حوالے دیئے ہیں۔ اس وقت میں ان پر گفتگو نہیں کروں گا کہ
یہ تفصیل سے میں اپنے دوسرے مضمون میں لکھ دوں گا اس خط میں بھی

جس کا اقتباس عظیم صاحب نے دیا ہے، بڑی صفائی سے صرف ذاتی و
نجی مصائب کے تذکرے ہیں، ان کے سہارے پر قومی غم کے جذبے کو
نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ صرف ایک ترکیب ہی ان کی ذہنی ساخت کی طرف
اشارہ کر دیتی ہے اور وہ ہے "قلعہ نامبارک" بہ ہر حال۔ عظیم صاحب اس
اقتباس کے تجزیہ کر کے لکھتے ہیں "۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانیوں پر انگریزوں کے
عتاب سے غالب کا دل جس طرح جلا تھا اس کا برملا اظہار توان کے نجی خطوط
میں ملتا ہے لیکن ان کی شاعری بھی اس سے خالی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہاں پھر موصوف سے یہی غلطی ہوئی ہے یعنی یہ غزل بھی نسخۂ شیرانی میں
موجود ہے جو ۱۸۲۶ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس لئے غدر، انگریزوں کا
ظلم، حکایات خوں چکاں سے شہریوں اور شہزادیوں کے مظالم کا کوئی
تعلق نہیں۔ پھر آخر میں عظیم صاحب نے لکھا ہے "انگریزوں کے
ہاتھوں قتل ہونے والوں اور بچھڑے ہوئے دوستوں اور شناساؤں کا ذکر
اس انداز میں کرتے ہیں :۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

(آخری مصرع میں سرور و سوز چھپا ہے جو صحیح نہیں ہے پہلا لفظ سرور
اور دوسرا سور ہے سوز نہیں ہے۔ سور بمعنی مسرت و خوشی و

ابتہاج۔ میرے پاس دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۶۳ء موجود ہے اس میں
اسی طرح چھپا ہے نسخۂ عرشی میں بھی اسی طرح درج ہے۔

گذارش یہ ہے کہ غالب کا یہ مشہور قطعہ نسخۂ شیرانی کے حاشیہ پر
موجود ہے یہ نسخہ ۱۸۲۶ء میں مرتب ہوا اس لئے یہ غزل اس کے بعد کے کسی
قریبی سال ہی میں کہی گئی تھی۔ غدر ابھی تیس اکتیس برس دور تھا۔ یہ سب غزلیں دیوان
غالب کے اس نسخہ میں شامل ہیں جو پہلی مرتبہ ۱۸۴۱ء میں چھپا اور شائع
ہوا اس لئے خواہ سال تصنیف غدر سے تیس پینتیس برس پہلے نہ ہو لیکن
غدر سے بیشتر کا ضرور ہے۔

یہ گذارش مجھے اس لئے کرنے کی ضرورت ہوئی کہ تنقید اور تحقیق کا کام آج
دور میں بہت زیادہ سائنٹی فک ہو گیا ہے اور تنقید نگار کو کام شروع کرنے
سے پہلے اپنے ذہن میں خود ساختہ اصول بنا کے اور نظریات قائم نہیں کرنے
چاہئیں۔ اور اس کے بعد صرف اپنے ان مفروضات کو تقویت پہنچانے کے لئے
ادیب یا شاعر کی تصنیف سے اپنے کام کی چیزیں سیاق و سباق اور تاریخی
ترتیب سے الگ کر کے نہیں جمع کرنی چاہئیں بلکہ ہم جس نقطۂ نظر سے کسی کے
کلام تصنیف یا زندگی کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اسے سامنے رکھ کر بالکل غیر
جانب داری سے اپنے ذاتی رجحانات، پسند و ناپسند کو الگ کر کے صرف واقعات
اور حقائق پر نظر رکھنی چاہئے اور پھر جہاں تک ممکن ہو خود بھی اپنے نجی وسائل اور
ذرائع سے ان کی صحت کی تصدیق یا تردید کرنی چاہئے۔ آدمی بہر حال آدمی ہے
غلطی کسی کی میراث نہیں ہے کہ دوسرے سے سرزد نہ ہو اس لئے جہاں تک
ممکن ہو دیانت داری سے غیر جذباتی انداز میں تنقید و تحقیق کی طرف متوجہ ہونا
چاہئے عظیم صاحب سے یہ تسامح صرف اس لئے واقع ہوا کہ ان کے ذہن سے
کلام غالب کی تاریخی ترتیب کا خیال نکل گیا اور چونکہ انہوں نے قومی شعور کا تعین
کیا اس میں کلام غالب سے اشعار منتخب کر کے لکھ دیئے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غالب قطعی طور پر اپنے مختلف ادوار میں بدلتے ہوئے سیاسی
معاشرتی اور تمدنی تحولات اور تغیرات کی طرف سے (باقی صفحہ پر)

---

Fortnightly QUOMI ZUBAN Karachi

## بابائے اردو کی تصویریں، تحریریں اور مکاتیب

عبدالحق اکیڈمی کی طرف سے بابائے اردو کا نوے (۹۰) سالہ یوم پیدائش بڑے اہتمام سے منایا جارہا ہے اس موقع پر دوسری بہت سی تقریبات کے ساتھ ایک علمی نمائش بھی منعقد کی جائے گی جس کا ایک شعبہ بابائے اردو کی ذات گرامی سے متعلق ہوگا ۔ اس میں بابائے اردو کی تصویریں اور تحریریں رکھی جائیں گی ۔ جن حضرات کے پاس مولوی صاحب قبلہ کی تصویریں اور تحریریں ہوں وہ ذیل کے پتہ پر بھجوادیں نمائش کے بعد یہ اشیا پوری حفاظت کے ساتھ متعلقہ حضرات کو واپس کردی جائیں گی ۔ اس موقع پر مولوی صاحب کے مکاتیب کا مجموعہ بھی شائع کیا جارہا ہے ۔ میں ان تمام حضرات سے جن کے پاس مولوی صاحب قبلہ کے خطوط ہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ یہ خطوط یا ان کی نقلیں مجھے ارسال کردیں ۔ اصل خطوط کی صورت میں نقلیں رکھ کر خطوط فوراً واپس کردئیے جائیں گے ۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری
رکن عبدالحق اکیڈیمی
اردو کالج اردو روڈ
کراچی نمبر ۱

## مطبوعات انجمن ترقی اُردو

**اسٹوڈنٹس انگریزی اُردو ڈکشنری ۔**

مرتبہ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

یہ اُردو انگریزی کی مستند ترین ڈکشنری ہے جو کئی بار شائع ہوچکی ہے ۔ اب اس کا چھٹا ایڈیشن بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے ۔ قیمت سواہ روپے ۔

**سرسید حالات و افکار**

از بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

اس کتاب میں سرسید کی شخصیت ، افکار اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک نادر مستند دستاویز ہے۔ قیمت صرف چار روپے

**نوادر الالفاظ ۔**

یہ اُردو کی سب سے پہلی باقاعدہ فرہنگ ہے جو ملا عبدالواسع ہانسوی کے رسالہ ”غرائب اللغات،، کی تصحیح و تکملہ کے ساتھ فاضل زمانہ سراج الدین علی خاں آرزو نے تالیف کی ۔ دور حاضر کے مشہور اُردو نقاد اور محقق ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ لغات کی مدد سے تصحیح و تشریح کے مرتب کیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے پر ایک فاضلانہ مقدمہ اور حواشی لکھے ہیں ۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے

ملنے کا پتہ
آردو اکیڈیمی سندھ
نزد مسافر خانہ بندر روڈ کراچی

قاری عبدالوحید منیجر انجمن پریس نے چھاپ کر دفتر انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ کراچی سے شائع
قیمت فی پرچہ :- چار آنے قیمت سالانہ :- پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان کا
پندرہ روزہ

# قومی زبان

-: نگران :-

بابائے اردو

جلد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷
شمارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲

۱۶ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء
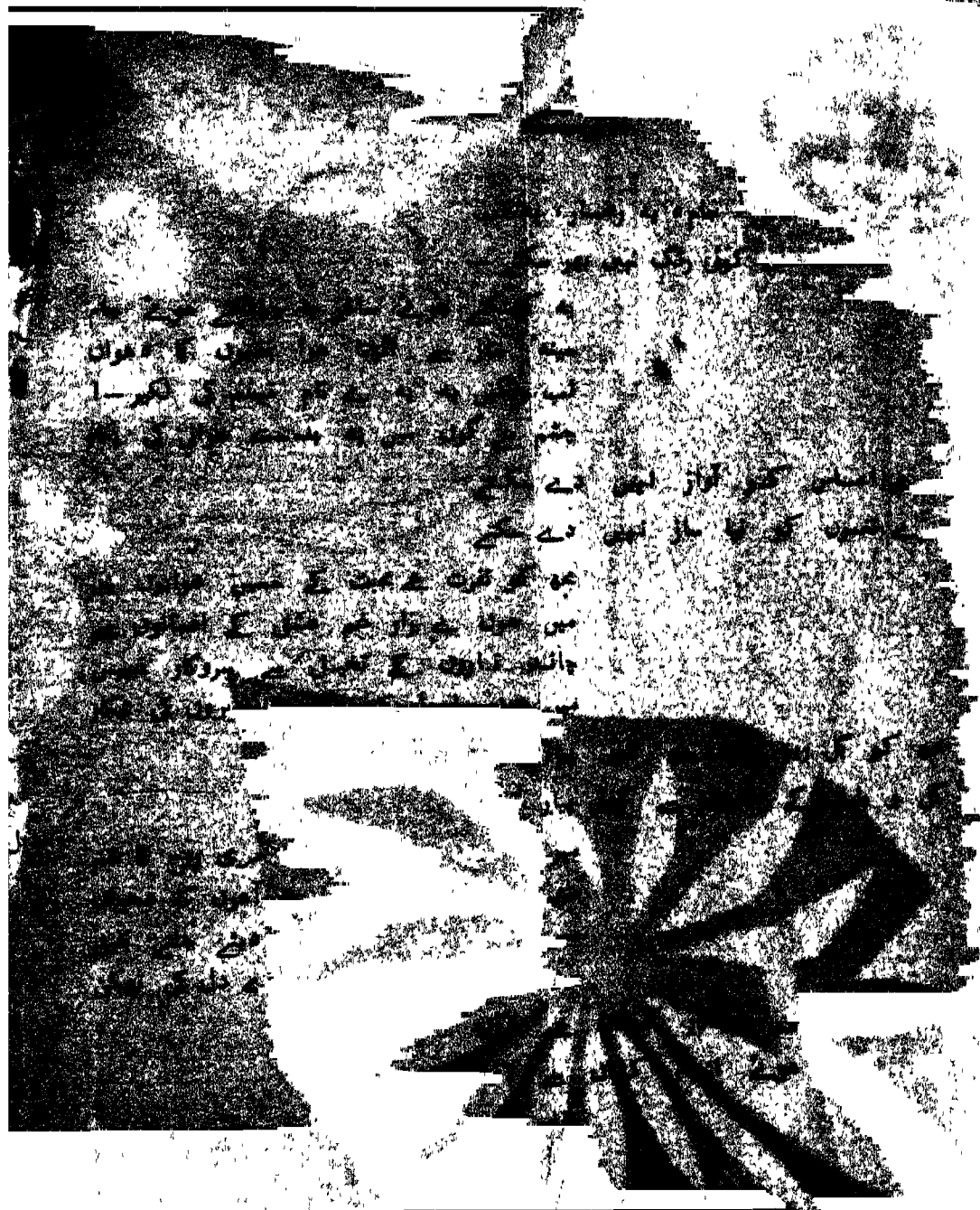
## اس شمارے میں



# نصابی کتابیں

میں موجودہ حکومت کے اس عندیہ کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ اب وہ نصابی کتابیں تیار کرانے کے لئے ناشرین کی بجائے مصنفین پاکستان کی جماعت رائٹرز گلڈ سے رجوع کرے گی۔ موجودہ کتابیں ناشرین نے تجارتی مصالح پر عموماً ایسے مصنفین سے لکھوا کر جن کا ادب میں کوئی مقام نہیں، یا خود مرتب کرکے شائع کی ہیں اور رسوخ کے بل پر منظور کرا رکھی ہیں۔ یہ کتابیں طلبہ کے حق میں مفید ہونے کی بجائے مضر ہیں، موضوعات غلط، زبان غلط، انداز بیان غلط، غرض کوئی بھی چیز طالب علموں کے مزاج کے لئے موزوں نہیں ہے۔ گلڈ کو کتابوں کی تیاری کا کام سپرد کرنے سے کئی فائدے ہوں گے، ایک تو یہ کہ تاجروں کی اجارہ داری ختم ہوگی، جن کا مقصد کم سے کم محنت اور روپیہ خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ نفع کمانا ہوتا ہے، دوسرے مستحق ادیبوں کو مالی فائدہ ہوگا، کیوں کہ گلڈ سے توقع ہے کہ وہ تجارتی مصالح سے بالاتر ہوگا، اور طلبہ کو مستند کتابیں، خوب صورت لکھائی چھپائی کے ساتھ کم سے کم قیمت پر مہیا کرے گا۔

عبدالحق

# سلیم جعفر کی رحلت

یہ خبر ہند و پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں نہایت رنج و الم کے ساتھ سنی گئی کہ ۲ ر اور ۳ ر جولائی کی درمیانی شب کو اردو کے مشہور و معروف ادیب جناب سلیم جعفر میرپور خاص میں رحلت فرما گئے۔ موصوف علم و فضل کے اعتبار سے ہمارے چیدہ اہل قلم میں سے تھے، اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھا، لیکن جو کچھ لکھا بڑی سوجھ بوجھ اور غور و فکر کے بعد لکھا یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین (جو نگار، ساقی، ہندوستانی الہ آباد، زمانہ کانپور اور نیا دور کراچی جیسے اعلیٰ ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں) تحقیق و تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ وہ ہندی زبان کے زبردست عالم تھے، انہوں نے ہندی شاعری کی بعض اصناف اور شعراء پر کئی قابل قدر مضامین لکھے بھگت کبیر پہ تو ایک مستقل کتاب "اردو ٹرسٹ کراچی" کی فرمائش پر تالیف کی تھی (جو بعض نامعلوم وجوہ کی بناء پر اب تک شائع نہیں ہوئی) انہیں فن عروض پر بڑی دسترس تھی اور اس موضوع پر بھی ان کی بعض تحریریں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

پاکستان آنے کے بعد جناب سلیم جعفر کو بڑے افسوس ناک حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ میرپور خاص میں وہ بہت ہی معمولی مشاہرے پر ایک وکیل کے پاس ملازم تھے باوجود انتہائی تنگ دستی کے انہوں نے نہ تو کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا اور نہ ہی کبھی اپنے مضامین کا معاوضہ طلب کیا۔ اگرچہ ان کی عمر ستر (۷۰) سال سے اوپر تھی لیکن وہ جوانوں کی سی ہمت رکھتے تھے، وہ شب و روز محنت کر کے اپنے متعلقین کی پرورش کرتے رہے۔ ان کے بہی خواہوں نے بارہا چاہا کہ حکومت نے ادیبوں کی امداد کے لئے جو فنڈ مقرر کیا ہے، اس میں سے انہیں مدد دلوانے کی کوشش کی جائے، لیکن سلیم جعفر صاحب نے اسے قبول نہ کیا، اس سے ان کی خودداری اور وضع داری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بڑا خاندان چھوڑا ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں، ایک نوجوان بیٹا ہے، اس کا بھی دماغی توازن درست نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا فرض ہے کہ وہ مرحوم کے لواحقین کی امداد کرے (واضح رہے کہ جناب سلیم جعفر گلڈ کے بنیادی رکن تھے) امید ہے جناب قدرت اللہ شہاب اس مسئلے سے ذاتی دلچسپی لیں گے[1]



[1] یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ یہ اطلاع ملی کہ رائٹرز گلڈ نے مرحوم کی بیوہ کو ایک ہزار روپیہ دینے کا اعلان کیا ہے۔ گلڈ کا یہ اقدام قابل ستائش ہے۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی

# حضرت سید یوسف راجو قتال کی دکنی نظم

محققین اردو دکھنی شاعری کے آغاز کو موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی متوفی ۸۲۵ھ سے تسلیم کر چکے ہیں کیوں کہ خواجہ بندہ نواز کی نظم اور نثر کی کئی ایک کتابیں ہمدست ہو چکی ہیں۔ آج ہم خواجہ صاحب کے والد بزرگوار حضرت خواجہ سید یوسف راجو حسینی المتخلص بہ راجا کے دکھنی کلام کو پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اور ہمدردان اردو اس کو دلچسپی اور شوق سے مطالعہ کریں گے۔ یہ نظم نواب سالار جنگ کے قلمی ذخیرے میں محفوظ ہے۔

سید یوسف راجو قتال دہلی سے دکن یعنی دیوگڈھ (دولت آباد) آئے اور یہاں ہی آپ کا ۷۳۱ھ اور بقول بعض ۷۵۲ھ میں انتقال ہوا۔ حضرت یوسف راجو فارسی کے شاعر تھے۔ راجہ اپنا تخلص قرار دیا تھا۔ چناں چہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں آپ کا ایک فارسی دیوان (۱۷۰۲-۶) موجود ہے۔ سر ورق پر "اشعار تصنیف راجہ بہ ہندی" لکھا ہوا ہے مگر اس میں کوئی ہندی یا دکھنی شعر نہیں ہے، صرف فارسی کلام درج ہے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

راجا کہ تماشاہ جہاں ہمہ عظیم است
اما چہ توان کرد کہ ایں چشم نداریم

گفت راجا ناگہا سلطان خوبان رخ نمود
صد ہزاراں سجدہ کردم حسن زیبا یافتم

حضرت سید یوسف کے اجداد سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں عرب سے ہندوستان آئے اور سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد میں سید یوسف حسینی امرائے تغلق میں شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد دکن آئے۔ اس زمانے میں دکن کا ایک حصہ سلاطین تغلق کے قبضہ و تصرف میں تھا۔ دکن کی بہمنی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ سید یوسف اور ان کے والد سید علی دونوں حضرت نظام الدین اولیا کے مریدوں میں شامل تھے۔ آپ کے انتقال کے وقت خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کم سن تھے۔

حضرت سید یوسف راجو کا مزار خلد آباد میں ہے آپ کو راجو قتال کے لقب سے کیوں یاد کیا جاتا ہے اس کی کوئی وضاحت مجھے معلوم نہیں ہوئی۔ خواجہ یوسف راجو کا کلام کسی علیحدہ کتاب میں محفوظ نہیں ہے بلکہ ایک فارسی مخطوطے کے ساتھ مجلد ہے۔ یہ فارسی کتاب فن سیر کے نمبر (۵) پر ہے اور اس میں اولاً ایک سیر کی کتاب ہے "احوال خاتم الانبیا" سے موسوم ہے اور دوسری ایک حدیث کی کتاب ہے جس میں زیادہ تر فقہ اور عقائد کے مسائل کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ ان دونوں میں مولف یا جامع کا نام درج نہیں ہے اور ثانی الذکر کتاب کا نام بھی درج نہیں ہے۔ کتاب کی جلد چرمی ہے اور اس پر طلائی کچھ پھول بھی ہیں مگر طلائی کام [illegible]

قیاس ہے تین چار سال قبل کی جلد ہوگی۔

دوسری کتاب یعنی مجموعہ حدیث کے خاتمے پر کتابت کی حسب ذیل تاریخ درج ہے :۔

" بتاریخ بست نہم شہر شعبان المعظم روز شنبہ یک پہر دو گھڑی تمام شد، در دار السلطنت حیدر آباد سنہ ۱۰۱۹ ہجری این خط فقیر الحقیر خاک پائے درویشاں و جمیع مومنین عبد العلی خانہ زاد میرزا محمد ربیع والدار لنگر فیض اثر "

جس نہج سے سنہ کو لکھا گیا ہے اس کے لحاظ سے اس کو ۱۰۱۹ھ پڑھنا چاہیئے ۱۰۰۱ھ بھی پڑھا جا سکتا ہے مگر ۱۰۱۹ھ کا قرینا زیادہ صحیح ہے اور پھر حیدر آباد کا دار السلطنت ہونا اور "لنگر فیض اثر" کے لحاظ سے بھی یہ کتاب قطب شاہی دور یعنی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں لکھی ہوئی قرار پاتی ہے۔ اس مجلد کی ثانی الذکر کتاب کے خاتمے کے دوسرے صفحہ سے خواجہ یوسف کی نظم شروع ہوتی ہے جو تین صفحہ پر مشتمل ہے۔ کتاب (۹ × ۵) سائز پر ہے۔ دونوں فارسی کتابوں کا خط نستعلیق ہے۔ خواجہ یوسف کی نظم کا خط مائل بہ نسخ ہے۔ اعراب بھی دیئے گئے ہیں اس نظم کا عنوان سرخ روشنائی میں حسب ذیل ہے :

" گفتار حضرت سید راجو قدس اللہ سرہ العزیز زوجہ خود را درزمان حضرت سید محمد گیسو دراز در شکم او بودند "

یعنی سید راجو کا کلام جو آپ نے اپنی زوجہ کو فرمایا تھا جبکہ حضرت سید محمد گیسو دراز آپ کے پیٹ میں تھے۔ یہ نظم اگرچہ دکھنی زبان میں ہے مگر اس کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ یہ نظم خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز کے کلام سے مماثل ہے اس نظم سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کے زمانے میں عورتیں عموماً فارسی کے بجائے دکھنی میں ہی گفتگو کرتی تھیں۔

کلام حسب ذیل ہے :۔

گفتار حضرت سید راجو قتال قدس اللہ سرہ العزیز زوجہ خود را درزمان حضرت سید محمد گیسو دراز در شکم مادر بودند۔

سری سہاگن سن ری سن    ایک ایک بول توں چت دھر سن
کن سو رُکہت یا کی کمان    کھول نکھنا بھید بیان
مت دیوا توں کہیں بیجے گی    بھوت دیو باکیں پوجے گی
جاتی جوسے پوتج نکو    سک ہور سیرا کوتج نکو
صدقہ کھپر کارے کے    پاکی سر پہ وارے کی
دو مالیدی کن جی لائے    بیشک دوزخ میں وہ جائے
ناڑ کھڑیاں باندے نا    ماٹ ہور ٹھلیاں مانڈے نا
غیر از خدا سجدہ کس نا کر    کافر ہو کر دوزخ نہ پر
بی بیاں بہ بیاں شاہ رسم    شیطان کیرا ہے حشم
مچھا سہاکن ناکہلا    چک سنواری نا چھلا
ٹونکا ٹامن کر نکو    کن فال تو کہیں پھر نکو
مت سو بنی کہیں تو جاوے گی    بھیا نے تین بہا آوے گی :
از کل مشکل تونکا چھوڑ دسنک    ندنہ رکھ کر بھیک نا منگ
پاؤنیاں جالنا مسلم چھوڑ چھوڑ    اوپے پاتی کفر ہے کھور
چھونتک تیر سو یا کی منجیا    سوہے کافر جن پوجیا
نیت کر کچھ باند نکو    مشرک کیرا اشاند نکو
یا جو کھیلے جن گڑیاں    جتلیاں لوالیاں با ملیاں
گیت بن گاوے یا کچھ راگ    کہتیاں کانیاں بیٹھیاں جاگ
ہے وہ دوزخ کا عذاب    کوئی نا سکے اس میں تاب
اسنی پر چہ اڑ نکی کی    دوزخ میانے پھکے کی
قہر خدا کا کس نکو    توبہ کر گنہ گار مشکو

جیکوئی کا تر لیویں گے
سخت شکنجا ہوویں گے

ک کے منکس کتر مینگی | دوزخ میاں نے جیت رینگے || سب میں کیا تجکوں کھول | تاؤں پناؤں یک یک بول

ک کے بچھاں آگ کے سانپ | آگ کے تختے اوپر ڈھانپ || فرض خدا کا ان پر ہے | واجب کہنا ہم پر ہے

ن تن پر نے چھوڑیں گے | ہیں کلیجا پھوڑیں گے || بدکام کرے کچھ بازنا | تیرے کو دن ان کا کہا

ترحال اس رانیاں کا | اللہ کیرے رانیاں کا || کام برے اس تاکید کر | گردن اپنی ساقط کر

ب مجھ سے میاں آویں گے | ہر دلعنت پاویں گے || بدکر تب دیکھیں چھوڑے وصیل | شیطان سنگ رے دوزخ میل

زخ کھلادے کا ندیت | محشر میاں ہوویں فضیلت || بندگی کرتے بھوتوں سال | ناچیز استھی سب پامال

ور لعنت بے حد بے حساب | دوزخ میاں نے کریں عذاب || مت توں شومیت کرینگے | دور خدا تے پرسکے

پ پیپ زخ تے چوسے گا | ہور رکند ون سب جگ روئیگا || اگرچہ صالح زاہد ہے | شوم برائی عابد ہے

ی لاکھو برسوں بجالیں گے | ہور اسفل میاں ڈالیں گے || دل سیاہی اوبر لکھن | ہے خدا کا [illegible] دشمن

میت میری سیدھی بوج | جیچ لکھیا کارن توزخ || کافر جیسا عادی ہے | ات منافق زادی ہے

ہور بن اصل آزادیاں | پاک دامن کیا تھا دیاں || جنت کرے چہاروں حرام | دوزخ بہتر جلے مدام

ستو سگلی جیوے کان | جیو کے نینوں دیکھو بچھان || تانکی جانگی باؤں سات | چوندبربھرکے اکن کھات

س توں سیدھی لے ناری | خاص خدا کی توں پیاری || اللہ تے وہ باغی ہے | دوزخ بہتر داغی ہے

یر دستاں اوپر کر رحم | بھوک پیاس انکا کر فہم || فحش کسی کوں بولے تا | عیب کسی کا کھولے نا

پیٹ بھر کھانا پیاسوں نیر | سردے ننہا تن پرچیر || سحر کسی پر چوتنے تا | چھوٹیاں چھوٹیاں دونا

ہر کوں انگلا مارے تا | ہٹ دندان پرسارے تا || مت جاسوسی توں کرینگے | دین تے خارج پرسکے

لکڑے پیتر ملکی سنت | پاکی گرکے کوئی ہات || جس میں ہوئے ایسے کام | بدبخت اوہے پرے پرنام

بن ڈالی تی اس کچ نامار | غضب سن کائیں مت آزار || ننگے لڑکے کے | پاؤں تے تل سر میر کیکے

جیکچ کھا کی تو کھانا | ولیا ان کو بی دینا || توں سن سیدھی عبرت دھر | پند تج دنیا مختصر

کچھ بھی کر توں اون کے گل | بوجو تج پر ہے آدھار || باتاں لکھیا چند انگے سات | سن کر چلے بہشت کی بات

جیو کے کانوں سن پربند | نہیں تو پرے کے تیرے بند || سید راجو بندہ عابد ہے

بند دوزخ کا ادگھر ہے | طوق زنجیریاں لو گھر ہے || بخشش ہارا معبود ہے

۔ ۔ ۔ سب نشان | سن کے ناری جیون کے کان || کل (۶۷) شعر ہیں جن کو نقل کرایا گیا ہے ۔

کچ تمن دہاں کیا تیرے پاس || پہلی کتاب کے پہلے صفحہ پر دوہرہ اور خواجہ صاحب کی نظم

سب رکھ دیا دا ۔ ۔ سن || آخر پر ایک مہر ثبت ہے

(باقی ص ۴۳ پر)

# سفینۂ غزل

## سید ہاشمی فرید آبادی

وہ نہ بولے نہ سنی بات سماعت کرکے
وجد اب تک ہے مرے نطق کو منّت کرکے

جان کا روگ ہے آدم کی، سہے ورنہ ہے
وہی اک تودۂ گِل، ترک محبّت کرکے

چھوڑ سکا ہوش تمہارا سرِ دامن نہ کبھی
تم چھپے کیوں مجھے شرمندۂ غفلت کرکے

منزلِ دوست کا شاید یہ پتہ ہو راہی
پاؤں لیتے ہیں مزا قطع مسافت کرکے

سجدہ اس در کا معراجِ جبیں، ڈر یہ ہے
عشق بیدار نہ ہو جائے عبادت کرکے

ہاشمی مضطرب خاطر نے بہ ایمائے جلیلؔ
تانِ حسرتؔ کی اڑائی ہے جسارت کرکے [1]

## جلیل قدوائی

پوشیدہ تھی جو دل میں تمنا تمہیں تو ہو
ننھی سی میرے عشق کی دنیا تمہیں تو ہو

کھینچا تھا میری چشمِ تصوّر نے بارہا
جس حسنِ بے مثال کا نقشا تمہیں تو ہو

بخشا ہے جس نے شوق بھی آنکھوں کو نور بھی
دنیائے عشق کا وہ اجالا تمہیں تو ہو

سیراب کیوں نہ دید سے ہو جائیں جانِ دل
تھا چاہیے جو ان کو وہ جلوا تمہیں تو ہو

نازاں جو اپنے ذوقِ تماشا پہ تھا، اُسے
جس نے بنا دیا ہے تماشا تمہیں تو ہو

کیا جانتا نہیں ہوں حقیقت کو برق کی
پہنے ہوئے لباسِ مطلا تمہیں تو ہو

آئے نہ بار بار اسی در پہ کیوں جلیلؔ
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا تمہیں تو ہو

---

[1] "قومی زبان" میں جلیلؔ قدوائی صاحب کا ایک مضمون حضرت جوشؔ ملیح آبادی پر شائع ہوا تھا جس کا خاتمہ مولانا حسرتؔ کی ایک غزل کے منتخب اشعار پر ہوا تھا۔ اس غزل کا مطلع جس سے ہاشمی صاحب نے مصرعِ طرح اخذ کیا یہ تھا:

ہوگئے اور بھی بیگانہ وہ غفلت کرکے
آزمایا جو انہیں ضبطِ محبت کرکے

# گریجویشن

# اردو کو ذریعہ تعلیم و امتحان بنانے کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں

## پنجاب یونی ورسٹی سینٹ کا یونی ورسٹی حکام اور حکومت سے مطالبہ

لاہور یکم جولائی۔ پنجاب یونی ورسٹی سینٹ نے جمعرات کے روز اپنے آخری اجلاس میں باتفاق رائے ایک قرارداد منظور کی جس میں حکومت اور یونی ورسٹی حکام سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ یونی ورسٹی کی سطح پر تعلیم و تدریس اور امتحان لینے کے مقاصد کے لئے انگریزی کی جگہ اردو رائج کرنے کے لئے موثر اقدامات کریں۔

سینٹ کے ارکان نے رائے ظاہر کی ہے کہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے مطابق پندرہ برس کا مجوزہ عرصہ گزرنے سے قبل اردو کو انگریزی زبان کی جگہ دینا قابل عمل ہے اور اس سے تعلیمی معیار کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اس ضمن میں پہلے اخلاقیات، سوشل سائنسز اور لسانیات کے مضامین کو انگریزی کی بجائے اردو میں شروع کیا جا سکتا ہے۔ قرارداد میں یونی ورسٹی کے حکام پر زور دیا گیا ہے کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ذریعہ تدریس و امتحان میں تبدیلی لانے کے لئے اردو کی ترقی پر محتاط اور مسلسل نگاہ رکھیں قرارداد میں تجویز پیش کی گئی ہے اس مقصد کے لئے یونی ورسٹی اردو کی ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے تین یا پانچ سال کے عرصے میں ذریعہ تدریس و امتحان پر نظر ثانی کرے اردو کے متعلق یہ قرارداد آغا بیدار بخت نے پیش کی ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کی تائید کی۔

قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ یونی ورسٹی کی سطح پر انگریزی کی جگہ اردو کو دینے کے فوری اقدامات کئے جائیں نیز یہ کہ ڈگری کا امتحان دینے والے طلبہ کو کم از کم صرف ایک پرچے میں اردو میں جوابات دینے کا اختیار دیا جائے۔

سینٹ کے وائس چیرمین پروفیسر یو کرامت نے اردو کو فوراً انگریزی کی جگہ دینے کی اس تحریک کی مخالفت کی۔ آپ نے تجویز کیا کہ پہلے اردو کو اس سطح پر لانے کے لئے مساعی کی جائیں جہاں وہ ذریعہ تدریس و امتحان کے طور پر انگریزی کی جگہ لے سکے۔

## پاکستان میں علمی اور تحقیقی کام

کراچی۔ ۲ جولائی۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے زیر اہتمام ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ڈائریکٹر سینٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ و سابق وزیر تعلیم حکومت پاکستان کے اعزاز میں دعوت عصرانہ دی گئی — اس موقع پر سید الطاف علی بریلوی سیکریٹری کانفرنس نے اپنی استقبالیہ تقریر میں تحقیقی اور تصنیفی کام کا جائزہ لیا آپ نے بتایا یہ اکیڈمی ۹ اپریل [illegible] کو پاکستان کے ایک [illegible] ریزولیوشن کے ذریعے وجود میں آئی تھی اور گزشتہ آٹھ سال کے عرصے میں جناب ممتاز حسن اور مولانا عبد العزیز کی نگرانی میں کام کر رہی ہے۔ اب اس

اسی مقصد کی سربراہی کے لئے حکومت نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی خدمات حاصل کی ہیں۔ مسٹر الطاف علی نے اکیڈمی کے کام کے سلسلہ میں متعدد تجاویز پیش کیں۔

سید الطاف علی نے مزید کہا کہ اب ہم ایک آزاد سلطنت اسلامی کے مالک ہیں اور اپنے ملک کے ذرائع اور وسائل پر ہمیں کلی دسترس حاصل ہے۔ حالت غلامی میں جو کام برسوں سے نہیں ہو پائے تھے، وہ اب مہینوں اور ہفتوں میں انجام پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے کاموں کے لئے سرمایہ کا انتظام اب ہماری قومی حکومت بیک جنبش قلم کر سکتی ہے۔

## تلوک چند محروم کے مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت

اردو کے نامور شاعر تلوک چند محروم کے کلام کے چار مجموعے دہلی میں زیر طبع ہیں ان مجموعوں میں "گنج معانی" اور "رباعیات محروم" کے بعد کا کلام شامل ہے ان مجموعوں کی تفصیل یہ ہے ۔

| | |
|---|---|
| کاروانِ وطن | قومی اور سیاسی نظموں کا مجموعہ |
| نیرنگ معانی | ادبی اور نیچرل موضوعات پر لکھی ہوئی نظمیں |
| شعلۂ نوا | غزلیات کا مجموعہ |
| بہارِ طفلی | بچوں اور لڑکوں کے لئے نظمیں |

یہ چاروں مجموعے جولائی سنہ ۱۹۶۰ء کے آخر تک منظر عام پر آ جائیں گے اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی سے حاصل ہو سکیں گے۔

## اخبار نویس بھی برآمد کئے جا سکتے ہیں

لاہور ۱۰ جولائی۔ وزیر تجارت غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کے لئے اخبار نویسوں کی برآمد کو خوش آمدید کہیں گے۔ لاہور میں کل شام درآمد و برآمد کے دفتر میں ایک بات چیت کے دوران میں مسٹر حفیظ الرحمان نے کہا کہ ہمیں اپنے مزدوروں افراد کو جن میں جوہر موجود ہوں غیر ملکوں کو برآمد کر کے غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کے تمام امکانات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آیا وہ اخبار نویسوں کو برآمد کرنے کی ہدایت کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس طرح زرمبادلہ کمایا جا سکتا ہے تو میں یقیناً اس خیال کی تائید کروں گا۔

## خطوط داغ

استاد داغ کی ایک مفصل سوانح عمری میں نے مرتب اور شائع کی ہے اس سے پہلے مثنوی فریاد داغ پر ایک تفصیلی مقدمہ لکھ کر شائع کر چکا ہوں۔

گلزار داغ اور آفتاب داغ بھی طبع ہو رہے ہیں مہتاب داغ اور یادگار داغ بھی مطبع میں ہیں۔ اب میں خطوط داغ مرتب کر رہا ہوں جن حضرات کے پاس داغ کے مطبوعہ یا قلمی خطوط ہوں براہ کرم مجھے عنایت فرمائیں۔

تمکین کاظمی۔ سلطان شاہی حیدرآباد دکن

## پاکستان رائٹرز گلڈ کا وفد تہران جائیگا

تہران ۴ جولائی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا ایک وفد اسی ماہ تہران پہنچ رہا ہے۔ گلڈ کے اس وفد میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے بعض ادیب، شاعر اور مشاعر شامل ہوں گے توقع ہے یہ وفد مشرق وسطیٰ کے بعض دوسرے ملکوں مثلاً عراق، متحدہ عرب جمہوریہ، لبنان اور ترکیہ کا دورہ بھی کرے گا۔ مزید معلوم ہوا ہے کہ وزارت تعلیم پاکستان آئندہ سال سے دوبارہ کا اہتمام کرنے پر غور کر رہی ہے۔ خیال ہے پاکستانی موسیقاروں اور فنکاروں کا ایک گروپ بھی اس سال کے آخر میں کسی وقت سیٹو کے ممبر ممالک کا دورہ کرے گا۔

## اردو میں کارروائی

کوئٹہ ۲۰ جولائی۔ قلات ڈویژنل کونسل نے اپنے اجلاس میں فیصلہ

[illegible]

اجلاس ... کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ... [illegible]

... قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی۔

## نوخواندہ لوگوں کیلئے لکھی ہوئی ایشیائی کتابوں پر

## انعامات

اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے چار سو ڈالر کے ۲۰۰ انعامات کا اعلان کیا ہے جو جنوبی ایشیا کے ملکوں میں ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء کے دوران میں شائع ہونے والی ان بہترین کتابوں پر دیئے جائیں گے جو نوخواندہ لوگوں کے مطالعہ کی غرض سے لکھی گئی ہوں۔ یہ کتابیں جن کا انتخاب پاکستان، بھارت، برما، سیلون اور ایران میں یونیسکو کے نیشنل کمیشن کریں گے۔ ان ملکوں میں استعمال ہونے والی کسی زبان میں لکھی گئی ہوں اور وہ کلاسیکی ادب سے آسان زبان میں منتقل کی گئی ہوں، یا سائنس کے ابتدائی اصولوں پر طبع زاد تصانیف ہوں، یا اقتصادی اور معاشرتی ترقیوں اور ایسے کاموں کو ان میں مدنظر رکھا گیا ہو جن سے بین قومی مفاہمت کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔

یہ انعامات یونیسکو کے اس پروگرام کے جزو ہیں جو ایسے [illegible]

[illegible]

[illegible]

صدر مجلس منتخب ہوا۔ سب سے پہلے معتمد ... جناب ... صاحب نے سال گزشتہ کی تفصیلی رپورٹ سنائی۔ نصیرالدین ہاشمی ... کی تحریک و تائید کے بعد اراکین مجلس نے سابقہ مجلس انتظامی ہی کو دوبارہ منتخب کیا۔ مجلس انتظامی میں ... صدر، ... احمد (ایم اے) معتمد، محمد یونس ... خازن، بیگم حبیب الرحمان شریک معتمد شعبہ نسواں، اور اراکین انتظامی میں ڈاکٹر غلام یزدانی، سجاد مرزا اور حبیب الرحمان شامل ہیں۔

انتخاب کے بعد حسب پروگرام پروفیسر ابوالخیر عبدالواحد پرنسپل اردو کالج نے "میری اپنی کہانی اور نظمیں" کے عنوان سے مضمون پیش کیا۔

مضمون کے بعد محفل شعر وسخن میں عبدالحمید خیال، خادم قدسی، مظہر کامل، منوہر لال شارب، راجہ کرن پرشاد، منوہر لال بہار، شبیر لکھنوی، عابد علی عاصم، مہرالنساء، ... میر اور نعیم الحسن خیال نے اپنا کلام سنایا۔ جناب ... کے شکریہ پر یہ دلچسپ ادبی محفل اختتام کو پہنچی۔ ([illegible])

تاریخی ادبی دستاویز

## خیال کا کونسل نمبر

[illegible]

[illegible] کاشمیری

# ۱۸۸۷ء کی دو ڈرامہ کمپنیاں لاہور میں

اردو ڈرامے نے پنجاب میں عہد بہ عہد جو ترقی کی ہے اس کے متعلق ابھی تک مکمل تحقیق نہیں ہو سکی۔ پنجاب میں اردو ڈرامے کی ابتدا کے بارے میں وثوق کے ساتھ ہم کوئی بات نہیں کہہ سکتے، یہاں کی اولین ڈرامہ کمپنیوں کے حالات تاریکی میں ہیں اور ان کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بمبئی، لکھنؤ اور بنگال کے ڈرامے پر کافی کام ہو چکا ہے لیکن افسوس ہے کہ پنجاب میں ڈرامے کی تاریخ تاحال پردے میں ہے اس ضمن میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں بمبئی کا اردو ڈرامہ عہد عروج پر تھا، پنجاب میں بھی ڈرامہ کافی حد تک ترقی کر چکا تھا۔ یہاں کے عوام ڈرامے کے بے حد شائق تھے، اور اردو ڈرامہ بڑی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے کی ایک کڑی سن ۱۸۸۷ء کے ایک اخبار "[illegible] لاہور" سے معلوم ہوتی ہے جس میں پارسی اوریجنل تھیٹریکل کمپنی" اور "انڈین اوریجنل اوپیرا تھیٹریکل کلب کے کاموں اور ان کے قیام لاہور کے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے پنجاب کے کن کن شہروں میں ڈرامے کھیلے۔ [illegible] کی اس فائل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل لاہور بھی [illegible] ڈرامے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ یہ محبت [illegible] [illegible] کا ذکر ملتا ہے۔ پارسی کمپنی کے مالک پسٹن جی فرام جی تھے۔ پسٹن جی کے حالات اور ان کی کمپنی کی تفصیلات فراہم نہیں ہو سکیں۔

زیر نظر اخبار کے فائل میں جن جن ڈراموں کا ذکر آیا ہے ان کے متعلق بڑی عرق ریزی کے باوجود مکمل معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ بعض ڈراموں کے مصنفین کے نام ملتے ہیں لیکن وہ مشتبہ ہیں اس لئے انہیں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی صاحب ان کے متعلق تفصیلات فراہم کر سکیں تو راقم ان کا شکر گزار ہوگا۔ اب آپ ان کمپنیوں کی خبریں ملاحظہ فرمائیے:

۲ر جون [illegible]

پارسی اوریجنل اوپیرا تھیٹریکل کمپنی!

"جب سے اس کمپنی نے راولپنڈی سے آکر لاہور میں اپنا ڈیرا جمایا ہے تب سے اس نے عجیب و غریب تماشوں سے اہل شہر کو بہت ہی محظوظ کیا ہے۔ عموماً لوگوں کا خیال ہے کہ جس قدر کمپنیاں لاہور میں اپنا ہنر دکھا چکی ہیں ان کے سامنے یہ کمپنی تو کیا کوئی کمپنی بھی مقابلہ نہیں کر سکے گی؛ لیکن جس وقت اس کا اسٹیج تیار ہونے پر پہلا ہی تماشا ہوا تو شہر میں دھوم مچ گئی جس نے ایک [illegible] [illegible] [illegible]

... اندر مسرت ... کہیں ابھی تک ... چنداں
... نہیں ہوئی۔ اس لئے ... جانے کا مصمم ارادہ ہے جہاں اس کا
سٹیج تیار ہو رہا ہے۔

## ۱۰ راگست

لاہوری شائقینوں کی دلی محبت اس کمپنی کو شہر سے روانہ ہونے کی اجازت نہیں دیتی، یا یوں کہئے کہ یہاں کا آب و دانہ اسے چند روز اور ٹھہرنے کے لئے مجبور کر رہا ہے جو وہ بدستور اپنا اڈا جمائے ہوئے بیٹھی ہے۔ شائقینوں کو بھی شاباش کہنا چاہئے کہ عاشق ہر شب جا ہی ڈٹتے ہیں خصوصاً سنیچر کو تو خلقت کی بہت گہما گہمی ہوتی ہے، کیوں کہ اس رات بھی تماشہ خاص لطف دار ہوتا ہے۔ گزشتہ سنیچر کو راج ہٹ اور تقریباً ہٹ کا تماشہ تھا۔ اس کے پرلطف اور پراثر ہونے میں تو کچھ شک نہیں ہے لیکن پروپرائٹر صاحب کی سخت مزاجی سے اسی رات اس تماشے کا لطف جاتا رہا۔ تماشہ نہایت عمدہ طور سے ہو رہا تھا مگر نامعلوم ایک غریب المزاج ایکٹریس سے کیا کوتاہی ہوئی کہ آپ نے پردے کی آڑ میں اس کی وہ گت بنائی کہ پناہ خدا ـــــ پردے کے اندر سے تڑاخ پڑاخ کی جو آواز آئی تو عاشق مزاج تماشائیوں کے دل دہل گئے۔ اس حرکت سے کل ایکٹروں کے ہوش باختہ ہو گئے جی سہم گیا۔ بس پھر آپ جانئے جیسا کام خوشی میں ہوتا ہے ویسا رنج میں نہیں ہوتا۔ بقیہ تماشہ نہایت ٹوٹے پھوٹے دل سے غریب ایکٹروں نے ختم کیا۔ لیکن ایسا کوئی شخص نہ تھا جس کو پروپرائٹر صاحب کی اس حرکت سے رنج نہ پہنچا ہو۔ کیونکہ اگر بالفرض ایکٹریس سے غلطی واقع ہو گئی تھی تو تماشہ کے بعد پروپرائٹر صاحب اس کو تنبیہ کر سکتے تھے، نہ یہ کہ ایک جم غفیر کے اندر اس کی ایسی گت کی گئی کہ جس کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا۔ ہماری رائے میں مسٹر [illegible] کو اپنے مزاج کی اصلاح کرنی چاہئے اور انہیں واجب ہے کہ غریب تماشائیوں اور ملازموں سے ہمیشہ رحم دلی اور محبت سے کام

پارسی، ایکٹروں کو ع
[illegible]

۱۴ راگست بروز سنیچر کمپنی مذکور خانم کا تماشہ کرے گی جو ایک بہت مرغوب اور دل پسند تماشہ ہے اور بعد میں ایک بہت پرلطف اور با نتیجہ نقل عثمان خاتون کی کر کے دکھائے گی اور اتوار کو آخری تماشہ چھیل چھبیلا کا مرتبہ کر کے غالباً پیر کے روز کمپنی مذکور سیالکوٹ کی طرف روانہ ہو جائے گی، اور اس کی روانگی کے بعد اسی دن اسی منڈوے میں، انڈین اور نیشنل تھیٹریکل کلب کمپنی کا جو عرصہ سے یہاں تیار ہو رہی ہے پہلا تماشہ ہوگا جس کے لئے یہاں کے شائقین بہت مشتاق ہیں۔

## ۳۱ راگست

پارسی کمپنی ابھی تک لاہور ہی میں ہے اور بدستور اپنے نادر تماشے دکھا کر لاہور کے جنٹلمین شائقینوں کو محظوظ کر رہی ہے۔ پچھلے دنوں حسب فرمائش کمپنی مذکور نے دو دفعہ خاص عورتوں کے لئے تماشے کئے جس میں اچھے اچھے عالی خاندان اور شریف گھرانوں کی عورتیں شامل ہوئیں۔ انتظام نہایت عمدہ تھا، اور غیر آدمی منڈوے کے نزدیک پھڑکنے نہیں پاتا تھا۔ افسوس اب کمپنی یہاں کوئی دن کی مہمان ہے لا... اڑو۔ لیکن اب چند آخری تماشے دیکھ کر کمپنی کی جان فشانی اور عمدگی کی داد دو۔"

## انڈین اور نیشنل اوپیرا تھیٹریکل کلب

اس کمپنی نے آخر کار لاہور کے شائقینوں کو اپنے سحر [illegible] ناٹکوں اور دل آویز کرتبوں اور [illegible] تماشائیوں کی عرصے سے اس کمپنی کی طرف [illegible] تماشہ کی رات خلقت اس قدر [illegible] ہو چکا [illegible] ایکٹروں کی [illegible]

پنجاب یونی ورسٹی سینٹ نے اپنے آخری اجلاس میں حکومت
اور یونی ورسٹی کے حکام پر زور دیا ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے مناسب
اقدامات کئے جائیں تاکہ وہ انگریزی کی جگہ یونی ورسٹی تعلیم کا ذریعہ بن سکے
اجلاس نے خیال ظاہر کیا کہ اگر تعلیمی کمیشن کی طرف سے مجوزہ پندرہ سال کی مدت
ختم ہونے سے قبل ہی اردو کو سائنسی اور سماجی مضامین کی تعلیم کا ذریعہ بنا لیا
جائے تو اس سے تعلیمی معیار کے گرنے کا کوئی احتمال نہیں۔ یونی ورسٹی حکام کو
اردو کی ترقی پر تسلسل اور احتیاط سے نظر رکھنا چاہئے، اور اگر ترقی کی رفتار
خاطر خواہ ہو تو تین سے پانچ برس کی مدت میں ہی اردو کو تعلیم اور امتحان
کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ پچھلے کئی برسوں سے
موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ سنجیدہ فکر حلقوں اور افراد نے اس دوران میں کئی
مرتبہ اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ اگر ہمیں قومی فکر و نظر پیدا کرنا ہے اور
عام تعلیمی معیار کو بلند اور رفتار ترقی کا تناسب بڑھانا ہے تو ہمیں اردو کو اپنی
قومی زندگی کا فعال جزو بنانا ہوگا۔ خوشی کی بات ہے کہ اردو کی افادیت
اور اہمیت کا احساس [illegible] بڑھ رہا ہے اور یہ فرسودہ دلیل مسترد کی جانے
لگی ہے کہ اردو سائنسی مضامین کی تدریس کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ پنجاب یونیورسٹی
سینٹ نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کر کے حقیقت پسندی کا ثبوت
دیا ہے [illegible] تعلیمی کمیشن کی اس سفارش کا مطلب ہے کہ اردو کو پندرہ برس
[illegible] مدارس میں ذریعہ تعلیم بنایا جائے [illegible]
حاصل نہیں ہوگی۔

اردو کے بہی خواہوں کا پختہ یقین ہے کہ اردو خاصی ترقی یافتہ
زبان ہے اور وہ ہر قسم کے مفاہیم اور مطالب کے اظہار کی قدرت
رکھتی ہے اور اگر اسے ترقی دینے کے لئے تھوڑی بہت کوشش
کی جائے تو وہ سائنسی مضامین کی تعلیم کا بھی موثر ذریعہ بن سکتی ہے اس
کے لئے ضروری نہیں کہ پندرہ برس تک ہی انتظار کیا جائے، بلکہ اس سے
بہت کم مدت میں یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے۔
اس ضمن میں بعض دور رس اقدامات کی ابتدا ہو چکی ہے۔ ثانوی تعلیم کے
بورڈ کی نصابی کمیٹی نے نئے تعلیمی سال سے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی
مدارس کے لئے اردو کو لازمی مضمون قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے اس سے
طلبا کو آرٹس اور سائنسی مضامین سے متعلق سوالات کے جواب اردو
میں دینے کی ترغیب ملے گی اور اس طرح اردو کو جلد از جلد ذریعہ تعلیم
بنانے کے لئے ایک ٹھوس بنیاد مہیا ہو جائے گی۔ ادھر صوبائی حکومت نے
تعلیمی اداروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے دفتری معاملات اردو ہی
میں طے کریں ان اقدامات کے پیش نظر توقع کی جا سکتی ہے کہ [illegible]
کی جگہ اردو کو رائج کرنے کے لئے سنجیدگی سے [illegible]
کوشش کی جائے گی کہ یہ مقصد [illegible]
اہتمام ہو جائے۔

○

ہم محترم [illegible]

[illegible] کی اس [illegible] غلط فہمی پر مبنی ہے کہ پشاور ڈویژن

میں پرائمری کی پانچویں جماعتوں میں ذریعہ تعلیم پشتو رہا ہے، حالاں کہ

یہ بیان صریحاً غلط ہے اول تو تعلیم کے پشاور ڈویژن میں پشاور ڈویژن

کے ڈیرہ اسماعیل خاں اور راولپنڈی کے ڈویژن بھی شامل ہیں ملاحظہ

ڈویژن سالم اور پشاور ڈویژن کے ضلع کیمبل پور اور ڈیرہ ڈویژن

کے ضلع میانوالی میں پشتو کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ

ازیں ۱۹۲۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق سابق سرحد کے

تمام اضلاع میں پشتو بولنے والے لوگوں کی تعداد پچپن فی صد سے

زیادہ نہیں، اور ضلع ہزارہ میں تو کل دس فی صد اور ضلع ڈیرہ اسماعیل

خان میں پچیس فی صد سے بھی کم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سابق صوبہ سرحد

کے تمام اضلاع اور قبائلی علاقوں میں شروع ہی سے ذریعہ تعلیم اردو

رہا ہے جیسا کہ پنجاب اور بلوچستان میں حساب، جغرافیہ، اسباق

الاشیا سب اردو میں پڑھائے جاتے رہے ہیں اور لکھائی پڑھائی

بھی اردو میں ہوتی رہی ہے۔ البتہ مدرسین کو بوقت ضرورت پشتو

استعمال کرنے کا حق رہا ہے، جس طرح کہ پنجاب میں الفاظ کے معنی

پنجابی زبان میں اور بلوچستان میں بلوچی زبان میں بتلائے جاتے ہیں

مزید برآں صوبہ سرحد میں حصہ پرائمری کی صرف چار جماعتیں ہی

ہیں اور وحدت بننے کے وقت ... ... یہ طے ہوا کہ پرائمری

جماعتیں پانچ ہونی چاہئیں، لیکن اس پر بہت کم مقامات پر عمل کیا گیا اب

تک صوبہ سرحد کا حصہ پرائمری بالعموم چار جماعتوں پر مشتمل ہے۔ ان

واقعات پر کمیشن کی یہ سفارش کہ ان علاقوں میں پہلے دو سال صرف

پشتو میں تعلیم دی جائے اور تیسری سے پانچویں تک اردو زبان

ایک [illegible] صورت میں استعمال کی جائے خلاف واقعات

اور ناقابل عمل ہے کیوں کہ اضلاع میں پشتو محض [illegible] فی صد کی

[illegible] زبان ہے [illegible] کس طرح [illegible] جماعتوں میں پشتو

ناجد نوری

# غزل

میں تماشا بن گیا دنیا تماشائی ہوئی
تجھ سے اے جانِ جہاں اچھی شناسائی ہوئی

اور دیوانے کی تیرے ہمت افزائی ہوئی
اتنی ہی نکھری محبت جتنی رسوائی ہوئی

دردِ فرقت، سوزِ دل، آہ و خلش، ارمان و یاس
کتنے ہنگاموں کا باعث شامِ تنہائی ہوئی

ان کا آنا تو نظر آتا نہیں مجھ کو مگر!
یہ دکھائی دے رہا ہے موت ہے آئی ہوئی

دیکھئے ہوتی ہے کیا تعبیر ایسے خواب کی
اڑ گئی آنکھوں سے میری نیند بھی آئی ہوئی

دستِ گل چیں کو نہ دے الزام اے خوش رنگ پھول
تیری بربادی کا باعث تیری رعنائی ہوئی

آ گیا ہے آج کیا احساس کی آنکھوں میں خود
دیکھتا ہے غالب ہی غنچوں کے ہنسی آئی ہوئی

---

ہی ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے امید ہے کمیشن یا محکمہ تعلیم کی طرف سے اس
[illegible] کر کے یا تا [illegible] بہتر اردو بنایا جائے [illegible]
[illegible] جس سابق [illegible] جماعت ہی سے اردو زبان [illegible]

ترجمان سرحد پشاور [illegible]

# مراسلات

## اردو یونیورسٹی

ایڈیٹر صاحب !

اردو جیسی مظلوم زبان شاید ہی کوئی ہو۔ پاکستان بننے کے بعد بجائے اس کے ترویج و اشاعت میں زیادہ آسانیاں فراہم کی جاتیں، اس کے ساتھ سوتیلوں کا سا سلوک کیا جا رہا ہے، اور اس کی جگہ غیر ملکی زبان ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئیں ہیں۔ ہماری دفتری کاروائیاں اور حصول تعلیم کا ذریعہ اردو کی بجائے انگریزی کو بنایا گیا دنیا کے ہر ملک میں قومی زبان بننے کا حق وہاں کی زبان ہی کو دیا گیا۔

اردو کی اس بے سرو سامانی کے دور میں بابائے اردو کا اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ ایک مستحسن اقدام ہے، اردو یونیورسٹی کے قیام سے اردو کو ایک مضبوط قلعہ مل جائے گا، اور نہ صرف اس کی ترویج و اشاعت میں مدد ملے گی بلکہ بہت سی تعلیمی مشکلات بھی دور ہو جائیں گی کیوں کہ ذریعہ تعلیم موثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ مادری زبان میں ہو۔

ہر زبان کا ایک تاریخی، سیاسی، ثقافتی، تمدنی اور تہذیبی پس منظر ہوتا ہے اور جو قوم اپنی زبان کے ساتھ بے اعتنائی برتتی ہے اسے ان سب سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس کی عزت، اس کی شخصیت، اس کا وقار، اس کی آزادی غرض سب کچھ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اگر ہم کو اپنی تہذیب، تمدن، ثقافت اور اپنی عزت و عظمت اور وقار عزیز ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اردو یونیورسٹی کی اس تحریک میں بابائے اردو کا ساتھ دیں۔ اس عظیم منصوبہ کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت فوراً پوری ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی آمدنی میں سے ایک حقیر سی رقم اردو یونیورسٹی فنڈ کے لئے نکال کر اس اہم ملی و قومی کام میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں بزم امروز کے اراکین کا یہ اقدام بڑا مستحسن ہے کہ وہ رقم جمع کر کے اس نیک کام میں بابائے اردو کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور اب تک (۲۷۰) روپے کی رقم ان کی خدمت میں پیش بھی کر چکے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی باعث شرم ہے کہ اس کام میں ہمارے بڑے، بچوں سے پیچھے رہ گئے۔

یہ بات ہمارے لئے باعث شرم ہے کہ جو زبان اب ہمارے لئے ایک ناگزیر حقیقت بن چکی ہے اس کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی برتیں اور ضرورت کے وقت اس کے دامن کو خالی رہنے دیں۔ آج بابائے اردو آپ کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں دیکھیں اس نیک کام میں کون بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اگر اس بے حسی کے سبب پہلے اردو یونیورسٹی کے لئے ہم کچھ نہ کر سکے تو ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے [illegible] اب بھی اس نیک کام میں حصہ لے کر اپنی بے حسی کی تلافی کر سکتے ہیں۔

ہم بابائے اردو اور [illegible] کام میں ان کے ساتھ ہیں اور امید کرتے ہیں [illegible] اس خدمت و ایثار کے جذبے [illegible] یونیورسٹی کے [illegible]

[illegible]

# اردو کا مستقبل

آج یہ مسئلہ کئی اہل قلم حضرات کی بحث کا باعث بنا ہوا ہے کہ اردو زبان کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس بحث نے لوگوں میں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک گروہ وہ ہے جو اس کے بہ زوال ہونے کی پیش گوئی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اردو زبان میں اتنی گنجائش اور کمیت کی طاقت نہیں کہ ہر فن اور ہر اصطلاح پر عبور حاصل کر سکے خصوصاً ٹیکنیکل اور نئی اصطلاحیں اس میں جذب نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ان نظریات کے زبردست مخالف ہیں۔ یہ لوگ اردو زبان کے مستقبل سے بہت پر امید ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اردو بتدریج مائل بہ ارتقا ہے۔ ہم کس گروہ کا ساتھ دیں بس یا اسکا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں اردو کی بنیادوں کا جائزہ لیتے ہوئے ترتیب سے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف آنا پڑے گا، ہر مفروضے کو، ہر دلیل کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنا پڑے گا۔ تاکہ ہم حتمی طور پر یقین سے کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

کسی ملک کی مادی اور اخلاقی ترقی اور بلندی کے لئے اس ملک کے باشندوں میں زیادہ سے زیادہ ثقافتی اور سیاسی یک جہتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی اہمیت اس علاقے میں اور بھی بڑھ جاتی ہے، جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہوں۔ جہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہوں اور جہاں ثقافت طبقاتی نظام میں بٹی ہوئی ہو۔ ایک ادنیٰ اندازے کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں (۱۴۷) ایک سو سینتالیس بولیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس تفریق کو ختم کرنے کے لئے فطرتی طور پر غیر محسوس طریقے سے ایک ایسی مخلوط زبان ترویج پانے لگی جس نے صدیوں بعد اردو زبان کا نام حاصل کیا۔

اردو کے آغاز و ابتدا کے متعلق کئی نظریات پیش کئے جاتے ہیں مگر کسی نظریے میں جامعیت نہیں۔ حافظ محمود شیرانی کا کہنا ہے کہ اردو کا بیج غزنوی دور میں بویا گیا۔ افغانی، ایرانی، ترکی اور ہندو مسلم اتحاد سے ایک نئی ثقافت معرض وجود میں آئی۔ ایک نیا تمدن جنم میں آیا، اور ایک ایسی زبان پرورش پانے لگی، جس نے آج کئی سو سالوں کے بعد موجودہ شکل اختیار کی۔ اردو زبان کا پس منظر بہت گہرا ہے اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو اپنی ابتدائی شکل میں بیک وقت دو زبردست محاذوں سے پھیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک طرف ساحلی علاقہ کا وہ محاذ تھا جہاں پر بالترتیب پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کی آمد اپنا اثر دکھا رہی تھی، اور دوسرا شمال مغربی علاقے کا وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا محاذ تھا۔ یہی وہ محاذ تھا جس پر آریوں اور [illegible] سے لے کر ترک اور پٹھان تک پرورش کرتے رہے ہیں اور اس طرح [illegible] اثرات پیدا ہوتے گئے۔ اگر سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ لسانی [illegible] ایک مقررہ جگہ پر ہی تک محدود ہوتی تو کوئی بات نہ تھی لیکن دونوں طرف سے پیدا ہونے والے اثرات کا [illegible]

کے بعد جو زبان تشکیل پائی اس نے ادب کی دنیا میں زبردست ہل چل پیدا
کردی اس کا نام اردو ہے۔

سر ولیم جونس، گریرسن اور ہارنل کا نظریہ یہ ہے کہ لاطینی فارسی
اور سنسکرت اور دیگر کئی زبانیں ایک درخت ہی کی چھوٹی بڑی شاخیں ہیں
اس کی تائید میں سید وحید الدین سلیم نے اپنی معرکہ آرا کتاب وضع اصطلاحات
میں لکھا ہے۔ اردو زبان کا رشتہ جس طرح دنیا کی قدیم مشہور ترین علمی زبان
سنسکرت سے ہے اسی طرح اس کا دور کا تعلق دنیا کی دوسری دو بڑی نامور
علمی زبانوں لاطینی اور یونانی سے اور زمانۂ حال کی تین بڑی زبانوں جرمنی
فرانسیسی اور انگریزی سے ہے۔ اس سے ملتی جلتی ایک رائے اور بھی ہے
ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں کہ عموماً یہ سمجھ لیا جاتا
ہے کہ اردو زبان نام ہے صرف عربی اور فارسی کے میل جول کا، اس کی
بناوٹ، قواعد اور ساخت پر کسی کی نظر نہیں ہوتی حالانکہ اس میں کئی بولیوں
کے الفاظ اور کئی زبانوں کے حروف بکثرت شامل ہیں۔ برعکس اس کے مولانا
محمد حسین آزاد نے آب حیات کے دیباچے میں بڑا مختصر سا فقرہ داغا ہے لکھتے ہیں
"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے" تاہم
کچھ بھی ہو ان بیانات سے یہ امر بلا شک و شبہ پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے
کہ اردو زبان میں بہت زیادہ لچک ہے اتنی کہ ہر زبان کو اپنے اندر سموتی
ہے۔ یہ اردو تو نہیں تھی لیکن اس کی اولین ترین شکل ضرور تھی جس میں مشہور
شاعر مسعود سعد سلمان نے بارھویں صدی عیسوی میں ایک دیوان ترتیب
دیا تھا۔ یہ دیوان آج موجود نہیں لیکن اس سے بعض نقادان فن کا یہ کہنا غلط
ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو مغلیہ لشکر سے معرض وجود میں آئی۔ زبان مغلیہ دور میں
اس نے ایک کروٹ ضرور لی۔ یہاں یہ بیان کرنا بالکل برمحل ہوگا کہ ایک
غلط خیال جو [illegible] کی حیثیت سے یہ کہتا ہے کہ اردو کا عظیم ادبی
[illegible] کبھی [illegible] کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اگر ایسا ہوتا تو امیر خسرو اور
[illegible] جیسے [illegible] لکھتے۔ قلی قطب شاہ جیسے سلطان اس

میں طبع آزمائی نہ کرتے۔ گلکرائسٹ جیسے مربی اور انگریزی فن کار نہ ہوتے
اور میر امن دہلوی کبھی باغ و بہار اور قصہ چہار درویش نہ لکھتے۔ آرائش
محفل تخلیق نہ کی جاتی۔ میر جیسا نازک مزاج شاعر اور غالب جیسا فارسی کا
اردو کو قابل التفات نہ سمجھتا۔ سید احمد خان ایک خاص اور سچا [illegible]
کے تحت اپنے رفقائے کار کو اردو نثر نویسی کی طرف راغب نہ کرتے، اور
الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور ذکاء اللہ جیسی عظیم المرتبت
شخصیتیں یوں اردو زبان میں شہ پارے جنم نہ دیتیں۔ ان کے ساتھ ساتھ
اگر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا نام نہ لیا گیا تو یہ گویا اردو کے ادب سے [illegible]
خلاف کھینچ لینے والی بات ہوگی، یہ والیٔ دکن کی انتہائی گہری دلچسپی تھی
جس کی بنا پر انہوں نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور سید وحید الدین
سلیم کو اردو زبان کے سلسلے میں باقاعدہ ہاتھ بٹانے کو کہا، یہ وہ عہد ہے
جس میں وضع اصطلاحات بڑی کد و کاوش کے بعد لکھی گئی۔ اس کتاب کے
متعلق خود وحید الدین سلیم نے بتایا کہ ایسی کتاب نہ یورپ میں لکھی گئی ہے
اور نہ ایشیا میں۔ اور یہ ہے بھی بین حقیقت۔ جامعہ عثمانیہ کے زیر نگرانی
ہزاروں کتابوں اور سینکڑوں اصطلاحات کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں
مگر افسوس ہے کہ یہ تراجم ابھی تک رائج نہیں ہو سکے حالانکہ یہ تصور عام
ہو چلا ہے کہ ہم اس سے متعارف ہونا نہیں چاہتے۔ صرف حیدرآباد کی یہ کوششیں
اردو کے خد و خال بدل سکتی ہیں۔

اردو زبان کی خوش بختی ملاحظہ ہو اس میں باقاعدہ اور [illegible]
دلچسپی لینے والے وہ لوگ تھے جنہیں ظاہری طور پر اردو سے کوئی [illegible]
نہیں تھا۔ یہ انگریز تھے۔ شاید انہوں نے اردو کے مستقبل کو حال [illegible]
میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں [illegible]
کئی [illegible] قسم کی اردو کی کتابیں تصنیف کروائیں۔ یہ انگریز ہی تھے جنہوں
[illegible] سے پہلے اردو، ہندی انگلش ڈکشنری ترتیب دی [illegible]
[illegible] یہی [illegible] اردو [illegible]

[illegible] ہے ۔ پانی [illegible] کی مرہون منت ہوتی ہے
[illegible] کوشش یقیناً بڑا اچھا اثر چھوڑ رہی ہے۔ قندیل کی یہ سعی بھی
[illegible] طور سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی، قارئین نے اس اقدام کو بے حد
سراہا ہے ۔

اردو کے ماضی اور حال کو دیکھتے ہوئے اس کے مستقبل کے
متعلق رائے قائم کرنا چنداں مشکل نہیں رہا۔ دنیا کی کوئی زبان اس
وقت اردو زبان کا سامنا نہیں کر سکتی ۔ یہ پھیلے گی اور خوب پھولے گی۔
ہم جو اہل زبان کہلاتے ہیں، اردو کے سرپرست بنتے ہیں ایک طرف
ہے، دوسری قومیں بالخصوص انگریز اور امریکی ابھی تک متواتر اس میں
ارتقائی مرحلے طے کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ پاک و
ہند میں قائم تمام غیر ملکی تعلیمی اور مذہبی مراکز میں غیر ملکی اسٹاف کے لئے
اردو زبان سیکھنی ضروری ہے ۔ میں ذاتی طور پر کئی انگریزوں کو جانتا
ہوں جو اتنی اچھی اردو بول سکتے ہیں کہ ان پر اہلِ زبان ہونے کا گمان
گزرتا ہے۔ وہ لوگ نہایت متعصب ہیں جو ان حقائق کی موجودگی میں بھی آنکھیں
بند کر کے اردو کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں وہ دراصل حالات کے جدید
تقاضوں کا ساتھ نہیں دینا چاہتے وہ جس ٹہنی پر بیٹھے ہوئے ہیں اسی کو
کاٹنا چاہتے ہیں مگر ایسا کرنے سے انہی کو چوٹ اور لغزش کا خطرہ ہے
کہیں ایک ٹہنی کم ہونے سے درخت بھی گرا کرتے ہیں۔ عرفی نے شاید
ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا تھا ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نکند رزقِ گدا را

ہم ببانگ دہل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے مستقبل سے مایوس طبقہ کے
لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اور ان کی چیخ و پکار
نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مصداق ہے ۔

* یہاں چلتے چلتے ایک سوال بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں اردو
کو کیا بجز دی جا رہی ہے جب ۱۹۵۶ء کے آئین میں [illegible]
سال کے لئے قومی زبان انگریزی ہی ہوگی قرار پایا تھا۔ مگر اب چار
سال کے بعد اس مدت پر ضرور اثر پڑنا چاہئے۔ امید ہے کہ حکومت
پاکستان اس امر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مناسب ترمیم کرے گی ۔
(قندیل)

رشتے رابطے اور ہمدردی کا تصور رفتہ رفتہ معدوم کر دیا ہے انسان
اور مشین کے درمیان رشتہ استوار کر دیا ہے۔ اس نظام سے
تمام انسانیت پرستوں کو انسانی ہمدردی اور محبت کی موت واقع
ہونے کا شدید اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

اردو میں اس صدی کے اوائل میں رومانوی تحریک کا آغاز
ہوا۔ مخزن، ہمایوں اور رومان جیسے ادبی رسائل نے اس کے فروغ
میں حصہ لیا۔ رومانوی تحریک نے نئے عہد کا گجر بجایا۔ اس تحریک کے
علم بردار علی گڑھ تحریک کی کوکھ سے نکلے تھے ان کی رگوں میں حالی،
اور سر سید کے افکار و اقوال کا خون دوڑ رہا تھا لیکن سر سید تحریک کے
زیر اثر ادب میں جو مصلحانہ رنگ پیدا ہو گیا تھا اس نے یکسانیت اور
جمود سا پیدا کر دیا تھا۔ ادب واعظ و پند بن کر رہ گیا تھا جس کی بہترین
مثال حالی کا مسدس تھا۔ یہ نئی نسل، ایک وسیع افادیت کا تصور اپنے
ساتھ لائی تھی۔ علی گڑھ تحریک نے کھلم کھلا پرانے معتقدات سے بغاوت
نہیں کی تھی۔ لیکن ان میں لوچ اور لچک پیدا کر کے سمجھوتے کی صورت
نکالی تھی اور اس وقت یہ دانش مندانہ قدم حالات کے مطابق اٹھایا گیا
تھا۔ اب رومانوی تحریک نے ڈنکے کی چوٹ پر تمام رسوم و قیود اور
دقیانوسی اعتقادات کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ سارے لوگ مغربی
تصورات سے متاثر ہوئے تھے، اس زمانے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو انفرادیت
اور شخصی آزادی کے تصور نے مسحور کر دیا تھا۔ اس کے دل میں آزاد
محبت کی امنگ انگڑائیاں لے رہی تھی۔ یہ تمام خواب اور آرزوئیں ایسے
سماج سے مستعار لی گئی تھیں جہاں ان کی عملی صورتیں بھی تھیں لیکن
ہندوپاک کے اس سماج میں یہ تمام تصورات بھی ایک جرم سے کم نہ تھے
عورت مرد کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ عورتوں کی تعلیم پر
پابندی تھی اور سماجی طور پر انہیں ہر شعبہ زندگی میں مردوں سے گھٹیا
تصور کیا جاتا تھا۔ یہ شکست جنسی اور جمالیاتی ناآسودگی سے ایک
آتش فشاں بن گئی تھی اور تمام پرانی رسوم و فرسودہ عقائد کی دھجیاں
اڑ گئیں۔ اگر اس دور میں ادیبوں اور شاعروں نے ذہنی آمادگی اور
ماورائیت کو اپنا شعار بنایا تو وہ بالکل حق بجانب تھے، رومانوی تحریک
کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا، اس نے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو خود آگہی
اور خود شناسی کی دولت بخشی۔ انہیں ایک ایسی بصیرت عطا کی جس کے توسط
سے وہ علی گڑھ تحریک کے اصلاحی ر انداز سے آگے دیکھ
سکیں۔ زندگی کے رشتے مصلحت سے چھڑا کر اپنے بارے میں صاف صاف
بیان کر سکیں۔ اس تحریک نے جذباتی تجربے کو بڑی اہمیت دی جس نے ایک
خاص رومانوی اسلوب کی بنا ڈالی، شعر میں ندرت اور بانکپن اور نثر
میں آراستگی اسی تحریک کے اثرات ہیں۔

اقبال کی شاعری بھی رومانوی تحریک کی ایک پراثر آواز تھی۔
شروع میں اس کی شاعری کسی خاص فکری رجحان کی داعی نہیں تھی۔ یورپ
سے واپس آنے کے بعد اقبال نے اپنے فن و ادب میں ایک نئے فکری
نظام کی بنیاد رکھی۔ رومانوی تحریک کے اثرات اردو کی نئی ابھرتی ہوئی
صنف افسانے میں بہت نمایاں تھے۔ لیکن رومانوی تحریک کا زیادہ اثر
شاعری کے بجائے اردو نثر پر پڑا۔ سجاد حیدر یلدرم۔ نیاز فتح پوری۔ مجنوں
حجاب وغیرہ کے افسانے اس انداز فکر کے خاص نمونے ہیں۔ ان تمام افسا
نگاروں کے ہاں ماورائیت اور افلاطونی محبت کا ایک واضح مقصد تھا
کے ساتھ مجلہ ہمایوں نے اس تحریک میں ایک اور مکتبہ فکر کی بنا ڈالی جن میں
میاں بشیر احمد، فلک پیما شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور گروہ بھی تھا
جن میں سجاد انصاری اور مہدی حسن (افادی) کے نام نمایاں تھے
اقبال اور ان نثر نگاروں کے سوا ایک اور بڑی قد آور اور منفرد
شخصیت ابوالکلام آزاد کے روپ میں ابھر رہی تھی۔ "البلاغ" "الہلال"
اور "تذکرہ" کے اسلوب نثر نے ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔

ہمایوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے وقفے میں جس قافلہ ا

کی راہنمائی کی، ان میں پہلے عہد کے رومانوی ادیبوں کی نسبت شدید جذباتیت
اور بے قیدی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس قافلے میں جذباتیت کا عمل
دخل مزید تھا لیکن اس کا انداز فکر بدل گیا تھا۔ ماورائیت اور فرار کے اثرات
کافی ماند پڑ گئے رفتہ رفتہ سماجی شعور ان کی جگہ لینے لگا۔ اس نئی رومانیت
کے تحت "غبار خاطر" اور جوش کے مضامین بھی آتے ہیں۔

تنقیدی ادب میں عبدالرحمان بجنوری اور مجنوں گورکھپوری
نے تاثراتی تنقید کی بنا ڈالی۔ بجنوری نے "محاسن کلام غالب" میں جو
رشحات پیش کئے ان میں داخلیت اور بے پناہ تاثریت ہے۔ بجنوری نے
غالب کے فلسفے کو اپنے تخیل و حیات سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا، اور
دیوان غالب کو جوش عقیدت میں الہامی کتاب کا رتبہ بخش دیا۔ مجنوں
کے ہاں تاثراتی تنقید ابتدائی دور میں ہے بعد میں اس نے ادب کو زندگی کا عکس
تسلیم کیا اور حقیقت نگاری پر زور دینے لگا۔ فراق کے ہاں بھی تاثراتی انداز
تو شروع میں پایا جاتا تھا جو جدید نکتہ سے شیر و شکر ہو کر افسانے کے
مضامین کی صورت میں نکھر کر اجاگر ہوا۔

رومانیت کی پہلے دور کی شاعری کا سب سے بڑا علمبردار اختر شیرانی
ہے جس کے مکمل خود فراموشی اور ماورائیت ہے۔ پھر جوش کا نام آتا ہے جو
فراوانی جذبات میں اختر شیرانی سے بھی آگے ہے لیکن اس کے ہاں خود
آگہی کی ایک لہر پائی جاتی ہے۔ جوش کی شاعری ایک مسلسل ذہنی ارتقا
کا نادر نمونہ ہے۔ وقت کے تقاضوں سے ایک فن کار کس طرح اپنے
نظام فکر کو استوار کرتا ہے یہ جوش کا سرمایہ شعری ہے۔ نئی رومانیت کے
زیر اثر ساغر نظامی، روش صدیقی اور اختر انصاری و فراق کی شاعری
کا پہلا دور آتا ہے۔ اختر انصاری اور فراق گورکھپوری بعد میں ترقی
پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اور ان کی شاعری ایک نئے سماجی نظام کا
پیام دینے لگی۔ "افادی ادب" کا سوال ادب میں سب سے پہلے اختر
انصاری نے "افادی ادب" کے نام سے ایک کتابچہ لکھ کر اٹھایا۔

رومانوی تحریک کے اثرات ترقی پسند ادیبوں میں بھی دیر تک سرایت
کئے رہے۔ ترقی پسند رومانوی ادیبوں کرشن چندر، ندیم قاسمی اور میرزا
ادیب کے ہاں جذبات و احساسات کی فراوانی کے سوا وطن پرستی اور
ظلم کے خلاف بغاوت کا کھلم کھلا پیغام تھا۔ ان کے ہاں یلدرم، نیاز
اور حجاب کی طرح ماورائیت اور خود فراموشی مفقود تھی۔ اس جدید
رومانیت کو نقادوں نے رومانوی حقیقت نگاری کا نام دیا۔ ان ادیبوں
نے نوجوان مرد عورتوں کے لیے خود آگہی کے نئے باب کھول دیئے۔
فرد کی آزادی کا تصور ان کے ذہن میں بٹھا دیا۔

اب میں پھر اقبال کی طرف لوٹتا ہوں۔ مغرب کے مادہ پرست
نظام اور میکانکی تعقل پسندی سے اقبال کی بیزاری اور بغاوت اس کے
بے حد وسیع شعور اور فن کارانہ دیانت داری کا بیّن ثبوت ہے۔
مجھے رفیق خاور صاحب کے اس نظریے سے اتفاق ہے کہ اقبال نے
مغربی نظریات مشروط طور پر قبول کئے، بجائے حال اور مستقبل کے ماضی
کو اپنا آدرش بنایا۔ اقبال نے عقل سے زیادہ وجدان پہ اپنے نظام فکر کی
بنیاد رکھی، اس لئے کہ عقل پرستی نے صنعتی نظام کی صورت میں انسانیت کی
تباہی کے تمام سامان پیدا کر دیئے تھے۔ اقبال کا فلسفہ خودی رومی کے
افکار کا تتبع نہیں بلکہ اقبال کی نظر میں مومن کل میں جذب ہو کر بھی اپنی انفرادیت
قائم رکھ سکتا ہے اس نظام فکر کو استوار کرنے میں اقبال پر اس زمانے کے
سیاسی حالات نے بھی بے حد اثر ڈالا۔

اقبال کی مغرب سے اس شدید بغاوت کا محرک ماضی کے نظام
سے بے حد جذباتی لگاؤ ہے اس جذباتی لگاؤ میں رومانیت کے گہرے
اثرات شامل ہیں۔ اقبال بھی دوسرے رومانیوں کی طرح قرون وسطیٰ کے
نظام کو لانا چاہتا ہے جس میں صنعتی نظام کی پابندی اور وقت کی تکرار
نہ ہو۔ جیسے جیسے یہ محدودیت اور شدت آہستہ آہستہ ہوئی لیکن اقبال زیادہ
دیر اس جذباتیت کا شکار نہ رہ سکا۔ اس کی گہری فلسفیانہ طبیعت اور

طاقتوں کی اقتصادی بدحالی نے ایک نئے نظام کو استوار کرنے کے لئے شدید طور پر تحریک دی۔ اقبال اگر زندہ رہتا اور دوسری جنگ عظیم میں میکانکی عقل پرستی کی مزید اور زیادہ ہولناک تباہ کاریاں دیکھتا اور بعد ماضی کی طرف جانے کی بجائے اس میکانکی عقل پرستی سے لڑنے کے لئے نئی اور صحت مند عقل پرستی کی بنیاد ڈالتا۔

مغرب کے سماج کو چونکہ اس میکانکی عقل پرستی سے براہ راست سابقہ پڑ رہا ہے اس لئے ان کے ادیبوں نے زیادہ سنجیدگی اور دیانت سے اس بارے میں سوچا اور آگے کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کی۔ یورپ میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان ادیبوں اور اہل علم طبقہ کی حالت عجب دگرگوں تھی۔ ہکسلے نے اپنے ناول میں اس ذہنی تذبذب، انتشار اور آشوب کا بڑا حسین مرقع پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کو انسانیت کے مستقبل کی بڑی فکر ہے وہ چاہتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے بجائے یہ دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہے، یہ عرفان ذات کا فلسفہ ہے اس فلسفہ کے نقیبوں نے تمام پرانے توہمات کو کاٹ ڈالنے کا پرچار کیا۔ ادب میں اس تحریک کا بانی ژاں پال سارتر ہے۔

اقبال کی عظمتِ آدم کا تصور اس لئے نامکمل رہا کہ وہ آدم اپنے سے ایک بڑی ذات کا مجبور بھی تابع زمان تھا۔ اس کی مادی ترقیوں کو دیکھ کر انجم و اسرار ضرور سہمے تھے لیکن اس کے باوجود چند ایسے توہمات کے طلسم تھے جن کو ابھی وہ توڑ نہیں سکا تھا۔

وجودیوں نے آدم کی عظمت کو مکمل کر دیا ان کے فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کی ذات سے بالا کوئی ذات نہیں۔ انسان تمام دوسری ذاتوں سے عظیم و برتر ہے ؎

ہمیں چراغ ہمیں پروانے

ذات کا عرفان خود شناسائی اور اپنی عظمت کا احساس اس کی زندگی کے چراغ کو روشن کئے ہوئے ہیں، ان ہنگاموں، آشوبوں، الجھنوں اور توشوں میں اسے کسی اجنبی دنیا میں پھینک دیا گیا ہے۔ اب اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے کہ وہ اپنے وجود کو محشر خیال گنجینۂ معنی اور طلسمات رنگا رنگ کا محور سمجھے۔ اس مشک کی تلاش میں جو اس کی ناف میں ہے جنگل جنگل صحرا صحرا بھٹکے۔ قسمت کو لعن طعن کرنا مقدر کو کوسنا اسے زیب نہیں دیتا۔ قسمت اور مقدر کی تخلیق اب اس کا ادنا کرشمہ ہے بقول غالب ؎

اپنی ہستی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

وجودیت اشیاء کا ادراک نہیں وہ مادیت ہے بلکہ اپنی ذات کا ادراک ہے۔ اس فلسفے کے اثرات میر کی شاعری میں بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔ میر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت داخلیت قرار دی ہے داخلیت اصل میں فلسفۂ وجودیت کی سربستہ رنگ میں جلوہ گری ہے۔ میر کی داخلیت اردو غزل کا ایک گہرا مزاج ہے۔ داخلیت ہماری تمام غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ یہ داخلیت ہمارے موجودہ دور کے شاعروں میں بھی مختلف انداز، روپ اور رنگ میں لوٹ لوٹ کر آتی رہی ہے۔ میراجی۔ فیض۔ راشد۔ مختار صدیقی، مجید امجد اختر الایمان اور ناصر کاظمی کی شاعری میں اس کے سارے روپ ملتے ہیں۔

مجھے رفیق خاور صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کہ اقبال کے بعد ہماری شاعری خالی الذہن ہو گئی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبال نے اسلوب اور فکر دونوں لحاظ سے اردو ادب میں بیش بہا اضافے کئے لیکن اس کے بعد شاعری کا خالی الذہن ہو نا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاعری کی سب سے بڑی قدر یہ نہیں کہ وہ صرف فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ شاعری انسان کے جذبات و محسوسات کے اظہار کا نام ہے۔ اس اظہار میں جتنا خلوص و صداقت ہوگی وہ شاعر

ہی عظیم اور کامیاب ہوگی۔ یہ خصوصیات اقبال کے بعد بیشتر شاعروں
میں بھی پائی جاتی ہیں۔

اقبال نے صرف ایک دروازہ کھولا تھا۔ اس کے بعد آنے والوں نے
تمام دروازے کھول دیئے اقبال کے افادی انداز سے الگ ہو کر جمالیاتی
قدروں اور سماجی قدروں کو شیر و شکر کر کے اپنی تخلیقات میں پیش کیا
مغرب میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ پہلے فن کار اس فن کی
مبادیات اور اصول پورے کرے ان میں مہارت تامہ حاصل کرے
اس کے بعد اپنا نظریہ حیات پیش کرے لیکن اسے بھی اپنی تخلیق میں سموئے
اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ اقبال نے اپنے
شعر کلام کو غلط طور پر استعمال کیا ہے اسے اپنے افکار و خیالات کے
تبلیغ کا ذریعہ بنایا جنہوں نے ثقالت اور کرختگی پیدا کر دی۔ اور جمالیاتی
قدروں کو ٹھیس پہنچائی۔

رفیق خاور صاحب نے آگے چل کر فرمایا کہ مغرب میں شاعری نے
کتنے رنگ بدلے اور کتنی تحریکیں جاری ہوئیں۔ لیکن ہمارے یہاں کوئی
تحریک نہ ابھر سکی۔ رفیق خاور صاحب نے شاید اس بات کی طرف
دھیان نہیں دیا کہ مغرب نے نشاۃ ثانیہ کے بعد توہمات، فرسودہ رسوم
اور جاگیرداری نظام کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اس طرح ہمیں بھی علم کی نشاۃ
ثانیہ کے بعد دقیانوسی سماج اور جہالت سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس تحریک
کا رد عمل مذہبی رنگ میں دیوبند، اعظم گڑھ، اکبر اور اقبال کی مخالفت
کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس ساری کش مکش سے الگ ہو کر کچھ ادیبوں نے
تخیل کی دنیا آباد کی۔ یہ رومانوی مکتبۂ فکر بھی اپنی حیثیت سے ایک مستقل
رجحان بن گیا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک ان دونوں اثرات
کے رد عمل میں واضح طور پر سامنے آئی۔ ایک طرف انہوں نے رومانی
پسندوں کی تخیل [illegible] کے ادب کو [illegible] سے [illegible] بچایا اور
دوسری طرف دقیانوسیت سے بغاوت کی۔ اس تحریک میں انتہا پسند

بھی تھے اور اعتدال پسند بھی، لیکن زندگی کو انہوں نے کسی ماورائی
یا وجدانی تصور سے دیکھنے کے بجائے ٹھوس مادی قدروں سے دیکھا۔
زندگی کے اقتصادی پہلو کی اہمیت پر زور دیا۔ ادب کو زندگی کا عکس
قرار دیا۔ ترقی پسندوں نے اپنی انتہا پسندیوں کے باوجود اردو ادب کو
صحت مند اور توانا رجحانات سے متعارف کرایا۔

ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ ارباب ذوق کی ایک تحریک بھی
چلی شروع میں یہ لوگ بھی ترقی پسندوں کے سیل بے پناہ کا ایک دھارا
بنے رہے۔ پھر کچھ مدت بعد ان لوگوں نے اپنی ایک انفرادیت حیثیت
بنالی۔ ترقی پسندوں کے ان لوگوں پر ابہامیت اور اشاریت
کے الزام لگائے۔

ترقی پسندوں نے اردو ادب میں سب سے بڑا اضافہ یہ کیا کہ
ادب کو زندگی کے سماجی پس منظر میں دیکھا۔ ارباب ذوق کی تحریک نے
انسان کے داخلی جذبات کے اظہار و ابلاغ کو اپنایا۔ اس طرح اسلوب اور
تکنیک میں تنوعات پیدا کئے اگرچہ یہ تمام محرکات ترقی پسند تحریک کے
قافلے ہی سے آئے۔ ترقی پسند تحریک کا یہ زمانہ ہمارے افسانوی ادب
کا سنہری دور تھا۔ افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہر موضوع کو افسانے کے
کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی۔


فیض اور راشد کی شاعری ان دو مکتبۂ ہائے فکر کی بڑی
خوبی سے نمائندگی کرتی ہے۔

رفیق خاور صاحب نے اپنے مقالے میں تقسیم سے قبل اور بعد
کے ادبی میلانات اور رجحانات کا کوئی تعین نہیں کیا ہے جو بہت
ضروری ہے دو ملک اور دو قومیں عالم وجود میں آگئیں، ادب کے
دو دھارے ہو گئے۔ تقسیم سے قبل ہمارے ادب پر افسانے کی صنف
چھائی ہوئی تھی۔ بڑے عمدہ اور دل کش افسانے لکھے گئے جو ترقی اور
سماجی قدروں کے امتزاج کے نمونے تھے۔ آج بھی ہمارے افسانہ نگار

پسندی اور ترقی پسند تحریک کی نگاہوں سے جاکر دیکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک فکری وحدت بھی تھی (جس کے فقدان کا ذکر رفیق اور صاحب نے کیا ہے) وہ کسی طرح غلامی اور جاگیردارانہ سماج کے خلاف یا پاسنگ جدوجہد کر رہے تھے۔ زندگی کو اقتصادی اور سماجی پس منظر میں پیش کر رہے تھے اور ہندوپاک کے دیہاتوں کی زندگی کو سامنے لا رہے تھے۔ جو ملک کی عام خوش حالی کا موجب تھے لیکن جن کی زندگیاں غربت و مجبوری کی لامتناہی داستانیں تھیں۔ یہ ہمارے افسانہ نگاروں کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جسے کوئی بھی باشعور آدمی نہیں بھول سکتا لیکن قادر صاحب نے یک قلم ان کو موقوف کر دیا۔

تقسیم کے بعد یہ برصغیر جس کشت و خون اور فرقہ وارانہ نفرت کے سمندر سے گزرا وہ عوام کے لئے بالکل غیر متوقع تھا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک سال کی مدت میں لاکھوں انسانوں کا قتل عام ہوگا اور لاکھوں ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت کریں گے۔ ان حالات میں طالع آزماؤں کی بن آئی۔ اردو زبان کو بھارت سے دیس بدر کیا گیا جہاں کے چند صوبوں میں وہ صدیوں سے مادری زبان تھی۔ یہاں بھی اسے کوئی مقام نہ حاصل ہو سکا۔ سابقہ حکومتوں نے اردو زبان سے سوتیلی ماں والا سلوک روا رکھا۔ دوسری طرف مقامی زبانوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور اردو بولنے والے بھی تعصب کا شکار ہو گئے اس طرح دونوں طبقوں میں اعتماد مفقود ہو گیا۔ خدا خدا کر کے وہ دور گزرا۔ اس دور میں ادب کی دو اصناف نظم اور تنقید نے بڑی ترقی کی اور نا دلٹ کی آوازیں بھی گاہے گاہے آنے لگیں۔

اسی زمانے میں نئی نسل اور پرانی نسل کی چپقلش کا بھی آغاز ہوا ان دونوں نسلوں کے ادیبوں پر کوئی لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ تقسیم سے قبل ترقی پسندوں اور ارباب ذوق والوں کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ یہ اختلاف دو طرح کے محرکات سے پیدا ہوا ہے، پہلا محرک نظریاتی اختلاف ہے اور دوسرا پیمانے اور جبل کی اجارہ داری اور گروہ بندی ہے پرانی نسل کے ادیبوں میں وہ ترقی پسند شامل ہیں جو اپنے زمانے میں ادب کے بڑے بڑے ستونوں کو ہلا چکے ہیں اور وہ ادیب بھی ہیں جو اقربا نوازی، دوست داری، وضع داری اور قدامت کی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

نئی نسل کے ادیبوں میں ایسی قدریں ضرور نظر آتی ہیں جن کی نشاندہی بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ بات قبل از وقت ہی ہے پہلی چیز تو قومیت کا جذبہ ہے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اردو زبان اب ہماری قومی زبان ہے یہ ایک آریائی زبان ہے۔ آریاؤں کی تہذیبوں کے بڑے بڑے مراکز بالائی اور زیریں سندھ کی وادی تھے جو اب پاکستان کا ایک حصہ ہے اس سے اردو زبان کو وسعت دینے اور نو آریائی کلچر کی بنیاد ڈالنے کے لئے ضروری ہے۔ تمام علاقوں کے لوک کلچر کو قریب لایا جائے اردو زبان میں پشتو، سندھی، پنجابی اور بلوچی وغیرہ کے جو الفاظ شامل ہو چکے ہیں یا ان میں مشترک ہیں ان کی کثرت استعمال پر زور دیا جائے تمام علاقائی زبانوں کا علمی و ادبی سرمایہ اردو میں منتقل کیا جائے اور اردو کے کلاسیکی ادب کا ان زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔

جس طرح پہلی جنگ عظیم کے بعد اشتراکی نظریات نے تمام اہل علم طبقہ کو چونکا دیا، اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد ناآسودہ اور مایوس اہل علم کے لئے فلسفہ وجودیت نے ایک بڑی تسکین مہیا کر دی۔ وجودیت ہمارے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہے میر کی شاعری کی اس دور میں مقبولیت اس بات کا بین ثبوت ہے میر کی شاعری کو جن نئے فلسفوں کے پس منظر میں جانچا جا رہا ہے ان میں وجودیت کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

اس ساری بحث سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ادیبوں نے اپنی بساط کے مطابق ادب کے سنوارنے میں خون جگر کی رنگینی سے پورا

پیغام یا کلین ادب کی ترقی و ترویج کے لئے کچھ ایسے مسائل بھی سامنے آتے ہیں جن کو صرف ادیب اکیلے حل نہیں کر سکتے۔ رفیق صاحب کے اپنے مقالے کے سلسلے میں ادب کی تشکیل نو کے لئے جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ بغیر ارباب بست و کشاد کی مدد کے عملی جامہ نہیں پہنا سکتیں۔

اس چیز کے لئے ضروری ہے کہ اردو کو فوراً دفتری اور تعلیمی زبان بنایا جائے، جدید پریس لگائے جائیں۔ بہتر اور آسان قسم کا ٹائپ موزوں کیا جائے۔ ادیبوں کو معقول معاوضہ دلوایا جائے۔ تمام نئے اور قدیم فنون و علوم کی کتابیں اردو میں منتقل کی جائیں، تعلیم عام کی جائے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں اور کتابوں کی بکری میں اضافہ ہو۔ ورنہ ہمارے ہاں تو یہ عالم ہے تنقید اور سنجیدہ علوم کی جتنی بھی کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کا پہلا ایڈیشن ہی کئی سالوں میں جاکر بکتا ہے اب ناشر کو دوبارہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا ایڈیشن نکال کر کئی سالوں کے لئے اپنے سرمائے کو سڑنے دے۔ ایسی صورت میں مغربی ادبی مفکروں کو اردو میں اپنا کر بھی پیش کیا جائے تو ان سے صرف معدودے چند لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اس بے قدری اور تنگ دستی کی وجہ سے ادیبوں کو حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ ادب کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ ان خارجی رکاوٹوں اور ناساعد حالات کی وجہ سے ہمارے ادب میں ایک تعطل یا ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا ہے جسے چند پیش رو نقادوں نے جمود کا نام دے کر نئے ادیبوں پر الزام لگایا کہ ان میں خلوص اور تخلیقی دیانت داری مفقود ہے۔

---

بقیہ

## حضرت سید یوسف راجو قتال

سلسلہ ص

گھر منتقل ہوا میر کو بیاہی لکھکر ... دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور

کتاب کے آغاز اور اختتام پر ایک ایک مہر ہے پہلی مہر میں لفظ محمد اور الحسینی اور سنہ ۲۷ پڑھا جاتا ہے اور دوسری مہر سے احمد اور حسینی پڑھا جاتا ہے اور سنہ ۱۱۲۷ھ ظاہر ہوتا ہے۔

رسم الخط میں گ اور ڈ کے لئے نیچے اور اوپر چار نقطے (ﭬ) دیئے گئے ہیں۔ بہرحال اس نظم کے متعلق جو معلومات ہو سکے وہ درج کر دیئے گئے ہیں، مزید غور و خوض ارباب فن کر سکتے ہیں۔

آخر میں یہ بھی صراحت کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ نظم محبی مولوی قدرت رحیم صاحب نے سالار جنگ کے فارسی اور عربی کیٹلاگ کی ریسرچ کے سلسلے میں دستیاب ہونے سے مجھے نشان دہی کی ہیں، اس کا شکر گزار ہوں۔

---

بقیہ

## سنہ ۱۸۸۷ء کی دو ڈرامہ کمپنیاں

بہ سلسلہ صفحہ ۱۴

اور فصیح البیانی سے لوگوں پر سکتہ کی حالت طاری ہو گئی۔ دو چار ایکٹر بہت ہی اعلیٰ درجے کے ایکٹ کرنے اور ناچنے گانے والے ہیں خصوصاً گلفام اور سبز پری تو اس کمپنی کی ناک ہیں جن کے گانے سے سمجھدار آدمیوں کے دل پر چھری چل جاتی ہے۔

افسوس کہ کمپنی کچھ عرصے تک یہاں نہ ٹھہری اور کمپنی کے قابل قدر تماشوں سے اس کے مشتاقوں نے اپنے ارمان نہ نکالے اب کمپنی ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی طرف روانہ ہو گئی ہے، جہاں کچھ دنوں رہ کر ملتان میں اور پھر بہاولپور کی طرف روانہ ہو گی۔ ہمیں امید ہے کہ اہل بصیرت اور سمجھدار آدمی اس کی قدر کریں گے۔

---

توبہ کے بعد بھی خالی خالی<br>
کوئی ساغر نہیں دیکھا جاتا<br>
(داغ)
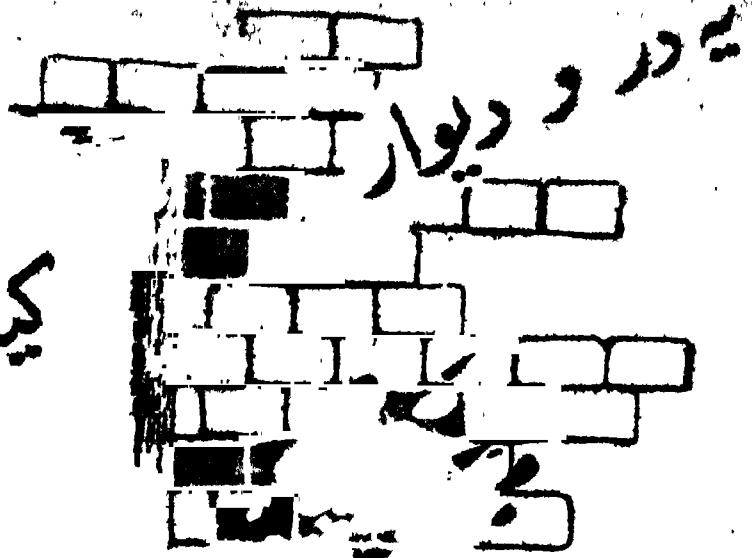
ہمارے گھروں، محلوں اور شہر کے در و دیوار ہماری ہنرمندی کے
علاوہ ہماری عادات اور تہذیب کا بھی نمونہ ہوتے ہیں۔
اب ذرا ان در و دیوار کو دیکھئے جو آپ کے سامنے ہیں۔ یہ زبانِ حال
سے ہماری بے توجہی اور بدسلیقگی کے خلاف فریاد کر رہے ہیں۔ ان کی مرمت
پر ذرا توجہ دی جاتی تو یہ اتنے خستہ حال نہ ہوتے اور ان کو تہذیب سے برتا
جاتا تو ان پر یہ بدنما داغ دھبے نہ ہوتے۔
چھوٹی موٹی مرمت پر زیادہ صرف نہیں ہوتا لیکن ذرا سی غفلت
بہت سے نقصان کا باعث ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صفائی تہذیب اور
شائستگی بہت آسان باتیں ہیں جو صرف ذرا سی توجہ چاہتی ہیں۔

**غفلت سے**
**نقصان نہ اٹھائیے**

**ذاتی اور قومی املاک**
**کو صاف اور سلامت رکھئے**

جاری کردہ ادارۂ [illegible]

UNITED – O.A.P.P

خطبات عبدالحق۔

باباۓ اردو کی صدارتی تقریروں اور لکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے یہ کتاب انجمن نے دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی تھی مگر وہ ایک مدت سے ختم ہو کر کمیاب ہو چکی ہے، اور اس کے نسخے بمشکل دستیاب ہوتے ہیں، چنانچہ ملک میں اس کی بہت مانگ تھی اس بنا پر یہ نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مطبوعہ خطبات کے علاوہ بعد کے خطبات اور بعض تقریریں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے۔ ۳۵۵+۱۲ صفحات، لکھائی چھپائی خوش نما کاغذ اعلیٰ قسم کا لگایا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ساڑھے چھ روپے۔

سب رس۔

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ء اس کا سنہ تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جست و جو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں باباۓ اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

تلخیص الاردو۔

انجمن ترقی اردو کے رسالہ "اردو" کے سی سالہ پرچوں سے بہترین مضامین کا بہترین انتخاب ہے جسے انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی کی یادگار میں مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے اور سب کے سب کارآمد اور مستند معلومات سے پر ہیں۔ کتاب کی جان دو مضامین ہیں: (۱) روسی نطشے اور اقبال از ڈاکٹر عبدالحکیم (۲) نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

اردو اکیڈمی سندھ - مولوی مسافر خانہ - بندر روڈ کراچی

## مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

**روایت کی اہمیت**

از ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ یہ کتاب اردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے ۔ اس میں روایت کی اہمیت ، اردو شاعری میں گل و بلبل کے اشارے ، دلی کا دبستانِ شاعری ۔ اردو شاعری میں حب الوطنی کی روایت اور اردو تنقید میں روایت اور تجربے کے ایسے پر مغز اور خیال افروز مقالات شامل ہیں جن سے اردو ادب کے تاریخی مد و جزر کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے مختصر الفاظ میں یہ تحقیقاتی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے قیمت سات روپے آٹھ آنے ۔

**اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔**

موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام نے جو قابل قدر حصہ لیا اور اسے اس قابل بنایا کہ آگے چل کر وہ ایک مہذب زبان کی حیثیت حاصل کرسکے اس موضوع پر ایک معلومات افزا مقالہ ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خاص انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے ۔ تیسرا ایڈیشن ۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ۔

**کلیات ولی ۔**

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی گجراتی کا مکمل دیوان جو کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے مرتب کیا ہے ۔ مع مقدمہ و فرہنگ الفاظ ۔ تیسرا ایڈیشن قیمت پانچ روپے ۔

ملنے کا پتہ

**اردو اکیڈیمی سندھ ۔ مولوی مسافر [illegible]**

[illegible] الوحید منیجر [illegible] پریس نے چھاپ کر دفتر انجمن ترقی اردو [illegible] سے شائع کیا ۔ [illegible] قیمت [illegible]
مدیر : مشفق خواجہ

قومی زبان

# سفینۂ غزل

—*—*—

## نظیر محسن

فضائے لالہ و گل میں وہ تازگی نہ رہی
وہ کیا گئے کہ بہاروں میں دل کشی نہ رہی

قدم قدم پہ ہیں چھائے ہوئے اندھیرے سے
لہو کے دیپ جلاؤ کہ روشنی نہ رہی

مزاج عشق نے آداب حسن اپنائے
دیار عشق میں وہ رسم بندگی نہ رہی

مرے خلوص وفا سے عبث شکایت ہے
نگاہ ناز میں بھی شان دل بری نہ رہی

چمک اٹھا ہے تیری یاد میں حریم خیال
شب فراق فضاؤں میں تیرگی نہ رہی

تری نگاہ کرم زندگی سنوار گئی
جہان دل میں وہ پہلی سی برہمی نہ رہی

چلو کہ حلقہ دارو رسن کی بات کریں
فسانۂ گل و بلبل میں دل کشی نہ رہی

## منظر ایوبی

نہ ہو دوام تو لطف بہار کچھ بھی نہیں
گل و سمن، روش و شاخسار کچھ بھی نہیں

نہ مسکرا مرے حال تباہ پر اے دوست
خزاں نہ ہو تو جمال بہار کچھ بھی نہیں

تمہیں نے میری نظر کو بدل دیا ورنہ
حقیقتاً تو مجھے نا گوار کچھ بھی نہیں

جمال دوست کی نیرنگیوں سے واقف ہوں
مری نگاہ میں فصل بہار کچھ بھی نہیں

کسی کی جیب میں کانٹے کسی کے ہاتھ میں پھول
خطا معاف، یہ نظم بہار کچھ بھی نہیں

فریب موت کی قیمت تو میں سمجھتا ہوں
کہ زندگی کا مجھے اعتبار کچھ بھی نہیں

وہ بد نصیب کوئی اور ہوگا اے منظر
جہانِ عشق میں جس کا وقار کچھ بھی نہیں

انجمن ترقی اردو پاکستان کا

پندرہ روزہ


# قومی زبان


نگران
بابائے اردو

جلد ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷
شمارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳

یکم اگست سنہ ۱۹۶۰ء


## اس شمارے میں



# اردو

## غیر ممالک میں

اس وقت دنیا کی تقریباً تمام اہم یونی ورسٹیوں میں اردو کی درس و تدریس کا کام جاری ہے، اور بعض مقامات پر تو یہ انتظام ایسا معقول ہے کہ اس کے مقابلے پر ہماری یونی ورسٹیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے (واضح رہے کہ پاکستان کی کسی یونی ورسٹی میں اردو کا علاحدہ شعبہ نہیں ہے) اس وقت غیر ممالک میں روس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہاں اردو کا کام سب سے زیادہ ہو رہا ہے۔ یہ زبان وہاں کی کئی یونی ورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ ہر سال بیسیوں روسی ادبی شاہکار اردو میں منتقل ہوتے ہیں اور روس کے مطبعوں میں چھپتے ہیں۔ ان کی چھپائی ایسی نفیس اور اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں کی چھپی ہوئی کتابیں ان کے سامنے بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔ تہران (ایران) یونی ورسٹی میں ہر سال پچاس سے زیادہ طالب علم اردو کا امتحان پاس کرتے ہیں۔ ٹوکیو (جاپان) یونی ورسٹی میں گذشتہ بیس سال سے اردو کی تعلیم جاری ہے۔ انقرہ میں جب تک ڈاکٹر داؤد رہبر رہے اردو کی درس و تدریس کا کام جاری رہا اور اب وہ امریکہ گئے ہیں، تو وہاں بھی انہوں نے یہ سلسلہ جاری کیا ہے، کولمبیا یونی ورسٹی میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہے (مشہور نقاد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کولمبیا یونی ورسٹی میں پاکستانی ثقافت اور اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ایک سال گزار کر حال

ہی میں واپس آئے ہیں)۔ اٹلی میں پروفیسر اقبال شیدائی، اور ایساندرو بوسانی کی وجہ سے یہ کام بحسن وخوبی جاری ہے، اور لندن یونیورسٹی میں تو عزیز احمد اور رالف رسل جیسے بالغ نظر اہل علم کی بدولت اردو کافی مقبول ہو رہی ہے ——— الغرض اردو اب محدود فضاؤں سے نکل کر بین قومی سطح پر نمایاں حیثیت حاصل کر رہی ہے لیکن اردو دوستوں کو اردو کی اس مقبولیت پر قانع نہیں ہو جانا چاہیئے، اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ غیر ممالک میں اردو کی کتابیں بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں بعض ادارے اپنے ذرائع سے تھوڑی بہت کتابیں پاکستان یا ہندوستان سے منگوا لیتے ہیں، مگر ان کے ذرائع ایسے بھی وسیع نہیں ہوتے کہ وہ اردو زبان کی تمام ضروری اور اہم کتب فراہم کر سکیں۔ انجمن ترقی اردو کو غیر ممالک سے اکثر اردو کی کتابوں کے لئے فرمائشیں آتی رہتی ہیں، انجمن حتی الامکان ان فرمائشوں کو پورا کرتی ہے، انجمن نے کئی غیر ملکی اداروں کو نہ صرف اپنی مطبوعات بلکہ دیگر اداروں کی مطبوعات بھی تحفتاً ارسال کی ہیں ظاہر ہے کہ انجمن کی طرف سے مستقل طور پر یہ انتظام جاری رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیوں کہ انجمن کے وسائل بہت محدود ہیں اور اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ وہ مستقل طور پر غیر ملکی تعلیمی اداروں کو اردو کتابیں فراہم کر سکے، اصل بات تو یہ ہے کہ یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے، اور اگر وہ چاہے تو اپنے سفارت خانوں کی معرفت متذکرہ اداروں کی کتابیں مہیا کر سکتی ہے۔ اردو ہماری قومی اور سرکاری زبان ہے۔ غیر ممالک میں اس کی ترویج، پاکستان کا نام روشن کرنے میں بڑی مدد دے سکتی ہے اور ہم اس سے وہی کام لے سکتے ہیں جو قابل سے قابل سفیروں سے لیا جا سکتا ہے ہمیں امید ہے کہ ہماری حکومت اس طرف توجہ کرے گی

اس موقع پر ہمیں اپنے اشاعتی اداروں سے بھی یہ کہنا ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کریں، جہاں وہ اردو کے نام پر بے انتہا دولت کما رہے ہیں، وہاں اس کے لئے تھوڑا سا ایثار بھی کریں، ہمیں یقین ہے کہ ان کا یہ ایثار ایک بہترین قومی خدمت ہوگی۔ ہمارے اشاعتی اداروں کو چاہیئے کہ وہ حتی الامکان غیر ممالک کے تعلیمی اداروں کو اپنی کتابیں اور رسالے تحفتاً پیش کریں (مستقل طور پر نہ سہی ایک آدھ بار ہی سہی) ——— اس موقع پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جس کا تذکرہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔ پچھلے سال ہم نے اپنے اخبار میں ایک اپیل شائع کی تھی، کہ اردو کے ناشرین اپنی کتابیں اور رسالے تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو بھجوائیں، ہمارا پرچہ ہند و پاکستان کے تمام اشاعتی اداروں، لائبریریوں، اہل علم اور علمی اداروں کے پاس جاتا ہے، یہ اپیل یقیناً ہزاروں افراد کی نظر سے گزری ہوگی، خاص خاص اشاعتی اداروں کو تو ہم نے خود خط لکھ کر متوجہ کیا تھا ——— اس تگ و دو کا نتیجہ کیا نکلا؟ اردو دوستوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس اپیل کے جواب میں تہران یونیورسٹی میں صرف ایک رسالہ پہنچا اور وہ بھی ایک دیہات سدھار جماعت کا ترجمان تھا۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اردو کے سہارے زندگی بسر کرنے والے اردو کے لئے ذرا سا بھی ایثار نہیں کر سکتے۔ ہم یہاں چند پتے درج کر رہے ہیں، اگر اردو کے بہی خواہ مناسب سمجھیں تو وہ ان پتوں پر اردو کتابیں روانہ کریں۔

(۱) Prof. Kuroyanagi,
302, SHIMORENJAKU MITAKA,
TOKYO (JAPAN)

(۲) Dr. Dawood Rahbar,

(باقی ص ۲۸ پر)

## اردو یونیورسٹی

# وقت کی اہم ضرورت

ہفت روزہ "رضاکار" کراچی

پاکستان کی گذشتہ تیرہ سالہ قومی زندگی میں جب کبھی تعلیمی اصلاحات کا مسئلہ زیر غور آیا ہے، ذی شعور اور اہل فکر حضرات کی طرف سے ارباب بست وکشاد کی خدمت میں ہمیشہ یہ گذارش کی جاتی رہی ہے، نظام تعلیم میں کوئی نمایاں اور مفید تبدیلی کرنے اور تعلیمی معیار کو حسب دل خواہ بلند کرنے کے لئے سب سے مسلّم ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی بنیادی خامی کو دور کر کے انگریزی کے بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ کیوں کہ تجربات اور مشاہدات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے ہم نہ علمی ترقی کی رفتار کو تیز تر کر سکے اور نہ معیار تعلیم میں کوئی نمایاں فرق پیدا کر سکے۔ بلکہ اس غیر دانش مندانہ طریقے سے کچھ ایسے مضر اثرات مرتب ہوئے جنھوں نے قومی زندگی کی رفتار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ماہرین تعلیم اور نفسیات کے جاننے والے اس امر پر متفق ہیں کہ علمی مسائل اور ٹکنیکی مسائل کو جس حسن وخوبی سے قومی زبان میں سمجھایا جا سکتا ہے، غیر ملکی زبان میں وہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ کسی بھی مضمون کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس زبان پر عبور حاصل ہو جس زبان میں تعلیم دی جا رہی ہے، تب کہیں جا کر نفس مضمون سمجھ میں آسکتا ہے۔ غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ پہلے طلباء کو اس زبان میں مہارت حاصل ہو، جو اپنی قومی زبان پر عبور حاصل کرنے کے مقابلے میں انتہائی مشکل کام ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے، اور نہ مضمون پر۔ ظاہر ہے کہ جب طلبا نفس مضمون ہی کو نہ سمجھ سکیں گے تو ان سے یہ امید کرنا کہ وہ مضمون کی باریکیوں پر غور وفکر کر کے تحقیقی اور تخلیقی کام انجام دیں گے کسی طرح درست و جائز نہیں۔ اپنی قومی زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر وہ اپنی قومی روایات تہذیب وثقافت اور مذہبی وروحانی تجربات سے بیگانہ رہتے ہیں یا انگریزی تہذیب وثقافت کے مقابلے میں انہیں ہیچ اور ناقابل اعتنا گردانتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کا اثر انہیں نقالی اور اندھی تقلید کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سابقہ قومی سرمایہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، اور مغرب کی پورے طور پر نقل بھی نہیں کر پاتے یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ ایک صدی کی تعلیم کے بعد بھی ہم اس قابل نہیں ہو سکے کہ انگریزی زبان کے ذریعے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو علوم وفنون حاصل کرتے ہیں اسے اپنی ملکی زبان میں اسی ڈھنگ سے ادا کر سکیں کہ عوام اس سے مستفید ہو سکیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ عوام ابھی تک علم کی روشنی سے بیگانہ ہیں۔ ہم اپنی قومی تہذیب

اور ثقافت سے روز بروز بیگانہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر ہم نیک نیتی سے اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کر سکیں، معیار تعلیم کو بلند کر سکیں اور تعلیم کی روشنی سے عوام کے سینوں کو منور کر دیں تو ہمیں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ کرنے میں ہچکچانا نہیں چاہیئے۔ اب رہا یہ سوال کہ اردو میں اعلیٰ مدارج پر ذریعہ تعلیم بننے کی صلاحیت موجود ہے کہ نہیں؟ تو اس سلسلے میں ہمارے سامنے اردو کالج اور عثمانیہ یونی ورسٹی کی واضح مثالیں موجود ہیں جہاں علوم و فنون کے ہر شعبہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا تجربہ شاندار کامیابی کے ساتھ کیا گیا۔ اب ایسی واضح اور روشن مثالوں کے باوجود بھی اگر اردو کی صلاحیتوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ہمارا احساس کمتری ہوگا اور فکر کی اس غلط نہج کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہوگا۔ اس لئے جب یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ علمی ترقی اور تعلیمی اصلاح کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بھی پوری صلاحیتیں موجود ہیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قومی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے علمی اور تعمیری جدوجہد کی جانی چاہیئے، اس لئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس شدید قومی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اردو یونی ورسٹی کا منصوبہ بنایا ہے۔ اردو یونیورسٹی کا قیام ہماری ایک ایسی قومی ضرورت ہے جس کے لئے کسی وضاحت اور تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس یونی ورسٹی کے قیام کا مقصد محض علمی ساتی درسگاہ قائم کرنا ہی نہیں بلکہ خود بابائے اردو کے الفاظ میں "مجوزہ اردو یونی ورسٹی کے ذریعے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے گا، جو طالب علموں کے ذہن کی ارتقا کے لئے سازگار ہوگا ان میں صحیح قومیت اور وطنیت کا شعور پیدا ہوگا۔ ان میں اپنی تہذیب و روایات سے محبت کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے شاندار ماضی کی روشنی میں حال کو سنوارنے کے قابل ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اتنا نیک اور بلند ہے کہ باشعور اور ملک دوست حضرات کی اس سے دلچسپی قطعی لازمی اور ضروری ہے۔

(۱۵ جولائی ۶۰ء)

بابائے اردو

# اردو یونی ورسٹی —

# ایک علمی و تہذیبی مرکز

کراچی کے طالب علموں کے اخبار "رضاکار" کا اردو یونی ورسٹی نمبر ۱۵ جولائی ۱۹۶۰ء کو شائع ہوا۔ اس نمبر میں بابائے اردو کا یہ پیغام شامل ہے:

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے ہفت روزہ اخبار "رضاکار" کراچی نے "اردو یونی ورسٹی نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مبارک فیصلہ ہے اور مجھے توقع ہے کہ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہتا ہوں۔ اردو یونی ورسٹی کے قیام سے میرا مقصد تعلیم کی ان فرسودہ روایات کو زندہ کرنا نہیں جو انگریزی عہد کا طرۂ امتیاز تھیں اور جو آج بھی ہماری یونی ورسٹیوں میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہیں۔ میری مجوزہ اردو یونی ورسٹی نہ صرف علم و تحقیق اور ادب و لسانیات کا گہوارہ ہوگی بلکہ اس کے ذریعے ہم ایک ایسا ماحول پیدا کریں گے جو طالب علموں کے ذہنی ارتقا کیلئے سازگار ہوگا اور جس کی بدولت ان میں صحیح قومیت اور وطنیت کا شعور پیدا ہوگا۔ ان میں اپنی تہذیب اور روایات سے محبت کا جذبہ پیدا ہوگا، اور وہ اپنے شاندار ماضی کی روشنی میں حال کو سنوارنے کے قابل ہوں گے۔ غرض کہ یہ یونی ورسٹی ایک ایسا علمی و تہذیبی مرکز ہوگی، جو نونہالان قوم کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو ابھارے گی اور زندگی کے مسائل میں ان کے احساسات، تصوّرات اور خیالات کو قومی روایات کے سانچے میں ڈھالے گی!

فیض احمد فیض

# کلچر اور ادب

جب ہم کسی شخص کے بارے میں یہ طے کرنا چاہیں کہ وہ مہذب یا کلچر یافتہ ہے کہ نہیں ہے، تو ہمیں عام طور سے اس کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ دینے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ نہ ہم اپنے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بھئی پہلے تو یہ طے کر لو کہ کلچر ہے کیا چیز۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کسی کے ذہن میں شائستگی اور خوش اخلاقی کا کوئی نہ کوئی معیار پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اس معیار کی رعایت سے ہم کسی کے طور اطوار پرکھ سکتے ہیں لیکن جب یہی سوال کسی قوم یا معاشرے کے بارے میں کیا جائے تو مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ قوموں کی تہذیب یا کلچر بہت سے اجزا سے مرکب ہوتا ہے اور جب ہم قومی کلچر یا تہذیب کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس شیرازے کے سب اوراق اور ان اوراق کے سب رشتے بہ یک وقت ذہن میں رکھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ بعض اوقات ہم کلچر سے محض روزمرہ کے رہن سہن اور طریق زندگی مراد لیتے ہیں بعض اوقات عقائد اور دین مذہب اور بعض اوقات محض فن و ادب، لیکن بات بہر صورت مسلم ہے کہ قومی تہذیب کے تعین میں ان اجزا کا باہمی رشتہ ان کی اہمیت یا غیر اہمیت ان کی تقدیم یا تاخیر کچھ بھی ہو انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور قومی تہذیب کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے ان کی مجموعی صورت ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس مجموعے کے بنیادی اجزا کیا ہیں؟ اول وہ سب عقیدے، قدریں، افکار، تجربے امنگیں (values) یا آدرش جنہیں کوئی انسانی گروہ یا برادری عزیز رکھتی ہے۔ دوم وہ آداب، عادات، رسوم اور طور اطوار جو اس گروہ میں رائج اور مقبول ہوتے ہیں۔ سوم وہ فنون مثلاً ادب، موسیقی مصوری، عمارت گری اور دستکاریاں جن میں یہی باطنی تجربے، قدریں، عقائد، افکار اور ظاہری طور اطوار بہت ہی مرصع اور ترشی ہوئی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔ جیسے میں نے ابھی عرض کیا تہذیب یا کلچر کے یہ گوناگوں مظاہر آپس میں یوں پیوست ہوتے ہیں کہ کوئی جز اپنے کل سے الگ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ معاشرت کے نظام سے اچھائی اور برائی اور سلیقہ اور بدسلیقگی کا معیار وضع ہوتا ہے۔ ان قدروں کے قبول یا عدم قبول سے نظام کی تعمیر یا تخریب ہوتی ہے اور ادب و فن کی صورت میں ان کی ترویج و تشہیر۔ تو یوں سمجھئے کہ کسی مخصوص گروہ یا برادری کے جملہ مادی، روحانی اور فنی سرمائے اور کمالات کو اس کا کلچر یا تہذیب کہتے ہیں اب مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اس سرمائے میں ادب کا مقام اور اہمیت کیا ہے۔

یہ تو ایک بات ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ جس طرح کوئی صاحب جنہیں مہذب کہتے ہیں اپنی تہذیب پیدائش کے وقت ساتھ نہیں لائے تھے۔ اسی طرح قومی تہذیبیں بھی قوموں کے ساتھ کسی معین دن پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ تمام ناشائستگی سے شائستگی، [illegible] سے ترتیب، پسماندگی

سے ترقی، بدسلیقگی سے سلیقہ، کلچر، تہذیب، ثقافت اور ان کے ہم معنی
الفاظ اسی عمل پر دلالت کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی بھی عمل ازلی
اور پیدائشی نہیں۔ ارادی اور اکتسابی ہوتا ہے۔ چنانچہ کلچر صرف پیدا ہوتا
ہی نہیں سنوارا اور بگاڑا بھی جاتا ہے اور اس کے بنانے اور بگاڑنے میں
بھی وہی عوامل شامل ہوتے ہیں جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یعنی معاشرتی
زندگی کا نظام اور طور طریقے حسن و جمال کی جان پہچان اور سوچ سمجھ کے
معیار، ادب و فن کی صورتیں اور ان کے اسالیب۔ اس وقت ہمیں یہ بھی
دیکھنا ہے کہ اس عمل میں ادب کی کیا اہمیت اور کیا منصب ہے، تو یہ دو
باتیں ہوئیں۔ اول کسی کلچر کی واقعی صورت میں ادب کا مقام۔ دوم
کسی کلچر کے ارتقائی عمل میں ادب کی کارگزاری۔

اب پہلی بات لیجئے لیکن بات سے پہلے ایک اور بھی بات
ہے ہمارے ہاں ابھی تک یہ روش عام ہے کہ اگر شہر کے کسی عجائب گھر میں
گندھارا کا کوئی بت رکھا ہو یا کسی نمائش میں چغتائی کی کوئی تصویر ٹنگی ہو
تو وہ کلچر ہے لیکن دیہات کے کسی گھر میں سجے ہوئے برتنوں چنگیروں،
پھلکاریوں اور پیڑھوں پلنگوں کا کلچر سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح
غالب، میر اور اقبال کے شعر کو ادب کہتے ہیں لیکن مختلف بولیوں کی عوامی
کہاوتوں، گیتوں، قصوں اور کہانیوں کو ادب نہیں کہتے یہ بات صحیح
نہیں، قومی کلچر کسی شہر، گلی، محلے یا کسی چھوٹے سے طبقے یا گھرانے کی پسند یا ناپسند
کو نہیں کہتے، سارے معاشرے کے اجتماعی ظاہر و باطن کو کہتے ہیں۔ البتہ یہ
ضرور ہے کہ ماحول، تربیت اور دوسری آسائشوں اور عدم آسائش
کے طفیل اس میں بہت سی اونچ نیچ، بہت سی ادنیٰ وار فع تراشیدہ
اور ناتراشیدہ صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے ادب کلچر کا سب سے ہمہ گیر، سب سے نمائندہ
سب سے جامع اور سب سے موثر جزو ہے۔ کلچر کے باطنی اور نظریاتی پہلو پر
نظر ڈالئے تو عمومی عقیدوں، قدروں، تحریکوں اور امنگوں کا تعین، تعریف
اور تفسیر سب سے بیشتر ادیب ہی کے نطق و قلم سے ہوتی ہے۔ یہی ان کی
پریشان اور پوشیدہ صورتوں کو ترتیب اور اظہار کی صورت بخشتا ہے لاشعور
سے شعور، احساس سے ادراک، تصور سے تصویر تک کے منازل اسی کے
مساعی سے طے ہوتے ہیں۔ کہاوتیں، ضرب الامثال، گیت، قصے، کہانیاں
اشلوک اور مناجاتیں، رزمیے اور بزمیے ان سب سے شاعر، قصہ گو
اور نثر نگار نہ صرف اپنے ہم عصر، ہم قوموں کو ذہنی اور قلبی انبساط کا سامان
بہم پہنچاتا ہے بلکہ اس وسیلے سے ان کے ضابطۂ قدر و اخلاق ان کے مسلمہ
آداب و قوانین، ان کے اصول و عقائد کی تعریف اور تشریح بھی کرتا ہے
کسی نہ کسی حد تک دوسرے فنون کے اہل کمال بھی یہی کام سرانجام دیتے ہیں
عمومی قدروں، عقیدوں اور آداب و اظہار کی جھلک مصور کے موئے قلم
موسیقار کے ساز اور رقاص کی جنبشِ اعضا میں بھی شامل ہوتی ہے۔
لیکن اظہار کے یہ سارے ذرائع ادب کے مقابلے میں مبہم اور محدود ہیں
ان کا انحصار بیشتر اشاریت اور رمزیت پر ہوتا ہے اور باطنی تصورات
کے اظہار اور تعین کے لئے انہیں وہ سہولتیں میسر نہیں جو الفاظ و زبان
کو حاصل ہیں۔

کلچر کے ظاہری اور عملی پہلو کو لیجئے تو اس کا بیان، اس کی مصوری
اور اس کے عارضی مظاہر کو دوامی صورت میں منتقل کرنا پھر بیشتر ادیب ہی
کی ذمہ داری ہے۔ یہاں بھی مصور، سنگ تراش، معمار اور دستکار،
ادیب کا شریک کار ہوتا ہے لیکن مصور کا کینوس، سنگ تراش کا مجسمہ،
معمار کی عمارت اپنے مادی حدود و قیود کو پھلانگنے پر قادر نہیں، ادیب کا
لفظ و معنیٰ ان قیود سے آزاد ہے۔ اگر اسے اپنے قلم پر قدرت ہے اگر اس
کی نظر بیدار اور اس کا مشاہدہ بصیر ہے تو وہ ایک ہی گیت یا ایک ہی ماہئے
میں بیسیوں باغ و راگ سینکڑوں پیکر اور ان گنت مناظر سجا سکتا ہے اگر
کلچر کے تیسرے یا فنی پہلو پر غور کیجئے تو ادیب کی کاوشیں اس کے اپنے مخصوص
میدان اظہار کے سوا دوسرے فنون میں بھی متفرق دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ہی

(باقی ص ۳۱ پر)

بابائے اردو

# حضرت سید احسن مارہروی مرحوم[1]

مرزا غالب نے صاحب عالم کے نام خط لکھ کر مارہرہ کو ملک سے روشناس کیا۔ اس کے بعد حضرت احسن کی بدولت اس قصبے کا نام ایسا روشن ہوا، کہ اردو زبان کے طلباء اور اردو داں طبقے میں اس کی شہرت ہو گئی "مارہروی" حضرت احسن کے نام کا جزو لاینفک ہو گیا اور اس نے "مارہرہ" کا نام روشن کیا۔ حضرت احسن نے قدیم مدارس میں تعلیم پائی اور جدید مدارس میں تعلیم دی۔ اس لئے وہ جدید اور قدیم دونوں کی روش سے آگاہ تھے۔ قدیم مدارس کی تعلیم میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ طالب علم جو کچھ پڑھتا تھا اس پر اسے پوری قدرت ہوتی تھی، کیوں کہ ان کا مقصد حصول علم تھا نہ کہ امتحان پاس کرنا۔ حضرت احسن نے فارسی اور اردو ادب کا بڑے غور سے مطالعہ کیا جو ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔

انہوں نے ولی کے دیوان کو بڑی محنت سے مرتب کیا، اور انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا۔ ان کی ایک دوسری قابل قدر تصنیف "تاریخ نثر اردو" ہے۔ اس میں انہوں نے ہر عہد کی نثر کے نمونے درج کئے ہیں۔ اس کے لئے انہیں بڑی تلاش و جستجو کرنی پڑی، اور اس غرض سے وہ میرے ہاں اورنگ آباد میں مہینہ بھر مہمان رہے اور انہوں نے قدیم نثر کے مخطوطات سے جو میرے کتب خانے میں تھے استفادہ کیا۔ حضرت احسن مرزا داغ کے ممتاز شاگردوں میں تھے انہوں نے مرزا داغ کے خطاب کی مناسبت سے "فصیح اللغات" کے نام سے ایک لغت مرتب کرنی شروع کی تھی۔ اس میں خاص طور پر مرزا داغ کے محاورات درج کئے تھے اور جن محاوروں کے لئے انہیں کوئی سند نہیں ملتی تھی وہ حضرت داغ سے فرمائش کر کے ان کے لئے اشعار لکھوا لیتے تھے۔ مرزا داغ کی وفات کی وجہ سے یہ کام نا تمام رہ گیا۔

وہ بہت اچھے شاعر اور نثار تھے، انہوں نے اردو ادب اور زبان کے متعلق بہت سے مضامین لکھے۔ اس بارے میں ان کی اکثر مجھ سے خط و کتابت رہی۔ علی گڑھ کالج میں انہوں نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا وہ اپنے طالب علموں کو بڑی محنت اور شوق سے پڑھاتے تھے اور ان کی تعلیم کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ان میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، وہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی علمی ترقی میں ہر قسم کی مدد دیتے تھے۔

وہ بڑے مہمان نواز صاحب ذوق اور سچے دوست تھے طبیعت میں بڑی نفاست تھی قدیم آداب کے بہت پابند تھے، حفظ مراتب کا خیال رکھتے اور ہر ایک سے خواہ چھوٹا یا بڑا بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔

اردو ادب میں ان کی تصانیف یادگار رہیں گی اور اردو کے طالب علموں کو ان سے ہمیشہ فیض پہنچتا رہے گا۔

مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ ان کے سعادت مند اور لائق فرزندوں نے ان کی یاد کو زندہ رکھا ہے اور ان کی برسی کی تقریب میں ان کے دوستوں اور شاگردوں اور قدر دانوں کو شریک ہونے کا موقع دیا ہے۔

---

[1] بابائے اردو کا ایک پیغام — ۳۰ جولائی [illegible] کو علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف حضرت احسن کی برسی منائی گئی — اس موقع پر یہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

# حضرت احسن مارہروی کا علمی ذوق

الحاج حضرت شاہ سید علی احسن صاحب مارہروی میرے استاد تھے اور کم و بیش سات سال تک مجھے ان سے استفادے کا موقع ملا۔ ان کی صحبت میں جو برکات میں نے حاصل کیں، ان کی تفصیل کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں، صرف زبان و ادب کے بارے میں اتنا عرض کروں گا کہ اردو زبان کی خدمت کا شوق اور اس کے مطالعہ کا چسکہ مجھے مولانا ہی کی بدولت پڑا۔ سنہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے میں پہلی مرتبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا ان دنوں تارو الے بنگلے میں مقیم تھے۔ شام کا وقت تھا، اور مولانا کے گرد و پیش ملاقاتیوں کا ایک ہجوم تھا۔ کچھ طالب علم، کچھ ملنے ملانے والے، کچھ اعزا اور اقارب سب قرینے سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا کا پاکیزہ لباس، نورانی صورت، شگفتہ چہرہ، تقدس اور محبت کے حریم میں آج تک میری نظروں کے سامنے پھر رہا ہے۔ یہ پہلی ملاقات تھی، اس دن اردو ادب کے متعلق بعض باتیں مولانا نے دریافت فرمائیں اور مجھے اپنی بے بضاعتی پر بڑا رنج ہوا۔

اس دن سے میرا معمول تھا کہ اوقات درس کے علاوہ بھی کبھی کبھی مولانا سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے مولانا کو تکلیف دیتا تھا اور مولانا خندہ پیشانی سے اپنے بزرگوں کی عزیزانہ محبت خلوص اور ایثار سے میرے بجا اور بے جا استفسارات کا جواب اور وہ بھی ہمیشہ تشفی بخش عنایت فرماتے۔ یہ سلسلہ مولانا کی آخری علالت تک قائم رہا۔ جب وہ مرض الموت میں گرفتار ہو کر وطن سے علی گڑھ تشریف لائے، پٹنہ کو روانگی سے پہلے میں حاضر ہوا اور کیا معلوم تھا یہ ہماری آخری ملاقات ہے جلد ہی پٹنہ کے ایک تار نے ان کے انتقال کی خبر سنائی، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مولانا کی وفات سے ہماری بزم میں جو جگہ خالی ہو گئی اب اس کا پُر کرنے والا مستقبل قریب میں کوئی نظر نہیں آتا۔

فروغ شمع جو ایسے رہے گا رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

مولانا کے ذوق علمی اور ان کی تحقیق و تلاش کے کارنامے ہماری ادبی محفلوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تحقیق کے معاملے میں ان کا یہ حال تھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی لفظ یا شعر پر کچھ اختلاف ہوا۔ مولانا اپنی وسیع النظری کے بھروسے [illegible] اور فیصلہ تو فوراً صادر فرما دیتے، لیکن اپنے قطعی یقین کے باوجود [illegible] ضروری کتابیں فوراً طلب کرتے، اگر کوئی کتاب اس وقت آسانی سے نہ آسکتی تو مولانا خود یونیورسٹی کے کتب خانے میں تشریف لے جاتے اور ہم لوگ بھی ہمراہ ہوتے۔ مولانا ایک سند پر اکتفا نہ کرتے بلکہ متعدد اسناد پیش کر کے اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے طے فرما دیتے۔

کتابوں سے انہیں عشق تھا اور اسی وجہ سے اپنی کتابیں دوسروں کو عاریتاً دینے میں بھی تکلف تھا۔ مجھ سے مولانا کو بڑی محبت تھی لیکن مجھے

بھی کتابیں اسی وقت ملتیں جب میرے ذمے کسی کتاب کی واپسی
باقی نہ ہو۔ قدیم اور جدید مصنفین اور مولفین کی بیشتر تصانیف بالخصوص
شعر وادب اور تاریخ زبان پر مولانا کے ذاتی کتب خانے میں موجود
تھیں اور بہت کم ایسا ہوتا کہ ہمیں کتابوں کی تلاش میں کہیں اور جانا پڑتا۔
اسی شوق میں مولانا دوسرے کتب خانوں کی سیر میں بڑی دلچسپی
لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کتب خانہ نواب صدر یار جنگ بہادر اور ایک
مرتبہ کتب خانہ خدا بخش بانکی پور (پٹنہ) کی سیر میں میں مولانا کے ہمراہ تھا۔
اور ان کتب خانوں کے نوادر دیکھ کر مولانا اتنا ہی محظوظ ہوتے تھے
جتنا کوئی سیاح کسی دور دراز ملک کے نادر الوجود عجائبات کو دیکھ کر
خوش ہو سکتا ہے۔

عام طور پر لوگ مولانا کو پرانے رنگ میں کہنے والے شاعروں
میں سرآمد سمجھتے تھے، اور ان کی عروض دانی شعر فہمی اور تنقید کو بڑی وقعت
کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن شاعری کے علاوہ ادب کے دیگر اصناف
پر بھی ان کو بڑی زبردست قدرت حاصل تھی۔ تاریخ زبان کے
مطالعے میں ان کی وسعت نظر اور عمیق مطالعہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے
اردو نثر کی تاریخوں میں ان کی مشہور کتاب نمونۂ منثورات عدیم المثال ہے
اس سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے انہوں نے
اسے تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے یہاں مواد کم اور تنقید زیادہ ہے
انشاپردازی کے زور سے بعض معمولی مطالب اور غیر اہم مباحث
کو پھیلا کر بیان کر دیا ہے جتنا اردو کے اسالیب۔ بیان یا سیر المصنفین
لیکن مولانا کے یہاں اردو نثر کے ابتدائی عہد سے عصر حاضر کے نمونے اس کثرت
سے جمع کر دیئے گئے ہیں کہ اس کتاب کو اصل ماخذ قرار دیکر بہت کچھ
مفید کام کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں سب سے پہلے اردو زبان
کی مختصر تاریخ اور نثر کی ابتدا سے بحث کی ہے، اور پھر ہر دور کی
مشہور کتابوں، رسالوں، اخباروں، سرکاری کاغذات، مراسلات کے
نمونے پیش کیے ہیں، ہر دور کے آخر میں اس دور کی خصوصیات
اس دور کے متروکات اور ایجادات کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے
اس ضمن میں بعض تصانیف کے سلسلے میں ان کے مصنفین پر مجموعی
حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ پرانے اخباروں کی تفصیل خصوصیت
کے ساتھ قابل قدر ہے۔ اکثر اخبار ایسے نظر آتے ہیں جن تک اب

مولانا احسن مارہروی

# غزل

(جو دسمبر ۱۹۰۳ء میں کہی گئی)

دل ہے واقف میرے ہر اک راز سے
کام چلتا ہے اسی دم ساز سے

مجھ کو اک پردہ نشیں کا عشق ہے
آہ بھی کرتا نہیں آواز سے

حشر کا ہم کو ذرا کھٹکا نہیں
مٹ چکے تیرے خرام ناز سے

پھر نہ ہوتا عشق میں کوئی تباہ
دیکھتا انجام گر آغاز سے

گیت گاتے ہیں تمہارے عشق کے
سوز سے مطلب نہ ہم کو ساز سے

پیاس میں ساقی کہاں کی ناپ تول
ڈال بھی دے جام میں انداز سے

آج احسن بلبل ہندوستان
کم نہیں ہیں بلبل شیراز سے

رسائی دشوار ہے۔ اگر کبھی اردو صحافت کی تاریخ لکھی گئی تو اس کے مصنف کو مولانا کی کتاب کے اس حصے سے ضرور مدد ملیگی ۔

تاریخوں کی صحت پر مصنف نے خاص طور پر زور دیا ہے سنہ عیسوی اور سنہ ہجری دونوں ایک ساتھ دیئے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والے اپنی اپنی عادت کے مطابق جس سن سے چاہیں زمانے کا تعین کرلیں ۔

کتاب کا انداز بیان محققانہ اور سلیس ہے۔ انشا پردازی کا زور دکھانے کی کوشش کہیں نہیں کی گئی ہے۔ تاہم سلاست میں عبارت میں پھیکا پن نہیں پیدا کیا ہے، اور نہ اختصار کے سامنے ضروری مطالب کو قربان کیا ہے۔

نثر میں دوسرا اہم کارنامہ کلیات ولی کا مقدمہ ہے جسے انجمن ترقی اردو نے ولی کی کلیات کے ساتھ شائع کرایا ہے، ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم بتایا جاتا ہے ۔ اسے ہم چاہے تسلیم نہ کریں لیکن یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ اردو شاعری کا عام رواج انہیں کے دور سے ہوا۔ اور اس شاعری میں جدت کا رنگ انہوں نے ہی اپنے قلم سے بھرا لیکن ابنائے وطن کی غفلت شعاری میں ان کی پیدائش، سکونت، وفات اور عام حالات زندگی عرصے تک پردۂ خفا میں رہے، اور اسی وجہ سے اردو شاعری کے اس مجدد اعظم کی تاریخی حیثیت میں بہت بڑی کمی واقع ہوگئی۔ مولانا جنہیں قدیم ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور جو ولی کے عہد کی قدیم دکھنی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، ولی کو عصر نو سے متعارف کرانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے، مولانا نے جس کد وکاوش سے ولی کے دیوان کے قلمی نسخے جمع کئے اور جس عرق ریزی اور محنت سے ان کا مطالعہ اور مقابلہ کر کے ایک مکمل اور صحیح نسخہ مرتب کیا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ جن لوگوں کو قدیم نسخوں کے پڑھنے اور مقابلہ کرنے کا خود موقع ملا ہے، وہی اس محنت کو محسوس کر سکتے ہیں بعض نسخے نامکمل تھے، بعض بے انتہا بدخط، بعض میں ضرورت سے زیادہ تحریف تھی، ایک ایک لفظ کی صحت کو پرکھ کر اسے علاحدہ کرنا بغیر وسیع مطالعے اور محنت کے ناممکن تھا۔ اس پر جو فاضلانہ مقدمہ لکھا، وہ بھی اب تک ولی پر آخری حرف ہے، بعد میں جن لوگوں نے ولی پر کام کیا ہے انہوں نے یا تو مولانا کے اس ماخذ سے فائدہ اٹھایا ہے یا پھر کہیں کہیں مولانا سے جزوی اختلاف کیا ہے لیکن من حیث المجموع اب تک اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ ایک اٹل ستون کی طرح قائم ہے ۔

نثر میں ایک اور بڑا کارنامہ ان کے استاد نواب مرزا خاں داغ کی سوانح عمری اور ان کی شاعری پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے، اس کتاب کے انداز بیان اور ترتیب میں کہیں کہیں شبلی کی جھلک نظر آجاتی ہے ۔ ویسی ہی زور دار زبان، ترتیب میں جدت اور انداز میں ایک خاص کشش موجود ہے۔ جو شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر کی خصوصیات ہیں اس کتاب کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ مولانا نے جس شخص کے سوانح حیات احاطۂ قلم بند کئے ہیں، برسوں اس کی صحبت میں رہ کر فیض اٹھایا تھا ۔ ہر واقعہ یا تو خود ان کی آنکھوں کے سامنے گذرا تھا یا انہوں نے خود استاد کی زبان سے سنا تھا، اور مکمل کتاب بھی ان ہی کی آخری نظر کے بعد منظر عام پر آئی تھی ۔ داغ کی شاعری جن کمالات کا مجموعہ ہے، اس کے بیان کا یہ محل نہیں، لیکن داغ پر جب بھی کوئی سوانح نگار یا ناقد قلم اٹھائے گا، اس کی رہبری کرنے کے لئے پہلا سنگ راہ یہیں ملے گا ۔

یہ تیسرا کارنامہ اگرچہ پہلے دونوں کارناموں کے مقابلے میں نسبتاً ابتدائی عمر کی یادگار ہے، لیکن اس میں بھی پختگی اور سنجیدگی جو مولانا کی اور تحریروں کی خصوصیت ہے موجود ہے، الفاظ کا صحیح استعمال باوجود قدیم دبستانوں کی تعلیم کے، عربی اور فارسی کے غریب

اور نامانوس لغات سے اجتناب، ضروری اختصار، غرض فصاحت
اور بلاغت کے تمام جزئیات کو ملحوظ رکھا ہے۔

داغ ہی کے متعلق مولانا نے ایک اور دل چسپ سلسلہ
داغ و احسن کے عنوان سے شروع کیا تھا۔ افسوس ہے کہ اس کام کی
ابتدا اس وقت ہوئی جب مولانا پر اضمحلال کے آثار پیدا ہونے لگے
تھے اور یہی وجہ ہوئی کہ یہ مکمل نہ ہو سکا۔ داغ و احسن کی صحبتوں میں
جو علمی رموز اور شاعرانہ نکات بحث و مباحثے میں آتے رہتے تھے ان
کی یہ ایک مکمل اور جامع تاریخ ہوتی جو شعر و ادب کے طالب علم سر
آنکھوں پر رکھتے۔

پرانے زمانے کی یادگار مولانا کا ایک اور مقدمہ محسن کاکوروی
کی نظم دل افروز "تخمیس" پر ہے۔ محسن کاکوروی کی نظم پر امیر علوی
نے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ فصیح الملک میں شائع ہوا۔ اس پر مولانا
کی تمہیدی رائے بھی شامل ہے۔ "تخمیس" اور مقدمے کو کتابی صورت میں
شائع کر دیا گیا ہے جس سے محسن کی شاعری کی خصوصیات کے علاوہ لغت
گوئی کی عام تاریخ پر بھی بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

---

بقیہ **کلیات مومن** سلسلہ ۲۵

ہے، مثلاً :-

ص ۱۷۹ ہر جائے ہے تیرہ جلوہ لیکن
دیکھا نہ کہیں نظر نہ آیا

یہ اس شعر کی خرابی ہے ؎ ہر جا ہے تیرا جلوہ لیکن
دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا

ملاحظہ فرمایا آپ نے پہلی صورت میں ایک اچھے شعر کی کیسی گت بن گئی
ص ۲۰۰ س ۴ مصرع ثانی :- کریں نہ مدخل ظل سے تمیز مدخل ظل
اس مصرع میں "مدخل ظل سے مدخل ظل" بالکل بے معنی ہو کر رہ گیا ہے
صحیح مصرع یوں ہے ؎ کریں نہ مدخل ظل سے تمیز مخرج ظل

* ص ۲۰۰ س ۹ دوسرے مصرع میں "بلید" کی جگہ "پلید" چھپ گیا ہے
" " " ۱۰ "احتمال غریب" کی جگہ "احتمال بسوط" صحیح ہے۔
مصرع ثانی یوں ہے ؎ جو اس کی رائے سے ہو مستغنی نہ کامل
اس مصرعے میں لفظ "مستغنی" کو مسخ کر کے "مستقی" بنا دیا گیا ہے۔

ص ۲۰۰ س ۱۱، دوسرا مصرعہ: کہ میرے بعد نبوت کے تھا مگر قابل
اس مصرعے میں "تو کمال" کر دیا گیا ہے۔ لفظ "قابل" کو "قاتل" بنا دیا
گیا۔ کیا داد دی جا سکتی ہے اس شان تصحیح کی۔

ص ۲۰۱ س ۱۱ دوسرا مصرعہ: مزید دہر میں ہیں صفحہ زماں ہے سجل
در اصل یہ مصرعہ اس طرح ہے:

زید دہر ہوں میں صفحہ زماں ہے سجل

ص ۲۰۱ س ۱۳ عابد سائل کے بجائے عابد شاغل چاہیے
" " ۱۹ سفینہ ہے وہ جو بہلول کو کہے حاقل
یہاں لفظ حاقل اصل میں عاقل کی خرابی ہے۔

ص ۲۰۲ س ۸، مصرعہ اول ؎

ملال سامع کا طول کلام ہے باعث

اصل میں یہ مصرعہ یوں ہے ؎

خموشش تا بکجا لاف ہائے بے معنی

غرض یہ ہیں وہ چند نمونے، جو زیر نظر ایڈیشن کے مطالعے
سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اگر انہی کو نظر میں رکھ کر آئندہ ایڈیشن
پورے اہتمام صحت کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو میں سمجھوں گا،
میری یہ محنت وصول ہو گئی۔

ڈاکٹر احسن فاروقی

# جدید دور اور ادب کی ترقی

جدید انگریزی نثر نگاروں کا مطالعہ کرتے ہوئے کچھ ہی عرصہ
ہوا کہ مجھے جدید دور میں نثر کی ترقی کا ایک خاص احساس ہوا۔ ظاہر ہے کہ
انگریزی نثر کی بنیادیں اٹھارویں صدی میں مستحکم ہوئیں اور انیسویں صدی میں
یہ اپنے عروج کمال پر پہنچی۔ اس وقت کی نثر کے بابت عام رائے یہ ہے کہ وہ
انیسویں صدی کی نثر کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے مگر میں نے یہ محسوس کیا اس دور
کی نثر اور کچھ ہو یا نہ ہو انیسویں صدی کی نثر سے زیادہ ترقی یافتہ ضرور ہے۔ اس
میں شک نہیں کہ مزاحیہ مضمون نگاری کے باب میں چارلس لیمب کے مقابلے میں
اس کا پیرو ای۔ وی لوکس نہیں آتا مگر لوکس کے مضامین خیالات ترتیب طرز ہر
معاملے میں ایک زیادہ بہتر سلیقہ، صفائی، توازن، نفاست کا اثر قائم کرتے ہیں
لوکس لیمب سے زیادہ بڑا انسان نہیں مگر لیمب سے زیادہ ترقی یافتہ ضرور ہے
اس طرح لٹن اسٹریچی کو میکالے اور کارلائل سے مسٹر چرچل کو برک سے گالسورتھی
کو ٹھیکرے سے ہر معنے میں فن کے لوازمات کو زیادہ بہتر پورا کرتے ہوئے پایا۔
ادب میں جینیس کے آنے کا کوئی قانون نہیں۔ یہ کسی وقت اور کسی دور میں آسکتی
ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی دور میں آسکتی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی دور میں اس
کی تعداد بہت زیادہ ہو اور کسی دور میں بالکل ہی نہ ہو۔ مگر ہر دور میں ادب
کی مجموعی حیثیت سے ایک قدم آگے ترقی ضرور ہے۔ یہی ثابت کرتی ہے، کہ
انسان اپنے ہر شعبہ زندگی کی طرح ادب میں بھی ایک بہتر مقصد کی طرف جا رہا
یہی ہیں اس رجائیت کا ثبوت دیتی ہے کہ ہمارے ہر قدم پر۔ ۔ ۔

A FRESHER AND FRESHER PERFEC-
-TION TREADS.

یہ کلیہ ہمارے اردو ادب پر بھی پورا اترتا ہے۔ ہم لوگ زیادہ تر ان
رجعت پسندوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ ہر معاملے میں جو کچھ بھی ہونا تھا وہ
ماضی میں ہو چکا اور اب اس سے بہتر کچھ ہونے کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ ہمارے
عام نقادوں کی یہ رائے ہے اور جس سے ملتے ہوئے خاص نقاد بھی ڈرتا ہے کہ آج کل
کا ادب پرانے ادب کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ ہمارے ادب کی ابھی عمر ہی کیا
ہے اس میں محض ایک دو شاعری کا ایک نثر نگاری کا گزرا ہے۔ اگر یہی سب کچھ
تھا تو پھر ادب کو ختم ہو جانا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ادب کے جدید ترین
ہونے سے یہ فائدہ ہے کہ اس میں آگے کمال کی صورتیں پیدا ہونا ضروری ہیں ہمارے
یہاں محض ابتدا ہی ہوئی ہے اور اس کی تکمیل قانون قدرت ہے۔ رجعت کے معتقد
میں اپنے والے کچھ کہیں رفتار ترقی کسی طرح نہیں رک سکتی۔ اس لئے میں صاف
دیکھتا ہوں کہ جدید دور میں ہمارا ادب نہ صرف اس طریقے پر زیادہ ترقی یافتہ ہے،
جیسا کہ میں جدید انگریزی ادب کو دیکھتا ہوں بلکہ اس میں جینیس کی گنجائش بھی
تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہم اس دور کے لوگوں کو پرانے دور والوں سے
زیادہ عظیم اور بہتر کہیں تو کوئی غلطی نہ ہوگی۔ شاعری ہی کو لے لیجئے، اس
دور میں ایک اقبال ہوا جس کی شاعری میں نہ صرف ہماری شاعری کی وہ ترقی
یافتہ تکنیک ہی ملتی ہے جو ولی سے لے کر داغ تک ترقی کرتی چلی آتی ہے، بلکہ

بلکہ جینیس کا وہ زور ملتا ہے جو کبھی پہلے کسی شاعر کو میسر نہ آیا۔ ان کے
سامنے میر تقی محض گھریلو زبان میں بونے نظر آتے ہیں۔ میر انیس الفاظ کے طوطے
مینے بنانے سے آگے نہیں بڑھتے۔ غالب ہی فکر اور فن دونوں میں ان کے ہم سر
نظر آتے ہیں مگر پھر بھی فلسفی آہنگ اور فطری اور انفرادی ربط تک نہیں پہنچتے
اقبال کو عظیم شاعر ماننے کے لئے ہر شخص تیار ہے مگر ان کو اردو کا بہترین
شاعر کہنے میں وہی ہماری قبر پرستی آڑے آتی ہے۔ کبھی کوئی کہتا ہے "ہاں
فکر اور خیالات کے لحاظ سے ان کا ہم سر کوئی نہ ہوا مگر زبان ....." کیا خوب
جیسے کہ بغیر زبان کے فکر اور بغیر فکر کے زبان کا وجود کوئی معنے رکھتا ہے۔
اقبال کو کسی الہامی طور پر اس زبان سے ہم آہنگ ہونا تھا جو لال قلعہ اور
قیصر باغ کے محدود دنسائی لہجہ سے بالاتر ہو جو آفاقی مفکر اور فاتح عالم مردِ
میدان کی زبان ہو اور یہی زبان ان کے تفکر کا موزوں ترین جامہ بن کر
آئی۔ اقبال نے عام شاعری اور اپنی شاعری کے متعلق بہت کچھ کہا ہے
مگر مجھے اس میں سب سے زیادہ اہم "جواب شکوہ" کا یہ بند معلوم ہوتا
ہے ؎

جب مئے درد سے ہو فطرتِ شاعر مدہوش
آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ زردوش
کشورِ دل میں ہوں خاموش خیالوں کے خروش
عرش سے سوئے زمیں شعر کہلاتا ہے سروش

قید دستور سے بالا ہے مگر دل میرا
فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا

اردو شاعری کو حقیقت میں انہوں نے وہ درجہ دیا کہ یہ عرش پر نازل
ہونے کے قابل ہو گئی۔ ان کا کلام ہماری شاعری کی ترقی کی اب تک کی آخری
منزل ہے اور یہ منزل ہمیں اس بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔

ان کے بعد جو لوگ ابھرے ہیں وہ ظاہر ہے کہ سورج کے
سامنے چراغ کی طرح ماند نظر آتے ہیں، ان میں اور اقبال میں وہی فرق
ہے جو میں نے لیمپ اور ایکس میں بتایا۔ مگر یہ لوگ اردو شاعری کو اس راہ
پر لگا رہے ہیں جس تک اقبال نہ پہنچے۔ اقبال نے خیالات اور طرز ادا کی
جدت میں قلم توڑ دیئے مگر عروض میں وہ پرانی ہی ڈگر پر چلتے رہے۔ جبکہ
دور ہر چیز کی آزادی کے ساتھ عروض کی آزادی بھی چاہتا تھا۔ چنانچہ
جن لوگوں نے ہماری شاعری کو یہ آزادی دی انہیں اقبال سے
زیادہ ترقی یافتہ کہنا ضروری ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ہمارے
جدید تجربہ کرنے والے شاعروں نے اب تک کوئی شاہکار پیش
کیا اور نہ کوئی اول درجہ کی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ آزاد شاعری
مجھے پرانی شاعری کے مقابلے میں ویسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے کہ موتی
چاندی کے موتی اور نقشین پتھر کے سامنے چاندی کا ورق۔ مگر یہ
چاندی کا ورق اپنی اہمیت رکھتا ہے جو پتھر کی اہمیت سے کم نہ ہونا
چاہیئے۔ فیض۔ راشد اور ان کے ساتھیوں نے جو قدم اٹھایا ہے اس
میں لغزشیں نظر آسکتی ہیں مگر یہ صاف ایسی راہ ہے جو ترقی کی طرف
جارہی ہے اور اس لئے یہ کہنا کہ اردو شاعری ختم ہو گئی محض رجعت پسندی
کی حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

خیر شاعری کے باب میں ہمارا دور ابھی ایک بڑی اونچی چوٹی
سے اتر رہا ہے اور دوسری چوٹی پر پہنچنے کے لئے اس کا نیچا ہو جانا
ضروری ہے۔ مگر نثری ادب میں ہم ضرور ضرور اپنے پیش روؤں
سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اردو نثر سرسید احمد خاں سے شروع ہوتی
ہے اور ان کے ہمراہیں حالی، شبلی، نذیر احمد۔ آزاد۔ ذکاء اللہ
وغیرہ کی خدمات بڑی اہم ہیں۔ یہ سب فارسی داں تھے اور ٹکسالی زبان
میں رچے ہوئے تھے۔ ان کو نثری طرز کا ایک بنیادی تصور تھا، اور
اس لئے انہوں نے ہماری نثر کی بنیاد رکھ دی مگر ان کی اہمیت وہی
رہے گی جو انگریزی میں اٹھارویں صدی کے نثر نگاروں کی ہے، مگر
اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے بعد اردو نثر ختم ہو گئی۔ ابھی کل کی بات

ہے کہ ایک صاحب کہنے لگے "حالی کا سا کوئی تنقید نگار دکھا دیجئے۔ نذیر احمد کا سا ناول نگار دکھا دیجئے۔ آزاد کا سا انشا پرداز دکھا دیجئے۔ اردو کے آج کل کے لکھنے والوں کے تو ہجے بھی درست نہیں ہوتے" میں نے جواب دیا کہ حالی، نذیر احمد وغیرہ کی بس یہی فوقیت تھی کہ ان کے ہجے درست ہوتے تھے وہ مطالق کو ت سے نہ لکھ جاتے۔ سینز لکھنے میں نہ گڑبڑاتے کہ ز، ذ، ض، ظ میں سے کون سا حرف ہے مگر اس سے آگے معاملہ صاف تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی زبان ایک سادگی اور انفرادیت رکھتی ہے مگر اصناف ادب کا تصور ان کا اس قدر زیادہ ابتدائی ہے کہ اس وقت کا معمولی سے معمولی لکھنے والا ان سے میلوں آگے ہے" ظاہر ہے کہ اس بات پر انہیں غصہ آجانا ضروری تھا اور چونکہ ہم دونوں کراچی شہر میں آبسنے والے لوگوں میں سے تھے۔ ہاتھا پائی ہوجاتا کوئی بات ہی نہ تھی، ولے بخیر گذشت۔

مگر یہ ان صاحب ہی کی رائے نہیں ہے بلکہ رائے عامہ ہے اسی کے نتیجے میں جمود اور انجماد اور تشکیل نو وغیرہ کی آوازیں ہر طرف سے سنائی دے رہی ہیں اور "الخناس" کی طرح جو "یوسوس فی صدور الناس" کے عمل میں نہیں تھکتا اچھے لکھنے والوں کے عزم کو کم کر رہی ہیں اور تذبذب میں ڈال کر اپنے عمل سے مایوس کر رہی ہیں اور تذبذب میں ڈال کر اپنے عمل سے مایوس کر رہی ہیں۔ میں ان سب آوازوں کو ستی ان سنی کر دینے کا عادی ہو گیا تھا مگر اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سختی سے روکا جائے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ نثر کے کچھ شعبوں میں عصر رواں اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ سابقین اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ غور سے دیکھئے کہ سر سید اور ان کے ساتھیوں کی نثر کا ایک ہی ابتدائی تصور ہی تھا، ان کی نثر زیادہ تر کچھ جملوں اور فقروں کا کھیل ہے۔ آزاد کے یہاں معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ شعر اکٹھا کر دیئے گئے ہیں جو صرف اس لئے شعر نہیں ہیں کہ وہ بحر پر پورے نہیں اترتے سر سید نے رنگینی کی جگہ عام بول چال کی سادگی اور روانی اختیار کی ہے مگر ان کے زیادہ تر مضامین ایسے مغلق ہو گئے ہیں کہ حلق سے نہیں اترتے۔ "آدم کی سرگذشت" اور "امید کی خوشی" جیسے مضامین میں شاعری کا جذباتی یا تخیلی پہلو نثر کو پورے طور پر گرفت میں لئے ہوئے ہے حالی ان کی پیروی کرتے ہیں مگر نثر کا منطقی آہنگ جس میں ہر پیراگراف ایک وحدانیت ہوتا ہے اور کسی مقولے کی وضاحت، بحث اور امثال کے ذریعہ کرتا ہے، ان کے یہاں بھی نہیں ہے۔ بے تکے پن کی سب سے بڑی مثال شبلی کے یہاں نظر آتی ہے جو اپنی طباعی میں پیراگرافوں کی ریڑھ لگانے کی سب سے نمایاں مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اصل میں نثر ایک ایسے ترقی یافتہ ذہن کا کام ہے، جو مکمل مسائل کی تحلیل صفائی کے ساتھ کر سکے۔ ہر جزو کا دوسرے جزو سے ربط جانے ہر بات کی دوسری بات سے منطقی کڑیاں جوڑ سکے۔ وضاحت اس کا خاص عمل ہو۔ تخیلات، رنگ اور جذبات اس کے غلام ہوں اور اس کی روشنی ایک خاص چمک پیدا کرے جو شاعری کی چمک سے مختلف ہو۔ ہمارے وہ نثر نگار جن پر نثر کا خاتمہ کیا جاتا ہے، اس ذہنی درجے تک صرف آتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہی انتہا ہے تو نثر کا خدا حافظ۔ ہمارا اس وقت کا ہر نثر پارہ ان کے بہترین ٹکڑوں سے ہر طرح زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ نثر کا حق ہم ان سے بہتر ادا کرتے ہیں۔ نثر میں طرز ادا سے زیادہ خیالات اہم ہیں۔ ہمارے ابتدائی نثر نگاروں کا تجزیۂ زندگی بہت ہی کم تھا۔ پرانی ٹلی بندھی مذہبی باتوں سے وہ لوگ آگے بڑھنا جانتے ہی نہ تھے۔ کسی کے یہاں سے کوئی ٹکڑا ایسا نہیں نکالا جا سکتا جو حیات پر ایسی انفرادی تنقید ہو کہ اس کی قدر دوام تک پہنچ جائے۔

اگر نثر کی عام کیفیت سے الگ ہو کر اصناف نثر کا خیال کرتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھئے تو یہ امر صاف ہو جاتا ہے کہ دو اصناف میں یعنی تنقید اور ناول میں ہم وہاں پہنچے ہیں جہاں پر پہنچنے میں حالی، شبلی، نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا کے پر جل جاتے۔ حالی کی تنقیدی کائنات میں کچھ انگریزی

شاعروں کے نام تھے اور کچھ الفاظ تھے جو انہوں نے کسی معمولی انگریزی
داں سے سن سنالئے تھے، ملٹن، بائرن، گولڈ اسمتھ کا ذکر انہوں
نے اس طرح کیا ہے کہ ان لوگوں کا محض نام ہی جانتے ہوئے معلوم
ہوتے ہیں۔ گولڈ اسمتھ کی نظم کے اختتامیہ کے ترجمہ کو جو انہوں نے معنے
پہنائے ہیں وہ نہایت درجہ مضحک ہیں۔ ملٹن کے تین لفظوں کی جو تکرار
انہوں نے پیش کی ہے جن پر شاعری کی پوری بنیاد قائم کرنے کی کوشش
کی ہے ان کے بابت انہیں یہ نہیں معلوم کہ کس موقع پر استعمال ہوئے تھے
اور کس حد تک شاعری پر عاید کئے جاسکتے ہیں۔ ایک لفظ سنژوس
( Sensuous ) جس کا انہوں نے اصلیت ترجمہ کیا ہے
ان کی بالکل سمجھ ہی میں نہیں آیا۔ شاعری کی جس صفت کی طرف اشارہ
کرتا ہے وہ ان کے تمام بیان میں کہیں محسوس ہی نہیں ہوتی۔ "مقدمہ شعر و
شاعری" کا وہ حصہ جو نیچرل شاعری کے بیان میں ہے ضرور اہم ہے مگر باقی
تصنیف نہایت غلط اور گمراہ کن ہے۔ اخلاق پر زور، اخلاقی غزل کے
لئے جہد اور مرثیوں کا اخلاقی اثر زبردستی لینے کی تلقین یہ ظاہر کرتی ہے کہ
انہیں ادب اور اصناف ادب کی بنیادی خصوصیات سمجھنے کی اہلیت ہی
نہیں ہے۔ شبلی کا "موازنہ انیس و دبیر" بھی اسی قدر غلط اور گمراہ کن ہے
موازنہ ایک گھوڑ دوڑ کا نام ہے جس میں اپنے مرغوب گھوڑے کو جتا دینے
کی کوشش ہوتی نظر آتی ہے۔ میر انیس کی انفرادیت تک پہنچنے کا سوال ہی
نہیں البتہ اردو کے طالب علموں کے مضامین میں اس تصنیف کے برے
اثرات اس قدر نمایاں نظر آتے ہیں کہ اس کو دریا برد کر دینے کو جی چاہتا ہے
برخلاف ان کے آج کل کے تنقید نگاروں میں ان سے کہیں زیادہ علم اور
کہیں زیادہ تنقید کرنے کا سلیقہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان
تمام لوگوں کو جنہیں آج کل تنقید نگار کہا جاتا ہے میں منشیان تنقید کہتا ہوں
کیوں کہ ان کا تمام تر کام تمام فائلوں سے نوٹ لے کر ایک مربوط ڈرافٹ
بنا دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی اس درجہ پر نہیں پہنچا ہے کہ نئے
اصول وضع کرتا یا کسی ادیب کی بابت ایسی بات کہہ جاتا جو دائمی طور
پر اہم ہوتی۔ مگر حالی اور شبلی نے یہی کیا کیا ہے، انہوں نے بھی منشی گیری ہی
کی ہے اور اس کام میں ہمارے منشیان تنقید ان سے کوسوں آگے
ہیں۔ آج کل کے منشیان تنقید میں بہت سے کتے ہیں جو بغیر سمجھے بوجھے
(بقول پیٹرسن) دو غزلے اور سہ غزلے بھونک جاتے ہیں مگر ان کی
بھونک میں بھی حالی اور شبلی سے زیادہ علم اور زیادہ معنی ہیں۔ کوئی کچھ
کہے مگر یہ امر مسلم ہے کہ ہماری تنقید نگاری انگریزی تنقید کے اثر سے
شروع ہوئی ہے۔ اور اسی کی آبیاری سے نشو و نما پا رہی ہے۔ بہت سے
اردو کے معلمین انگریزی سے لائی ہوئی باتوں کے سلسلے میں بڑی کم فہمی
اور کج فہمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مگر حالی اور شبلی سے ان کے آگے ہونے
میں کوئی شک نہیں ہے۔ حالی کو میں نقاد کہتا ہوں اور آل احمد سرور
کو نقاد کہتے جھجکتا ہوں، مگر یہ صاف ظاہر ہے کہ سرور کے سامنے حالی
طفل مکتب تھے۔ میں نے مرثیہ نگاری اور میر انیس میں میر انیس کا جس
طرح مطالعہ کیا ہے اس کو پڑھ کر شبلی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے!

---

کلیم الدین احمد کی اپنے باپ کی طرفداری ان کی قومی صفت سہی مگر جس
طرح انہوں نے شاعری اور تنقید پر نظر ڈالی ہے وہ بہ وضیر لتہ تنقید کو اول
درجہ پر پہنچاتی ہے۔ مارکسی تنقید نگار یک طرفہ سہی مگر مذاق ادب کو اس
طرح نہیں بگاڑتے جیسے حالی اور شبلی۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے
منشیان تنقید میں سے کسی کی کوئی تصنیف زندہ رہے اور آگے پہنچ جائے گی
مگر یہ یقین ہے کہ جو لوگ اس وقت تنقید لکھ رہے ہیں ان میں سے چند
(اور دائمی بقا پانے والے چند ہی ہوتے ہیں) دائمی بقا ضرور پائیں گے۔
آنے والا دور یہ بھی یقین کرے گا کہ کون سب سے زیادہ وقعت کے قابل
ہے۔ اور یہ یقین ہے کہ اسے حالی اور شبلی سے زیادہ وقعت ضرور
دے گا۔

ناول کے سلسلے میں تو نذیر احمد، سرشار، شرر کو ناول نگار کہنے

والوں پر ہنسی آتی ہے ناول کا لفظ انگریزی سے لیا گیا ہے اس کو اسی معنوں میں لیا جانا چاہئے جو اس کے اس کی مخرج کی زبان میں ہیں۔ اگر ہم انگریزی سے لفظ ڈاگ لیں تو کتے ہی کو ڈاگ کہنا لازمی ہے یہ نہیں کہ بلی کو ڈاگ کہنے لگیں۔ نذیر احمد کے تمثیلی فسانوں کو ناول کہنے والوں کو سن کر مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ بلی کو ڈاگ کہہ رہے ہیں۔ یا مجھے ایک طالب علم یاد آتا ہے جو انگریزی کا سبق یوں حفظ کر رہا تھا سی۔ اے۔ ٹی ریٹ کے معنے کتا۔ نذیر احمد نے اخلاق کا درس دینے کے لئے تمثیل یا الیگری کا طریقہ اختیار کیا، اور اس سلسلے میں پانچ کتابیں چھوڑیں جن میں کی دو تو بالکل نام کے لئے ہی یاد رہ گئی ہیں۔ تین اب بھی دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں مگر ان میں قصہ کی دلچسپی کیا ہے۔ پلاٹ کا وجود بھی ہے تو ایسا یا ایک کہ نہ ہونے کے برابر۔ زن و مرد کے تعلق کو یک قلم خارج کیا گیا ہے کیوں کہ یہ مخرب اخلاق ہوتا ہے اگر کہیں میاں بیوی ہیں تو ایک دوسرے کو وعظ سنانے کے لئے، عام زندگی کے ہلکے نقوش نظر آتے ہیں مگر وہ اخلاق کی جکڑ بندی میں آ کر بالکل یک طرفہ ہو گئے ہیں، افراد کا کہیں نام نہیں محض تمثیلی تشخیص نظر آتی ہے۔ کوئی نصیحت کا مجسمہ ہے تو کوئی ظاہر داری کا، کوئی ابن الوقت ہے تو کوئی حجت الاسلام۔ ایک بھی فرد ایسا نہیں جس کا کوئی بھی پہلو ہو۔ سب اپنے اخلاقی نام کے مطابق مشین کی طرح چل رہے ہیں۔ یورپ میں الیگری کو قرون وسطیٰ سے وابستہ کیا جاتا ہے اور اس کو جدید ناول کی ایک بے جان صورت کہا جاتا ہے مگر ہمارے یہاں ناول کے مربے ہی کو ناول کہے جانے کی ضد ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم مذہبی لوگ ہیں اور ہمارے مذہب کی سب سے اہم حرکت مزارات کی پرستش ہے مزارات میں دفن لوگ ہمارے لئے زندہ لوگوں سے زیادہ زندہ ہیں۔ یہ بدعانیت کا درجہ اور اسی درجے میں رہ کر ہم تنقید بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے نذیر احمد کی تمثیلوں کو ناول کہے جانا اور ان کو اردو کا پہلا اور اب تک کا بہترین ناول نگار مانے جانا ضروری ہے۔

مولوی نذیر احمد کی تصانیف کو اگر ان کے سامنے ناولیں کہا جاتا تو وہ بگڑ کر ایسا وعظ پلاتے کہ طبیعت جھک ہو جاتی۔ مگر شرر نے اپنی تصانیف کو ناول کہلوایا۔ اگر ان کو تاریخی ناولیں مان لیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایم اسلم کی ناولیں ان کی ناولوں سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔ ایم اسلم ان سے زیادہ واقعاتی سنسنی پیش کرتے ہیں۔ سلیقہ میں ایم اسلم ضرور رہ گئے ہیں، زندگی کی ترجمانی کا دونوں کے یہاں سوال نہیں اٹھتا۔ مگر ایم اسلم کے بیانات زیادہ قرین قیاس ہیں پھر آج کل شرر کے سے اعلیٰ ناول نگاروں کا گروہ ہے جن میں سے ہر ایک شرر کو ان کے میدان میں شکست دیتا ہے، شرر کی اہمیت محض تاریخی رہ گئی ہے۔ سرشار ناول نگاری کے بہت قریب نظر آتے ہیں، اور ان کا خوجی اردو ادب میں ایک لافانی کیریکٹر ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف شروع تو سرور مسرور کے رنگ میں کی تھی مگر آخر میں اس کے ناول ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ناول کے عناصر ضرور ہیں مگر یہ کوئی پختہ شکل نہیں اختیار کرتے ان کے خلاف اس وقت جو بھی کوئی ناول لکھ رہا ہے چاہے وہ محض سنسنی خیز ناول ہی کیوں نہ لکھتا ہو ناول کی مخصوص شکل سے واقف ضرور ہے، ہم اسے پست ناول نگار کہیں ہم اس کی تصنیف کو ریل کے سفر میں پڑھنے کے بعد گاڑی سے باہر پھینک دیں مگر اسے ناول نگار ضرور کہیں گے۔ رسوا کی امراؤ جان ادا ضرور مکمل ناول کہی جا سکتی ہے مگر یہ محض اتفاقی کامیابی ہے۔ رسوا کی دوسری تصانیف جیسے "شریف زادہ" اخلاقیات میں اسی طرح جکڑی ہوئی ہیں جیسے نذیر احمد کی تمثیلیں، اور امراؤ جان ادا پر بھی اخلاق کا بھوت اس قدر سوار ہے کہ وہ مقامات جہاں ناول اخلاقیات کے دائرے سے نکل کر زندگی کی پوری پوری تصویر بن جاتی ایسے دبائے گئے ہیں کہ امراؤ جان کا گلا گھٹ کر رہ گیا ہے اور وہ اس طرح پر زندہ نہیں ہو پاتی جتنی کہ اول درجے کی ہیروئن کو ہونا چاہئے۔ اس ناول کی تعمیر کو بہت سراہا جاتا ہے مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ ڈرامائی قسم کی ناول ہے ہی نہیں جو

اس میں تعمیر اہم ہے۔ اصل میں ہمارے افسانہ نگاروں میں وہ نظر جو ناول اور مختصر افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے ۱۹۲۶ء کے بعد پیدا ہوئی ہے پریم چند جنہوں نے شروع میں شرر کی ناولوں کے ایسے مختصر افسانے "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" میں پیش کئے تھے "واردات" کے سے افسانے لکھنے لگے اور پھر ترقی پسند تحریک کے ساتھ ایک گروہ افسانہ نگاروں کا نمودار ہوا جن کے یہاں او رکچھ نہ تھا یا نہ تھا مگر وہ آزاد نظر ضرور تھی جو جدید قصہ نویسی کی جان ہے اور جس کی بنا پر ہی قصوں کو رومانس سے مختلف کرنے کے لئے ناول کا نام دیا گیا تھا۔ ان افسانہ نگاروں میں سے کچھ نے تقسیم ہند کے بعد ناولیں لکھی ہیں۔ کچھ لوگ ناول نگار ہی ہو کر سامنے آئے ہیں۔ کچھ ناولیں لکھ رہے ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئیں۔ ان سب کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اردو میں ناول نگاری اب شروع ہوئی ہے قریب آدھے درجن ناول نگار تو اس وقت ایسے ضرور ہیں جن کے شاہکاروں کی میت بھی امراؤ جان ادا پر بھاری ٹھیرے گی۔

غرض قوم کی ترقی میں اس قوم کے ادیبوں اور ناظرین کا عقیدہ بڑا ضروری چیز ہے جو قوم ترقی کرنا نہیں چاہتی اور اپنے ماضی ہی کو فخر کے ساتھ دیکھتی ہے وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ اردو ادب پر اس وقت جمود اس لئے ہے کہ اس کے ادیب اور ادب نواز جمود جمود چلا رہے ہیں۔ رجعت اور پسپائی نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ گذشتہ دور سے کہیں زیادہ بہتر تصانیف وجود میں آرہی ہیں مگر ان کو دیکھنے ہی سے انکار کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی بڑا تنقیدی شاہکار لکھ دے مگر قوم کی نگاہیں اپنی پرانی لیلاؤں کی طرف ایسی محویت سے بندھی ہوئی ہے کہ اسے کوئی دیکھنے کا بھی نہیں۔ ناولیں عمدہ سے عمدہ شائع ہو رہی ہیں۔ ناول نگار سچ مچ شاہکار لکھ رہے ہیں اور رفتار ارتقا طے کر کے ایسی تصانیف پر آرہے ہیں جو سدا شاہکار رہیں گے مگر قوم کو اپنے پرانے بڈھوں ہی سے ایسی لاگ ہوئی ہے کہ ان کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔ اقبال نے قبر کی تجارت ہماری قوم کا مقبول پیشہ بتایا تھا۔ ادب کے سلسلے میں بھی ہم یہی کرتے ہیں۔ پرانے ادبی پیروں کے مزارات پر اعتکاف کئے بیٹھے ہیں۔ دنیا کو دیکھنا گناہ ہے، جدید لوگوں کی کرامات کی طرف کیسے نگاہ جائے ہاں جب یہ مر جائیں گے تب ان کی قدر کی جائے گی اور لوگ ان کی قبروں کے معتکف ہوں گے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے پرانے ادیبوں نے محض جھک ماری تھی۔ ان میں سے ہر ایک پر میرے طویل مضمون رسالوں میں چھپنے کے بعد کتابی صورت میں آچکے ہیں۔ ان کی خدمات اہم ہیں اور ان کی اہمیت کو میں نے دل کھول کر سراہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اصناف کے ارتقا میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ ترقی انتہا کو پہنچ جاتی ہے مگر جن لوگوں کا میں نے اس مضمون میں ذکر کیا وہ کسی طرح بھی منتہی نہیں کہے جا سکتے۔ انہوں نے محض ابتدائیں کیں، اور اگر ان ابتداؤں کے بعد ترقی نہیں ہوتی تو ان سب ہی کا کام بے کار ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بنیادیں رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اگر ان بنیادوں ہی کو بس سمجھا جائے تو وہ مکان بن چکا جن کی یہ بنیادیں ہیں۔ اب وقت ہے کہ ان پر سخت تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تاکہ ان کے جنگل تصانیف میں سے وہ درخت چن لئے جائیں جن کے ذریعے آگے باغ لگائے جا سکتے ہیں اور عمدہ پھل نکالے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان رجعت پسندوں کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پھولوں کو ہٹایا جائے جو یہ طے کر کے بیٹھ گئے ہیں کہ جو کچھ ماضی میں ہو گیا وہی بس ہے اور جدید دور کی تمام مخلصانہ کوششوں اور کاوشوں کی طرف سے منہ پھیرے بیٹھے ہیں۔

---

یہ راز نہیں کھلتا ہم پہ سراپا غم<br>
کیا سمجھتے ہیں جس دم کچھ ہنستے ہنساتے ہیں (حسن ہومن تلخ)

سید جعفر طاہر

# ایک خوش گو شاعر

## میاں محمد شاہ دین ہمایوں

نام میاں محمد شاہ دین، تخلص ہمایوں۔ ۲ر اپریل ۱۸۶۸ء کو باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین ایک فاضل بزرگ تھے اور آپ کے دادا مولوی قادر بخش صاحب فارسی اور عربی کے جید عالم تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں وہ شاہی خاندان کے نوجوانوں کی اتالیقی پر مقرر تھے۔ طبیعت شعر و سخن کے لئے نہایت موزوں پائی تھی اور نادر تخلص کرتے تھے لیکن مقام افسوس ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام ضائع ہو گیا۔

ہمایوں مرحوم کی ابتدائی تعلیم باغبانپورہ میں ہوئی۔ چھ برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ مڈل کے امتحان میں اول رہے اور انٹرنس میں پنجاب بھر میں انگریزی میں اوّل رہے۔ بی اے کا امتحان لاہور میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور ۱۸۸۷ء میں مزید تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے اور بیرسٹری کر کے واپس آئے۔ پنجاب کی مجلس وضع قوانین کے رکن نامزد ہوئے اور پھر عدالت عالیہ میں جج مقرر ہوئے، جہاں وہ چیف جسٹس کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے۔ ۲ر جولائی ۱۹۱۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہی۔ علامہ اقبال نے مرحوم کی تاریخ وفات لکھی ہے:۔

در گلستانِ دہر ہمایوں نکتہ سنج
آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رسید
مے جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت

۱ ۳ ۶ ۳ ۶

علامۂ فصیح ز ہر چار سو شنید

۴ ۳۳۴

قد چھوٹا۔ بدن بھاری۔ کتابی شہابی چہرا۔ قوی ہیکل اور مضبوط ہاڑ کاٹھ کے انسان نظر آتے ہیں۔ پیشانی فراخ، ناک بلند۔ آنکھیں قدرتی طور پر خمار آلودہ۔ ابرو گھنے۔ ہونٹ پتلے پتلے۔ بال علامہ اقبال کے سے انداز میں پیچھے کی طرف ہٹے ہوئے اور داڑھی سیاہ، بھری بھری اور مقطع ٹائپ کی۔ چہرے سے بزرگی، نیکی اور تدبر و تفکر کی علامات بخوبی نمایاں ہیں۔ کم گو، متین اور مستعد افسر دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کا واحد شغل مطالعہ رہا۔ خدمت قومی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی کہ سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تو آپ نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

## کلام

آپ کی شاعری میں قومی درد ہے اور سماجی تبدیلیوں کا احساس ہے۔ خارجی مناظر کا بھی طبیعت پر خاص اثر ہے لیکن ان کی شاعری محض

رسمی شاعری نہیں۔ انگلستان جانے سے قبل عشقیہ غزلیات لکھیں، لیکن واپس آئے تو یہ رجحان بدل گیا۔ یہاں تک کہ جوانی کا مجموعہ کلام ضائع فرمادیا۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنے خیالات کو بیان کرنے پر بڑی قدرت ہے۔ غزل قدیم رنگ میں کہتے ہیں۔ لیکن "شعرائے قوم سے خطاب" اور اسی قبیل کی دوسری نظمیں بڑی خیال افروز ہیں۔

## تصانیف

مستقل تصنیف کوئی نہیں۔ آپ کی وفات کے بعد "جذباتِ ہمایوں" کے نام سے آپ کے صاحبزادے میاں بشیر احمد صاحب مدیر ہمایوں نے آپ کی چند نظموں کو جمع کرکے چھپوادیا ہے۔

## مختصر انتخاب کلام

### "شعرائے قوم سے خطاب"

اے شاعرانِ قوم زمانہ بدل گیا
پرمثلِ زلفِ یار تمہارا نہ بل گیا

بیٹھوگے کب تلک سرِ رہ تم لکیر کو
بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا

اٹھو اگر نہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح
اک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا

ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے
گر گر کے ملک ہند کچھ آخر سنبھل گیا

○

### وادیٔ سندھ

سندھ کی وادی پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
برقعہ اوڑھے اک دلہن بیٹھی ہے شرمائی ہوئی

منتظر بارش کے ہیں مکی کے اور شالی کے کھیت
تشنگی سے خوشہ کی صورت ہے مرجھائی ہوئی

آج گا مدر بل ہوا ہے اس کا منظر نظر
اس کے سر پہ کیا گھٹا پھرتی ہے منڈلائی ہوئی

سندھ کے نالے کی آہوں کا دھواں شاید اٹھا
کیسی تاریکی ہے سطحِ آب پر چھائی ہوئی

قاصدِ ابر آرہا ہے لے کے پیغامِ کرم
بارگاہِ ایزدی میں کس کی شنوائی ہوئی

سوئے مشرق ہے سر کہسار پھر بارش کا زور
رحمتِ باری ہے گویا جوش پر آئی ہوئی

اے ہمایوں فیضِ بارش سے کھلے ڈل کے کنول
کیوں ترے دل کی کلی ہے آج مرجھائی ہوئی

---

رہے گا کب تلک تو محوِ دیدارِ رخِ انور
مجھے دم بھر قدم ان کے دلِ بیتاب لینے دے

---

جدا ہونے کو تھی متصل ہیں جب وہ جانِ بسمل سے
ہماری حسرتیں رو دیں لپٹ کر تیغِ قاتل سے

---

ملتا نہیں خزاں میں گلِ لالہ نام کو
وہ آئے دیکھنے مرے داغِ الم کو آج

(لاہور کا دبستانِ شاعری)

---

محمد ذکریا مائل
ریسرچ اسکالر ترقی اردو بورڈ کراچی

# کلیاتِ مومن

## مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی پر ایک نظر

جناب ڈاکٹر عبادت صاحب بریلوی اردو دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ نے متعدد کتابیں تالیف فرمائی ہیں اور بہت سی کتابیں آپ کے لکھے ہوئے مقدمات سے آراستہ ہیں کچھ مدت سے آپ کا تصحیح و ترتیب کیا ہوا نسخہ "کلیات مومن" راقم السطور کے پیش نظر رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً مومن خاں مرحوم کے مطلوبہ اشعار تلاش کرتے وقت اس سے استفادے کی نوبت آتی رہتی ہے۔ دوران مطالعہ میں ڈاکٹر صاحب کی تصحیح کے جو شاہکار اپنا اثر انقش دل پر چھوڑ جاتے ہیں اس مضمون کا محرک اوّل انہی کو سمجھنا چاہئے۔

یہ نسخہ ادارہ کتابی دنیا (کراچی بک ورلڈ پبلی کیشنز) کراچی۔ لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے جس نے بہ قول جناب مرتب "اس کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اور ضیا پریس آرام باغ کراچی میں طبع ہوا ہے اس کی قیمت چھ روپے نو آنے ہے۔

جناب مرتب نے اپنے مقدمے کے آخر میں اس نسخے کی نسبت سطور ذیل رقم فرمائی ہیں:-

"موجودہ ایڈیشن کی مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔"

"حتی الامکان صحت کا بھی خیال رکھا گیا لیکن اس کے باوجود بعض غلطیاں رہ گئی ہیں، امید ہے کہ انہیں دوسرے ایڈیشن میں درست کر دیا جائے گا۔"

اس وقت انہی دو باتوں کو ذہن میں رکھ کر اس ایڈیشن کا ایک سرسری نظر سے جائزہ لینا مقصود ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے مجھے سب سے پہلے یہ بات واضح کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مجھے ڈاکٹر صاحب موصوف سے قطعاً کوئی پرخاش نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مجھے ان کی جناب میں نیاز بھی حاصل نہیں، اس لئے یہ مضمون محض علمی خیر اندیشی کے جذبے کے ساتھ سپرد قلم کر رہا ہوں۔

بات قدرے تلخ ہے لیکن چونکہ حقیقت ہے اس لئے کہنا ضروری ہے کہ جناب مرتب نے کلیات مومن جیسی اہم کتاب کی ترتیب و تصحیح کا جو کام اپنے ذمے لیا ہے، افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو بالکل ملحوظ نہیں رکھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس سعی ناتمام کی بدولت انہوں نے اپنی سابقہ مساعی جمیلہ

کی نسبت بھی زیادہ حسن ظن کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

میں نے اس مضمون میں زیرِ نظر کتاب کے صرف چند ہی حصوں پر نظر ڈالی ہے، اور انہی کے مطالعے سے اس کثرت سے کتابت اور ترتیب کی غلطیاں سامنے آئی ہیں کہ ان کا شمار "بعض" سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ایسے مواقع پر مرتب یا مؤلف صاحبان اپنی غلطیوں کو بھی بڑی آسانی سے غریب کاتب کے سر منڈھ دیا کرتے ہیں، مگر کیا یہ کہہ کر وہ اپنی تصحیح کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو سکتے ہیں؟ کیا دیانتِ تصحیح کا یہ تقاضا نہیں کہ کاپیاں چھپنے سے پہلے دیکھ لی جائیں اور کم از کم بہت نمایاں قسم کی غلطیاں تو نہ رہنے دی جائیں۔ افسوس ہے کہ اس سلسلے میں بڑی سہل انگاری سے کام لیا گیا ہے۔

سب سے پہلے کتاب کے سلسلۂ صفحات پر نظر پڑتی ہے تو یہ تماشا دیکھنے میں آتا ہے کہ اس کلیات کے ص ۹۶ کے بعد ص ۸۷ چھپا ہوا ہے اور ۸۷ کے بعد ۹۸ ہے۔

ص ۹۶ پر (ز) کی ردیف کے تحت صرف ایک غزل ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہے چشم پوشی پھر بھی یہاں آنسو رواں ہنوز
جی سر ہو گیا ہے دلے دل طپاں ہنوز

اس غزل میں جو متعدد غلطیاں پائی جاتی ہیں ان پر آگے بحث کی جائے گی۔ یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ زیرِ نظر ایڈیشن میں اس غزل کے بعد ص ۹۷ کے بجائے ص ۸۷ چھپ گیا ہے اور اس صفحے پر 'ز' کی دوسری غزلیات کے بجائے یہ شعر ملتا ہے ؎

کن شارع مہر نے حیراں کیا ہمیں
تکتے ہیں کب سے روزنِ دیوار کی طرف

اس کے بعد اس غزل کے بقیہ اشعار ملتے ہیں اور اس کے اختتام پر ردیف القاف شروع ہو جاتی ہے!

اب مطبوعہ ص ۸۷ کے بعد ص ۹۸ آتا ہے اور اس صفحے کا پہلا شعر یہ نظر آتا ہے۔ ؎

مرہ وحیراں میں کیا شبہ پڑا دیکھنا
محوِ خود آرا ترا آئینہ بیں ہے ہنوز

اس غزل کے بعد 'ردیف السین' کی باری آجاتی ہے اور یہ سلسلہ 'غ' کی دو غزلوں کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اور 'ردیف القاف' کے بعد رجعت قہقری کے ساتھ 'ردیف الفا' کی نوبت آتی ہے اس کے ذیل میں یہ مطلع ملتا ہے۔ ؎

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

اب آپ کی نگاہیں منتظر رہتی ہیں کہ اس مطلع کے بعد اس غزل کے بقیہ اشعار صفحہ مابعد پر ملیں گے جس پر صرف ۷ کا ہندسہ طبع ہو کر رہ گیا ہے اور جسے بلحاظ ترتیب صفحات ص ۸۷ ہونا چاہیے تھا، مگر نگاہیں اس کوشش میں مایوس ہو جاتی ہیں اور مذکورہ صفحے پر 'ز' کی غزل کا یہ مطلع دعوت نظر دینے لگتا ہے ؎

ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز
لطف وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز

جب یہ غزل ختم ہو چکتی ہے تو 'ز' کی دوسری غزل کا یہ مطلع بڑے عجیب انداز سے چھپا ہوا نظر آتا ہے ؎

لب پہ دم آیا دلے نالہ نہیں 'ہم' ہنوز
نغمۂ غم بھی ترا پردہ نشیں ہے ہنوز

ملاحظہ ہو یہ 'ہم'، 'ہے' کی شکل مسخ کرنے کے بعد بنایا گیا ہے۔

اس غزل کے چار شعروں کے بعد ص ۹۷ پر ردیف 'ق' کی ایک غزل اس شعر سے شروع ہو جاتی ہے ؎

"یہیں تک ہے حالت جاں کنی غرض اب تو جان پہ آبنی
یہ عذاب مرگ ہے یا تپش یہ خدا کا قہر ہے یا قلق

مومن خاں مرحوم کے اس شعر کا پہلا جزو در اصل 'بے ابہام'
ہے جسے 'ابہام' کی صورت دے کر شعر کی موزونیت کا خون کر دیا گیا ہے
مگر موزونیت باقی رہے یا بھاڑ میں جائے اسے مرتب صاحب کی بلا
جانے !

اب اگر آپ کو اس 'قلق' والی غزل کے اس شعر سے پہلے کے
اشعار کی تلاش ہو تو دل ہی دل میں، جناب عبادت کے وطن عزیز کا
احترام ملحوظ رکھ کر (اپنے بانس بریلی کو) کا ورد کیجیے اور ص ۹۲
کے بعد جو غلط ہندسہ والا صفحہ ۷۸ چھپ گیا ہے اس کی طرف رجوع
فرمائیے تب آپ کو اس غزل کے پہلے دو شعر مل سکیں گے۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اسی قسم کا لطیفہ ص ۱۱۰ پر زیب نظر ہوتا ہے۔ اس صفحے کی تیسری سطر
پر یہ مطلع ہے ؎

جلتا ہوں ہجر شاہد و یاد شراب میں
شوق شراب نے مجھے ڈالا عذاب میں

فی الحال اس سے تو صرف نظر کیجیے کہ غریب مومن شراب کے رسیا ہرگز
نہ تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس مطلع کے دوسرے
مصرع میں مرتب صاحب کی نظر عنایت "شوق ثواب" کو شوق
شراب بنا کر ان کا نامۂ اعمال خواہ مخواہ سیاہ کر ڈالنے کی سعی نامحمود
فرمائے گی، ابھی تو یہ دیکھیے کہ اس غزل کے بعد دو شعر چھپنے کے بعد یہ
بے چاری یوں ہی ناقص نظر آتی ہے اور اس کے باقی شعر جن میں مومن
خاں کا یہ معرکہ آرا مقطع شامل ہے ؎

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

اس بری طرح نذر تغافل ہوئے ہیں کہ بعد والے صفحات میں کہیں ان
کا سراغ نہیں ملتا۔ ص ۱۱۹ پر 'حسرت ہو' 'عبادت ہو' والی غزل
کا صرف ایک مصرع پہلی سطر پر نظر آتا ہے۔ ع

"ہم جبہ سے جبہ تیغ کا جب دست حسرت ہو"

ہاں اگر آپ پھر علامہ اقبال کے ہم نوا بن کر

"دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو"

پر عمل پیرا ہوں تو ذرا ص ۱۱۶ کی طرف لوٹئے تو اس کے آخر میں
جہاں 'حسرت ہو' والی غزل کا مطلع اور 'دست حسرت' والے
مصرع ثانی کا پہلا مصرع مل جائے گا، وہیں ؎

"مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں"

کے باقی شعر ص ۱۱۷ پر مل جائیں گے! سبحان اللہ ترتیب و تصحیح کا
کتنا دلکش کرشمہ ہے۔

اب پھر ایک صفحہ پیچھے ہٹ کر ۱۱۵ پر آئیے تو اس کا آخری
شعر یہ ملے گا۔ ؎

بازیچہ کر دیا ستم یار و جور چرخ
طفلی سے غلغلہ ہے مرا شیخ و شاب میں

آپ قدرتاً ص ۱۱۶ پر اس غزل کے مقطع کی جستجو میں پڑ جائیں گے مگر
وہ اس صفحے پر مل جائے تو بات ہی کیا ہوئی۔ وہاں تو ردیف 'واؤ' کی
غزل کا یہ مطلع ملے گا ؎

گرم جولاں مرے مدفن پہ تم آتے کیوں ہو
اپنے دل سوختہ کی خاک اڑانے کیوں ہو

البتہ یہ مقطع ص ۱۱۷ پر 'ردیف الواؤ' کے اس شعر ؎

سرگیں آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

کے بعد ص ۱۱۰ کی پہلی دو سطروں میں نظر آ سکتا ہے ؎

مومن یہ عالم اس صنم جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہان سراسر خراب میں

اندیشہ ہے کہ اگر اس نوع کے کارناموں پر مزید توجہ کی گئی تو
ی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ جائے گا اور قارئین تصحیح و ترتیب کے
عجیب شاہکار کے مزید نمونوں سے لطف اندوز نہ ہو سکیں گے،
لئے اب دوسری قسم کی چند غلطیوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر آخر
ان اغلاط کی ایک فہرست دی جا رہی ہے جو گنتی کے چند قصیدوں
غزلوں کے مطالعے سے دریافت ہوئی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ
یاں جو (۶۹۰) صفحات کی کتاب سے اخذ کی گئی ہیں اگر ان
فلق اشعار کا اندازہ مطلوب ہو تو مجموعی طور پر یہ اشعار زیادہ سے
۵۰ - ۷۵ صفحات کے اندر محدود نکلیں گے۔ اگر کوئی اتنی زحمت
کرنے کے لئے تیار ہو کہ پوری کتاب خاطر خواہ غور و مقابلہ کے بعد
مرتب کرے تو یہ قیاس کرنا چنداں دشوار نہیں کہ ایسی غلطیوں کی
کہاں سے کہاں پہنچ سکتی ہے، یقیناً ایک مختصر غلط نامے کا اضافہ
ان کے استقصا سے قاصر رہے گا۔

| ص | س (سطر) | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ۱۰۲ | ۹ | تب | شب |
| ،، | ۱۱ | میں | کا |
| ،، | ۱۴ | بزم سور میں | بزم شور میں |
| ۱۱۵ | ۹ | فتح یاب | فتح یاب |
| ۱۲۰ | ۹ | شب ہجراں شب | روز ہجراں سے |
| ۱۲۱ | ۸ | پاکی دامن کی | دین پاکی دامن کی |
| ،، | ،، | بیداد | بے درد |
| ۱۲۴ | ۴ | سوئے فلک | سوئے فلک کیوں |
| ۱۲۵ | ۱۲ | ملا ہے | ملائے |
| ،، | ۱۴ | سوئے دام لو | سو دے دام لو |
| ۲۰۰ | ۲ | مقتل | مقبل |
| ،، | ۴ | مدخل | مخرج |

| ص | س | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ۱۳ | ۱ | سمیہ بانہ نکلتا | سر بام نکلتا |
| ،، | ۲۰ | صنم ہجر | غم ہجر |
| ،، | ،، | گل ام | گل اندام |
| ۱۴ | ۱۲ | ہر اک بات نہیں ہے | ہر اک بات میں |
| ۱۵ | ۱۱ | نیم ناز سے ہیں | نیم ناز ہی میں |
| ،، | ۱۲ | اخیار | اغیار |
| ۱۶ | ۳ | غم صہبا | خم صہبا |
| ،، | ۹ | غلط سارے | غلط پیغام سارے |

۵ آگ کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر
وقت بارش اگر خورشید لف ہر ژالہ تھا

اس غزل کا مطلع یہ ہے جو زیر نظر دیوان میں غائب ہے ۵
وقت جوشِ بحر گریہ میں جو گرم نالہ تھا
حلقہ گرداب رشک شعلہ جوالہ تھا

| ص | س | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ۳۱ | ۹ | اول | ہوں |
| ۳۲ | ۲ | بیہودہ | بیہدہ |
| ۴۰ | ۱۲ | رشک فغاں ہائے | رشک فغاں کی ہائے |
| ۱۴۴ | ۱۴ | تو بھی ہیں رات | تو بھی ہیں دن رات |
| ۱۴۵ | ۱۵ | تازکے | تازنے |
| ۱۶۸ | ۶ | مرہم میخواری دل کو نشتر رنگ | مرہم میخوارئ دل کو نشتر رنگ |
| ۱۶۹ | ۱۲ | قطلیر | قد گیر |

ویسے تو اس سرسری فہرست اغلاط میں بھی متعدد غلطیاں ایسی
ہیں جو کاتب کے سر نہیں تھوپی جا سکتیں۔ قارئین غور سے پڑھیں گے
تو حقیقت آپ روشن ہو جائے گی۔ لیکن ذیل میں عام غلطیوں سے
صرف نظر کر کے چند غلطیاں حصۂ قصائد سے خصوصیت سے ایسی
درج کی جاتی ہیں جن کی ذمہ داری براہ راست جناب مرتب پر پڑتی
(باقی صفحہ ۱۳ پر)

ابن فرید

# سخن در سخن

رفیق خاور کے مقالے "اردو ادب کی تشکیل نو" نے بڑے اہم مسئلے کو چھیڑا ہے، یہ احتساب اگر واقعی صحت مندی کا نقیب ثابت ہو تو عجب نہیں کہ بہت سے خوابیدہ ذہن بیدار ہوجائیں۔ اور "دگر دانائے راز" کا انتظار ختم ہوجائے لیکن "دگر دانائے راز" کا منتظر رہنا بھی تو ادب کی زندگی کا سرِّ نہاں ہے ـــــ بہرحال انتظار تو نہیں ختم ہونا چاہئے۔ البتہ خضر کو ہر منزل پہ رہبری کے لئے مل جانا چاہئے۔

تشکیل نو کے سلسلے میں خاور نے جو باتیں کہی ہیں وہ یوں تو بہت سی ہیں، اور ہر ایک کو اپنی فہم اور اپنے ذوق کے مطابق اور اپنی بات کہنے کے لئے ان میں سے انتخاب کرنے کا اچھا خاصا موقع ہاتھ آجاتا ہے مقالہ پڑھنے کے بعد مجھے بھی دو ایک باتوں نے بری طرح الجھایا۔ معلوم نہیں یہ باتیں صرف میری فہم اور میرے ذوق کی غمازی کرتی ہیں، یا ان میں حقیقت کا بھی پہلو ہے۔

اردو ادب کے لئے یہ غم تو واقعی بڑا جان لیوا ہے کہ سرسید، حالیؔ و اقبالؔ کے بعد اردو ادب میں کوئی "ڈویکر" پیدا نہیں ہوسکا ان کے بعد ادب نے ترقی کی طرف گام زن ہونے کی کوشش تو کی، لیکن زیادہ تر اہلِ قلم محوِ نالۂ جرسِ کارواں ہیں جنھوں نے ترقی کے لئے اپنی مساعی کو ترقی پسندی کا نام دے دیا۔ ان کے یہاں بھی سرسید سے بلند دعوتی و تبلیغی زبان، حالیؔ سے بہتر تنقیدی تصنیف، اقبالؔ سے ارفع مقصدی کلام میسر نہیں آتا۔ تھوڑی بہت چمک ہمیں ضرور نظر آتی ہے، لیکن یہ سورج کی کرن نہیں، ذرّے کا عکس ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اور کوئی اقبالؔ، حالیؔ و سرسید کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ ـــــ اور یہ بھی کہ ـــــ کیا ہیئت، موضوع، اسالیب اور صنائع و بدائع میں غیر معمولی تبدیلی کے بعد ایسا ہی بڑا ادیب یا ادب پیدا ہوجائے گا؟ ـــ مستقبل میں ان تبدیلیوں سے کیا حاصل ہوگا، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن ماضی میں جو تجربے ہوئے ہیں ان سے تو کچھ یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تراش و خراش بھی زیئس (ZEUS) کو جنم نہ دے سکی۔ پھر مستقبل کے بارے میں ہم کیا توقع رکھیں۔

یہاں میرے ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے، آخر ہم ادب کے ذریعہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ہم ادب کے ذریعے پیش کرنا کیا چاہتے ہیں؟ میری اس بات سے ایک بڑی گمراہی کا امکان پیدا ہوسکتا ہے، اور وہ یہ کہ میں ادب کی تخلیق کا براہ راست کا قایل نہیں بلکہ ادب کے ذریعے پیش کی جانے والی بات کا قایل ہوں۔ اس پہ ماضی میں بڑی طول طویل بحثیں ہوچکی ہیں، اس لئے مجھے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو اختیار ہے جو مسلک چاہیں اختیار کریں۔ مگر جب میں نے مقالہ پڑھا تو معاً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہم ادب کے ذریعے کہنا کیا چاہتے ہیں؟ اس سوال کے ابھرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ خاور نے اپنے مقالے میں

جن بڑی بڑی ادبی شخصیتوں اور ان کی تصنیفوں کا ذکر کیا ہے وہ سب کی سب اس خاص سوال کے جواب کی طرف رہنمائی کرتی ہیں کیا علی گڑھ تحریک کا واحد مقصد ماضی کی قدروں سے انحراف تھا؟۔ کیا اکبر الہ آبادی صرف طنز کرنا چاہتے تھے؟ کیا اقبال کے کلام کا مقصد محض طرح تو افگنی تھا؟ یہی نہیں بلکہ ہمیں آج کیوں یاد ہے؟ ہومر، ورجل، یوریپڈیز، سوفوکلز، شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے، دانتے، ایلیٹ وغیرہ کی عظمت عالمی ادب میں کیوں مسلّم ہے؟۔ کیا یہ صرف شاعر و ادیب تھے (ایلیٹ ہے)۔ مجھے یقین ہے کہ ہر صاحب نظر اس سے اتفاق کرے گا کہ ان کے محاسن ادب کے بارے میں صرف اس امر پر اکتفا کرنا، ان کے مرتبے کی تقلیل ہوگی۔

اس وقت تک ہمارے علم میں جتنی بھی اساطیر ہیں۔ ان کی پشت پر ہمیں ایک سوچی سمجھی ہوئی مقصدی بات ملتی ہے۔ یونانی اساطیر کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اگر ان کے معابد کے کاہنوں، اور عوام کو اپنے خداؤں کو راجع کرنے کے لیے موثر ترین کلام کی ضرورت نہ ہوتی، یورپ میں یونا رومی (یونانی رومی؟) تہذیب کے زوال کے بعد مسیحیت کو فروغ ہوا، اور اس نے ادب میں وہی مقام حاصل کر لیا جو یونانی رومی اعتقادات کو حاصل تھا۔ یہ بھی فکر ماقبل کی طرح مسیحی شاعروں اور ادیبوں کے ذہن و فکر میں رچ بس گئی اور ان کے دل کی آواز بن کر ان کی زبان قلم سے جاری ہوگئی۔ ملٹن۔ گوئٹے اور دانتے کے یہاں یہ آواز بہت واضح ہے اور شکسپیر کے بارے میں بھی یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ ذہناً کٹر عیسائی تھا۔ اٹھارویں صدی کے قریب مسیحیت اور سائنسی تحقیقات کی آپس کی چپقلش نے مسیحیت کا زور توڑ دیا۔ اب مغربی مشاہیر ادب کے پاس روح و وجدان کے پیرائے میں کہنے کے لئے کوئی بات نہیں رہ گئی۔ چنانچہ انہوں نے دوبارہ یونانی رومی اساطیر میں جائے امان تلاش کی۔ انیسویں صدی کے رومانی آذروں کو یہ صنم کچھ زیادہ پسند نہ آئے چنانچہ انہوں نے اپنے حرم خود بنائے، اور آخر آخر اس صدی تک آتے آتے ایلیٹ، رچرڈ اور ایڈس نے مسیحیت کے سامنے خود کو بپتسمہ کے لئے پیش کر دیا۔

اردو ادب میں تجدید کے جن علم برداروں کا نام اس مقالے میں گنایا گیا ہے حسن اتفاق کہ وہ بھی سارے کے سارے ایک ہی مقصد اپنے سامنے رکھتے تھے۔ سرسید کی تجدد پسندی کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ وہ مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند کے بانی اور خطبات احمدیہ وغیرہ کے مصنف تھے۔ حالی، مسدس، مناجات بیوہ اور ایسی ہی کتنی نظموں کے علاوہ مقدمہ شعر و شاعری میں بھی اپنا مافی الضمیر پیش کر گئے ہیں۔ ان کے درس اخلاق سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اقبال کے بارے میں کہنا ہی کیا ہے؟ ان کا پورا کلام ایک پیغام ہے۔ مسجد قرطبہ سے لے کر ابلیس کی مجلس شوریٰ تک ساری نظموں میں یہ پیغام پھیلا ہوا ہے، صرف دیدۂ بینا کی ضرورت ہے!۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ عالمی ادب کے تمام مشاہیر نے اپنے سامنے کوئی پیغام یا نظریہ رکھا ہے، اور یہ سب کچھ ان کے معتقدات سے متعلق رہا ہے۔ کم از کم میرے مطالعے اور علم میں اب تک کوئی زندہ جاوید ادبی شخصیت نہیں ہے جس نے اپنے معتقدات سے انحراف کر کے دوامی ادب پیش کیا ہو۔ ہر ایک کے یہاں ماضی کی روایات اور اپنے نظریہ حیات سے انتہائی وابستگی نظر آتی ہے۔ ان کے نفس نفس میں ان کی تہذیب اور تصورات کی مہک تھی۔ اس بنا پر ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک حرف اس خوشبو سے معطر ہوتا تھا۔ اور جب بھی وہ کوئی تخلیق پیش کرتے تھے تو انہیں فکر کو فن پر مسلط کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کا فن، ان کی فکر کے ابلاغ کے لئے، اپنا مناسب ترین فارم تلاش کر لیتا تھا۔ مثال کے طور پر میں صرف کالی داس کے ڈراموں

شکنتلا اور اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کا نام لوں گا، جو بہترین فنی اسالیب کی وجہ سے زندہ ہیں۔

اردو ادب کے موجودہ ادیبوں کے ساتھ بڑی دقت یہ ہے کہ جس تہذیب میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ ان کی فنی کاوش اور اعلیٰ تخلیق کے لئے ناکارہ ہے۔ وہ مغرب سے متاثر ہیں ــــــ یہ کوئی بری بات نہیں ــــــ لیکن ان کے پیش نظر یہ بات نہیں ہے کہ فکری اکتساب اور تہذیبی تقاضوں کے پیش نظر انہیں وہاں سے کیا اخذ کرنا چاہئے اور کیا نہیں مغرب کی چمک دمک اور اس کی ایک خاص نہج پر ارتقا نے انہیں یہ تو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہمیں "پیروئ مغربی" کرنا چاہئے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مغرب نے اپنی روایات سے کبھی انحراف نہیں کیا، اور نہ اپنی تہذیبی قدروں سے کبھی انقطاع کیا۔ اور ہمارے ادیب نہ صرف یہ کہ اپنی ماضی کی تمام اچھی بری قدروں سے انحراف کر رہے ہیں، بلکہ ان سے جہل کی حد تک ناواقفیت بھی رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں انہیں ان تہذیبی قدروں، فکری بنیادوں کو درآمد کرنا پڑ رہا ہے جن کو عملاً نافذ ہوتے ہوئے دیکھنے سے وہ محروم ہیں۔ مزید برآں یہ اقدار ان کی سرزمین پر کیا عملی شکل اختیار کریں گی؟ اس کا حتمی جواب بھی ان کے پاس نہیں ہے، محض ایک تصوراتی ہیولہ ہے، جس کو ذہن میں بٹھا کر وہ جدید ادب جدید اقدار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ظاہر بات یہ ہے کہ جو تصورات دماغ سے اتر کر دل میں رچ بس نہ جائیں، وہ تاثیر کلام سے کیسے مملو ہو سکتے ہیں؟ دماغی کاوشیں فنکارانہ ادب تو پیش کر سکتی ہیں، لیکن اعلیٰ ادب نہیں پیش کر سکتی ہیں۔

بہرحال یہ احساس ہے جسے میں نے اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ادیب جب تک اپنی تہذیبی اقدار، اپنے فکری سرمائے اور نظریۂ حیات سے کامل آگاہی نہ پیدا کر لیں گے اور ہومر، ورجل، ملٹن، گوئٹے، دانتے، ایلیٹ، اقبال، ٹیگور وغیرہ کی طرح اپنی آگ سے اپنے آتش کدے کو روشن کرنے کی کوشش نہ کریں گے کبھی اعلیٰ ادب اور زندہ جاوید لوبیٹ شاہ کی توقع فضول ہے۔

رہ گئی اسالیب، ہیئت اور صنائع و بدائع کی بات، ان کے اکتساب کے سلسلے میں کون اختلاف کر سکتا ہے؟ لیکن جو زبان دل کی آواز کی پابند ہو گی تو وہ اپنی بات کہنے کا ڈھنگ خود کر لے گی۔ مکتبی مشقوں کے کرنے سے نہ تو طرز ادا سیکھی جا سکتی ہے اور اس میں اثر انگیزی کی روح ڈالی جا سکتی ہے۔

---

بقیہ:- اداریہ (بسلسلہ ص۲)

Hartford Seminary,
55, Elizabeth Street,
Hartford 5, Connecticut,
(U.S.A.)

(۳) Prof. Mohammad Iqbal Shedai,
Via Francessco Millio-55
TURIN (ITALY).

(۴) ڈاکٹر یاحید شہریار
استاد زبان اردو
دانشکدۂ علوم معقول و منقول
دانشگاہ تہران
(ایران)

مجید نظامی

# بی بی سی لندن میں مشاعرہ

پاکستان میں مشاعرہ کوئی انوکھی بات نہیں بقول کسے وطنِ عزیز میں "نولاٹ پٹیاں شاعر لبدا اے"[1] ممکن ہے لندن میں بھی شعرائے کرام کی کمی نہ ہو۔ ہزاروں پاکستانیوں میں سے بیسیوں شاعر تو ضرور ہوں گے جنھوں نے اپنا یا کسی مرحوم استاد کا کلام کسی نہ کسی مجلس میں ضرور سنایا ہوگا لیکن بی بی سی لندن میں گزشتہ ہفتے جو مشاعرہ ہوا (اس میں بدقسمتی سے شرکت کی سعادت نصیب نہ ہو سکی) اس کی روداد ایک ساتھی کی زبانی سن کر یوں معلوم ہوا جیسے لندن میں شعراء اور سامعین دونوں اجناس کا کال پڑگیا ہے بی بی سی لندن میں مشاعرہ ہو، اور صاحبِ صدر سمیت مبلغ پانچ شعرائے کرام اور آرگنائزر سمیت نصف درجن سامعین ہوں؟ یقین نہیں آتا مگر عین ممکن ہے یہ مشاعرہ مقامی زبان میں جسے "پرائیویٹ" کہتے ہیں وہ ہو۔ بہرحال اس کا جواب تو آرگنائزر سلیم شاہد ہی دے سکتے ہیں لیکن آپ کو اس سے کیا؟ آپ جناب انور جلال شمزا کی نظم "پکڈلی ـــــ رات کے سوا نو بجے" سنیں آپ کو یہ یاد دلانا کہ یہ انور جلال شمزا وہ آرٹسٹ اور فن کار ہیں شمزا صاحب کی توہین ہے۔ یہ نظم سنانے سے پہلے شمزا نے سامعین پر واضح کر دیا کہ اس نظم کے تمام کردار خیالی ہیں۔ اگر سامعین میں سے کسی کے ساتھ ان کی ملاقات ہو تو یہ محض اتفاق ہوگا۔ یہ نظم شمزا صاحب کے تجریدی آرٹ کی طرح آزاد ہے اس لئے آپ تھوڑی دیر کے لئے قافیے ردیف کے چکر کو بھول جائیں تو اچھا ہے ـــــ پیشتر اس کے کہ آپ یہ سوچیں کہ شمزا صاحب قافیے ردیف کی قید سے آزاد ہیں میں ان کا ایک قطعہ پیش کرتا ہوں دراصل یہ مجھے بعد میں پیش کرنا چاہئے تھا۔ بہرحال ملاحظہ فرمائیے۔

کاش یہ تیری جوانی بھی فسانہ بن جائے
میری بدنام محبت کے فسانے کی طرح
اور مرے بھولنے والے مجھے معلوم نہ تھا
تو بدل جائے گی اک روز زمانے کی طرح

اب نظم ملاحظہ ہو یہ "آزاد" ہی نہیں ذرا طویل بھی ہے لیکن آپ دامنِ صبر کو تھامے رکھیں گے تو مایوس نہیں ہوں گے، اگر آپ لندن نہیں آئے تو آپ لندن میں "اقبال کے شاہین" کی ایک شام کا تصور کر سکتے ہیں۔ (یہ شام دوسری شاموں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی) اور اگر "ولایت پلٹ" ہیں تو دوستوں سے کہہ سکتے ہیں کہ شمزا نے یہ آپ کی شان میں ہی لکھی ہے نظم تو طویل ہے ہی تمہید بھی طویل ہوگئی ہے نظم ملاحظہ ہو: ۔

یہ دنیا کا سب سے بڑا[2] شہر لندن
یہ مشہور پُرنور گلیاں یہ بستہ [illegible] سا لندن
یہ سرد اور بھیگی دسمبر کی راتیں
یہ ویسٹ اینڈ اور یہ پکڈلی کے یہ خواب
مدہوش آوارہ جلوے
یہ صد رنگ ماحول پرنور سڑکیں
یہ خاموش کیوں ہیں؟ یہ سنسان کیوں ہیں ؟
ابھی تو گھڑی میں سوا نو بجے ہیں

---

[1] اینٹ اٹھاؤ تو نیچے سے شاعر نکلتا ہے۔

[2] ٹوکیو سب سے بڑا شہر ہے لیکن آپ تسلیم کر لیں تو خوشامد [illegible]

اگر میں یہاں پہ ذرا دیر رک کر
کوئی لمحہ پل بھر تماشے کی خاطر
تماشائی بن کر ذرا سانس لے لوں
پکڈنڈی کو دیکھوں پکڈنڈی کے صد رنگ
پر نور سڑکوں کے کہرے کو دیکھوں
سڑک کے کنارے پہ کچھ منتظر لوگ
خاموش مبہوت گم سم کھڑے ہیں
یہ سب مضطرب ہیں یہ سب منتظر ہیں
یہ سب باری باری گھڑی دیکھتے ہیں
انہیں کیا ہوا ہے ؟ ذرا ان سے ہٹ کر
ٹھٹھر کر سمٹ کر یہیں معلوم کر لوں
یہ کیا سوچتے ہیں یہ کیا کر رہے ہیں
یہ کیا چاہتے ہیں
اگر اس سرے سے جہاں ڈفل کوٹ والا
کھڑا ہے میں آغاز کر دوں
اگر اس کے بکھرے ہوئے خیالات کو غیب
کے علم سے ایک آواز کر دوں
ابھی تو گھڑی میں سوا نو بجے ہیں
اگر دو منٹ تک کوئی خوبصورت سی لڑکی نہ گزری
اگر دو منٹ تک ان آنکھوں نے حرارت نہ پائی
اگر دو منٹ تک وہ مانوس چہرہ وہ بھرپور سینہ وہ ٹانگیں نہ دیکھیں
جو ہر رات خوابوں میں بے خواب کر دیں
تو کونے کے پب میں "پیل ایل" پی کر ان آنکھوں کو سی کر
یا مرکے یا جی کر چلا جاؤں گا مگر ابھی تو گھڑی میں سوا نو بجے ہیں ۔
اگر دو منٹ تک الو بس نہ آئی

اگر دو منٹ تک یہ لڑکی جو گھٹنے سے میری طرح منہ اٹھائے اسے دیکھتی
ہے جو موجود ہے پر متعارف ہی نہیں ہے ۔
اسے ڈھونڈتی ہے جو خوابوں میں ہے اور ویسے نہیں ہے
اگر دو منٹ تک الو بس نہ آئے اگر دو منٹ تک یہ لڑکی جائے
تو میں اس کو جا کر غم دل سنا کر، ذرا سا ہنسا کر، برانڈی پلا کر
بغل میں دبا کر اکیلے یا پھر شاید ہمراہ اس کے چلا جاؤں گا گھر
ابھی تو گھڑی میں سوا نو بجے ہیں
یہ لڑکا جو گھٹنے سے میری طرح منہ اٹھائے، بغل میں پرانی کتابیں
دبائے یہاں پر کھڑا ہے
اسے دیکھتا ہے اُسے دیکھتا ہے مگر دراصل یہ مئے دیکھتا ہے
اکیلا ہے شاید
کتابوں کے سیلاب نے ہڑبڑا کر پکڈنڈی میں اس کو دھکیلا ہے شاید
اگر دو منٹ تک یہ لڑکا میری مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھا
اگر دو منٹ تک میری شوخ آنکھوں میری ان نگاہوں کے جادو نے
اس کو وہ جرات نہ بخشی ۔
وہ جرات جو اس کو میرے پاس لائے ۔
تو میں طیش کھا کر سب کچھ بھلا کر ٹیکسیوں پہ چالیس سے کھول لوں گی
کہ "میں آ رہی ہوں"
ابھی تو گھڑی میں سوا نو بجے ہیں
اگر دو منٹ تک وہ کم بخت آوارہ عورت نہ آئی تو دو منٹ تک اس نے
منحوس صورت مجھے نہ دکھائی، اگر دو منٹ اور ایسے ہی گزرے
یہ طوفان یہ بارش یہ ٹھنڈی ہوائیں اگر دو منٹ اس کا سایہ نہ لائیں
تو یہ رات کتنی مہربان ہوگی
ابھی تو گھڑی میں سوا نو بجے ہیں
ابھی تو یہ صد رنگ ماحول پر نور سڑکیں یہ بھیگی ہوئی شب جواں ہے

ٹریفک رواں ہے
یہ لمبی بسیں یہ سکوٹر یہ کاریں میرے اور تیرے درمیاں ہیں
مگر تو کہاں ہے
اگر دو منٹ تک مجھے اور اس جگہ رکنا پڑے گا تو بس یہ سمجھ لیجئے
آج شب بیوی کے قدموں پر جھکنا پڑے گا
وہ آئی وہ آئی بلا آخر تو آئی ـــ ارے بھائی ٹیکسی
جھٹاپٹ خدارا "فلم واک" چلیے

اس نظم کے بعد آپ کیا سنیں گے ؟ سید مظفر حسین کراچی کے دو شعر عرض ہیں سنئے اور سر دھنئے :

تلخی سے جو ملی ہے ساقی گلفام کے ساتھ
ہوشیاری کی بھی تلقین ہے ہر جام کے ساتھ
ہم کو دعویٰ ہے وفا کا نہ وفائی کی امید
سب بدل جاتے ہیں اس گردش ایام کے ساتھ

اب ریڈیو پاکستان کراچی کے کلیم اللہ صدیقی کا کلام بلاغت نظام ملاحظہ ہو۔

جہاں میں اور کسی کام کا نہیں ہوتا
وہ سخت دل کہ جو درد آشنا نہیں ہوتا
ہوا ہے کیا ترے ذوق عطا کو اے ساقی
بلند اگر میرا دست دعا نہیں ہوتا
جہاں میں سب ہیں کلیم اعتماد کے قابل
مگر وہ دل جو خراب وفا نہیں ہوتا

اس مشاعرے میں جناب صدیق کلیم لیکچرر گورنمنٹ کالج لاہور نے بھی سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا افسوس ہے ان کا کلام نہیں مل سکا اور آپ محروم رہے ہیں۔ پھر کبھی سہی زندہ یار صحبت باقی ۔

راوی کا کہنا ہے صدر مشاعرہ جناب محمد علی خاں ملیح آبادی تھے جو جوش کے ہم مکتب اور دوست اور ساٹھ ۶۰ سال سے لندن میں مقیم ہیں خود شاعر بھی ہیں۔ (بشکریہ نوائے وقت لاہور)

---

۲ے لندن میں شراب خانے کا نام ۳ے بیئر کا نام
۴ے لندن کے علاقے کا نام

---

بقیہ

## کلچر اور ادب

بسلسلہ ٹ

موسیقار کے لیے نغمہ تخلیق کرتا ہے۔ ایکٹر اور اداکار کے لئے ڈرامے اور ناٹک ایجاد کرتا ہے۔ خطاط اور نقاش کے اظہار کمال کے لئے بنیادی مصالحہ مہیا کرتا ہے اور پھر ان سب فنون کے لئے ناقد، شارح اور مفسر کے فرائض سرانجام دیتا ہے ۔

یہ سب کچھ تو ہمارے پہلے سوال کے متعلق تھا یعنی کسی کلچر کی موجود اور مخصوص صورت میں ادب کی اہمیت کیا ہے اور میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی کلچر کی باطنی قدروں کی تعریف، اظہار اور تعین اور اس کی ظاہری صورتوں کی تشکیل، بیان اور صورت گری بیشتر ادیب ہی کے ہاتھوں تکمیل پاتی ہے ایسی اہمیت ادب کو کلچر کے ارتقائی عمل میں بھی حاصل ہے۔ ہر ذی شعور ادیب اپنے ہم عصر کلچر کا محض ترجمان ہی نہیں ہوتا۔ ناقد بھی ہوتا ہے وہ عمومی ذوق کی تعبیر و تشکیل ہی نہیں کرتا اس کی تربیت بھی کرتا ہے وہ خوبی اور برائی حسن اور بدصورتی کے عمومی معیار کی وضاحت ہی نہیں کرتا اس معیار کی صحت اور نادرستی کا بھی جائزہ لیتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے اور گرد و پیش سے محض کسب علم ہی نہیں کرتا تعلیم بھی دیتا ہے۔ اسی سبب سے جملہ اہل فن و ہنر کی صف میں ادیب کی حیثیت سب سے زیادہ معتبر ہی نہیں سب سے زیادہ ذمہ داری بھی ہے۔ وہ بیک وقت اپنے کلچر کی تخلیق بھی ہوتا ہے اور خالق بھی، اس کی آیت بھی اور اس کا مفسر بھی، اپنی ذات میں اپنے عہد کی تصویر بھی اور مصور بھی۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان)

# گرد و پیش

## خواتین کا ادبی ذوق

ملتان ۲۰ جولائی ۔ وزارت داخلہ نے یونسکو کی درخواست پر تعلیم یافتہ خواتین کے ادبی ذوق کا سروے شروع کیا ہے اس سلسلے میں ایک سوال نامہ ملتان کے ڈپٹی کمشنر کی وساطت سے ڈویژنل انسپکٹریس آف اسکولس، ڈسٹرکٹ انسپکٹریس آف اسکولز ۔ پرنسپل گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج اور خواتین کے زنانہ ہائی اسکولوں اور مڈل اسکولوں کی ہیڈ مسٹریس اور لیڈی ٹیچروں کو بھیجے گئے تھے، اس سوال نامے میں وضاحت کر دی گئی تھی کہ جواب دیتے وقت اخباروں اور رسالوں کا ذکر نہ کیا جائے. بلکہ صرف پسندیدہ کتابوں کا ذکر کیا جائے۔ خواتین نے جو جواب دیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں شادی شدہ خواتین کا تناسب ۱۲ فی صد سے زیادہ نہیں، جواب میں خواتین نے اپنی سماجی پوزیشن، نہایت اچھی قرار دی ہے ۔ ان سب نے گرمیوں کی دوپہر اور سردیوں کی راتوں کو اپنے مطالعہ کا وقت بتایا ہے اور ہر ایک نے ہفتہ میں چار ناول یا تاریخی کتب پڑھنے کا دعویٰ کیا ہے، ان جوابات کے مطابق بعض خواتین ہفتہ میں دس کتب کا بھی ۔ کرتی ہیں۔ ان خواتین میں ۔۴ فیصد معانی پر جوش عشق و محبت ۔۔۔ ین پڑھتی ہیں ۔ ۴ فی صد ڈاکہ، چوری، جاسوسی اور سنسنی خیز قتل کے افسانے پسند کرتی ہیں۔ ۱۱ فی صد ادبی تفریحی قسم کا لٹریچر اور باقی ماندہ دس فی صد مذہبی تاریخی اور سائنس کی وقیق علمی و تحقیقاتی کتب کی دلدادہ ہیں۔ خواتین نے بتایا ہے کہ وہ مطالعہ کے لئے کتابیں زیادہ تر کرائے پر لیتی ہیں، ۲۵ فی صد کتابیں خریدتی ہیں ۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز خواتین عمرانیات، تاریخ، فلسفہ اور انگریزی ادب کو پسند کرتی ہیں (نوائے وقت)

## ملکی ادب کی فہرست تیار کی جائے گی

کراچی ۲۲ جولائی ۔ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن جلد ہی یکم جنوری اور ۳۰ جون ۱۹۶۰ء کے درمیان شائع ہونے والے مکمل ادب کی ایک فہرست تیار کرنے کا کام شروع کر رہی ہے ایسوسی ایشن نے اس مقصد کے لئے گذشتہ دنوں ایک سب کمیٹی قائم کی تھی، اس نے اس کام کے لئے حکومت سے مالی امداد کی درخواست کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے سب کمیٹی قومی ادب کی فہرست سازی کا کام مقامی ناشروں کے رسالے کتابی دنیا کے تعاون سے کرے گی ۔

## اسٹالین کی کتابوں پر جرمانہ

سنگاپور ۲۴ جولائی ۔ روس کے سابق آمر اسٹالین کی لکھی ہوئی تین کتابوں کو رکھنے پر ایک ملاح کو ۱۵۲ روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا ۔ یہ کتابیں پیپلز پبلشنگ ہاؤس پیکنگ نے شائع کی تھیں ان میں سے ایک "منتخب مضامین" اور دوسری لینن ازم کے مسائل ہے ۔

## اردو کو حقارت کی نظر سے دیکھنے والے اپنی ماں کو حقارت سے دیکھتے ہیں (بابائے اردو)

کراچی ۲۰ رجولائی ۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے آج یہاں کہا کہ جو لوگ اردو کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ اپنی ماں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ آج اس استقبالیہ میں تقریر کر رہے تھے جو کوئنز روڈ دینی کمیٹی کی چیرمین بیگم سرور عرفان اللہ کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو خواتین نے میٹروپول میں دی تھی۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہمارے ملک کے لوگ اپنی مادری زبان استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں اور غیر ملکی زبانیں بولنا فخر کی بات سمجھتے ہیں ۔

بابائے اردو نے خواتین پر زور دیا کہ وہ مجوزہ اردو یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے جماعت بنائیں ۔ انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس کام میں مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ مفید کام کر سکتی ہیں ۔ بابائے اردو نے موجودہ حکومت کی تعریف کی کہ وہ تعلیمی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دے رہی ہے بیگم سرور عرفان اللہ نے تقریر کرتے ہوئے پاکستانیوں سے اپیل کی کہ وہ بنیادی جمہوریت کو ایک موثر ادارہ بنانے کے لئے کام کریں ۔

## مولانا احسن مارہروی کی یادیں

۳۰ رجولائی سنہ ۱۹۶۰ء کو کراچی میں مولانا احسن مارہروی مرحوم کی بیسویں برسی منائی گئی ۔ اس تقریب کی تفصیلی روداد آئندہ شمارے میں شائع کی جائے گی ۔ قومی زبان کے زیر نظر شمارے میں مولانا مرحوم کی یاد میں دو تحریریں شامل ہیں، ایک تو بابائے اردو کا پیغام جو ان کی برسی کے موقع پر پڑھا گیا اور دوسرے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مضمون جو علیگڑھ میگزین سے نقل کیا گیا ہے ۔

# سرسیّد احمد خان

## (حالات و افکار)

| | |
|---|---|
| مصنف :- ڈاکٹر مولوی عبد الحق | ضخامت : ایک سو چھیانوے صفحات |
| قیمت : چار روپے | ناشر : انجمن ترقی اردو - اردو روڈ - کراچی |

سرسید احمد خاں ان مشاہیر میں سے ہیں جن کی بے لوث خدمت اور ناقابل شکست جرأت تاریخ کے انتہائی نازک ادوار میں قوم کا سہارا بنی ہے۔ مسلمانان ہند اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ جب ان کی ہمّت پست ہو چکی تھی ان پر افسردگی اور مردنی کی کیفیت طاری تھی وہ خود اعتمادی اور عزت نفس تک سے محروم ہو چکے تھے اور توہمات و تعصبات اور رجعت پسند عناصر انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے تو ان کے درمیان سرسید جیسی ایسی شخصیت موجود تھی جس نے مستقبل کو نظر میں رکھا، اس کے بارے میں سوچا اور اس کا خاکہ مرتب کیا اور حال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ہر مصلح کی طرح سرسید بھی ہدف تنقید بنے اور ان پر بھی عاقبت نا اندیش اپنوں نے ہی طعن و تشنیع کے تیر برسائے مگر وہ کسی مخالفت کو خاطر میں نہ لائے اور بالآخر وہ ذہنی اور فکری انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے جس کے بغیر مسلمانان ہند کا بحیثیت قوم وجود تک خطرے میں تھا۔ یورپی استعمار کا مقابلہ فرسودہ ہتھیاروں سے ممکن نہیں تھا اس لئے جدید اسلحہ درکار تھے۔ سرسید احمد خاں نے سب سے پہلے اسی کی فکر کی! یہ ضرور ہے کہ اس دور میں کوئی نہ کوئی "سید احمد خاں" لازماً پیدا ہوتا مگر وہ جو کوئی بھی ہوتا اسے آج ہم اپنا محسن مانتے اور ہماری تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا!

سرسید احمد خاں کے حالات و افکار اور ان کے دور کے مخصوص تقاضوں اور مطالبوں کا تجزیہ کرنے اور سرسید مرحوم کی شخصیت، تحریک اور مطمح نظر کو پوری طرح اجاگر کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو بھی اس کا احساس ہے۔ فرماتے ہیں "اب نہ وہ عقیدتمند ہی رہے جو ان کی (سرسید) ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے تھے اور نہ وہ مخالف جو ان کے ہر کام کو ریاکاری، خوشامد اور اسلام دشمنی پر محمول کرتے تھے اس لئے بے لاگ مورخ کیلئے موقع ہے کہ وہ اس عہد کی تاریخ اور ماحول پیش نظر رکھ کر ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کی صحیح تصویر کھینچ دکھائے۔ (مگر) میں نے اس نیت سے قلم نہیں اٹھایا یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں لیکن چونکہ مجھے کئی سال تک ان کو پاس سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے اس لئے میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے انہیں کیسا پایا اور وہ کس کردار اور کس سیرت کے انسان تھے" ـــــ مولوی صاحب نے سرسید کی زندگی کا خاکہ اور ان کی تحریک کے بعض پہلوؤں کا جائزہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب سے بہتر اور ان سے زیادہ اعتماد کے ساتھ اس موضوع پر شاید ہی کوئی قلم اٹھا سکے۔ مشاہدہ بہرحال تحقیق سے افضل ہوتا ہے اور مشاہدہ اور تحقیق یکجا ہو تو اس سے زیادہ مستند تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ بہرحال مولوی صاحب کو اگر وہ سری مصروفیتوں نے مہلت نہ دی تو ان کی یہ کتاب بھی (جو دراصل مضامین اور تقاریر کا مجموعہ ہے) مستقبل کے مورخین کے لئے انتہائی اہم مواد ثابت ہوگی۔ (روزنامہ امروز لاہور) ۲۲ ۵۰ء

# مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

عبدالحق ۔

ابائے آردو کی صدارتی تقریروں اور لیکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے یہ کتاب انجمن
نے دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی تھی مگر وہ ایک مدت سے ختم ہو کر کمیاب
ہوچکی ہے ، اور اس کے نسخے بمشکل دستیاب ہوتے ہیں ، چنانچہ ملک میں
س کی بہت مانگ تھی اس بنا پر یہ نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مطبوعہ
مطبات کے علاوہ بعد کے خطبات اور بعض تقریریں بھی شامل کردی گئی ہیں ۔
شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے ۔ ۳۰۰+۱۲ صفحات ، لکھائی
چھپائی خوش نما کاغذ اعلیٰ قسم کا لگایا گیا ہے ۔ قیمت فی جلد ساڑھے چھ رپے ۔

س ۔

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا
وجہی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ء اس کا سنہ تصنیف ہے ۔ آردو
نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جست وجو کے بعد خاص اہتمام اور
صحت سے چھاپی گئی ہے ۔ شروع میں بابائے آردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے ۔ قیمت پانچ رپے آٹھ آنے ۔

الاردو ۔

انجمن ترقی اردو کے رسالہ" اردو کے سی ساله پرچوں سے بہترین مضامین کا بہترین
انتخاب ہے جسے انجمن کی پنجاہ ساله جوبلی کی یادگار میں مرتب کرکے شائع
کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے اور سب کے سب کارآمد
اور عمدہ معلومات سے پر ہیں ۔ کتاب کی جان دو مضامین ہیں : (۱) رومی ،
نطشے اور اقبال از ڈاکٹر عبدالحکیم (۲) نذیر احمد کی کہانی کچھ آن کی اور
کچھ میری زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے ۔

ملنے کا پتہ

**اردو اکیڈیمی سندھ ۔ مولوی مسافر خانہ ۔ بندر روڈ کراچی**

## مطبوعـــات انجمن ترقی اردو پاکستـــان

ا کی اہمیت ۔

از ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ یہ کتاب اردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ
ہے ۔ اس میں روایت کی اہمیت ۔ اردو شاعری میں گل و بلبل کے اشارے
کا دبستان شاعری ۔ اردو شاعری میں حب الوطنی کی روایت اور اردو تنقید
روایت اور تجربے کے ایسے پر مغز اور خیال افروز مقالات شامل ہیں ۔
اردو ادب کے تاریخی مد و جزر کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے مختصر الفاظ
یہ تحقیقاتی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے ۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے ۔

کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔

موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام
نے جو قابل قدر حصہ لیا اور اسے اس قابل بنایا کہ آگے چل کر وہ ایک مہذب
زبان کی حیثیت حاصل کرسکے اس موضوع پر ایک معلومات افزا مقالہ ہے جو
ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خاص انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے
تیسرا ایڈیشن ۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ۔

ت ولی ۔

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی گجراتی کا مکمل دیوان جو کئی قلمی
نسخوں سے مقابلہ کرکے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے مرتب کیا ہے
مع مقدمہ و فرہنگ الفاظ ۔ تیسرا ایڈیشن قیمت پانچ روپے ۔

ملنے کا پتہ

**اردو اکیڈیمی سندھ ۔ مولوی مسافر خانہ ۔ بندر روڈ کراچی**

قاری عبدالوحید منیجر انجمن پریس نے چھاپ کر دفتر انجمن ترقی اردو پاکستان ، اردو روڈ کراچی سے شائع
قیمت فی پرچہ :- چار آنے قیمت سالانہ :- پانچ روپے
مدیر :- [illegible] خواجہ
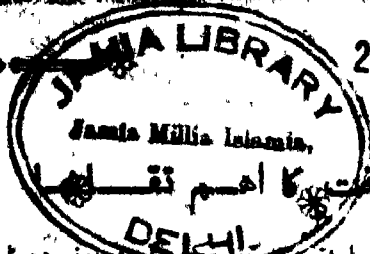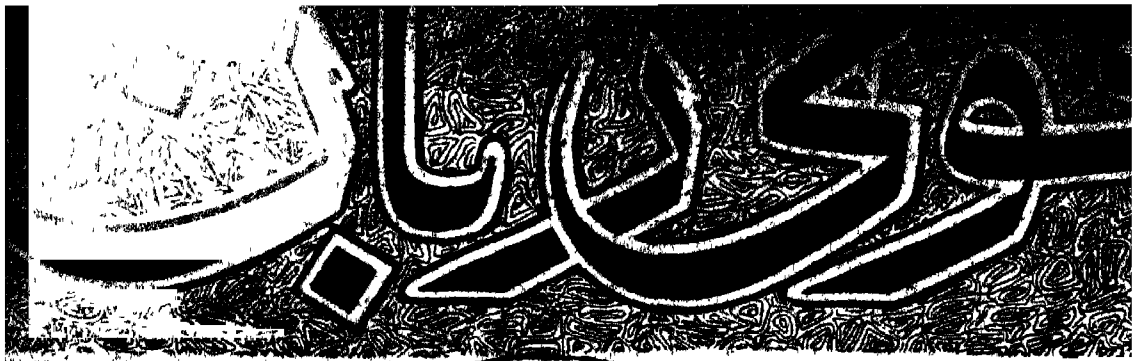
بابائے اردو

## وقت کا اہم تقاضا

اس سوال کے طے ہو جانے کے بعد کہ اردو یونی ورسٹی کا قیام وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، ایک دوسرا سوال بھی سامنے آتا ہے کہ یونی ورسٹی کے قیام کے لئے رقم کہاں سے آئے گی اور کس طرح فراہم کی جائے گی۔ میں نے سید احمد خاں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور فیض حاصل کیا، لیکن افسوس کہ ان سے چندہ مانگنے کا گر نہ سیکھ سکا، جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں مجوزہ اردو یونی ورسٹی کے لئے سردست صرف پچاس پچپن لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔ یہ رقم بہت بڑی نہیں۔ صرف کراچی کے دردمند اور مخیر اصحاب اس رقم کو بڑی آسانی سے فراہم کرسکتے ہیں، لیکن یہ میری کوتاہی ہے کہ مجھے مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا مگر اس کے باوجود ہاتھ پھیلائے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اس لئے میں اپنے ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری دست گیری کریں، مجھے سہارا دیں اور اردو یونی ورسٹی کے قیام میں میری مدد کر کے مجھے ایک نئی زندگی عطا کریں۔ میں اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اردو یونی ورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔ اردو یونی ورسٹی بن کر رہے گی۔ یہ خود قضا و قدر کا منشا ہے۔ سوال صرف دیر سویر کا ہے۔ اگر آپ نے میری مدد کی اور یونی ورسٹی کے قیام کے وسائل و اسباب مہیا کر دئے تو یہ جلد بن جائے گی اور میری زندگی میں ہو جائے گی۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھے مانگنا نہیں آتا۔ لیکن [illegible]

# چراغ منزل

(بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نوےویں سالگرہ کے موقع پر ان
کی پرخلوص اردو خدمات سے متاثر ہو کر)

یہ جور گلشن ویراں! یہ تلخی حالات!
کہاں طلوع سحر؟ ہے ابھی اندھیری رات!
یہ سہمے سہمے ستارے! یہ دھندلا دھندلا جہاں!
ابھی زمیں سے فلک تک ہے ظلمتوں کا سماں
ابھی ہے زلف پریشاں نگار اردو کی
کہ بزم ہے ابھی ویراں نگار اردو کی
ابھی سحاب میں ہے آفتاب کی منزل
ابھی ہے دور بہت انقلاب کی منزل
تم، اے ادب کے پیامی! چراغ منزل ہو
شب سیاہ میں روشن منار ساحل ہو
تمہیں تعلق خاطر ہے وہ سویروں سے
کہ ہر قدم پہ الجھنا پڑا اندھیروں سے
تمہیں سے آج منور فضا ہے اردو کی
نظر فروز جہاں میں ضیا ہے اردو کی
ادب نواز! تمہیں آبروئے فن بھی ہو
تمہیں خود انجمن آرا بھی، انجمن بھی ہو
خلوص دل کو ہے نسبت تمہارے کام کے ساتھ
پیام جوش عمل ہے تمہارے نام کے ساتھ
الٹ دو ہاتھ سے اپنے نقاب اردو کا!
دکھا دو اہل نظر کو شباب اردو کا!

---

(یہ نظم بزم عبدالحق [illegible]
حیدرآباد [illegible]
[illegible])

انجمن ترقی اردو پاکستان کا
پندرہ روزہ

# قومی زبان

نگران :-
بابائے اردو
جلد ... ... ... ۱۷
شمارہ ... ... ... ۴
۱۶ اگست ۱۹۶۰ء

## اس شمارے میں



# چودہ اگست

چودہ اگست کی مبارک تاریخ کو ہم غیروں کی غلامی سے آزاد ہوگئے ہمیں آزاد ملک پاکستان بھی مل گیا۔ مگر جس پاکستان کی ہمیں جستجو تھی، وہ ابھی تک نہیں بنا۔ یہ بنتے بنتے ہی بنے گا۔ آزادی اور اقتدار دو بڑی عجیب قوتیں ہیں ان کا سنبھالنا ہر بشر کا کام نہیں۔ ہمارے رہنما، جو اب تک غیروں کے حکم اور اشارے پر چلتے تھے جب دفعتاً آزاد اور با اقتدار ہو گئے تو وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ آزادی اور اقتدار کو ملک کی بہبودی اور ترقی کے لیے کس طرح استعمال کیا جائے، انہوں نے ان دونوں قوتوں کو اپنی ذات کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ کیا اہل حکومت اور کیا اہل تجارت، کیا اہل علم، سبھی، ملک کو لوٹنے اور اپنا گھر بھرنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ملک رہے یا نہ رہے اپنا گھر بھرا رہے۔ اس نے تمام ملک میں افراتفری پیدا کر دی۔ لوگوں کے اخلاق گر گئے، رشوت، چور بازاری اور بد دیانتی عام ہو گئی اور پاکستان کی حالت اس نوبت کو پہنچ گئی کہ کسی تدبیر یا قانون سے اصلاح کی توقع نہ رہی۔ ایسی حالت میں صرف دو صورتیں ہوتی ہیں، یا تو ملک ہاتھ سے نکل جائے اور دوسروں کے قبضے میں چلا جائے یا ایسا انقلاب برپا ہو کہ تمام بد اعمال اور سیاہ کار عناصر کو ختم کر کے ملک کو تمام اخلاقی غلاظت سے پاک کر دیا جائے۔ ہماری خوش قسمتی سے پاکستان میں دوسری صورت رونما ہوئی اور عین وقت پر جب کہ حالت نہایت نازک ہو گئی تھی ایک مرد دلاور نے اس کو دستے ہوئے ملک کو بچا لیا۔ انسان کی چھ ہزار سالہ تاریخ میں سینکڑوں انقلاب آئے اور ہر انقلاب کے دامن پر قتل و غارت اور خون ریزی کے دھبے نمایاں ہیں مگر پاکستان

انقلاب امن و دلجوئی کا پیغام لایا اور ابرِ رحمت بن کر آیا جس نے پاکستان کی سوکھی کھیتی میں نئی جان ڈال دی۔

مشہور ہے کہ بخار کا پیچھا بھاری ہوتا ہے، لیکن انقلاب کا پیچھا بہت زیادہ بھاری ہوتا ہے اس کا سنبھالنا انتہائی مشکل کام ہے انقلاب کے بعد پاکستان میں ایسے عظیم الشان اور حیرت انگیز کام ہوئے ہیں جن کا عمل میں لانا گزشتہ حکومتوں کے بس کی بات نہ تھی۔ جن جن اصلاحات کا آغاز کیا گیا ہے اور جن جن اصلاحات کے خاکے آیندہ کے لئے تیار کئے گئے ہیں ان کو عمل میں لانا اور مختلف شعبوں کو قابو میں رکھنا آسان نہیں، زراعت، تجارت، تعلیم اور ملکی نظم و نسق اور ان کی سینکڑوں شاخیں ایسی ہیں کہ ان پر بہت نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی اور ان کی نگہداشت کے لئے ایسے بے لوث اور محبِ وطن کارکنوں کا ہونا لازمی ہے جو اپنی ذات کو نظرانداز کر کے ملک کی بہبودی کو مقدم رکھیں۔ خلوص اور راستی سے کام کرنے والوں کے لئے بہت سی آفتیں ہیں۔ سب سے بڑی آفت حسد اور رقابت ہے۔ ان کو بدبین اور حاسد افراد سے محفوظ رکھنا صدرِ مملکت کا فرض ہے۔ ہر شخص جو کسی حیثیت سے بھی ملک کی خدمت کرتا ہے، وہ نہ صرف قدر افزائی کا مستحق ہے بلکہ اس کی حفاظت لازمی ہے۔ یہ صدر ایوب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسے کاردان اور تجربہ کار کام کرنے والے مل گئے ہیں کہ جو نام و نمود کے لئے نہیں بلکہ ملک کی بہبودی کی خاطر شب و روز اپنے فرائض کے ادا کرنے میں منہمک رہتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، ہر سچے کام کرنے والے کی گھات میں طرح طرح کی آفتیں لگی رہتی ہیں، ایسا نہ ہو کہ خلوص اور راستی سے کام کرنے والے گر جائیں اور دوسرے اوپر آجائیں ہمیں صدرِ مملکت کے تدبر اور دور بینی پر کامل اعتماد ہے کہ وہ ان آفتوں کو ابھرنے نہ دیں گے۔

سب سے بڑی چیز جس کی طرف اہلِ ملک کی نظریں لگی ہوئی ہیں، وہ پاکستان کا آیندہ طرزِ حکومت ہے۔ بنیادی جمہوریت ایک نیا تجربہ ہے، اس کی بنیاد اس امر پر رکھی گئی ہے کہ عامۃ الناس جو اب تک امورِ سلطنت میں دخل دینے سے محروم رکھے گئے تھے، ان کو حکومت کا حقدار بنایا جائے یہ بہت بڑی اصلاح ہے اور اگر یہ دیانت اور صداقت کے ساتھ عمل میں لائی گئی تو ملک کی بڑی خوش نصیبی ہوگی اور چونکہ تخریب پسند عناصر کو سیاست سے خارج کر دیا گیا ہے اس لئے امید ہوتی ہے کہ یہ تجربہ کامیاب ہوگا لیکن ایک دوسری چیز جس کے لئے لوگ بے چین ہیں وہ آزادیٔ عمل اور آزادیٔ رائے ہے ہم کو اس کا ڈر ہے کہ جو نئی اصلاحیں عمل میں آرہی ہیں اور جن نئے کاموں کا تجربہ کیا جا رہا ہے ان میں ایسی شدت اور سختی برتی جائے کہ آزادی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کام کی ترقی اور توسیع کے لئے آزادی لازم ہے اور جب تک انسان کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے گا وہ کبھی کوئی قابلِ قدر کام نہ کر سکے گا اور اس کی صلاحیت اور قوت مردہ ہو جائے گی، لیکن آزادی کے ساتھ بھی کچھ پابندیاں اور شرائط ہیں اگر ان پر نظر نہ رکھی جائے تو آزادی ایک خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے اس میں اہلِ حکومت اور اہلِ ملک دونوں پر کچھ فرائض عاید ہوتے ہیں۔ اہلِ حکومت اگر اہلِ ملک پر اپنے اقتدار اور قوت کے بل پر غیر ضروری اور ناروا سختیاں اور پابندیاں عاید کر دیں گے تو تمام انتظامی اور اصلاحی کام بے اثر ہو جائیں گے اور دوسری طرف اگر اہلِ ملک حد سے تجاوز کر جائیں اور اپنی آزادی کو اس بری طرح استعمال کرنے لگیں گے جیسے کہ گذشتہ دور حکومت میں ہوا تو ملک کو ایک بڑا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

آج کا دن آزادی کی یاد منانے کے ساتھ ساتھ آزادی کے بہتر پہلو پر غور کرنے کا بھی دن ہے۔ ایک طرف اہلِ حکومت کو اور دوسری طرف اہلِ ملک کو حکومت کے استقلال کے لئے آزادیٔ عمل اور آزادیٔ رائے لازم و ملزوم ہے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ آزادی کو صحیح معنوں میں اس کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ جہاں صدرِ مملکت نے آزادی کے دن یہ دعا کی

(باقی ص ۲۳ پر)

# یادوں کے چراغ

میں جب اول روز مدرسۃ العلوم مسلمانان (ایم اے او کالج علی گڑھ)
ے اسکول میں داخل ہوا اور بورڈنگ ہاؤس میں پرنسپل صاحب کی عنایت
ے کمرہ مل گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نئی دنیا میں آ گیا ہوں وہاں کے طالب علم
ن کی عادات اور بے تکلفیاں اور مصروفیات، وہاں کے اساتذہ وہاں
ا ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے دنیا بدل گئی پر ان کا مزہ کبھی نہ بدلا،
سجد اور نمازیں اور موذن کی کڑک دار آواز یہ سارا ماحول میرے لئے
الکل نیا اور عجیب سا تھا ۱۸۸۸ء یا ۱۸۸۹ء کی بات ہے اس وقت
الب علموں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ طالب علم ہندوستان
ے ہر صوبے اور علاقے کے تھے۔ بعض اوقات ہندوستان کے باہر کے بھی
آ کر داخل ہو جاتے۔ یہاں آ کر سب ایک ہو جاتے تھے اور کوئی صوبائی
تیاز باقی نہ رہتا۔ سب اردو بولتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے میرے
ایک ہم جماعت بنگالی چاٹگام کے اس قدر صاف اور بے تکلف اردو
بولتے تھے اور ان کا لہجہ بھی ایسا تھا کہ میں ابتدا میں یہی سمجھتا رہا کہ یوپی
کے کسی مقام کے رہنے والے ہیں۔

کھیلوں میں یہاں کے طالب علموں نے بڑا نام پایا تھا خاص کر کرکٹ
میں جو خاص انگریزی کھیل ہے اسی لئے انگریز یہاں کے طالب علموں کو
بہت پسند کرتے تھے اور ان سے بہت خوش تھے۔ یہ تھے بھی بہت چست و
چالاک خوش اخلاق۔ ایک خاص بات جو مجھے یہاں نظر آئی وہ قومیت کی
جھلک تھی جو کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کالج کے بانی سرسید احمد خاں
کا طفیل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا
کیا اور اس احساس کو تقویت ان اکابر قوم سے پہنچتی تھی جو کسی نہ کسی تقریب
سے کالج میں یا سید صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔

خصوصاً ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں بڑی چہل
پہل اور رونق رہتی تھی، دور دور سے لوگ ان جلسوں میں شریک
ہونے کے لئے آتے تھے خاص کر مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی کا
کلام سننے کے لئے کھچے چلے آتے تھے۔ سید صاحب مولانا نذیر احمد کا لکچر پہلے
دن رکھتے تھے۔ لوگ اس کے انتظار میں ٹھیرے رہتے تھے اور جانے نہیں
پاتے تھے ان کی طلاقت، ظرافت، بے باکی و آزادی اور پھر جداگانہ ایک
سماں پیدا کر دیتی تھی ایسے پرزور مقرر شاذ ہوتے ہیں، وہ بڑے منہ
پھٹ اور بے باک بھی تھے ایک بار انہوں نے اپنے لکچر کا سارا زور اس
بات پر صرف کر دیا کہ تہذیب الاخلاق جو بند ہو گیا تھا اسے پھر جاری کیا
جائے۔ سب کچھ کہنے کے بعد کہنے لگے کہ سید احمد خاں شاید یہ کہیں گے
کہ دوسرے کاموں سے جو وقت بچتا ہے وہ سب کا سب تفسیر قرآن لکھنے
میں صرف ہو جاتا ہے اس لئے تہذیب الاخلاق کے لئے وقت نہیں دے سکتے اس
کے جواب میں مولوی نذیر احمد نے فرمایا، مگر اس تفسیر کے اوراق تو شب برات
میں لونڈوں کے پٹاخے بنانے کے کام آئیں گے۔ تمام ہال قہقہوں سے
گونج اٹھا۔ مولانا حالی جب اپنی نظم پڑھتے تھے تو کہرام مچ جاتا تھا ایسے جلسے
جو ہماری تہذیب و زبان اور علم و ادب کی جان تھے دوسری کسی جگہ کہاں

نصیب ہوتے تھے۔

انٹرنس (جسے آج کل میٹریکولیشن کہتے ہیں) کے امتحان میں کامیابی کے بعد میں کالج کی جماعتوں میں چلا گیا اسکول میں سب معلم ہندوستانی تھے سوا ہیڈ ماسٹر ہورسٹ کے جو بلند قامت گراں ڈیل شخص تھے اور کسی فوج کے کرنل معلوم ہوتے تھے۔ سیکنڈ ماسٹر ولایت حسین تھے جو بڑے محنتی اور فرض شناس تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی انہیں کے ذمہ تھی اور وہ بورڈنگ ہاؤس ہی کے ایک کمرے میں رہتے تھے ان کے ذمہ اور بھی کئی کام تھے۔ سر سید ... محسن الملک اور دیگر اکابران کی بہت عزت کرتے تھے میرے حال بڑی مہربانی فرماتے۔ وہ ہماری جماعت کو ریاضی بھی پڑھاتے تھے، ایک دن میں کسی وجہ سے ان کا کام کر کے نہ لایا۔ وہ بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے "میں تو تمہارا بھاٹ بنا ہوا ہوں اور جگہ جگہ تعریف کرتا پھرتا ہوں اور تم ہی میرا کام کر کے نہیں لاتے۔ مجھے بہت شرم معلوم ہوئی اور اس کے بعد سے میں نے اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ میں کبھی کسی کھیل میں شریک نہ ہوا۔ اسٹریک کئی بار مجھے کمرے سے پکڑ کر کھیل کے میدان میں لے گئے میں ساتھ ہو لیتا فیلڈ میں پہنچ کر غچہ دیکر دوسری طرف نکل جاتا۔ یونین کے الیکشن میں بڑا ہنگامہ ہوتا۔ میں یونین کے جلسوں اور تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ کالج میں کئی انجمنیں تھیں لجنۃ الادب وغیرہ میں نے ان میں کبھی شرکت نہ کی البتہ "اخوان الصفا" میں جس کے بانی پروفیسر آرنلڈ تھے دو ایک مضمون پڑھے۔ ایک مضمون میں نے سینٹ پال پر پڑھا۔ اس دن سے لڑکے مجھے سینٹ پال کہنے لگے۔ مطالعہ کا شوق مجھے ابتدا سے تھا۔ تعطیلوں میں طالب علم اپنے اپنے وطن چلے جاتے تھے چھٹیوں کے دنوں میں پڑھنے کے لئے کچھ طالب علم لائبریری سے کتابیں مستعار لے جاتے تھے یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا۔ میں بہت سی کتابیں مختلف نوعیت کی انتخاب کرتا۔ آرنلڈ صاحب کہتے تمہیں بڑی ہوس ہے اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھو گے۔ وہ ٹھیک کہتے تھے سب کتابیں کہاں پڑھ سکتا تھا، بعض دیسی کی دیسی ہی واپس لے آتا۔

کالج میں تمام پروفیسر سوا عربی، فارسی، سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے۔ فارسی عربی کے پروفیسر مولانا شبلی اور مولانا عباس حسین تھے ریاضی کے بابو بکرجی۔ مولانا شبلی شاعر ادیب اور مورخ تھے ان کی جماعت میں بیٹھکر ہی خوش ہو جاتا تھا وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ عباس حسین صاحب نرے ملا تھے۔ ادبی ذوق سے عاری البتہ ضلع جگت کے استاد تھے۔ ضلع بولنے سے کبھی نہ چوکتے اور کوئی ان کے جواب میں ویسا ہی ضلع بول جاتا تو باغ باغ ہو جاتے ایک بار کالج کی تنخواہوں میں بہت دیر ہوگئی۔ مولوی شبلی سے بہت شکایت کرنے لگے کہ تنخواہ نہ ملنے سے بہت تکلیف ہے، مولوی شبلی نے کہا ہاں آج کل روپے کا بہت توڑا ہے روپے کے ساتھ توڑے کا لفظ سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ ساری تکلیف بھول گئے۔ ریاضی کے پروفیسر بابو چکرورتی بڑے ہی شریف اور نیک انسان تھے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے انٹرمیڈیٹ میں میرا ایک مضمون ریاضی بھی تھا اس لئے مجھے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ حاضری لیتے وقت میرا نام "آبدل ہوک" کہہ کر پکارتے بنگالی زبان میں ہر لفظ گول ہو جاتا ہے گھڑی، گھوڑی اور بنگالی بنگ ہو جاتا ہے۔ حق بھی "ہوک" ہو جاتا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کی حیثیت کالج میں خاص بلکہ امتیازی تھی۔ وہ سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے کالج میں انہیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا وہ کلاس میں عربی لباس میں آتے تھے سر پر عمامہ بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے سے دستے کی چھتری لئے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آجاتے۔ راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو کہ کسی مسجد میں درس دینے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے پہر مغرب سے پہلے میرے کمرے میں آجاتے اور مجھے سیر کے لئے ساتھ لے جاتے راستے

پوچھتے کہ آج کل کیا کر رہے ہو؟ کیا کچھ لکھ رہے ہو؟ جب میں بتاتا کہ
فلاں موضوع پر لکھ رہا ہوں تو اس کے متعلق مجھ سے بحث کرتے اور بعض
کتابوں کی نشاندہی کرتے ایک بار ایسی ہی سیر میں جب ان کے پوچھنے پر
میں نے کہا کہ میں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو پوچھا مجھے اس کا
خیال کیسے پیدا ہوا اور اس کے لئے مجھے مسالا کہاں سے ملا دوسرے دن
انہوں نے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر بھیجے جن میں پروفیسر براؤن
نے بابی مذہب پر مضامین لکھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ میں عالمانہ اور طالب علمانہ
دونوں شانیں پائی جاتی تھیں۔

ہمارے پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک چھریرے بدن کے بڑے
مستعد تیز آنکھیں چمکتی ہوئی، ذہین شخص تھے۔ اس منصب کے لئے ان کا
انتخاب سید محمود نے کیا تھا۔ کیمبرج یونی ورسٹی کے ممتاز گریجویٹوں میں تھے
اور وہاں کی یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ جب یہ کالج میں آئے تو بالکل
نوجوان تھے اور ہم سے خوب گھل مل گئے اور ہم ان کے ساتھ بے تکلفی سے
کھیلوں میں شریک رہتے۔ کچھ عرصے کے بعد جب انہیں ہندوستان کی
ہوا لگی اور یہاں کی تاریخ و حالات سے زیادہ واقفیت ہوئی تو رفتہ
رفتہ ان کا جھکاؤ سیاست کی طرف ہوتا گیا۔ اس زمانے میں انڈین نیشنل
کانگریس کا ملک بھر میں چرچا تھا۔ سر سید کی مخالفت سے ملک میں ایک
عجیب ہنگامے کی سی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ سر سید کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان
ایک ملک نہیں اور نہ ایک قوم ہے یہاں پارلیمانی حکومت کبھی کامیاب
نہیں ہو سکتی۔ اکثریت اقلیت کو کبھی ابھرنے نہ دے گی اور حق و انصاف جو
تقاضائے جمہوریت ہے محروم عمل رہے گا اور اقلیت کو اکثریت کا محکوم
ہو کے رہنا پڑے گا۔ یہ ایک طویل بحث ہے یہاں اس موضوع پر کچھ لکھنا
بے موقع ہوگا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، مسٹر بیک کو یہ نادر موقع ہاتھ
آیا اور انہوں نے نیشنل کانگریس کے خلاف خوب زہر اگلنا شروع کیا مسلمان
بہت خوش ہوئے۔ مسٹر بیک میں کچھ کچھ اینگلو انڈین رنگ پیدا ہو چلا تھا

وہ بجائے "مائی آرڈر" کے "مائی حکم" فرمانے لگے تھے حکم میں جو تحکمانہ شان
ہے وہ آرڈر میں کہاں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر انگریز اپنے آپ کو لاٹ صاحب
سمجھتا تھا اور ہر ہندوستانی کو اپنی رعایا۔ جب تک سر سید زندہ رہے یہ دبے
دبے رہے ان کے مرنے کے بعد کھل کھیلے اور کالج کے ٹرسٹیوں تک کو طفل
مکتب سمجھنے لگے اور ان پر حکم چلانے لگے۔ گورنمنٹ میں ان کا رسوخ تھا اور
اعلیٰ حکام سے راہ رسم تھی اس لئے ٹرسٹی بھی ان سے ڈرتے تھے میرا یہ گمان ہے
اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلط نہیں کہ وہ مسلمانوں سے اپنی قوم کے کام لینا چاہتے تھے
اتفاق سے اسی زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے،
کرزن زبردست امپریلسٹ ( Imperialist ) تھے ان کے
دماغ میں شاہنشاہیت کی بو سمائی ہوئی تھی مسٹر بیک ان سے جا کر ملے کرزن
بھی کیمبرج کے نامور گریجویٹ تھے اور یونی ورسٹی کی یونین کے صدر رہ چکے
تھے۔ بیک کرزن کی گوں کے آدمی تھے یہ شملے میں کرزن سے پینگیں بڑھا رہے
تھے کہ وہاں پیچش سے ان کا انتقال ہو گیا اگر جیتے رہتے تو کرزن کی حکومت
میں بڑے آدمی ہوتے اور بڑا مقام حاصل کرتے اس خیال کے آتے ہی میرا
دل کانپ اٹھتا ہے کہ نہ معلوم اس وقت مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا ایک مشہور
ہندی دوہے کا ٹکڑا "تا گھر میرا تا گھر تیرا چھیا رین بسایرے رے" انہیں
بہت پسند تھا اور اکثر پڑھا کرتے تھے یہی ان کی قبر پر کندہ ہے۔

ابھی مجھے کالج میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک دن میں کیا
دیکھتا ہوں کہ وکٹوریہ گیٹ سے داخل ہوتے ہی پکی بارک شروع ہوتی ہے اس
کے برآمدے میں کچھ طالب علم کھڑے ہیں اور ان کے بیچ میں مسٹر بیک تشریف
رکھتے ہیں طالب علموں کے ہاتھوں میں لمبی لمبی فردیں تھیں جن پر ناموں کی مہر
تھی۔ طالب علم یہ فہرستیں مسٹر بیک کو دکھا رہے تھے یہ جمعہ کا دن تھا طالب علموں
نے شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تھی اس زمانے میں سر سید انڈین نیشنل
کانگریس کے خلاف مسلمانوں کے ناموں کی فہرستیں انگلستان کی پارلیمنٹ کو
بھیج رہے تھے۔ یہ طالب علم مسٹر بیک سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ان فردوں

ازیں سے یہ کہہ کر کہ دستخط لے کر کہ گاؤ کشی کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور
الفن پاس کرانا چاہتے ہیں ہم اس کے خلاف گورنمنٹ میں مسودہ پیش کرنا
چاہتے ہیں۔ مسٹر بیک یہ سن کر ہنسے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی اور افسوس
ہوا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ذمہ دار انگریز ایک ایسے فعل پر خوشی کا اظہار
کر رہا ہے جو دیانت اور راستی کے خلاف ہے سر سید اسے کبھی روا نہ رکھتے اور
ایسے طالب علموں کو اپنے سامنے سے نکال دیتے۔ انہوں نے کبھی مقصد برآری
کے لیے یا اپنی سیاسی پالیسی کی خاطر کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو دیانت و
راستی کے خلاف ہو۔ اس قسم کی فہرستیں ان کے پاس آتیں جہاں انہیں ذرا شبہ
شبہ ہوتا یا دیکھتے کہ کچھ نام ایک قلم اور ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے ہیں تو
وہ ایسی فہرستیں چاک کر ڈالتے تھے۔ انگریز بلاشبہ معاملات میں بہت احتیاط
اور دیانت سے کام لیتا ہے لیکن جہاں قومی مفاد کا معاملہ آتا ہے تو ضمیر
انصاف اور راستی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہمیں اس کا
ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد
بھارت اور پاکستان کے بعض سرحدی اضلاع کے تنازعے کے چکانے کے لئے
انگلستان کی ہائی کورٹ کے ایک جج کو حکم بنایا گیا اور یہ قرار پایا کہ یہ جو فیصلہ
کرے گا وہ ہر دو فریق کو تسلیم کرنا ہوگا اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکے
گی۔ مسلمانوں کے بعض اکابر نے اس قرارداد کے ماننے سے انکار کیا اور کہا
کہ ایک ایسے اہم معاملے کو جس پر ہماری قسمت کا دارومدار ہے تنہا ایک شخص
کے ہاتھ میں دے دینا کسی صورت سے بھی قرین عقل نہیں لیکن مسٹر جناح نے
کہا کہ مسٹر ریڈکلف انگلستان کی ہائی کورٹ کا جج ہے وہ کبھی کوئی ایسی بات
نہیں کرے گا جو راستی و انصاف کے خلاف ہو۔ اس نے جو فیصلہ کیا وہ ہمارے
سامنے ہے پاکستان اسے اب تک رو رہا ہے اور نہ معلوم کب تک روتا رہے
گا۔ بعد میں قائد اعظم نے اس فیصلے کے خلاف بہت سخت سست لکھا اور کہا
اور لعنت ملامت کی لیکن کیا ہوتا ہے زبان دے چکے تھے ماننا ہی پڑا۔
مسٹر بیک مسلمانوں کی سرشت سے خوب واقف ہو گئے تھے اور ان
کے بہلانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے مثلاً کبھی عبا اور ترکی ٹوپی پہنے
آ پہونچے یا کانفرنس کے جلسے میں تقریر کرتے کرتے مسدس حالی کا کوئی بند
انگریزی لہجے میں پڑھتے تو مسلمان خوشی سے اچھل پڑتے ان کا پورا نام تھیوڈور
بیک تھا مسلمان تھیوڈور بیگ کہنے لگے۔ البتہ ایک بات ضرور کہوں گا کہ انہیں
طالب علموں سے بہت ہمدردی تھی ان کی بہبودی کے لئے یا نوکری دلانے
میں کوشش کرتے یا جب کبھی پولیس یا ریلوے اسٹیشن والوں سے لڑکوں کا
جھگڑا ہو جاتا اور مارپیٹ کی نوبت آجاتی تو مسٹر بیک ہمیشہ اپنے طالب علموں
کی حمایت کرتے۔

سر سید[1] کو ایک مدت سے یہ دھن تھی کہ کالج میں قومی لباس (جو انہوں
نے اپنے لئے بھی تجویز کیا تھا) رائج کیا جائے۔

چنانچہ اس خیال سے فرمائش کر کے کانپور کے کسی کارخانے سے
سے ایک نیلگوں سیاہ (بلو بلیک) سرج کا ایک تھان تیار کرایا جب یہ کپڑا
آیا تو اس میں سے ایک ترکش کوٹ اپنے لئے ایک میرے لئے اور ایک
میر اس مسعود کے لئے جو اس وقت بچے تھے سلوایا۔ سید محمود نے شکایت
کی کہ ہمارے لئے نہیں، کیا اس تھان میں اتنی گنجائش نہ تھی اس سے پہلے
وہ دلی سے سیاہ کپڑے کے ٹکڑوں پر کلابتوں سے "مدرستہ العلوم"
کڑھوا لائے تھے۔ کالر پر "مدرستہ" ایک طرف اور "العلوم" دوسری
طرف ٹکا ہوا تھا جب کالر کا ہک لگاتے تو سامنے پورا "مدرستہ العلوم" آجاتا
جس وقت درزی میرا کوٹ سی کر لایا تو میں اس وقت سید محمود کے پاس
دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے بلایا درزی نے مجھے کوٹ پہنایا وہ پہنا ہی
چکا تھا کہ جھٹ سید صاحب کرسی سے اٹھے اور مجھے سلام کیا اور کہا "تم میری
ہو" بجائے اس کے کہ میں سلام کرتا انہوں نے مجھے سلام کرنے میں تقدیم کی
(باقی ص ۲۹ پر)

[1] مضمون کا یہ حصہ مولوی صاحب کے ارشاد کے بموجب ان کی کتاب "چند ہم عصر" سے نقل کیا گیا ہے

غفران زاہدی
مدیر روزنامہ سیاست کانپور

# ہندوستان میں اردو

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد سال میں ایک بار پابندی کے ساتھ حیدر آباد دکن جاتے اور وہاں چند دن قیام کرتے ہیں اس مرتبہ کے زمانۂ قیام میں آپ نے وہاں کے حامیان اردو کے تعمیر کردہ ایوان اردو میں بھی اس کے منتظمین کی دعوت پر قدم رنجہ فرمایا اور اردو زبان کا بھی کچھ ذکر فرمایا جس کا خلاصہ خبر رساں ایجنسی کے ذریعے موصول شدہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی دونوں مختلف زبانیں نہیں ہیں اور اگر ہندی زبان میں فارسی وغیرہ کے وہ الفاظ جو اردو میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں شامل کر لئے جائیں اور اردو میں سنسکرت کے مروج الفاظ جو ہندی میں شامل ہیں ملا لئے جائیں تو یہ تفرقہ ختم ہو جاتا ہے۔ ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اس رنگا رنگی میں اتحاد قائم رکھنا ہندوستان کے باشندوں کا کام ہے ہندی کو ملک کی قومی زبان منتخب کیا جا چکا ہے اس بنا پر اسے خاص قسم کا مقام حاصل ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اردو اور دوسری زبانوں کو مٹا دیا جائے میں خود چاہتا ہوں کہ اردو ترقی کرے

صدر محترم کے یہ ارشادات عالیہ سر آنکھوں پر لیکن خدارا بتایا جائے کہ آزادی ملک کے بعد اردو اور ہندی کا یہ جھگڑا جس کے نتیجے میں اردو کا تقریباً سبھی جگہ حتیٰ کہ ان صوبوں اور علاقوں میں بھی جو اس کی جنم بھومی سمجھے جاتے تھے مٹانا اور بے دخل کیا جانا اس کا پیدا کیا ہوا ہے اور اردو کے خون ناحق سے کس کے ہاتھ رنگین ہیں؟ ایک مثال بھی ایسی پیش کی جائے کہ آزادی ملک کے بعد اردو والوں نے ہندی کو بے دخل کرنے یا اس کو مٹانے کی یا اس کی سرکاری حیثیت کو تسلیم نہ کرنے کی کوتاہی کوشش خفیہ یا علانیہ کی ہے جس کی بنا پر اردو والوں کو ایک "فریق متخاصم" قرار دیا جائے۔ اردو والوں کی حیثیت تقریباً ہر جگہ مظلوم اور اس حیثیت کی سی ہے جس کے خلاف یکطرفہ کارروائی برابر جاری ہے۔ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اردو والے غریب آزادی ملک کے بعد اب اس پوزیشن میں کہاں رہ گئے ہیں کہ وہ آل انڈیا کانگریس کے اس ریزولیوشن کو اپنے حق میں پیش کرنے کی جرأت کر سکیں جس میں صاف طور سے مرقوم ہے کہ ملک کی زبان شمالی ہند کی وہ بولی ہوگی جو وہاں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو دونوں رسوم خط اردو اور دیوناگری میں لکھی جائے گی اور اب ان میں کوئی اس معاہدہ کی یاد بھی دلانے کی ہمت نہیں کرتا جو لسانی جھگڑے کے طے کرنے کے لئے گاندھی جی کی رہنمائی میں ہوا تھا اور جس پر اس وقت کے صدر کانگریس کی حیثیت سے ہمارے راجندر بابو نے بھی دستخط ثبت فرمائے تھے اور اردو والوں کی طرف سے اس پر بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے دستخط کئے تھے حالانکہ یہ معاہدہ آزادی ملک سے کئی سال قبل کا تھا۔ اس وقت تو اردو والے صرف اتنا مطالبہ کر رہے ہیں کہ فلاں فلاں علاقوں میں اردو کو بھی علاقائی زبان کا درجہ جیسے دستور اساسی کی رو سے صدر جمہوریہ کی گارنٹیوں کے ماتحت ملنا چاہئے دیا جائے لیکن اس کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ جن صوبوں میں اردو زبان کے نفس وجود سے انکار سرکاری طور پر کیا جا چکا ہے ان کے ارباب کار سے ظاہر تھا کہ کسی انصاف کی توقع نہیں ہو سکتی تھی اسی بنا پر ایک سے زیادہ بار صدر جمہوریہ کی بارگاہ عالی میں اردو والے بڑی تمناؤں اور توقعات کے ساتھ وفد لے کر گئے تھے لیکن اس کا نتیجہ محض صفر ہی رہا۔ اس وقت اردو کو کشمیر کے سوا کہیں اور کوئی درجہ اور مرتبہ حاصل نہیں ہے بلاشبہ وہ اردو کی ترقی چاہتے ہوں گے لیکن اس کا عملی

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
دہلی یونیورسٹی

# عِراق اور اُردُو

پچھلے ہفتہ مجھے عراق جانے کا شرف حاصل ہوا وہاں کی حکومت نے مجھے ۱۴ جولائی ۱۹۶۰ء کے جشن جمہوریت میں شرکت کے لئے خاص طور پر مدعو کیا تھا اس موقع پر مختلف صحبتوں میں شریک ہونے کی مسرت اور مزارات مقدسہ پر حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی یہ میرا عراق کا دوسرا سفر تھا پہلی دفعہ ۱۹۵۶ء میں گیا تھا۔ اس لئے حالات کا تقابل زیادہ دشوار نہیں اس مرتبہ جس چیز سے خاص طور پر متاثر ہوا وہ یہ کہ عراق کے معاہدۂ بغداد سے الگ ہو جانے کے بعد وہاں کی حکومت اور عوام کے دلوں میں ہندوستان کی عزت اور محبت دو چند ہو گئی ہے۔

خطوط الجویۃ العراقیہ (عراق ایرویز) میں ہندوستانی ہوابازوں کی اکثریت ہے اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی پڑھانے والے استادوں کی تعداد بھی معمولی نہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے ڈاکٹر اور انجینیر بھی اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ حسن اتفاق سے یونسکو مشن کے چیف اور عراق ٹائمس جو انگریزی کا واحد روزنامہ ہے اس کے ایڈیٹر بھی ہندوستانی ہیں۔ یہ تو اندرون ملک کا ذکر تھا۔ خارجی حکمت عملی میں بھی رئیس الوزرا جناب عبدالکریم قاسم ہندوستان کی مثبت غیر جانبداری کو پسند کرتے ہیں اور بقائے باہم کے اصول پر عمل پیرا ہیں۔

لیکن بحیثیت اردو کے طالب علم کے مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ بغداد، نجف اشرف اور کربلائے معلی میں اردو بولنے والے موجود ہیں اور اردو کے فلموں اور ریکارڈوں نے تو ہماری دھنوں اور گیتوں کو ایک وسیع علاقے میں پھیلا دیا ہے مطار بغداد پر جس قلی نے میرا سامان ہوائی جہاز سے کسٹم تک پہنچایا وہ عراقی تھا لیکن اردو فر فر بولتا تھا میرا ڈرائیور عباس جو وزارت الخارجہ کی طرف سے مامور تھا مجھ سے اردو ہی میں گفتگو کرتا تھا۔ نجف اشرف میں ایک خادم کو اصرار تھا کہ میں اس کے سا مراسم زیارت ادا کروں مجھ سے کہنے لگا "عینی! آپ حیدرآباد سے تشریف لائے ہیں یا لکھنؤ سے یا دہلی سے۔ ابھی سعادت علی خاں صاحب تشریف لائے تھے۔ ان کی خدمت بھی میں نے ہی کی تھی" اسی طرح کربلائے معلّٰی، کاظمین، مسجد کوفہ، حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات کے خدا بھی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ فندق خیام (جہاں میں ٹھہرا تھا) اس کا منیجر غالباً ارمنی ہے لیکن عراق میں بس گیا ہے وہ ہندوستان کی فوج سے پہلے تعلق کی بنا پر اردو بول سکتا ہے اس نے ہمارے وفد سے اردو ہی میں گفتگو کی اور سب لوگوں کو اپنے لب و لہجہ سے بہت مسرور اور محظوظ کیا

جمہوریہ عراق کے وزیر تعلیم سے بھی ملاقات ہوئی جو بڑی دل نواز شخصیت کے مالک ہیں اور اس نکتہ سے باخبر ہیں کہ تہذ روابط میں زبان کی واقفیت کتنا بڑا درجہ رکھتی ہے اور منصور و مامو کے زمانے سے عراق اور ہندوستان سے تعلقات کتنے اہم رہے ان کا ارادہ ہے کہ جامعہ بغداد میں اردو کا شعبہ قائم کریں اور اس سیکھنے والوں کو اتنی سہولتیں بہم پہنچا دیں کہ وہ زبان و ادب میں اچھی د

پیدا کر لیں۔

عراقیوں کے لئے اردو سیکھنا بہت آسان ہے۔ عربی اور اردو کا رسم خط ملتا جلتا ہے بعض الفاظ و اسما بھی مشترک ہیں ہندوستان سے زائرین کی آمد و رفت بھی برابر رہتی ہے اس لئے زبان سیکھنے کے سوتے خشک نہیں ہونے پاتے۔ عراق کی موجودہ ترقی پسند حکومت ہندوستان سے بہت اچھے سیاسی، تجارتی اور تہذیبی تعلقات رکھنا چاہتی ہے اس لئے قوی امکان ہے کہ یہ رشتے اور زیادہ مضبوط ہوں گے۔

مجھے بعض عراقی ایسے بھی ملے ہیں جو اردو سیکھنے کے خواہش مند تھے لیکن اس کا افسوس کرتے تھے کہ ان کو مناسب اور مفید کتابیں نہیں ملتیں دراصل ہم نے اردو کو قفلی کے انگور کی طرح بند رکھا ہے۔ ہم نے اردو کی ایک کتاب بھی اس نقطۂ نظر سے نہیں لکھی جو ان لوگوں کے لئے مفید ہو جن کی مادری زبان بنگالی، عربی، ترکی، انڈونیشی، روسی، چیک یا فرانسیسی ہو اچھے انتخابات بھی عنقا ہیں۔ لغت ناپید ہے اور دو لسانی لغات جیسی یورپین زبانوں کی ملتی ہیں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں اس وقت زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور سیر و سیاحت ایک قسم کی "صنعت" میں شامل ہو چکی ہے اس لئے بڑا اچھا ہو اگر ہمارے اہل علم ان امور کی طرف بھی بطور خاص متوجہ ہوں۔

ایک بڑا فرق بھی محسوس کیا عراق چھوٹا سا ملک ہے تین دلی مل جائیں تو اس کی پوری آبادی ہو۔ لیکن اس کے اخبارات اور کتابیں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور بہت جلد بک جاتی ہیں۔ اردو میں طباعت و اشاعت کے جو طریقے ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو قلی قطب شاہ کے زمانے میں تھے۔ تنظیم تو ہے ہی نہیں۔ اخبارات نکلتے ہیں تو اس طرح جیسے آخری سانس۔ کتابیں چھپتی ہیں تو پتھر کے ذریعے اور پتنگ کے کاغذ پر۔ اغلاط سے مملو جن کا (بقول غالب) چھپنے سے چھپ جانا بہتر ہے۔ پہلا ایڈیشن پانسو کا اور بہت ہمت ہو تیر مارا تو ایک ہزار۔

خدا جانے ہم کب پتھر کے زمانے سے نکلیں گے اور نئے تقاضوں کو سمجھیں گے۔ (بشکریہ "ہماری زبان" علی گڑھ)

---

بقیہ

# ہندوستان میں اردو

(بسلسلہ ص ۹)

مظاہرہ آخر کہاں ہو رہا ہے کون سی صوبائی سرکار اردو کے غصب شدہ حقوق واپس دلا رہی ہے۔

رہا صدر محترم کا یہ ارشاد کہ اردو والوں کو اپنے یہاں سنسکرت کے الفاظ شامل کرنا اور ہندی والوں کو فارسی وغیرہ کے مروج الفاظ، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اردو زبان خود اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے معرض وجود میں آئی تھی اور آزادئ ملک سے قبل سوا چند تنگ نظر افراد کے سبھی کو اس کی یہ حقیقت تسلیم تھی۔ آزادئ ملک کے بعد جس نئی زبان کو ہندی کے نام سے رائج کیا جا رہا ہے اور جسے سرکاری سرپرستی میں ہر جگہ اچھالا جا رہا ہے اس میں سنسکرت ہی کے ثقیل الفاظ کی بھرمار ہے۔ اس لئے آسان زبان کی یہ تلقین ہندی کے سرپرستوں اور حامیوں کو کرنی چاہئے تھی نہ کہ اردو کے حامیوں کو۔

صدر محترم نے اس تقریر پر محض زبان کا ذکر کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے باہمی فرق کو غیر اہم قرار دیا ہے لیکن اصل سوال تو رسم الخط کا ہے اس کا کوئی ذکر صدر محترم نے اس موقع پر نہیں فرمایا۔ اردو کے مخالفوں کی اصل عناد اردو رسم الخط ہی سے ہے اور رسم خط کے مٹ جانے کے بعد پھر اردو زبان کا وجود ظاہر ہے کہ باقی نہیں رہ سکتا۔

# مجوزہ اردو یونیورسٹی ملک میں صحیح ادبی ذوق کو پروان چڑھائیگی

## رسالہ افکار کی تقریب سالگرہ میں بابائے اردو کی تقریر

کراچی ۱۴ اگست بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے آج یہاں کہا کہ اردو یونیورسٹی دیگر باتوں کے علاوہ لوگوں میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں مدد دیگی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اور اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جلد ہی ایک کمیٹی قائم کر دی جائیگی۔ مولوی صاحب آج شام ماہنامہ "افکار" کی سولھویں سالگرہ کے موقع پر اردو کالج میں منعقدہ ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے انہوں نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ ملک میں اردو جریدوں کی حالت اطمینان بخش نہیں اس سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ انہیں خود مالی پریشانیوں کی بنا پر انجمن ترقی اردو کا رسالہ "سائنس" بند کرنا پڑا جو اردو میں اپنی قسم کا واحد رسالہ تھا مولوی صاحب نے اس سے پہلے رسالوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں سرسید کے رسالے "تہذیب الاخلاق" کا ذکر کیا انہوں نے ایک معمولی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح نئی نئی طبی ایجادوں اور معلومات سے باخبر رہنے کے لئے ایک کامیاب ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ طبی رسائل و جرائد کا مطالعہ کرے بالکل یہی بات ایک ادیب کے لئے بھی ہے۔ مشہور ادیب اور ماہنامہ "ساقی" کے مدیر جناب شاہد احمد دہلوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو رسائل اور جرائد کا مستقبل تاریک ہی دکھائی دیتا ہے۔ شاہد صاحب نے کہا کہ عالمگیر اور ہمایوں جیسے معیاری رسائل ایک ایک کر کے بند ہو گئے انہوں نے عوام اور حکومت پر زور دیا کہ وہ اس نازک وقت پر جب اردو رسائل پر آ پڑا ہے پورا تعاون کریں اس سے پہلے افکار کے مدیر جناب صہبا لکھنوی نے اپنی تقریر میں ابتدا سے اب تک افکار کی سولہ سالہ زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا اس موقع پر افکار کے پرانے شماروں اور مکتبۂ افکار کی مطبوعات کی مختصر سی نمائش بھی کی گئی۔

## ایران میں فارسی کے لئے رومن رسم الخط

تہران۔ ۱۴ اگست ایف سی کالج لاہور کے طلبا کے ایک وفد کو جو ایران کے دورے پر آیا ہوا ہے ایرانی وزارت تعلیمات کے افسروں نے بتایا کہ ایران میں بہت جلد تمام سرکاری اور غیر سرکاری مقاصد کے لئے فارسی کا رسم الخط رومن اختیار کر لیا جائے گا۔ وفد کے لیڈر اور ایف سی کالج کے پروفیسر زیڈ ایچ زیدی نے بتایا کہ ایران کے وزیر تعلیم نے امید ظاہر کی ہے کہ دونوں ملکوں میں خیرسگالی کے وفود کا یہ سلسلہ باہمی تبادلہ ہوتا رہیگا۔

## علی گڑھ یونیورسٹی کے امور کی تحقیقات

نئی دہلی ۱۸ اگست علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے امور کی چھان بین کرنے والی تحقیقاتی کمیٹی کے چیرمین مسٹر جی سی چٹرجی نے جمعرات کو علی گڑھ میں اخباری نمایندوں سے بات چیت کے دوران توقع ظاہر کی کہ وہ اکتوبر کے آخر یا نومبر کے اوائل میں اپنی رپورٹ مرکزی حکومت کو پیش کر دیں گے۔

## بھارتی زبانوں کے لئے رومن رسم الخط

نئی دہلی ۵ر اگست یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے چیرمین مسٹر سی ۔ ڈی دیش مکھ نے تجویز پیش کی ہے کہ بھارت کی تمام زبانوں کے لئے رومن رسم الخط اختیار کیا جائے انہوں نے کہا کہ زبان کو ثقافتی اچھائیاں ایک دوسرے تک پہنچانے کی راہ میں رکاوٹ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اسے اس سلسلہ میں ایک پل یا راستے کی حیثیت حاصل ہے ۔ مسٹر دیش مکھ نے حال میں ایک ادبی مباحثے کا افتتاح کرتے ہوئے مذکورہ تجویز پیش کی ہے یہ مباحثہ ساہتیہ اکادمی مدراس کے جنوبی علاقائی دفتر کے زیر اہتمام ہوا مسٹر دیش مکھ نے کہا " رومن رسم الخط کا استعمال بھارتی زبانوں کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی کیوں کہ انگریز ملک کے زمانے میں ہندوستانی فوجوں میں اردو زرومن رسم الخط میں رائج تھی اور مدتوں پہلے مغربی مفکروں نے ہندوستانی تصانیف بلکہ ویدوں تک کو رومن رسم الخط میں منتقل کیا ہے ۔

## شاہنامہ فردوسی کی بنیاد پر فلم تیار کی جا رہی ہے

تاجیکستان کے استالین آباد فلم اسٹوڈیو نے ۔ کاوہ لوہار ، کے نام سے ایک فلم کی شوٹنگ شروع کر دی ہے جس کی کہانی شہرہ آفاق مثنوی ، شاہنامہ فردوسی سے ماخوذ ہے فلم میں سرخوشی و مسرت کے ایک فرضی ملک خرم زمین کے لوگوں کی زندگی اور فتوحات کی کہانی پیش کی گئی ہے فلم کے واقعات پانچویں چھٹی صدی کے ہیں فلم کی شوٹنگ سولھویں صدی کے تعمیر شدہ قلعہ حصار کے آس پاس ہو رہی ہے ہدایت کاری بورس کیما گر کر رہے ہیں ۔ اس فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کار عارف کر رہے ہیں جنہوں نے مقدم شاعر میں مشہور شاعر رودکی کا پارٹ ادا کیا تھا مقدم شاعر کو قاہرہ کے ایشیائی فلمی میلے میں ۔ طلائی عقاب ۔ کا انعام ملا ہے فلم سہ رنگی بن رہی ہے اور شہد وستہ کے اس میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے ۔

## اردو مجلس حیدرآباد دکن میں ابراہیم جلیس کا خیر مقدم

حیدرآباد دکن (بھارت) ۔ ہندو پاکستان کے ممتاز طنز نگار ادیب اور صحافی جناب ابراہیم جلیس نے اردو ہال واقع حمایت نگر میں ۳۱ر جولائی سنیچر کو شام کے پانچ بجے اردو مجلس کے ماہانہ اجلاس میں ، کراچی سے ہانگ کانگ تک کے زیر عنوان ایک طنزیہ رپورتاژ اپنے مخصوص انداز میں سنا کر سینکڑوں اردو داں حضرات سے خراج تحسین حاصل کیا ۔

اردو مجلس کے اس اجلاس کی صدارت راجہ گیان چند اگنی ہوتری شاد صدر اردو مجلس نے کی ۔ جناب جلیس کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ہم بڑی مسرت کے ساتھ اپنے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔ اردو کے ایک ممتاز ادیب اور مایۂ ناز مزاح نگار کی حیثیت سے ابراہیم جلیس صاحب ہند و پاک کے تعلیم یافتہ اور باشعور طبقے میں بجا طور پر قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں ۔ اس قابل فخر ادیب کا جادو نگار قلم ہی ہے جس نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا ہے جس ادبی اجتماع میں بھی جلیس صاحب نے زندگی کا جوش اور ولولہ پیدا کر کے اپنے شگفتہ خیالات کے موتی بکھیرے ہیں سامعین نے انہیں ہمیشہ قدر و منزلت سے قبول کیا ہے اور داد و تحسین کے فلک شگاف نعروں سے انہیں سراہا ہے آپ پاکستان کے با اثر روزنامہ جنگ کراچی کے کالم نویس ہیں اور اس کے مشہور طنز و مزاح کے کالم وغیرہ وغیرہ کے ذریعہ اپنے مخصوص انداز نگارش سے ہر مکتب خیال کے افراد کے لئے سامان ضیافت پیش کرتے ہیں ۔ بارہ سال کے طویل وقفے کے بعد آج ہم اپنے اس بے مثال ادیب کا خیر مقدم کرتے ہوئے بے پایاں مسرت کا اظہار کرتے ہیں خیر مقدمی تقریب کے بعد نواب سید جنگ سابق چیف جسٹس ریاست حیدرآباد نے جناب جلیس کی گلپوشی کی ۔ رپورتاژ کی سماعت کے بعد شعراء نے اپنے کلام سنائے ۔ جناب محمد منظور احمد معتمد اعزازی اردو مجلس کے شکریہ کے بعد یہ باغ و بہار یادگاری حیثیت کی حامل خیر مقدمی تقریب اختتام کو پہنچی ۔ (ریحان)

# جشن جگر

لکھنؤ کے ممتاز ادیبوں شاعروں صحافیوں اور دیگر تہذیبی ثقافتی کارکنوں کے دستخطوں سے ایک بیان جاری کیا گیا ہے جس میں لکھنؤ کی قدیم ادبی انجمن جلسۂ تہذیب کی طرف سے حضرت جگر مرادآبادی کی ادبی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں ہونے والی تقریبات کو کامیاب بنانے کی پرزور اپیل کی گئی ہے، بیان میں کہا گیا ہے۔

حضرت جگر مرادآبادی کا شمار اردو کے ان چند ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے غزل کی تمام صحت مند روایات اور زبان و بیان کی تمام نزاکتوں اور نفاستوں کا احترام کرتے ہوئے اسے عہد حاضر کے افکار و خیالات سے روشناس کرایا اسے نئی وسعتیں عطا کیں اسے نئے تقاضوں پر پورا اترنے کے قابل بنایا اور باشعور شعرا کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا چنانچہ یہ کہنا بڑی حد تک درست ہوگا کہ موجودہ دور میں غزل کے احیا اور خاص طور سے جدید غزل کی مقبولیت کے پیچھے حضرت جگر اور ان کے بعض دیگر ہم عصروں کی تخلیقات سے پیدا ہونے والے اثرات کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

اس صورت میں حضرت جگر اور ان کے دیگر ممتاز ہم عصروں کی زبردست ادبی خدمات کا اعتراف بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر لکھنؤ کی قدیم ادبی انجمن جلسۂ تہذیب نے مختلف شعرا کی خدمات کے اعتراف کے طور پر مخصوص تقریبات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کا آغاز حضرت جگر مرادآبادی کے سلسلہ میں ایک مخصوص تقریب کے ذریعہ کرنا طے پایا ہے۔

اس پروگرام کے تحت حضرت جگر کی شخصیت اور شاعری پر مشہور اہل قلم حضرات سے مضامین لکھوا کر انہیں کتابی صورت میں شائع کرنے اور ایک مخصوص ادبی اجتماع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس میں ان کی شاعری اور شخصیت کے متعلق مقالے پڑھے جائیں گے، تقریریں ہوں گی مشہور فن کار ان کی غزلیں سنائیں گے اور حضرت جگر کی خدمت میں ایک مخصوص رقم کی تھیلی پیش کی جائے گی۔

ہم لوگ اس تقریب کی کامیابی کے خواہاں ہیں اور تمام اردو دوستوں شاعروں، ادیبوں صحافیوں اور تمام ادبی انجمنوں سے خصوصاً اپیل کرتے ہیں کہ اس تقریب کو کامیاب بنانے میں پورا تعاون کریں جو حضرات مقالے لکھ سکتے ہیں وہ اپنے مقالے اور جو مالی امداد کر سکتے ہیں وہ اپنا چندہ جلد از جلد بھیج دیں ہماری دلی خواہش ہے کہ تمام اردو دوست حضرات اس مہم کو کامیاب بنانے میں شریک ہوں۔

حامد حسین اکلم رضوی (صدر جلسۂ تہذیب) جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ نیاز فتح پوری۔ اختر علی تلہری۔ احتشام حسین۔ حیات اللہ انصاری۔ علی عباس حسینی۔ نور الحسن ہاشمی، اور بہت سے دوسرے۔

صلاح الدین عثمان، سکریٹری جلسۂ تہذیب لکھنؤ

رفاہِ عام بلڈنگ۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

# شاہ عبداللطیف کی برسی

حیدرآباد، ۹ر اگست۔ مسٹر حبیب الرحمٰن وزیر تعلیم نے آج بھٹ شاہ میں شاہ عبداللطیف کی دو سو آٹھویں برسی کی تقریب کا افتتاح کیا آپ نے کہا شاہ عبداللطیف کا پیغام ساری انسانیت کے لئے امن اور خیرسگالی کے پیغام کی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے اپنی نظموں میں اسلامی احکام کی ترجمانی کی ہے اگر پاکستانی عوام شاہ عبداللطیف کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تو اس صورت میں یقیناً پاکستان بین الاقوامی برادری میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

# مخزن اسرار کا قلمی نسخہ

پشاور ۹ر اگست یہاں مرزا غلام مرتضےٰ کی لائبریری سے ایک قلمی نسخہ ملا ہے جو ۸۵۵ھ میں لکھا گیا اس طرح یہ کتاب ۵۳۰ سال پہلے کی ہے کتاب کا مولف نظامی گنجوی مصنف سکندر نامہ ہے کتاب کا نام مخزن اسرار ہے کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے ملک فخر الدین بہرام شاہ سلجوقیہ کے ایما پر[۴۴]

[۴۴] اسے لکھا اور انعام میں ۵ ہزار دینار سرخ اور ایک قطار اونٹ لے جن پر قیمتی مال و اسباب لدا ہوا تھا۔

# سفینۂ غزل

## صبا اکبرآبادی

○

یہ تسلیم ہے دستِ وحشت جواں ہے
مگر پیرہن میں گریباں کہاں ہے

چمن جل گیا سامنے لب نہ کھولے
اسیرِ قفس کس قدر بے زباں ہے

جو چاہو ہماری محبت کو کہہ لو
تمہارا زمانہ تمہاری زباں ہے

اُسی کو بہاروں کا حاصل سمجھ لوں
وہی شاخ جس پر مرا آشیاں ہے

بہت سے نئے غم ہیں دنیا میں باقی
مگر دل میں گنجائشِ غم کہاں ہے

گلستاں پہ بادل سے چھائے ہوئے ہیں
مرے چار تنکوں میں کتنا دھواں ہے

**انہیں کی نگاہوں کو دیکھا کرو گے**
**صبا دل سنبھالو، صبا دل کہاں ہے؟**

## ابوظفر صہبا

○

کیوں خفا ہو جو آنکھ پرنم ہے
رو رہا ہوں نیا نیا غم ہے

ایک فتنہ تھا وعدۂ فردا
محشرِ انتظار پیہم ہے

اور ہنس لو فریب دے کے مجھے
ابھی میرے خلوص میں دم ہے

کس شگوفے کے دل پہ چوٹ پڑی
سارے گلشن کی آنکھ پرنم ہے

اب زیادہ نہیں بس ایک نظر
دیکھیے کہ زندگی کم ہے

کام دیں گے یہی چراغ ابھی
لو بڑھا دو جو روشنی کم ہے

عابد رضا بیدار

# "رسالہ" انجمن مفید عام قصور، اور مسدس حالی [۱]

دوسری جگہوں اور خاص کر لاہور کی انجمن سے متاثر ہو کر قصور میں بھی انجمن مفید عام کی بنا ڈالی گئی۔ اس انجمن کو ۱۸۶۸ء کے قریب منشی غلام نبی نے جو اس وقت اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر قصور تھے اور منشی قادر بخش نے جو اس وقت قصور میں تحصیلدار تھے قائم کیا۔" یہ رپورٹ مجموعہ پنجاب (۳ - ۱۸۸۲ء) کی اطلاع ہے (ص ۹۳۷) لیکن صحیح تاریخ خود انجمن کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوتی ہے جس کا اقتباس ۱۸۷۹ء کے فروری نمبر میں دیا گیا ہے۔ دہاں مہتمم کے قلم سے تاریخ قیام جولائی ۱۸۷۳ء دی گئی ہے۔ انجمن کی اس رپورٹ میں انجمن کے کاموں کی تفصیل ہے لیکن اس کا بڑا حصہ ارشد صاحب کے مضمون میں کسی نہ کسی طرح آچکا ہے اس لئے یہاں صرف حوالہ کافی ہے۔ اسی رپورٹ میں اس کی مزید تفصیل یہ ہے:۔

" اس انجمن کے اغراض یہ ہیں، یعنی عوام الناس میں علم کی تحریک کرنا اور دیسی کارخانوں اور صنعت کاریوں کو ترقی دینا۔ انجمن مذکور کے متعلق ایک مدرسہ ہے جس میں انگریزی اور اردو کی تعلیم نہایت عمدہ ہوتی ہے اور ایک کارخانہ دیسی صنعت کاریوں کو ترقی دینے کے لئے ہے اور اس انجمن کی طرف سے ایک خوب عمدہ رسالہ اردو زبان میں ماہواری نکلتا ہے۔" (ص ۹۳۶-۷)

اس زمانے کی ہر ایسی انجمن کی طرح انجمن قصور نے بھی اپنا ایک رسالہ نکالا جس کا پورا نام رسالہ انجمن مفید عام قصور سمجھنا چاہئے صرف "رسالہ" گر لکھا ہے ——— یہ رسالہ جس کا اجرا ۱۸۷۴ء میں ہوا مندرجہ بالا اطلاع کے بموجب کم سے کم ۱۸۸۳ء تک ضرور جاری تھا۔

۸۳-۱۸۸۲ء کے سیشن میں اسی رپورٹ میں اس انجمن کے عہدیداروں کے حسب ذیل نام ملتے ہیں:۔

" پریزیڈنٹ ، صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور
وائس پریزیڈنٹ: رائے بہادر ٹھنڈی رام اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر
سیکریٹری : مرزا فتح محمد بیگ" (ص ۹۳۷)

رضا لائبریری 'لوہارو کلیکشن' میں انجمن قصور کے رسالے چھٹی جلد، ۱۸۷۹ء کے پرچے (جنوری تا جولائی) اور جلد ۷ کا پہلا شمارہ (جنوری ۱۸۸۰ء) محفوظ ہیں۔ موخر الذکر شمارہ وہی ہے جس کا ذکر آپ کے مضمون نگار نے مسدس حالی کے ذیل میں کیا ہے۔

انجمن کے رسالے کے بارے میں عمومی معلومات مضمون نگار نے مہیا کر ہی دی ہیں۔ یہاں میں ان کے ایک تسامح کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مسدس حالی پر اپنے نوٹ کے ضمن میں رسالے سے جو عبارت نقل کی ہے وہ رسالہ کی نہیں در اصل خود مسدس حالی کے دیباچے کی عبارت ہے اور خود حالی کی لکھی ہوئی ہیں۔ رسالہ نے بھی اس پر تفصیلی نوٹ لکھا ہے اور اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے معلوم نہیں مضمون نگار کو یہ نوٹ ملا نہیں یا کسی دوسرے کی مہیا کی ہوئی معلومات پر انہوں نے بھروسہ کر لیا۔ رسالے کا نوٹ مفید اور اہم ہے اور اس کو نقل کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

" یہ وہی کتاب اپنے رنگ ڈھنگ میں نرالی، دور از کار خیالات اور مبالغہ آمیز محاورات سے خالی حسب وہ مسدس حالی ہے جس کا مختصر ریویو ہم رسالہ نمبر (۱۰) میں مذر ناظرین کر چکے ہیں جب یہ کتاب ہم اور

---

[۱] [illegible] کے رسالہ [illegible] سے مضمون کے سلسلے میں

ہمارے اکثر لائق دوستوں نے تجربہ ملاحظہ کی تھی، تو اس وقت ہم سب کا بالاتفاق یہ خیال تھا کہ جس خوبصورتی اور بے تعصبی اور خیر خواہی کے ساتھ کتاب مذکور لکھی گئی ہے اسی طرح وہ ہر دل عزیز اور عام مفید بھی ہوگی اور غالباً کوئی شخص اس کے مضامین اور مطالب پر نکتہ چینی یا اعتراض نہ کریگا۔ مگر یاروں نے کچھ نہ کچھ کہے بغیر اس کو بھی نہ چھوڑا۔ جناب منشی ذکاءاللہ صاحب کے ریویو مندرجہ تہذیب الاخلاق بابت ماہ ربیع الاول ۱۲۹۶ھ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بعضوں نے اس کی نسبت یہ کہا کہ یہ سب مضمون تہذیب الاخلاق کے ہیں وہ نثر تھی یہ نظم ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ قرآن و حدیث کے مضامین کو نظم کیا گیا ہے، اس میں کوئی بھی نئی بات نہیں۔ ان سب نکتہ چینیوں کا جواب گو ریویو مذکور میں دیا گیا ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارا بھی وہ خیال جو پہلے کتاب مذکور کی نسبت تھا غلط نکلا اور حضرت سعدی شیرازی کا تجربہ نہایت سچا اور صحیح ثابت ہوا اور وہ یہ ہے ؎

بعذر توبہ تواں رستن از عذاب خدا
ولیک می نتواں از زبان مردم است

سچ ہے، انسانوں کی زبان سے کسی حالت میں انسان رہائی نہیں پا سکتا۔ مثل مشہور ہے کہ ایک شخص اپنی بی بی کے ہمراہ ایک راہ میں جاتا تھا جب اس نے بی بی کو سوار کیا تو لوگوں نے اس کو زن مرید کہا، جب وہ خود سوار ہوا اور بی بی پیدل چلی تو دیکھنے والوں نے اسے نامرد کہا جب وہ دونوں سوار ہوئے تو لوگوں نے ان کو بے رحم کہا کہ ایک جانور پر دونوں سوار ہیں۔ یہ حال دیکھ کر ان دونوں نے پیدل چلنا شروع کیا اور سواری کو خالی چھوڑا پھر دیکھنے والوں نے ان کو بے وقوف کہا۔

یہی حال ہر ایک بات کی نسبت لوگوں کا ہوا کرتا ہے، جب مولوی سید احمد خان صاحب بہادر نے چند باتیں جو اصل میں پرانی لیکن بے علموں کے خیال میں نئی اور اُن کے خیال سے ذرا بڑھ کر بیان کیں تو انہوں نے کہا یہ نئی باتیں کہاں سے نکلی ہیں ان کو ہم نہیں مانتے، اور جب مسدس حالی بالکل قرآن اور حدیث سے اقتباس کیا گیا اور وہ آیتیں اور حدیثیں جن سے وہ اخذ کیا گیا تھا بجنسہ ذیل میں لکھی گئیں تو کہنے والوں نے کہا کہ اس میں کوئی نئی بات نہیں، تو اب غور کرنا چاہئے کہ اہل دنیا پسند کریں تو کس بات کو کریں۔

حالانکہ یہ کتاب کیا تو اپنے رنگ ڈھنگ اور طرز انداز میں، کیا صفائی عبارت میں اور کیا مضامین کی لطافت میں بالکل نئی اور نرالی تھی سوا اس کے کہ کتاب مذکور میں خیالات کی تصویر اس شائستگی کے ساتھ کھینچی گئی ہے کہ جس کا ہر ایک شعر دل میں گھر کرتا جاتا ہے اور انسانوں کے نیچر یعنی قدرتی بناوٹ اپنے طبیعت اور حالات اور واقعات کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس کا ایک لاثانی اثر دلوں پر پیدا ہوتا ہے۔ ملٹن صاحب کی پاریڈ از لاسٹ اور شیکسپیر کی تصنیفات میں اس سے کوئی عمدہ اور عجیب بات نہ تھی۔ الغرض اس کتاب کی قدرتی تحریکوں کے جذبات کے پیرائے کو دیکھو خواہ اس کے کنایہ اور اشارہ اور تشبیہ اور استعارہ میں غور کرو، خواہ عبارت کی خوبی اور خوش اسلوبی کو ملاحظہ کرو، خواہ مضامین کی پاکیزگی اور دلفریبی پر خیال فرماؤ، اس کا ہر ایک مقام اور حالت ایسی ہی صحیح، دلفریب اور دل لبھانی ہوئی ہے جس پر شعر ذیل صادق آتا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

چونکہ کتاب مذکور کا ہر ایک مضمون اور مقام دلربا تھا اس لئے یہ امر مناسب معلوم ہوا کہ ممبران انجمن کی ضیافت انہیں چند شعروں سے کی جائے جو بذریعہ ریویو شائع کئے گئے بلکہ اب معلوم ہوا کہ آپ تمام کتاب سے جس کے مضامین رنگ برنگ اور مختلف اور لذیذ کھانوں کے قائم مقام ہونے سے مشوق ہیں جملہ ناظرین کی پرتکلف ضیافت کی جائے اور اس خیال سے جناب صاحب پریزیڈنٹ بہادر نے

(باقی ص ۲۵ پر)

سید جعفر طاہر

# شعلۂ مستعجل

## منصور احمد ندیم

منصور احمد مرحوم و مغفور

بندہ بھی مجبور فطرت بھی مجبور (یاس یگانہ)

نام منصور احمد تخلص ندیم۔ مولوی محمد حسین صاحب صادق کے صاحبزادے تھے۔ آپ ۸ اگست ۱۸۹۹ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے ابتدائی ایام جموں میں بسر کئے لیکن سنہ ۱۹۱۱ء میں آپ کا سارا خاندان مستقل طور پر لاہور منتقل ہو گیا چنانچہ آپ لاہور ہی میں جوان ہوئے اور عین عالم شباب میں سپرد خاک بھی یہیں ہوئے چھتیس سال کی عمر میں اپریل سنہ ۱۹۳۶ء کو انتقال فرمایا۔

ز باغ جوانی گلے بر نہ چیدہ
سوئے خلد بشتافت منصور احمد
بجاں آفریں داد جانِ عزیزش
حیاتِ ابد یافت منصور احمد

۱۳۵۶ھ (حضرت حفیظ ہوشیارپوری)

میرے سامنے انگریزی لباس میں ایک خوب صورت نوجوان ادیب اور شاعر کی تصویر ہے۔ عمدہ قد، صاف رنگ، فراخ پیشانی ناک بلند ابرو گھنے اور گتھے ہوئے آنکھیں موٹی موٹی اور بجا بیت رخشاں و تاباں، یہ چشمانِ کشمیریت کے معیار نقد پر پوری اترتی ہوئی۔ دہن نیم کشادہ اور نچلا ہونٹ ذرا موٹا۔ کان بڑے بڑے اور ٹھوڑی پر گوشت

آپ نے عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کی درسی کتب کا گھر پر ہی مطالعہ کیا تھا۔ شریف متین سنجیدہ اور ثقہ جوان تھے۔ طبعاً ایک نہایت خاموش طبع انسان اور خود نمائی و خود ستائی سے سخت متنفر تھے لیکن ان کی باوقار اور قابل احترام شخصیت اور ان کی سیرت کی نمایاں خوبیوں سے کوسوں پار بسنے والے ادب پرست حضرات بھی متاثر تھے۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد وہ حضرات بھی جنہوں نے مدت العمر کبھی ان سے بالمشافہ گفتگو نہیں کی تھی "ادبی دنیا" کے دفتر میں اظہار افسوس کے لئے حاضر ہوتے رہے۔ ملک بھر کی ادبی انجمنوں اور مجلسوں نے مرحوم کے ماتم میں کئی قراردادیں منظور کیں۔ ہمایوں، ساقی ٹریبیون، شیرازہ، خاتون، سماج، اور اختر ایسے بلند پایہ پرچوں نے مرحوم کے ماتم کے لئے اپنے کالم کے کالم وقف کر دیئے۔ ان کی موت پر حضرت علامہ کیفی، جناب جلال الدین اکبر، جناب مصطفیٰ خاں آزاد، جناب علی منظور حیدرآبادی، حضرت حفیظ ہوشیارپوری، جناب شہید ابن علی، حضرت عدم اور حضرت ضیا فتح پوری نے دل گداز مرثیے لکھے اور حق یہ ہے کہ مرحوم کی سیرت کی یہ تصویریں جو ان کے احباب نے مختلف زاویوں سے کھینچی ہیں ان پر نمائش بے جا یا مبالغہ کا نقش موہوم تک موجود نہیں۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی منصور
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ان کے مضامین ہمیشہ ملک کے بلند پایہ ادبی پرچوں میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ خود بھی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء تک یعنی متواتر چار سال "ہمایوں" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ۱۹۳۱ء میں علالت کی بناپر "ہمایوں" سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے ۱۹۳۲ء میں جب مولانا تاجور نجیب آبادی "ادبی دنیا" کے حقوق ملکیت سے دستبردار ہو گئے تو کارکنان "ادبی دنیا" نے پرچے کی ادارت آپ کے سپرد فرمادی۔ چناں چہ تادم مرگ مرحوم "ادبی دنیا" ہی سے وابستہ رہے۔

وہ افسانہ، ترجمہ، نظم، تنقید۔ غرضکہ ادب کے تمام شعبوں پر حاوی تھے اور ان سب باتوں کا گہرا نقش ادبی دنیا، خیالستان، اور ہمایوں کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے موجود رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زبان و ادب کی راہ میں شہید ہوئے اور وہ ادب جسے منصور ایسے شہیدوں کے خون نے سیراب کیا ہے آج زندہ ادب ہے، یہ ان کے ... ذوق عمل طویل اور خاموش جد و جہد، خلوص، راستی اور بے باکی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کے جدید سے جدید تر شاعر بھی ان کے افکار کو قدر اور احترام کی نگاہوں سے پڑھتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ ملک کے بہترین شاعر محض ان کی تنقیدوں اور مشوروں کی بدولت ایک مختصر سی مدت میں وہ سب کچھ سیکھ گئے جس کے لئے عمر نہیں بلکہ عمریں درکار ہوتی ہیں۔ ان کی مستقل تصنیف "دنیا کے بہترین افسانے" ہے، اور یہ کتاب ان کی فنی مہارت اور اعلیٰ انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی نظمیں ہمارے دور کی جدید تحریکات شعری کے (بلحاظ ہیئت و اسلوب) بہت قریب ہیں لیکن پختہ تر تھے۔ مشہور یونانی شاعرہ "سیفو" کی بعض نظموں کے ترجمے نہایت دلکش اور اثر انگیز ہیں۔

رباعیات بہت ہی خوب ہیں ان میں عشق و محبت بھی ہے دنیا کی ناپذیری اور بے ثباتی کا دردناک احساس بھی۔

برہم نہ یہ بزم شادمانی ہوتی ۔۔۔ اے کاش نہ ختم یہ کہانی ہوتی
اے کاش سدا قرار گل کو ہوتا ۔۔۔ اے کاش بہار جاودانی ہوتی

تالیفات : دنیا کے بہترین افسانے
فرہنگ اصطلاحات ادب

## چند اشعار

مرے جرم عشق کی اس قدر، مجھے اے ندیم سزا نہ دے
مرے دل پہ اتنی جفا نہ کر، مجھے یوں نظر سے گرا نہ دے
یہی ایک گوہر بے بہا، مری زندگی کا ہے ماحصل
مجھے ڈر ہے تیری یہ بے رخی، غم آرزو کو مٹا نہ دے
ہے خموش آتش زندگی مگر اک شرر ترے عشق کا
مرے دل میں اب بھی چمک رہا ہے اسے بھی یاس بجھا نہ دے
اب اگرچہ قابل اعتبار ہے غیر ہی کی وفا مگر
مری اس وفا کو جو اعتبار سے گر چکی ہے بھلا نہ دے
جو مجھے یقین ہو کہ میں ہی تیرے حریم غم کا رفیق ہوں
تو بلا کے گر مجھے بزم عیش میں بار تیری عطا نہ دے

○

بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھک گئے ہیں دنیا میں جس کے آگے
مقابلہ کر چکا ہوں میں اس کی رستمی، اور رہزنی کا
سکوں سے نا آشنا ہے دل مضطرب جہاں کا ہر ایک ذرہ
عمل سے ہے زندگی مری، راز ہے عمل میری زندگی کا
میرے ہی قلب حزیں کی ہے شمع جاوداں یہ یقین مانو
جہان تاریک میں سراسر ظہور ہے جس کی روشنی کا

○

ذرہ ذرہ کے جو میرے سر کو ٹھکراتے ہو ۔۔۔ آہستہ دل و جگر کو برماتے ہو
جس جور کی مدتوں تمنا کی ہے ۔۔۔ اے جان ندیم اسی سے شرماتے ہو

(لاہور کا دبستان شاعری)

# سخنہائے گفتنی

## صبیر الدین ہاشمی

"اردو ادب کی تشکیل نو کے بارے میں" "قومی زبان" میں فکر انگیز مضامین کا سلسلہ جاری ہے، ایڈیٹر ماہ نو "محترمی رفیق خاور صاحب کے مضمون کے بعد اس عنوان پر بحث شروع ہوئی ہے، ہندوستان اور پاکستان کے کئی اصحاب قلم نے اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کیا ہے بعضوں نے رفیق خاور صاحب کے خیالات سے اتفاق کیا ہے اور بعض نے ان کی مخالفت میں آواز بلند کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خاور صاحب کے بعض خیالات سے اتفاق کرنا ضروری ہے اور بعض ایسے امور ہیں جن سے اتفاق نہیں ہو سکتا۔

پاکستان بن جانے کے بعد میرے چند مضامین اردو کے جدید ادب کے متعلق رسالہ "ہمایوں" لاہور کے چند نمبروں میں شائع ہوئے ہیں ان کی صراحت حسب ذیل ہے۔

(۱) جون ۱۹۴۸ء — اردو زبان کے قدیم مورخ اور نقاد

(۲) فروری ۱۹۴۹ء — اردو ادب کے نئے تقاضے

(۳) اپریل ۱۹۴۹ء — تاریخ نگاری کی نئی راہیں

(۴) جون ۱۹۴۹ء — جدید سوانح عمریاں اور سفرنامے

(۵) اکتوبر ۱۹۴۹ء — تاریخ ادب کی تدوین اور تنقید نگاری کی اصلاح

(۶) اگست ۱۹۵۰ء — نئی شاعری

(۷) جولائی ۱۹۵۱ء — جدید مذہبی ادب

(۸) مئی ۱۹۵۲ء — اردو زبان کا ادب نسواں

مندرجہ صدر مضامین میں میں نے تفصیل کے ساتھ جدید ادب یا "ادب اردو کی تشکیل نو" کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا ہے مگر ان کو دوبارہ لکھا جائے تو کئی صفحے درکار ہیں، اور طوالت کا موجب بھی ہوگا۔

بہرحال اردو ادب کی تشکیل نو تو ضروری ہے مگر تمام قدیم ادب کو نظر انداز کر کے جدید ادب کی تشکیل کرنا صحیح نہیں ہے۔ قدیم ادب کی اچھی چیزیں نظر انداز نہیں ہو سکتیں۔ جدید ادب میں نئے تقاضے بھی شامل ہوں گے اور پرانی اچھی چیزیں بھی باقی رہیں گی۔

## ڈاکٹر قطب النساء بیگم ہاشمی

رفیق خاور صاحب نے "اردو ادب کی تشکیل نو" کے عنوان سے جن مسائل کو چھیڑا ہے اور جن سوالات کو اٹھایا ہے ان پر غور کرنا اردو زبان کی ترقی و توسیع کے لئے اہم بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ لیکن ان پر غور کرنے سے پہلے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سوالات بروقت اٹھائے گئے ہیں؟

اب جب کہ اردو زبان کی جان پر بنی ہے، اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں، ہندوستان میں اس کا جائز مقام اسے ابھی تک نہیں مل سکا ہے اور پاکستان میں ابھی تک اردو زبان کی ملکی و رسمی حیثیت قائم نہ ہو سکی حالانکہ ایک ضعیف العمر ہستی بابائے اردو مخالفین پاکستان سے بار بار اس کی اپیل کی

لیکن ابھی تک کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ مخالفین کے حملے
رہے ہو رہے ہیں قانون ابھی تک اردو زبان کے حقوق دلوانے
ل پذیر نہیں ہے، اردو زبان کی کتابوں کی مانگ میں پہلا سا کس بل بھی
نہیں۔ ایسی صورت میں اس کی تشکیل نو سے زیادہ "تشکیل موجودہ"
حفاظت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

آزادی کے بارہ سال بعد بھی دونوں تمام ملکوں میں اردو زبان کو
لا لینے کے لئے چیخ و پکار کی ضرورت داعی ہو رہی ہے، بے پناہ
ہے، طوفان بدتمیزی کی طرح ملک کے طول و عرض میں منعقد کئے
رہے ہیں، کانفرنسوں، مجلسوں اور یوموں کی بڑبونگ بھی ہوئی ہے جو
ت ایک طرح کے جواز کا حق بھی رکھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بے حسی کے دور میں مسرت اس وقت تک
نہیں کہلاتی جب تک وہ قہقہہ نہ بن جائے غم اس وقت تک غم
بھلایا جا سکتا جب تک کہ آواز کے ساتھ نوحہ خوانی نہ ہو۔ حق کی بات
ت تک سنی نہیں جا سکتی جب تک کہ اس کے لئے اسٹیج سے آواز بلند
ے، اس وقت تبسم، افسردگی اور خاموشی سی کیا معنی رکھتی ہے جب
، حامیوں نے حق مانگنا شروع کیا تو قدیم شاعروں کے "دن"
عام سے منائے جا رہے ہیں۔ ان کی شکستہ قبریں از سر نو بنائی
ں بلکہ ان کے مسمار شدہ مکانوں کو احاطہ بند کیا جا رہا ہے اس طرح
ت کے داعیوں کو طفل تسلی دی جا رہی ہے۔

اردو کے ادیب بھی اس وقت سہمے ہوئے ہیں اور ہوا کے رخ
ہوتہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ موجودہ صورت حال میں اگر کوئی چیز
ا ہو سکتی ہے تو اردو ادیبوں میں اعتماد کلی کا پیدا کرنا ہے۔ بغیر
دھ سے کوئی کارنامہ قابل وقعت نہیں ہو سکتا۔ ادیب اپنے
کارناموں کو پیش کرنے کے لئے آزادی رائے اور اطمینان کی
ہے آزادی رائے اعتماد کی جان ہے اس کے بغیر روایت و
روایت کے لئے کوئی راہ کھلی ہوئی نہیں ملتی۔

یوں اردو زبان میں ۱۹۳۶ء کے بعد سے مختلف النوع تجربات
ہو رہے ہیں۔ اصناف سخن میں نئے انداز نے جگہ پائی ہے اور نثر کی
زندگی سے قریب ہوتے ہوئے نئے فارم اور تجربوں کا شکار ہوئی
ہے لیکن اس پچیس سالہ دور میں ایسی تحریریں یا شعر و سخن کم ملتے ہیں جن کا
اثر دیرپا ہو اور جو مواد و اظہار بیان کے اعتبار سے صحیح امتزاج رکھتے
ہوں۔ اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی ہے، کہ
نوجوان ادیبوں میں ماضی سے بغاوت کا جذبہ شدت کی حد تک پایا جاتا ہے
اور ان کی نظریں مغرب پر لگی ہیں۔ جب تک کہ ماضی کے ورثے قیمتی
ذخیرہ کو اپنایا نہ جائے اور اسے جدید سے مربوط نہ کیا جائے۔ بڑا کارنامہ
کیسے وجود میں آ سکتا ہے اور قدیم و جدید کا امتزاج کیسے کیا جا سکتا ہے۔
بے جا بغاوت کا یہ جذبہ جو عام طور پر ادیبوں میں موجود ہے ادبی زندگی کے
لئے بہر صورت مضرت رساں ہے۔ خود جناب خاور صاحب کے مضمون میں
بھی اس جذبے کی بو ملتی ہے۔ انہوں نے ایک طرف قدیم ادب کی چھان
بین کا ذکر ضمناً کیا ہے تو دوسری طرف جدید رجحانات کو اپنانے میں زور
قلم صرف کیا ہے اور ادیبوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ادبی انتشار کو دور کرنے
کے لئے دوسروں کا اثر قبول کر کے ایک زیادہ گہری اور مرکب شخصیت پیدا
کریں۔ لیکن ادبی انتشار کو دور رکھنے کا یہ مشورہ اور انتشار پیدا کرنے کا مشورہ
ہے اور قدیم نظام تمدن کی جو نئے رواں جو چھوٹ کر بے پایاں ہو گئی اور کئی
ندی نالوں میں تقسیم ہو گئی ہے اس کی اصل وجہ اس بند کو توڑنا ہے جو ہمارے
اسلاف نے اپنے خون سے سینچ کر بنایا تھا اور جب ہم بے راہ ہو گئے تو
ادبی زندگی میں گروہ بندی نے قدم رکھا جس کی وجہ سے بعض اچھے ادیب
بھی آگے بڑھنے سے پہلے ہی اپنی موت آپ مر گئے اور پھر ادب میں سیاست
چور دروازے سے کچھ اس طرح داخل ہو گئی کہ جو ادیب گروہ بندی سے بچ
کر خاموشی سے اپنا کام کرنا چاہتے تھے ان کے لئے راستہ مسدود ہو گیا۔

آگے بڑھنے اور میدان میں آنے کی سکت ان میں باقی نہ رہی ۔

میرا اپنا یہ خیال ہے کہ آج کل جو اردو زبان و ادب کا دم گھٹا جا رہا ہے اس میں یہی بجز از زیادہ کارفرما ہیں، انتشار کی وجوہات بھی یہی ہیں ورنہ بلاشبہ ہم آگے بڑھ جاتے اور اردو ادب کی عمر میں بھی اضافہ ہوتا۔ اب اس حقیقت ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو ادبی رسالوں کی تعداد اشاعت میں کافی اضافہ ہو گیا لیکن ان کی کمیت و کیفیت میں وہ پہلا سا نکھار نہ رہا کسی چیز کی قدر و قیمت اس کے داخلی وزن سے ہے تعداد سے نہیں اور یہی حال پاکستان کے اکثر رسالوں کا ہے ۔

ایسی صورت میں اردو ادب کو "نیا جنم" دینے کی بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس کی ابتری کے بنیادی وجوہات کو تلاش کیا جائے جس سے ہمارے ادیبوں میں فکر و فن کی نئی نئی راہیں خود بخود کھلتی جائیں گی۔ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کے لئے ہم کو مغرب کی تقلید سے زیادہ مشرق کے خزینوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ کام کوئی ہو محنت اور لگن شرط اول ہے اور یہ تبھی ممکن ہے کہ ادیبوں کے سطحی کارناموں کو کسی جذبے کے تحت نہ سراہا جائے بلکہ محنت و عرق ریزی جہاں بھی ملے اس کی داد ضرور دی جائے ۔

آج جبکہ دنیا سیر و سفر کی سہولتوں سے سمٹ کر ایک نقطہ کے قریب آگئی ہے ہم ترقی یافتہ ممالک کے نامور ادیبوں کے کارناموں سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔ اور نہ ہم کو "دامن سمیٹ" بیٹھنے کی ضرورت ہے لیکن یہ لین دین واجبی واجبی ہو کہیں ایسا تو نہیں کہ دور کے بادلوں کو دیکھ کر ہم اپنے پانی بھرے برتن ہی توڑ دیں ۔

## حفیظ گلشن آبادی (حیدرآباد دکن)

میں نے جناب رفیق خاور صاحب کا مقالہ یکم جنوری ۱۹۶۰ء کے "قومی زبان" میں بار بار پڑھا مضمون میں وزن و وقعت ہے اور اہل بصیرت کے لئے چند اہم و تعمیری سوالات دستور رسالہ میں ملتے ہیں مضمون کیا ہے قدیم و جدید کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو ادب کی تشکیل نو کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کیا ہے جو بڑی حد تک غیر متوازن ہے۔ تحریر میں جن نظریات اور تحریکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے فاضل مضمون نگار اپنے خیالات کے اظہار کو براہ راست بیان کرنے میں بڑی حد تک مغرب کا دلدادہ نظر آتا ہے لیکن مضمون کے اس حصہ کو نظر انداز کرکے ہم ان کی تجویزوں پر غور کریں تو اس میں اہم اور فکر بڑھانے والی اشارے مل جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کے ذہن میں بہت سی چیزیں ۔۔ بہ یک وقت جمع ہیں۔ اسی لئے الجھا گنجلک ہے۔ پھر بھی یہ تحریر چونکہ کوئی منشور یا مینی فیسٹو نہیں بلکہ فکر و فن کی طرف ادیبوں کی توجہ مبذول کرنے کی ابتدائی صورت ہے اس لئے ان کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے ۔

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آج جبکہ دنیا لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے اور زندگی کا اتنا دیکھا ہوا مختلف روپ اختیار کرتا جا رہا ہے، اس دوران ادب میں برسوں سے کوئی نمایاں تبدیلی فارم اور فکر میں نظر نہیں آرہا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ارتقائے زندگی کی رفتار کے ساتھ ہمارا ادب بھی ارتقا کی منزلیں تیزی سے طے کرجاتا لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے پیش روؤں (حالی سے اقبال تک کی طرف اشارہ ہے) نے زندگی کے اشاروں کو ادب میں گھول دیا تھا اور راہنما قدم اتنے صحیح نپے تلے تھے کہ آج بھی ہم ان اشاروں کی طرف بار بار نگاہ ڈالتے ہیں۔ اب جبکہ زندگی میں نت نئے مسائل سر اٹھا رہے ہیں اور دوسرے ممالک کے ادب میں جو چہل پہل ہے اس کا عشر عشیر بھی ہماری زبان میں نہیں ملتا اور جب ہم ان کے سہارا تلاش کرتے ہیں تو ہم کو فرسودہ نمایاں ستون مل جاتے ہیں۔ ایک صنف جس کو ہمارے قدما نے بھی "تنگ نائے" کا خطاب دے رکھا تھا اور مختصر افسانہ جس کی ہمارے پاس کثرت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ افسانوں کی کثرت میں ہمیں وسعت نظر بھی مل جاتی ہے اور ہمارا ذریعۂ اظہار کچھ نہ کچھ بھی ہو چلا ہے لیکن اب جبکہ ہم چوراہے پر کھڑے چاروں طرف نظر دوڑا

تو بہت سے راستے اس مرکز سے ملتے ہیں۔ بچھڑ جانے پچھلے راستوں پر گھومنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہمت و استقلال کا سہارا لے کر نئے راستوں پہ نئے تجربات کی بنیاد ڈالیں۔

یہ بھی مسلم ہے کہ موجودہ ادیب کو بحرانی حالات اور شعوری تعدد نے بہت متاثر کر رکھا ہے اور اس پر مختلف اثرات کام کر رہے ہیں، حالات ادیب کا بہت کم ساتھ دیتے رہے ہیں اردو زبان کی تنگ بیتقل نے اس کے دم خم کو مجروح کر دیا ہے۔ معاشی دباؤ نے اسے منہ ڈالنے پر مجبور کیا ہے، قدیم ادب کا انبار اس کے پیچھے اور دنیا کے جدید ادب کا ڈھیر اس کے سامنے ہے وہ اس کشمکش میں ہے کہ کیسے اپناؤں اور کیسے اپناؤں، یہ سب کچھ سہی لیکن ایک نظر اگر ہم اپنے اسلاف پر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے شاہکار حالت مفلسی و تنگ دستی میں عالم وجود میں آئے۔ غالب کی رفعت تخیل و اعلیٰ شاعری نے اسی حالت میں جنم لیا جبکہ اس کے محبوب کی تواضع کے لئے "بوریہ" تک نصیب نہ تھا۔ گولڈ اسمتھ جس ناول کو اپنی ماں کی میت کو دفنانے کے ساتھ وجود میں لایا وہی اس کا شاہکار تھا۔ میر کا باغ و بہار سے منہ موڑ لینا اور قید ہستی میں۔ نشاط غم۔ کو پا لینا کچھ بے معنی تو نہیں

میرا ذاتی خیال ہے کہ فکر و نظر کی راہوں میں ہزاروں اندیشے سہی لیکن ان عوامل اور تجربوں کے لئے ہمیں کمر ہمت باندھنا ضروری ہے دیکھیں تو سہی ایک مرد خدا نے اردو زبان کا چولا بدلنے کا جو عزم کیا ہے اس سعی و کاوش میں ہمیں کیا ملتا ہے اور پھر ہم کیا کرتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم کو چاہئے کہ جناب رفیق خاور صاحب نے جس کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی مثبت اقدار کو تلاش کریں ممکن ہے اس سلسلے میں ہمیں بہت سی قابل عمل چیزیں مل جائیں، کیونکہ اب بھی اردو کے ادیب فکر و نظر میں چند کوتاہیوں کے باوجود اچھی اچھی صلاحیتیں رکھتے ہیں اور آئندہ دن ان کے جو تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں امکان موجود ہے۔ یہ تبدیلی ہمارے لئے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اردو ادب کا ابتدائی حصہ بہت نازو نعم میں پلا ہے اور وہ محبت کے دامن میں پھلتا پھولتا رہا ہے اور زندگی کے دوسرے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا اب اس کی تلافی کا ایک موقع ہے۔

---

بقیہ

## اداریہ

(بسلسلہ صفحہ ۲)

کی خواہش کی ہے کہ پاکستان مستحکم و خوش حال ہو۔ ہاں یہ بھی دعا ہونی چاہئے کہ ملک صحیح معنوں میں آزاد ہو اور ملک والے آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہوں۔

---

## بزم ادب

انجمن ترقی اردو کو آئے دن اردو دوستوں کی طرف سے علمی و ادبی استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں ان استفسارات کے جوابات وقتاً فوقتاً بھجوا دیئے جاتے ہیں ان میں سے بیشتر جوابات بابائے اردو قبلہ مرحمت فرماتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ان جوابات سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، جو استفسارات کرتے ہیں ایسی صورت میں ان کی افادیت محدود رہتی ہے اس صورت حال کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ سے ایسے تمام اہم استفسارات اور ان کے جوابات قومی زبان میں شائع کئے جائیں۔ ہماری استدعا پر ملک کے نامور نقاد اور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے ان استفسارات کے جوابات دینا منظور فرما لیا ہے۔ امید ہے قارئین کرام اس نئے سلسلے کو پسند فرمائیں گے۔ اس سلسلے کی پہلی قسط "بزم ادب" کے عنوان سے قومی زبان کے آئندہ شمارے میں شائع ہوگی۔

---

ہمیں زمانے میں کوئی بھی باوفا نہ ملا
تمام عمر بسر ہو گئی وفا کرتے

(حکیم ہاشمی)

جلیل احمد قدوائی

# غزل نما

آگاہ خود نہ اپنی حقیقت سے نہ ہو سکا
میں بھی عجیب عالمِ ہستی کا راز تھا
دل نے تڑپ کے کر دیئے طے سارے مرحلے
میں مبتلائے کش مکشِ ضبطِ راز تھا

ہے وہی میرے لئے حاصلِ یک عمرِ وفا
تم نے جو جرمِ محبت نظر انداز کیا

رنگ اس شوخ کی صباحت کا
آئینہ ہے ہماری حیرت کا
عمر ساری ملال میں گذری
اللہ اللہ! فریب راحت کا

تھی تو پہلے بھی یہ دنیا میں و لے تھی محدود
ہم نے اس رسمِ محبت کو مگر عام کیا
حسن یہ بادئ دل دیکھ نہ پلٹے احباب
جذبۂ عشق کو بیکار میں بدنام کیا

تھا جمالِ دوست بھی کس درجہ حیرت آفریں
جس نے دیکھا محو تھا جس نے دکھایا خود تھا

دل بے تاب کی شکایت کیا
آپ ہی نے اسے خراب کیا

ابھی پہنچے بھی نہ تھے منزلِ جاناں کے قریب
درد ہونے لگا محسوس رگِ جاں کے قریب
آ گیا کس نگہِ ناز کی حرمت کا خیال
رُک گئے اشکِ مرے آکے جو مژگاں کے قریب

تھا ابھی پیشِ نظر تیرا خیال
یا ریاضِ غم میں آئی تھی بہار

جہانِ حسن میں کھائی ہیں ٹھوکریں اتنی
تمیزِ دشت ہے باقی نہ امتیازِ چمن

ڈرایا اس قدر طوفانِ بحرِ زندگانی نے
کہ ہم ساحل کو بھی موجِ لبِ ساحل سمجھتے ہیں
ہمیں ہم رہ روانِ راہِ غربت کی کوئی منزل
بٹھا دے جس جگہ بے چارگی منزل سمجھتے ہیں
ڈراتی کیا ہے دنیا ہم کو مرگِ ناگہانی سے
اسے تو ہم حدودِ زیست میں داخل سمجھتے ہیں

جنونِ فتنہ ساماں کی بھی یاد اس نے بنا ڈالی
دعا دیتا ہوں میں اپنے جنونِ فتنہ ساماں کو

محرومئ پیہم نے بالآخر یہ بتایا
شامل ہے وہ ہر رنگ میں ایسا کہ جدا ہے

بے خبر ہو کے ہوئی مجھ پہ جو بیداد کیا
جان لگ کیجئے تو کچھ لذتِ بیداد ملے
اے فلک تکملۂ خونِ تمنا ہی سہی
کچھ تو ایثارِ محبت کی مجھے داد ملے

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئے لیکن
حیاتِ غم حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

خدا معلوم کتنے اور کیسے غم اٹھائے ہیں
ہنسی بھی دردمندوں کی فغاں معلوم ہوتی ہے

یہ سوزِ دروں کب تک؟ یہ ضبطِ جنوں کب تک
کچھ ان سے بیاں کر دے اے پردۂ خاموشی

اس طرح کہ چھوٹی نہ کوئی شانِ تلوّن
جب آئے تصوّر میں برنگِ دگر آئے

دل سمجھتا تھا ترے قرب سے ہوگی تسکین
اشکِ خوں آج بھی اس دیدۂ تر سے نکلے
نقدِ جاں اس پہ مٹانے کے لئے پھرتا ہوں
شاید اس سمت سے اس راہ گزر سے نکلے

دل مرا کشمکشِ شوق سے چھٹ جائے گا
تیرا پیکاں تو کسی طرح جگر سے نکلے

بقیہ:—

## رسالہ

(بسلسلہ ص ۱۸)

بھی اپنی فیاضی اور دریادلی کے تقاضا سے اتفاق فرمایا۔ اس لئے مصنف ممدوح کے شکریہ کے ساتھ تمام کتاب چھاپ کر گو وہ حجم میں رسالے سے بہت ہی بڑی ہے تاہم رسالے کی جا بجا تقسیم کی جاتی ہے اور اخیر میں جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی اور جناب مولوی الطاف حسین صاحب حالی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جن کی توجہ سے یہ عمدہ کتاب شائع ہوئی۔ سید صاحب کے شکریہ کی وجہ خود کتاب کے صفحہ ۷ اور ۸ سے ظاہر ہے۔ جناب مصنف ممدوح سید صاحب کی تحریک کا حال علاوہ اور بہت باتوں کے اس شعر کے ذریعہ سے ظاہر فرماتے ہیں: ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

دیرینہ سال پیر سے حقیقتاً سید صاحب ہی مراد ہیں اور جناب ممدوح کے شکریہ کی وجہ ظاہر ہے۔

ہم ایک مدت سے مولانا مصنف ممدوح کی توجہ عمدہ عمدہ امور حمایت اسلام میں دیکھ رہے تھے مگر خدا کا شکر ہے کہ اب جناب موصوف کی توجہ بہت ہی عمدہ طریقے سے اسلام کی حمایت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ خدا کرے اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جلد شائع ہو اور قوم کو خدا بد[illegible] و... اور بے وجہ بدظنیوں اور بدگمانیوں سے بچائے۔

---

طے کر رہا ہوں عشق کی ان منزلوں کو میں
میری خبر ہے ان کو نہ ان کی خبر مجھے

([illegible])

اشرف علی

# "گنج خوبی"

مؤلفہ ــــــــــــ میر امن

شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے میر امن دہلوی کی شہرہ آفاق تصنیف باغ وبہار یا چہار درویش کا نام نہ سنا ہو۔ اس کتاب کو اردو ادب میں آج بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل تھی، لیکن ادب کے چند طالب علموں کے سوا بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ "باغ وبہار" کے خالق میر امن نے اردو زبان میں ایک اور کتاب بھی "گنج خوبی" کے نام سے تالیف کی تھی۔

گنج خوبی ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور فارسی کتاب اخلاق محسنی کا بڑا کامیاب اردو ترجمہ ہے۔ میر امن نے یہ ترجمہ سلیس اور آسان اردو میں کیا ہے۔ اخلاق محسنی انگریزی، فرانسیسی، ہندی زبانوں کے علاوہ اور بھی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ فارسی ادب میں اخلاق محسنی کا پایہ انوار سہیلی، سعدی کی گلستان اور بوستاں کے برابر تصور کیا جاتا ہے لیکن میر امن کی یہ سعی باغ وبہار کی مقبولیت کی وجہ سے مشہور نہ ہو سکی۔ میر امن خاص دہلی کے باشندے تھے، اور محاوروں اور کہاوتوں کے شیدائی لیکن انہوں نے گنج خوبی کے سنجیدہ موضوع اور احادیث و روایات کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے سنجیدگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور یہی اس ترجمہ کی خوبی ہے۔ گنج معانی جن خوبیوں اور اچھائیوں کا گنجینہ ہے اس کے متعلق خود میر امن لکھتے ہیں:

"از بس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لئے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں اس واسطے اس کا نام بھی گنج خوبی رکھا۔ اب پڑھنے والے صاحبان والا شان کی خدمت شریف میں عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب عملداری اور حکم کے حق میں ایسی خوب ہے کہ اگر نظر میں رکھیں اور اس پر عمل کریں تو بہت سے فائدے حاصل ہوں اور اپنے کام آویں۔"

میر امن نے ترجمہ کرتے ہوئے جہاں تک ہو سکا عام بول چال اور روزمرہ کا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا اس لئے اصل مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا اور جس طرح شیخ سعدی شیرازی کی گلستاں بہ سبب سلیس فارسی کے مکتب میں پہلے کام آتی ہے ویسی ہی میں نے بھی اردوئے معلیٰ کی زبان کو بے پیچ ورود کا جیسے بادشاہ سے لے کر امرا اور ان کے ملازم بولتے ہیں بولا۔ البتہ عربی و فارسی کی نقلیں اور اصطلاحیں چاہتا تو بہت سی بھر دیتا لیکن یہ زبان کچھ کیفیت نہ پاتی بلکہ آمیزش پا کر کچھ زبان اور کی اور ہو جاتی۔ اب مبتدی کے واسطے فائدہ مند اور محقق صاحب دریافت کو پسند آوے گی کیونکہ یہ لگا ڈریا کی مانند اس کی عبارت رواں ہے اور قریب ہزار بیت استادوں کی جو مصنف نے تمام کتابوں سے چن چن کر ہر ایک مضمون کو ہر موقع پر شستہ ڈالیں ہیں۔ ان کو بھی اپنی سمجھ کر موافق جوں کا توں ہندی میں نظم کیا۔" فارسی حکایت بطور نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس کے سامنے اس کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے تاکہ قارئین خود کتاب کی اصلی عبارت کو پڑھ سکیں اور میر امن کے ترجمے کی داد دے سکیں۔

## فارسی

از امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ در کتاب جواہر الامارہ نقل
نقل کردہ کہ اند ایشان گفتند وقتی در جاہلیت بہ تجارت جانب مداین
می رفتم و چہل جامہ از برد یمانی با من بود چون بحوالی مداین رسیدم
دزدان سر راہ گرفتند و مرا غارت کردہ بردہا را بردند و من بعد
محنت خود را بہ مداین رسانیدم و بداد خواہی بدرگاہ نوشیروان
رفتم چون صورت تظلم من بسمع نوشیروان رسید و بر کماہی حالات
من اطلاع یافت حاجبی را فرستاد تا دست من گرفتہ مرا بوثاقی فرد
آورد و گفت این جا باش تا دزدرا طلب کنند و بردہا را باز ستانند
من در آن وثاق می بودم و ہر روز از مطبخ خاص خوانچہ طعام ملوکانہ
می آوردند پیش من ہی نہادند و من ہر روز بدرگاہ کسری می رفتم
و نظارہ مراسم مملکت داری و رعیت پروری می کردم تا بعد از
چہل روز بوثاق در آمدم جامہ ہائے برد را دیدم نہادہ و دستی بریدہ آنجا
افتادہ و کاغذ چہل تنگہ زر سرخ در روے دیران کاغذ نوشتہ کہ چہل روز
ایستادی تا دزد ترا بدست آوردند درخت تو بتو رسیدایں
چہل تنگہ مزد چہل روزہ انتظار تست چون بولایت خود رسی باید کہ
از ما شکایت نکنی۔

## اردو (ترجمہ)

عمر خطاب راضی ہوئے اللہ اُن سے اپنی نقل کرتے ہیں چنانچہ
جواہر الامارہ جو کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ ایک بار جب میں
مسلمان نہ ہوا تھا اور پیغمبر آخر الزماں کا دین جاری نہ ہوا تھا مداین کی طرف میں چلا
تھا اور چالیس تھان چادریں یمن کی میرے ساتھ تھیں جب نزدیک مداین کے
پہنچا چوروں نے راہ میں گھیرا اور لوٹ لیا میں بہ ہزار محنت اور خرابی سے شہر میں
گیا اور فریاد کرنے کو چلا جب دروازے پر گیا میری خبر نوشیرواں کے کان میں
پہنچی اور تمام میرا احوال دریافت کیا چوبدار کو بھیجا وہ میرا ہاتھ پکڑ کے لے چلا
اور ایک حجرے میں لاکر بولا اس مکان میں رہ جب تک تیرے مال کے چور کو
ڈھونڈیں اور تیرا اسباب ان سے پھیر لیں میں اس جگہ میں رہنے لگا ہمیشہ بادشاہی
باورچی خانے سے ایک خوانچہ ستھرے کھانے کا لاتے اور مجھ کو دیتے میں ہر روز نوشیرواں
کے دربار میں جاتا اور اس کی سلطنت کی راہ و رسم و روش کا تماشا دیکھتا اور رعایت سے
جو سلوک اور انصاف اس کا تھا معلوم کرتا اسی طرح انتالیس دن بیتے چالیسویں روز جبھی
میں اس کوٹھری میں آیا دیکھتا ہوں کہ میرا اسباب دھرا ہے اور ایک ہاتھ کٹا ہوا بھی
پڑا ہے اور ایک کاغذ پہ چالیس اشرفیاں دھری ہیں اور اس میں لکھا ہے کہ تو چالیس دن
یہاں رہا آخر چور تیرا پکڑا گیا اور تیرا اسباب تیرے پاس پہنچا یہ تیرے چالیس دن
منتظر رہنے کے ہیں جب اپنے ملک میں پہنچے تو ہمارا گلہ نہ کیجیو۔

اخلاق محسنی میں جابجا فارسی اشعار، مثنویاں اور قطعات آئے ہیں۔ مترجم نے ان اشعار کو بھی بڑی سادگی اور صفائی کے ساتھ اردو میں نظم کیا ہے میر امن
کی اس شاعرانہ خوبی کو دیکھ کر بجا طور پر انہیں ایک شاعر بھی ماننا پڑتا ہے حالانکہ میر امن نے کتاب مذکور میں اپنے شاعر نہ ہونے کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔
"اگرچہ فکر سخن کہنے کی ساری عمر نہیں۔ ہاں مگر خود بخود جو کوئی مضمون دل میں آیا تو اسے باندھ لیا نہ کسو کا استاد نہ کسی کا شاگرد
نہ شاعر ہوں اور نہ شاعر کا بھائی فقط اپنی طبع آزمائی" اس اعتراف کے باوجود بھی میر امن کی شاعرانہ جبلت کا ازلی اعتراف
کرنا ہی پڑتا ہے ایک نظم گنج خوبی سے اصل فارسی کلام کے سامنے درج کی جاتی ہے تاکہ میر امن کی قادر الکلامی کا اندازہ ہو سکے۔

### فارسی

روایات و احوال شاہنشہاں ــ حکایات و اخبار کار آگہاں
ہمہ بہرہ دارد ز دانائی بود ــ بعلم و خرد آشنائی بود

### اردو (ترجمہ)

شاہوں کے نیک و بد کی حکایت ــ اور دانائوں کی روایت سے
آنکھ اور دل میں روشنی آوے ــ علم اور عقل سے خبر پاوے

رنہ ہا بے سخن گفتہ اند　　با الماس تحقیق دُر سفتہ اند　　ہر طرح کی وہ باتیں بولے ہیں　　سچے ہی موتی سارے تولے ہیں

ران بے تجربہ کردہ اند　　بہ ہر کار بس رنجہا بردہ اند　　اور زمانے کو آزمایا ہے　　ڈھیر سارنج بھی اٹھایا ہے

نا بہ کہ بر قول ایشان رویم　　سخنہائی پیشینگان بشنویم　　یہ بہتر کہ ان کی بات سنیں　　اور اگلوں کی پیروی میں چلیں

ے کہ کشتند در روزگار　　بسے آورد میوۂ نغز بار　　جو درخت اس جہان میں لگے　　بہت سے میوے ان میں ہیں پکے

نا بدان باغہا پے بریم　　دمادم ازاں میوہا برخوریم　　آؤ تو ان باغ میں جاویں　　دم بدم اچھے اچھے پھل کھائیں

کتاب مذکور نایاب ہے اور اب تک جن حضرات نے میر امن پر تھوڑا بہت کام کیا ہے ان میں سے بیشتر نے ان کی اس کتاب پر سیر حاصل تبصرہ ں کیا۔ اس کی وجہ کتاب کی نایابی ہو سکتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ صاحب "داستان تاریخ اردو" کو بھی گنج خوبی پر تبصرہ لکھتے ہوئے اصل کتاب دستیاب نہیں ہو سکی م الحروف کو خوش قسمتی سے کافی چھان بین کے بعد گنج خوبی کے دو نسخے لیاقت میموریل لائبریری کراچی سے دستیاب ہوئے جو اس وقت پیش نظر ہیں۔ اس لئے اسب ہے کہ کتاب مذکور کی تاریخ تالیف، طباعت و کتابت نیز دوسرے اہم پہلوؤں پر مختصراً روشنی ڈالی جائے تاکہ قارئین کتاب گنج خوبی سے براہ ست متعارف ہو سکیں۔ کتاب کی تاریخ تالیف کے متعلق میر امن خود لکھتے ہیں:۔

" سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو عیسوی کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا" تاریخ طباعت کے متعلق مرقوم ہے " غلام حیدر ساکن ہوگلی کے دارالحکمت شہر کلکتے کے درمیان احمدی چھاپہ خانے میں جناب سید عبداللہ صاحب کے ۱۲۲۳ھ ہجری میں موافق ۱۸۰۹ عیسوی کے بخوبی تمام قواعد اردو کی رعایت کے ساتھ چھاپی گئی " اول صفحہ پر تین گنبد اور چار مینار بنے ہوئے ہیں جس پر خط طغریٰ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر ہے۔ صفحہ ۸ تک کتاب کا مفصل حال لکھا گیا ہے اور اسی صفحہ سے اصل کتاب کا ترجمہ شروع ہوتا ہے، ہر صفحہ پر سترہ سطور ہیں کل کتاب ۴۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ پوری کتاب چالیس ابواب میں منقسم ہے جہاں باب ختم ہوتا ہے اگلا باب صرف ایک خط کھینچ کر شروع کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اشعار آتے ہیں ان کو بھی ایک ہی سطر میں لکھ دیا گیا ہے بعض جگہ شعر کا ایک حصہ ایک سطر میں اور دوسرا حصہ دوسری سطر میں آجاتا ہے۔ کاغذ معمولی ہاتھ کا بنا ہوا ہے اور چھپائی ٹائپ کی ہے جو نستعلیق سے قریب ہے جس میں طباعت کی اکثر غلطیاں رہ گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں فہرست ابواب کے ساتھ غلط نامہ بھی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں میر امن کی گنج خوبی ان معنوں میں اردو نثر کی پہلی تصنیف کہی جا سکتی ہے کہ یہ اخلاق نصیحت اور انسانی کردار کو سنوارنے کے لئے لکھی گئی۔ اس تصنیف کی افادیت اور قدر و منزلت کا اندازہ علم دوست حضرات مطالعہ کے بعد ہی لگا سکتے ہیں۔

---

بقیہ:

## یادوں کے چراغ

(بسلسلہ ص...)

اس سے مجھ پر اس قدر شرم غالب ہوئی کہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ چند دن کے بعد فرمایا کہ طالب علموں سے نام بہ نام دریافت کرو کہ وہ اس لباس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ میں نے بھی ایک ایک سے پوچھا اور پوری فہرست بنا ڈالی۔ سب نے اسے پسند کیا صرف دو چار ایسے تھے جنھوں نے کہا ہمیں اس سے اختلاف تو نہیں البتہ کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔

(باقی آئندہ)

رشید لاشاری

# سچل سرمست کی اردو شاعری

سچل سرمست وادیٔ مہران (سابق سندھ) کے قومی شعراء میں سے ہیں۔ وہ اب سے قریباً ڈیڑھ سو سال قبل نہ صرف سندھی، فارسی اور سرائیکی میں شعر کہتے تھے بلکہ انہوں نے اس زمانے میں جبکہ اردو دلی، دکن اور لکھنؤ میں پرورش پا رہی تھی، سندھ میں بھی اپنے صوفیانہ رنگ میں اسے چلنے اور آگے بڑھنے کی قوت بخشی۔ رشید لاشاری[1] نے یہ مضمون "سچل سرمست کی اردو شاعری" یہ سندھی زبان میں لکھا ہے لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اب سے ڈیڑھ سو سال قبل سچل سرمست اور ان کے ہم عصر اسی اردو ادب کی تاریخ کے صفحات مرتب کر رہے تھے جیسے لکھنؤ دلی اور دیگر علاقوں میں درد، انشا، مصحفی اور نظیر جنم دے رہے تھے۔

---

تاریخ اردو ادب کے مصنفین نے اردو شاعری کے جو ادوار قائم کئے ہیں اس کے مطابق سچل سرمست اردو زبان کے دوسرے دور کے شعراء کے ساتھ ہیں اس دوسرے دور میں جس میں سودا، میر حسن، میر تقی، جرات، انشا، درد، مصحفی اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ شامل ہو چکے تھے اس طرح یہ دور ۱۷۴۰ء سے شروع ہو کر ۱۸۰۳ء میں ختم ہو گیا تھا۔ اس دور میں سندھ کے اندر میر علی شیر قانع، منشی پرسرام، سید ثابت علی شاہ، شاہ محمد بن روحل، فقیر ضیاء الدین ضیا اور ولی محمد لغاری جیسے اردو کے شعراء گزرے ہیں جن میں سچل سرمست بھی شامل تھے۔ لیکن سچل کا اپنا جداگانہ رنگ تصوف خود ان ہی کا حصہ تھا۔ سچل سرمست ۱۷۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے ۱۸۲۹ء میں اس دنیا سے کوچ کر گئے جس سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کا کلام اردو زبان کے دیگر ہم عصر شعراء سے متاثر نہ تھا کیونکہ اس دور میں سندھ جغرافیائی یا تہذیبی لحاظ سے لکھنؤ یا کسی دوسرے اردو کے مرکز سے قربت نہیں رکھتا تھا اور نہ سچل کے کلام میں اس دوسرے دور کے شعراء کا اسلوب بیان ہی نظر آتا ہے اسی طرح یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سچل سرمست کا کلام اردو کے ابتدائی شعراء ولی دکنی وغیرہ کے طرز بیان سے متاثر ہے اسی طرح مضمون کے لحاظ سے سچل سرمست کے کلام کا رنگ تصوف کسی بھی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

اردو زبان میں صوفیانہ شاعری کا سہرا خواجہ میر درد کے سر ہے جو اردو کے دوسرے دور کے شعراء میں گنے جاتے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں ان کے کلام کا رنگ بالکل نرالا ہے لیکن سچل سرمست ان سے بھی متاثر نہیں ہیں۔ گو تصوف کی باریکی، جدت طرازی، مضمون آفرینی، اسلوب بیان، سلاست اور روانی جو سچل سرمست کے کلام میں ہے وہی خواجہ میر درد کے کلام میں نظر آتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اہل زبان ہونے کی حیثیت سے فنی لحاظ سے خواجہ میر درد کے کلام میں زیادہ پختگی ہے اس سلسلے میں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ سچل سرمست کا اردو کلام صحت لفظی کے مطابق اپنی اصل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکا اور کاتبوں (نقل نویسوں) کی بے توجہی اور زبان سے ناواقفیت کے سبب اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں ورنہ یہ امکان تھا کہ آج سچل سرمست کا کلام بھی عیب سے بالکل پاک و صاف ہوتا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سچل سرمست نے اپنی تاریک

---

۱۔ ترجمہ آذر حواشی نیر

خیالی مضمون آفرینی، سادگی، جوش، سلاست اور روانی سے اپنی شاعری میں روح بھر دی ہے۔ لیکن خواجہ میر درد کو پھر بھی فوقیت حاصل ہے جس کا ثبوت مندرجہ ذیل مثالوں سے ملتا ہے ۔

توحید وجود باری کا مضمون صوفیانہ شاعری میں سب سے اہم و ممتاز موضوع ہے جس میں تعینات کے پردے اٹھتے ہی ہر طرف سالک کو وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" میں جو حق کی بشارت سمجھی گئی ہے اس سلسلے میں خواجہ میر درد نے فرمایا ہے ۔ ؎

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے
پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے

خواجہ میر درد نے زبان و محاورات کے لحاظ سے اس موضوع میں بے شک جان پیدا کر دی ہے لیکن یہ تصوف کا خاص مفہوم ہے جس میں عشقیہ شاعری کا رنگ جاذب نظر آتا ہے۔ اسی سادہ مفہوم کو سچل سرمست نے خاص صوفیانہ رنگ میں تصوف کی حقیقتوں سے سجا کر اس طرح پیش کیا ہے ؎

"موتوا" میں بشارت اس طرح کی اشارت
مرنے میں ہے صفاتی پاؤ گے پھر حیاتی
ہو جا فنا بقا میں اس حسن میں لقا میں
حق کی قسم تو حق ہے بن خاص ذات ذاتی
اس شمع پر پتنگے آتے ہیں کیا اچھل کر
ترسیں گے نہ وہ ہرگز جن کر لی ہمّاتی
منصور کا یہ قصہ معراج جان سارا
سولی پہ دیکھ لے تو اثبات کو ثباتی

محبوب کی چشم مست کی تیر اندازی، محبت کا نیا انشار، دل کی غارت گری، بے پروائی، لاابالی پن، ساقی گری، زیست سے بے نیازی، عشقیہ شاعری کے خاص لوازمات ہیں جو خواجہ میر درد کے قلب میں بسے تھے انہوں نے اس سلسلے میں فرمایا ہے۔ ؎

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہو گیا
کس کی نظر لگی جو یہ بیمار ہو گیا
بیٹھا تھا خضر آکے مرے پاس ایک دم
گھبرا کے اپنی زیست سے بیزار ہو گیا
چاک جگر تو سینکڑوں خاطر میں کم نہ تھے
دل کی تپش کے آگے میں لاچار ہو گیا

سچل سرمست نے اسی مضمون کو نہایت سادگی و سلاست سے ادا کیا ہے جہاں تک خواجہ میر درد کا ذکر ہے ان کے کلام میں کافی روانی ہے لیکن سچل سرمست کی آتش باری بھی گوہر افشانی میں کم نہیں مثلاً وہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

کس کو میں یہ سناؤں وہ یار ہے خیالی
کب پوچھتا ہے مجھ کو وہ دوست لاابالی
دیکھو میرے عزیزو کیا خوب دل ربائی
اس دل کو لوٹنے کی ترکیب ہے نکالی
ہاتھوں میں اس کے لالی آنکھوں میں اس کے کاجل
بھر بھر کے پی رہا ہے وہ جام پرتگالی
میں اژدہا ہی سمجھا دیکھا جو پیچ پیچاں
رخ پر لٹک رہی ہے بیدرد زلف کالی
کر کے وہ ناز عشوہ عشاق میں ہے آیا
مدہوش ہو رہا ہوں دیکھو یہ چیت چالی
بے چارہ اک نہیں میں آشفتہ دل ربا کا
لاکھوں پہ چھا گیا ہے وہ حسن لایزالی
آؤ گے لطف سے کب میری گلی میں جاناں
دن رات در پہ تیرے ہیں سچل سوالی

محبوب کی بے وفائی اور بے پروائی اور عاشق کی بے قراری اور [illegible]

ایک عام موضوع ہے جسے خواجہ میر درد نے ایک اہل زبان کی حیثیت سے
نہایت خوش اسلوبی اور لطافت سے نبھایا ہے لیکن ایک مجذوب شاعر کی
حیثیت سے سچل سرمست کی بلند پروازی اور جدت طرازی بھی کم نہیں خواجہ
میر درد نے فرمایا ہے ۔ ؎

تم نے تو ایک دن نہ ادھر سے گزر کیا
ہم نے بھی اس جہان سے آخر سفر کیا
تیرے سبب سے اور بھی مجھ پر غضب ہوا
اے نالہ واہ خوب یہ تو نے اثر کیا

سچل سرمست نے عشق و محبت کی اس محفل کی بے مدہوشی و مستی میں اس طرح
سرشار کیا ہے ۔ ؎

ساجن مجھے پیار کا ساغر پلا گیا ۔۔ دیدی صراحی ہاتھ میں ساقی کہاں گیا
مجھکو تو دوست سے یہ توقع نہ تھی کبھی ۔۔ ڈھارس بندھا کر دل کو وہ کیونکر رلا گیا
دل لوٹ کر گیا تو نہ لوٹا ادھر کبھی ۔۔ بس اس طرح سے مجھکو وہ دل سے بھلا گیا

اس دوست سے میں کیسے کروں شکوہ اے سچل
زخمی کیا جگر تو دوا بھی پلا گیا

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سچل سرمست کا اردو کلام خواجہ میر درد کی
ہی طرح دیگر شاعروں سے ہر حالت میں ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے
ماحول میں بھی بہت سی مقامی حالتوں کے مطابق ان کا کلام اپنی نوعیت طرز
بیان اور ادائیگی الفاظ کے لحاظ سے ہر حالت میں منفرد اور ممتاز ہے ۔ سچل
سرمست کے اردو کلام میں اخلاق، تصوف، کیفیات قلبی اور حسن و عشق کی
روایات ہر طرح سے موجود ہیں ۔ ان کے سندھی، فارسی اور سرائیکی کلام کی
طرح اردو کلام کی بنیاد عشق حقیقی پر ہے تاہم اگر انہوں نے کہیں عشق مجازی کا
بیان کیا ہے وہاں بھی ان کے کلام کے معیار میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے اگر
انہوں نے کہیں محبوب کے وصل پر دلی مسرت و روحانی کیفیت کا اظہار کیا ہے
تو اس طرح ۔ ؎

آیا ہو یار آیا کہتا ہوں حمد اللہ ۔۔ رخ دوست نے دکھایا کہتا ہوں حمد اللہ
اس حال ناتواں کی پرسش بہت تھی انکو ۔۔ مجھکو گلے لگایا کہتا ہوں حمد اللہ
غفلت کے خواب میں تھا دن رات میں پڑا ۔۔ الفت نے ہے جگایا کہتا ہوں حمد اللہ

پہچان اے سچل تو صورت خیال والی
مرشد نے ہے بتایا کہتا ہوں حمد اللہ

محبوب کے ہر جور و جفا پر راضی رہنے اور اس کی محبت و مہر و وفا کو انعامات
سمجھ کر شکریہ ادا کرکے اور محبوب کی اذیت کے باوجود دل سے دعائیں دینکو
عشق صادق کی حقیقی ترجمانی سچل سرمست نے اس طرح کی ہے ۔ ؎

کرتا ہوں اے ستمگر ہر باب شکر الٰہ ۔۔ اس بر نے کیا ہے بیتاب شکر الٰہ
تیرے جو نین دیکھے حیرت میں پڑ گیا ہوں ۔۔ تو نے کیا ہے مجھکو بے خواب شکر الٰہ
کیا قتل کیا یہ پار گیا درد کیا وظائف ۔۔ بھولا ہوں جزم شد و اعراب شکر الٰہ
وحدت کا اثر کے آیا شہباز دل پہ میرے ۔۔ اب مٹ چکے ہیں سارے آداب شکر الٰہ

ظاہر ہو یا ہو باطن اندر ہو یا ہو باہر
سچل ہے تجھ پہ لازم ہر باب شکر الٰہ

محبوب کے ناز و انداز اور عشوہ گری اس طرح بیان فرمائی ہے ؎

تیرے ہی نازکی آنکھوں کے میں غلام ہوا ۔۔ تیرا ہی عشق میرا پیشوا امام ہوا
کہوں میں کس کو بھلا اپنے حال سے آگاہ ۔۔ تیرے ہی درد سے قصہ میرا تمام ہوا
تیرے غرور کا چرچا ہوا زمانے میں ۔۔ ہمارا گریہ و آہ و فغاں سے کام ہوا
کیا ہے جب دل پہ میرے عشق نے قیام اپنا ۔۔ تمام نفل و فرائض کا اب سلام ہوا

کروں میں شکر خدا اور پڑھا کروں الحمد
سچل یہ عشق کا تحفہ عطائے عام ہوا

یہ ہے سچل سرمست کی اردو شاعری کا مختصر جائزہ جو اس بات کا انکشاف
کرتا ہے کہ اب سے ڈیڑھ سو سال قبل سابق صوبہ سندھ کے ریگستانوں میں
بھی اردو شاعری کس مقام پر تھی ۔

(بشکریہ "قندیل" لاہور)

# رفتارِ ادب

## مکتبۂ افکار کی مطبوعات

اس زمانے میں ادبی و علمی کتابیں چھاپنا بڑے دل گردے کا کام ہے اس قسم کی کتابیں پڑھنے والے بہت ہی کم ہیں اور ان میں سے بھی بیشتر ایسے ہیں جو کتابیں خرید کر نہیں پڑھتے، یہی وجہ ہے کہ ناشرین زیادہ تر ایسی کتابیں شائع کرتے ہیں جو ادنیٰ معیار کی ہوتی ہیں لیکن جلد بک جاتی ہیں۔ مکتبہ افکار کراچی کے ان چند اشاعتی اداروں میں سے ہے کہ جس نے عام روش سے ہٹ کر خالص علمی و ادبی کتابیں شائع کرنے کی مبارک روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اب تک اس ادارے کی طرف سے کئی اچھی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ہمارے سامنے اس وقت دو کتابیں ہیں ایک "نبضِ دوراں" (شوکت علیگ) اور دوسری "تہذیب و تحریر" (مجتبیٰ حسین)

## "تہذیب و تحریر"

تنقید اور نقاد ـــــ یہ دو لفظ اب خاصے بدنام ہو چکے ہیں، وہ زمانہ گیا جب تنقید نگاری کے لئے علم و فضل کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اب تو صرف "قرطاس و قلم" ہی اس کے لئے کافی ہیں ہمارے ان ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو مہینے دو مہینے بعد ہزار بارہ سو صفحوں کی ایک تنقیدی کتاب لکھ ڈالیں۔ اب تک تو ادب کو شاعروں سے خطرہ تھا لیکن اب نقاد بھی شاعری کرنے لگے ہیں "نقادوں" کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے "تنقیدوں" کے انبار لگ رہے ہیں لیکن نقادانہ بصیرت خال خال نظر آتی ہے۔ ایسے عالم میں کوئی اچھی تنقیدی کتاب نظر آجائے تو اسے پڑھنے والوں کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے "تہذیب و تحریر" بھی ایک ایسا ہی مجموعہ ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں وہ اپنے موضوع کا تجزیہ کرتے وقت "دوسروں کی باتوں" پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ اپنے ذاتی مطالعے اور غور و فکر کو مشعلِ راہ بناتے ہیں قدیم و جدید ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ ان کے بھرپور مطالعے نے انہیں جو باتیں سمجھائی ہیں، وہ انہوں نے اپنے مضامین میں بیان کر دی ہیں۔ یہ باتیں بہت کام کی ہیں، ان سے ادبی مسائل کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ـــــ "تہذیب و تحریر" پندرہ مضامین پر مشتمل ہے، پہلے تین مضامین ("ادب و اعتبار"، "ادب اور مذہب" اور "ادب کا مستقبل") خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں فاضل نقاد نے ادب کے بعض اہم مسائل کا تجزیہ بڑی چابک دستی سے کیا ہے اور غور و فکر کے بعض نئے راستوں کی نشان دہی کی ہے۔ صنفِ غزل کے بارے میں بھی چند مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں اس کے علاوہ بعض شاعروں (اکبر، حسرت، آرزو، فانی، ظریف لکھنوی) کے فن کے مطالعے بھی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی بعض تنقیدی آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریروں میں ادبی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی پرخلوص کوشش ملتی ہے۔

## "نبضِ دوراں"

مکتبہ افکار کی دوسری پیشکش "نبضِ دوراں" ہے جو شوکت علیگ

مجموعۂ کلام ہے جس میں ان کا گذشتہ سولہ سترہ سال کا کلام ــــــ
ومان' انقلاب' حیات وکائنات' اور سرو و ناہید' کے عنوانات
کے تحت جمع کردیا گیا ہے۔ شور صاحب کی شاعری پر مختصر سے مختصر مگر جامع
ین تبصرہ جو ہو سکتا ہے وہ خود انہیں کا ایک شعر ہے ؎

مرے حساس دل میں درد ہے سارے گلستاں کا
مجھے ہر شاخ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

فنکار یا شاعر کے پاس جب تک حساس دل نہ ہوگا جو ہر غم کو اپنا غم
سمجھے' اس وقت تک اس کے فن یا شاعری میں وہ بات پیدا نہ ہو سکے گی
جسے "فن کا راز خود ہو" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شور صاحب اپنے غم میں سُلگیں یا دوسروں کے غم میں' بنیادی طور پر
ان کی شاعری ایک ہی غم کی حامل ہے اور وہ ہے "غمِ انسان" ــــــ
انسان اور انسانیت کی پامالی ان سے نہیں دیکھی جاتی۔ ان کی شاعری تمام
انسان دشمن عناصر کے خلاف اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس
سلسلے میں ان کے ہاں عمق و فکر کی بلندی نہیں ملتی بلکہ جذباتی جھلاہٹ
نظر آتی ہے اور اسی وجہ سے احساس ہوتا ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری
طور پر جوش سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ "نبضِ دوراں" میں ایسی کئی
نظمیں ہیں' جن میں شاعری سے زیادہ خطابت کا زور نظر آتا ہے مثلاً :-

جبہ و دستار میں چھپ چھپ کے ڈستے ہیں ناگ
لُٹ چکا ہے جن کے سجدوں میں عبادت کا سہاگ
ہونٹ پر تسبیح' سینوں میں وظیفوں کا گداز
کیسے کیسے سانپ ڈس جاتے ہیں پڑھ پڑھ کر نماز (نظم سانپ)

آج بھی ریش و قبا ہے مفتی و مُلا کا سود
آج بھی ہیں رونقِ بازار کعبے کے یہود
عارف و درویش و صوفی اب بھی ہیں بیزار شکار
اب بھی ہر دکان پہ بکتے ہیں رسولِ کردگار

زہد کی فتنہ گری ہے آج بھی پشمینہ پوش
آج بھی گندم نما ہیں منبروں کے جَو فروش
(نظم "آزادی کے بعد")

یہ خطابت جوش ہی کا حصہ ہے ــــــ شور صاحب کی شاعری میں
اگر یہ بات نہ ہوتی تو اچھا تھا۔

شور کی شاعری کی اہم خصوصیت طنز ہے' وہ طنزیہ پیرائے میں
بعض اوقات بہت کچھ کہہ گزرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی بعض
نظمیں (یہ شاعر اور مشاعرے' اور "یونی ورسٹی کے سند یافتہ" وغیرہ)
قابلِ ذکر ہیں۔ "نبضِ دوراں" کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو آج کل کے
شاعروں میں ذرا کم ہی نظر آتی ہے اور وہ ہے زبان پر بے پناہ قدرت
ــــــ شور لفظوں کی جادوگری سے بڑی اچھی طرح واقف ہیں
اور یہ جانتے ہیں کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی کس
طرح پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ (یہاں شور صاحب جوش سے بالکل مختلف
نظر آتے ہیں کیوں کہ جوش کا فن زیادہ سے زیادہ لفظوں میں کم سے
کم معانی پیدا کرنا ہے)

"نبضِ دوراں" میں غزلیں بھی ہیں۔ ان میں روایت کا احترام
اس حد تک پایا جاتا ہے کہ یہ سراسر "روایتی" بن کر رہ گئی ہیں اس
میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض اشعار بہت بلند پایہ ہیں مثلاً :-

ہزار سجدۂ دیر و حرم سے بہتر ہے ‏ ‏ ‏ اک آہِ نیم شبی' ایک گریۂ سحری

جس قدر غنچے کھلے تھے نوبنو ‏ ‏ ‏ میری آنکھوں سے ابر برسا گئے

کس کو فرصت ترے تصور سے ‏ ‏ ‏ اک حرفِ غلط ہے تنہائی

ترے شہر میں وہ عالم بھی گذر گیا جنوں پہ
کوئی مجھ سے بات کرتا تو میں اشک بار رہتا

بحیثیت مجموعی "نبضِ دوراں" ایک اچھا شعری مجموعہ ہے۔

# سرسید احمد خان ——— حالات و افکار

(ماہنامہ "فاران" کراچی۔ اگست سنہ ۱۹۶۰ء)

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سرسید احمد خاں مرحوم سے نہ صرف یہ کہ تعلق خاطر بلکہ والہانہ عقیدت و شیفتگی رکھتے ہیں۔ یہ کتاب مولوی صاحب موصوف کی اسی عقیدت کی زندہ یادگار ہے۔ مولوی صاحب نے سرسید کو بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ یوں کہئے ان کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی ہے! مولانا حالی کی "حیات جاوید" سرسید احمد خاں کی نہایت ہی جامع لائف ہے لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی اس کتاب میں بعض ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے جن سے "حیات جاوید" کے صفحات خالی ہیں۔

اس کتاب سے تفصیل کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید مرحوم نے اردو زبان کے بقا اور اس کی ترقی کے لئے کتنی زحمتیں اٹھائی ہیں۔ سرسید حقیقت میں اردو کے بہت بڑے محسن ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب دراصل اردو کی ترقی و اشاعت اور اس کی حفاظت و مدافعت میں سرسید کے جانشین ہیں!

مولوی عبدالحق صاحب کے طرز نگارش کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے جو اس کتاب میں بھی ملتی ہے۔ سلجھی ہوئی فکر، دلنشین انداز بیان، بات کو خواہ مخواہ "فلسفہ" بنانے کی کوشش نہیں، سامنے کی باتیں مگر کام کی باتیں!

——— ("کتابی دنیا" کراچی) ———

اس میں مصنف نے متعدد لطیفے، واقعات اور قصے بیان کئے ہیں جن سے سرسید کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ مولوی صاحب نے جس طرح ان کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے ساری کتاب گہرے مطالعے کی طالب ہے یہ کتاب لکھ کر انھوں نے موجودہ نسل پر احسان کیا ہے انہوں نے بجا طور پر اس سبق آموز کتاب کا انتساب صدر محمد ایوب خان کے نام کیا ہے "جنہوں نے پاکستان کو سیاہ کاروں اور غداروں سے نجات دلائی اور خوشحالی و ترقی کی راہ دکھائی ۔" ہم سرسید کی زندگی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور غالباً اسی جذبے کے ماتحت مولوی صاحب نے یہ مفید کتاب لکھی ہے تاکہ پاکستان والے سرسید کو اپنا راہنما بنائیں اور ان کے سینکڑوں کاموں کی روشنی میں پاکستان کی خدمت کریں ۔ کتاب کے آخر میں ورنیکلر یونیورسٹی پر سرسید کے مضامین کے اقتباسات دیدیئے گئے ہیں تاکہ اس زمانے کے لوگ سمجھیں کہ اردو یونیورسٹی کا خواب ایسا نہیں جس کی تکمیل نہ ہو سکے، کتاب برمحل ہے، اور زمانہ حاضرہ کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے ۔ (مئی سنہ ۱۹۶۰ء)

## مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

**خطبات عبدالحق۔**

بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے یہ کتاب انجمن نے دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی تھی لیکن وہ ایک مدت سے ختم ہوکر کمیاب ہوگئی ہے اور اس کے نسخے بمشکل دستیاب ہوتے ہیں، چنانچہ ملک میں اس کی بہت مانگ تھی اس بنا پر نیا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مطبوعہ خطبات کے علاوہ بعض خطبات اور بعض تقریریں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر ... ابن جملوی کا پیش لفظ ہے۔ ۵۵۴+۱۲ صفحات، لکھائی چھپائی خوش نما کاغذ اعلیٰ قسم کا لگایا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ساڑھے چھ روپے۔

**سب رس۔**

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ء اس کا سنہ تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جست وجو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

**تلخیص الاردو۔**

انجمن ترقی اردو کے رسالہ' اردو کے سی سالہ پرچوں سے بہترین مضامین کا بہترین انتخاب ہے جسے انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی کی یادگار میں مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے اور سب کے سب کارآمد اور عمدہ معلومات سے پر ہیں۔ کتاب کی جان دو مضامین ہیں: (۱) رومی، نطشے اور اقبال از ڈاکٹر عبدالحکیم (۲) منیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

**اردو اکیڈمی سندھ۔ مولوی مسافر خانہ۔ بندر روڈ کراچی**

انجمن ترقی اردو پاکستان
کا
پندرہ روزہ

# قومی زبان

نگران :-
بابائے اردو

جلد ۔۔۔۔۔۔ ۱۷
شمارہ ۔۔۔۔۔۔ ۵

یکم ستمبر ۱۹۶۰ء

اس شمارے میں



## ادبی رسائل

بابائے اردو نے رسالہ "افکار" کی سولھویں سال گرہ کے موقعے پر تقریر کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ملک میں ادبی رسالوں کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے، اچھے اچھے رسالے کچھ ہی دنوں میں مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں، ــــــ یہ صورت حال واقعی تشویش ناک ہے۔ پاکستان میں اس وقت اردو کے ان گنت رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد غیر ادبی (فلمی اور جاسوسی) رسالوں کی ہے' ادبی رسالے بہت ہی کم ہیں' ادبی اور غیر ادبی رسالوں کی اشاعت میں زمین آسمان کا فرق ہے، فلمی اور جاسوسی رسالے کئی کئی ہزار چھپتے ہیں اور ادبی رسالوں میں ایسے بہت کم ہیں جن کی تعداد اشاعت ایک ہزار سے اوپر ہو۔ اس کی وجہ محض یہی ہے کہ ہمارے پڑھنے والے سنجیدہ ادب کی طرف توجہ نہیں کرتے، وہ زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرا کر ایک ایسی دنیا میں کھو جانا چاہتے ہیں جہاں وہ سب کچھ ہو جو ان کی اپنی زندگی میں نہیں ہے یہ فرار جہاں ایک طرف گھٹیا ادب کو فروغ دے رہا ہے وہیں دوسری طرف سنجیدہ ادب کی اشاعت کے امکانات کو کم کر رہا ہے ــــــ آج کا قاری جس انداز سے سطحی رسائل کی سرپرستی کر رہا ہے' اس کے نتائج نہایت مضر ہیں۔ ادبی رسالوں کو جو اس صورت حال سے نقصان پہنچ رہا ہے اس کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس حقیقت سے کس طرح آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں کہ گھٹیا، سطحی اور سنسنی خیز تحریریں ہماری نئی نسل کے ذہنوں پر نہایت برا اثر ڈال رہی ہیں ــــــ اس تشویش ناک صورت حال کا مقابلہ ایک ہی طرح سے کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ادبی رسالوں کو زیادہ سے زیادہ مقبول کیا جائے تاکہ پڑھنے والے سطحی تحریروں کی طرف سے توجہ ہٹا کر اچھے اور صحت مند ادب کی سرپرستی کریں۔ اس سلسلے میں حکومت بھی بہت کچھ کر سکتی ہے وہ اپنے اشتہارات کے ذریعے ادبی رسائل کی مالی مشکلات دور کر سکتی ہے۔ اگر حکومت نے ایسا کیا تو پھر عام تجارتی ادارے بھی ادبی رسالوں کو محروم التفات' نہ رکھیں گے۔

پڑھنے والوں کو جنسی، جاسوسی اور گھٹیا رومانی (باقی صفحہ ۱۰ پر)

بابائے اردو

# یادوں کے چراغ

(گذشتہ سے پیوستہ)

کالج کی جماعتوں میں فوجی ڈرل جاری کی گئی اس سے صرف
سال چہارم کی جماعت مستثنیٰ تھی۔ ایک دن پرنسپل مسٹر بیک جن کی
تحریک سے ڈرل کا نیا نیا انتظام جاری ہوا تھا ہماری جماعت میں
آئے ان کے ہاتھ میں رنگین ریشمی ململوں کے کئی نمونے تھے، فرمانے لگے
کہ تم اپنی جماعت کے لئے ان میں سے کون سا رنگ پسند کرتے ہو؟
میں نے کہا کہ ڈرل کے لئے اس قماش کے کپڑے کچھ مناسب نہیں معلوم
ہوتے فرمایا سوال رنگ کا ہے کپڑے کا نہیں غرض ہر جماعت کے لئے
رنگ رنگ کے ریشمی ململوں کی شیروانیاں اور پگڑیاں تجویز ہوئیں،
اور اسی وردی میں طالب علم ڈرل کرتے تھے دنیا کے شاید ہی کسی ملک میں
ڈرل کے لئے ایسا نازک اور ملائم لباس ہو۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیوں کی
ڈرل کے لئے بھی کوئی ایسا لباس تجویز نہ کرتا۔ ان نوجوان طالب علموں کو
جو قومی بہبودی اور ترقی کے لئے جدوجہد کرنے کو تیار کیے جا رہے
تھے اور جن سے قوم کی خاطر زندگی کے میدان کارزار میں محنت و مشقت
ایثار و جاں نثاری کی توقع تھی اس قسم کے لباس میں ڈرل پریڈ کرانا جو
کسی رئیس کے لئے زیادہ موزوں تھا کس قدر نامناسب اور مضحکہ خیز
تھا۔ میں جب طالب علموں کو اس میں ڈرل کرتے دیکھتا تو مجھے بہت
کوفت ہوتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میرے خیال میں یہ بات آئی
کہ یہ معاملہ کسی طرح سید صاحب تک پہنچانا چاہیے۔ اس کے متعلق میں نے
مولوی حمید الدین مرحوم سے بھی جو میرے ہم جماعت تھے مشورہ
کیا۔ انہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ معاملہ بہت نازک تھا اور
در پردہ مسٹر بیک کی شکایت نکلتی تھی۔ مسٹر بیک بڑے جابر اور
رائے تھے اس زمانے میں ان کا اثر و اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہر
ایک طالب علم تھا کسی بڑے سے بڑے ٹرسٹی حتیٰ کہ نواب محسن الملک
کی مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف سید صاحب سے کچھ کہہ سکیں۔ آخر
روز دل کڑا کر کے اس مہم کو سر کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مولوی حمید
کو بھی ساتھ لیا، یہ جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی
کالج سے سیدھے سید صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ سید صاحب حسب معمول
کر رہے تھے۔ ہم سلام کر کے سامنے بیٹھ گئے۔ سید صاحب برابر
اور ہم خاموش بت بنے بیٹھے رہے میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا
سوچ میں تھا کہ اس ناگوار ذکر کو کس طرح چھیڑوں، اتنے میں
کھانا چننا شروع کیا کھانے کی میز اسی ہال میں تھی جب کھانا آ گیا
صاحب اٹھ کر کھانے کی میز پر جا بیٹھے دوسری طرف سے سید
آ پہنچے علیک سلیک کے بعد انہوں نے کھانے کی صلاح کی۔ میں
کھانا کھا چکے ہیں۔ کہنے لگے خیر یہاں آ کر بیٹھ تو جاؤ۔ میں سیدھا
جا بیٹھا۔ زبان یاری نہیں دیتی تھی کہ کہوں تو کیا کہوں اور کیسے
حسن اتفاق خود سید صاحب ہی نے جنہیں ان دنوں قومی لباس

سائی ہوئی تھی اپنے تجویز کئے ہوئے لباس کا ذکر چھیڑا میں نے کہا اب تو دوسرا ہی لباس شروع ہوگیا ہے پوچھا وہ کیا میں نے عرض کیا جب سے ڈرل شروع ہوئی ہے تو اس کے لئے نیا لباس تجویز ہوا ہے کہنے لگے وہ صرف ڈرل کے لئے ہے اس سے ہمارے لباس کو کیا تعلق میں نے کہا ڈرل کے لئے رنگین ریشمی جاکٹیں اور ریشمی ململوں کی پگڑیاں تجویز کی گئی ہیں کہنے لگے۔ ہاں میں نے بھی دیکھا ہے زین العابدین کا لونڈا بر ساتی مینڈا بنا پھرتا ہے سید محمود نے فرمایا کہ ڈرل پریڈ انگریزوں کی چیز ہے اس لئے ہم نے یہ کام انگریز پروفیسروں کے سپرد کر دیا ہے فرض کرو کہ میں ایک کلب بناتا ہوں اور اس کی ممبری کے لئے یہ شرط لگاتا ہوں کہ ممبر دم لگا کر آئے اب ہر ممبر کو اس کی پابندی کرنی ہوگی جسے یہ شرط پسند نہ ہو وہ ممبر نہ بنے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ سب کے لئے یہ شرط لازم کر دیں تو پھر؟ کہنے لگے سوا تعلیم کے کوئی دوسری چیز لازم نہیں ہو سکتی اور کسی کو جبر کرنے کا حق نہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ محض اس وجہ سے ایک شخص ورزش یا کسی اور تحریک سے محروم کر دیا جائے یہ نہیں ہو سکتا میں نے کہا بات یہیں تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا لیکن بات بہت آگے بڑھ گئی ہے ڈرل تعلیم کے درمیانی گھنٹوں میں ہوتی ہے کسی جماعت کی دوسرے گھنٹے کے بعد کسی کی تیسرے گھنٹے کے بعد تو اب لڑکے پوٹلیاں باندھ باندھ کر لے آتے ہیں کہ تعلیم کا گھنٹہ ختم ہوتے ہی ایک لباس پہنیں اور پھر دوسرا پہنیں اس کے لئے اتنی مہلت اور نہ اس کا موقع، لامحالہ ڈرل ہی کا رنگین لباس پہن کر کالج کی جماعتوں میں آتے ہیں اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی ڈرل میں جا شریک ہوتے ہیں۔ یہ سنتے ہی سید صاحب جلال میں آگئے، کانشا ایک طرف اور چھری دوسری طرف جا پڑی فرمانے لگے اس میں ایک پیچ ہے۔ وہ میری عمر بھر کی محنت خاک میں ملانا چاہتا ہے میں سلک منٹو کی ہری میں بھی اسی لباس میں گیا اور کوئی تبدیلی منظور نہ کی سید محمود نے کہا ہر شخص تو آپ سا نہیں ہو سکتا پھر سید محمود کی طرف مخاطب ہو کر کہا آج کالج میں میرا لکچر ہے تم بھی آنا اور مجھ سے فرمایا اب تم جاؤ، ہم اٹھا کر چلے آئے رستے بھر بہت پریشان رہا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہنے کو تو میں سب کچھ کہہ گیا لیکن سید صاحب نے مسٹر بیک سے اس کا ذکر کر دیا تو میری خیر نہیں۔

سید صاحب نے کالج کے لئے آنریری لکچروں کی تجویز کی تھی اور پہلا لکچر انہوں نے خود دینا منظور کیا تھا، ادھر کی گفتگو میں اس لکچر کا اشارہ تھا۔ غرض نماز جمعہ کے بعد سید صاحب تشریف لائے اسٹریچی ہال طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑے دروازے کے مقابل ہال کے آخر میں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک میز اور ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ سید صاحب ہال اس طرح داخل ہوئے جیسے کوئی جہاز آتا ہے۔ تخت پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ ایک کرسی اور لاؤ چنانچہ ایک اور کرسی تخت پر لا کر رکھ دی گئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ مسٹر بیک کہاں ہیں؟ کسی نے کہا یہ ہیں وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سید صاحب نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں آکر بیٹھو یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور سمجھا کہ اب ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔ جب مسٹر بیک بیٹھ گئے تو انہوں نے اپنی تقریر یوں شروع کی:

اے عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں کو تمہارے ماں باپ اور تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلے اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو مختلف علوم پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات عمدہ مسائل علمی عمدہ مقولات اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد ... گو وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے، نہ کسی

پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے اس کے حروف بہت پکا اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے اس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں ۔ اس کے پڑھنے کے لئے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہر وقت کھلی رہتی ہے ۔ اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے ، وہ کتاب کیا ہے ؟ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے پس تم کو سمجھنا چاہئے کہ اس کتاب کو کیوں کر پڑھو اور اس کے معنے کیوں کر سمجھو ۔ اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف" یا نئی زندگی ۔ یہی اصلی کتاب ہے اور اس کا پڑھنا اور اس کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اس کالج کا ہے ۔ اس کے بعد فرمایا کہ تمام چیزیں جو دنیا میں عقلی و ذہنی ہیں ان کا کچھ نہ کچھ نشان ظاہر میں بھی پایا جاتا ہے تم جانتے ہو کہ اس برادری اور دلی محبت اور دوستی کی جو تم آپس میں اپنی عاقل ماں کے بچے ہونے میں رکھتے ہو ظاہری نشانی کیا ہے ؟ یہ نشان انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے خدا کا بنایا ہوا ہے جس کے پیدا نہ کرنے سے تم صرف دنیا ہی میں ملامت کے قابل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی ناراضی کے بھی مستحق ہوتے ہو وہ نشان کیا ہے ؟ جماعت کی نماز ہے جو خدا نے جیسا کہ وہ واحد ہے ، تمہاری آپس کی وحدت کے لئے موثر کیا ہے اس کے بعد فرمایا کہ ایک اور چیز اس وحدت اور آپس میں یگانگت پیدا کی ہے وہ کیا ہے ؟ تم سب بورڈروں کا اور خصوصاً کالج کلاس کے طالب علموں کا ایک سا لباس کا ہونا ، شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ ظاہری چیزوں کو اندرونی جذبات کی اصلاح سے کیا تعلق ہے ؟ مگر یہ محض غلطی ہے ۔ مذہب کی رو سے دنیا کے برتاؤ سے بہت سی ظاہری چیزیں ایسی ہیں جو اندرونی جذبات پر اثر کرتی ہیں ، اس سلسلے میں انہوں نے مختلف جماعتوں اور قوموں کی مثالیں دیں کہ لباس کی یکسانی سے ان میں کیسی ہمدردی اور یک جہتی اور محبت ہوتی ہے ۔ اس کے بعد فرمایا کہ جو لباس تمہارا ہے یعنی ترکی ٹوپی اور کوٹ اور انگلش بوٹ یہ نہایت عمدہ ہے یہی لباس سلطان روم اور ان کے امرا اور وزرا کا ہے ۔ اس کی تصریح کرنے کے بعد فرمایا ، ہندوستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم بین انگریز جو ہندوستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایسی ٹوپی کوٹ اور بوٹ پہنے ہوئے ہونے پر اعتراض کرتے ہیں " اس آخری فقرے پر اس زور سے چیرز ہوئیں کہ سارا ہال گونج اٹھا مسٹر بیک کا رنگ فق ہوگیا اور منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں ۔ اس ہال میں بیسیوں کیا سینکڑوں جلسے ہوئے ہیں لیکن کسی جلسے میں اس جوش و خروش اور زور سے تالیاں نہیں بجائی گئیں جیسے اس موقع پر ۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام دیر تک جاری رہا جلسہ برخاست ہونے پر طالب علم اپنے اپنے کمروں میں گئے رنگین ریشمی ململ کی پگڑیاں نکالیں ، انہیں پھاڑ پھاڑ کر کسی نے قمیصیں بنائیں اور کسی نے کرتے کے پردے اس طرح یہ قضیۂ نامرضیہ ختم ہوگیا ۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر شوکت سبزواری

# بزمِ ادب

عبدالرشید صاحب (کراچی) نے بابائے اردو کے نام ایک مراسلے میں یہ استفسار کیا ہے "رسالہ ماہ نو مئی ۱۹۹۰ء میں شان الحق حقی صاحب کا ایک مضمون حرف "الف" کی تشریح سے متعلق شائع ہوا ہے۔ کیا اس مضمون سے مدیرانِ لغت کو اتفاق ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بورڈ کے سکریٹری ہیں، لغت کی ترتیب و تدوین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے خیال میں حقی صاحب کا یہ منصب نہیں کہ وہ ایسے مضامین شائع کروائیں جن سے بظاہر یہ اندازہ ہو کہ لغت کے مدیران بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ از راہِ کرم مطلع فرمائیں کہ مذکورہ مضمون کی علمی حیثیت آپ کے نزدیک کیا ہے"۔ — اس خط کا جواب ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب (مدیر لغت اردو ترقی اردو بورڈ) نے دیا ہے جو درج ذیل ہے — (ادارہ)

"ماہ نو" کی اشاعت مئی ۱۹۹۰ء میں حرف 'ا' کی جو تشریح شائع ہوئی ہے اس کا ترقی اردو بورڈ کے مجوزہ جامع اردو لغت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ 'ماہ نو' کے مدیر نے لکھا ہے "حقی صاحب نے (جو اتفاق سے ترقی اردو بورڈ کے سکریٹری بھی ہیں) حرف 'ا' کی تشریح اپنے طور پر نموتاً (کذا) پیش کی ہے"۔ مجھے معلوم نہیں حقی صاحب نے یہ تشریح مدیرانِ لغت کی رہنمائی کے لئے کی ہے یا اردو بورڈ کے ارکان کو یہ باور کرانے کے لئے کہ ع

ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

آپ فرماتے ہیں یہ ان کا منصب نہیں۔ اس بارے میں میرا کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا۔ ترقی اردو بورڈ کا کام ہے ان سے باز پرس کرے اور یہ پوچھے کہ بورڈ کی اجازت کے بغیر اپنے منصب کے خلاف انہوں نے یہ اقدام کیسے کیا اور "ماہ نو" میں ایک ایسی تحریک کیوں شائع کرائی جسے بورڈ کی منظوری حاصل نہ تھی۔ کیا اس سے بورڈ کے وقار کو صدمہ نہیں پہنچا؟

آپ نے اس تشریح کی علمی حیثیت دریافت کی ہے، یہ تشریح مقامی ارکان مجلس ادارت کے سامنے پیش ہوئی تھی (حقی صاحب کی موجودگی میں) اور اس کی غلطیوں اور خامیوں کی نشان دہی کرنے پر حقی صاحب نے یہ کہہ کر واپس لے لی تھی کہ میں نے اسے یوں ہی ارکان مجلس کے ملاحظے کے لئے پیش کر دیا تھا۔ اب آپ کے استفسار پر میں مجبور ہوا ہوں کہ اس پر تفصیل سے اظہار خیال کروں:۔

"ا: (تلفظ اَلِف: فتح اول، کسرِ لِ، سکونِ فْ) مذکر"

فتح اول کہا تھا تو کسر ثانی اور سکون ثالث کہتے یا کسرِ لِ، اور سکون فْ کہا تھا تو فتح 'ا' کہتے۔ یعنی یا تو حروف کی شکلیں لکھ کر ان کی حرکتیں بتاتے یا اول، ثانی، ثالث کہہ کر ان کی نشان دہی کرتے۔ 'ا' کو اول کہنا اور 'ل'، 'ف' کی شکلیں دینا شتر گربگی ہے۔ اور یہ بھی شتر گربگی ہی ہے کہ مثلاً 'عربی'، 'رجوع' وغیرہ الفاظ کے لئے تو مخففات استعمال ہوں

اور فتح، کسرہ، سکون اور مذکر جملں کے توں (بلا تخفیف) رکھ دیئے جائیں
کیا ان کے مخففات نہیں ہوسکتے ؟ کیا حقی صاحب کو علم نہیں کہ ایڈوائزری
کمیٹی نے فتح، کسرہ، سکون اور مذکر کے لئے ترتیب فت، کس، سکن،
مذ مخففات تجویز کئے ہیں ؟

الف (ا) کا تلفظ ہرگز نہیں، اس کا نام ہے (ا) مسمّیٰ ہے
اور الف اس کا اسم ۔ 'ا' کا اَ (A) اِ (I) اُ (U) تلفظ ہوتا
ہے۔ یہاں اس کا یہی تلفظ دینا تھا۔ لفظ تلفّظ بھی زاید اور موجب
تطویل تھا۔ قوسین میں 'ا' کی تینوں حرکتیں دے دی جائیں ۔
بلکہ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ تشریح کرتے وقت اس کی وضاحت
کردی جاتی کہ لاطینی، ناگری، پہلوی، اوستائی حروف تہجی کے
خلاف اردو میں 'ا' تین علتوں ( vowels ) (انگریزی A '
I' U ناگری अ इ उ ) کا قائم مقام ہے ۔

اردو حروف ہجاء کے سلسلے میں تین چیزیں سامنے آتی ہیں
(۱) بسیط آوازیں ( PHONEMES ) (۲) علامات و
حروف ( PHONOTYPES ) (۳) اسماء ( NAMES )
مثلاً "الف" نام ہے "ا" کا اور "ا" علامت ہے اس بسیط آواز
کی جو منہ میں رکاوٹ کے بغیر سانس کے سرسرانے سے پیدا ہوتی ہے۔
حقی صاحب نے ان تینوں کو خلط ملط کر دیا۔ "ا" کی آواز سے بحث
کرتے کرتے اس کی شکل کو لے بیٹھے اور وہاں سے اس کے نام (الف)
پر پہنچے اور یہ نہ سوچا کہ یہ اس کا مقام نہیں۔ "الف" مستقل لفظ ہے
جس کا ذکر لغت کی "ال" کی تختی میں ہوگا ۔

علامات اوقاف کے استعمال میں بھی سہل انگاری برتی گئی ہے
مثلاً "ا" (اصل لفظ جس کی شرح مطلوب ہے) "تلفّظ الف" اور
"ع" (ماخذ لفظ) تینوں کے بعد کولن ( اوپر نیچے دو نقطے : )
استعمال ہوا ہے حالانکہ تینوں کی حیثیتیں مختلف ہیں۔

"۱- اردو، نیز جملہ عربی الاصل حروف تہجی کا پہلا حرف "
عدد (۱) کے بعد (۲) یا (۳) آنا چاہئے ۔ میں آخر تک دیکھتا چلا گیا ،
لیکن مجھے اس کے مقابلے کا (۲) یا (۳) نہیں ملا ۔ "اردو" کے بعد
کاما (اُلٹا پیش) بے محل ہے۔ اس تحریر بے قاعدگی کے علاوہ
عبارت پیچیدہ، غیر منطقی اور غلط فہمی پیدا کرنے والی ہے۔ اس
سے متبادر ہوتا ہے کہ :-

(۱) اردو حروف تہجی عربی الاصل نہیں (اور یہ قطعاً غلط ہے)
اردو حروف عربی الاصل ہوتے تو "جملہ عربی الاصل حروف تہجی" میں
شامل ہوجاتے اور الگ اردو کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ؟!
"جملہ" کی جگہ "دوسرے" کا لفظ رکھ کر کہا جائے "اردو نیز
دوسرے عربی الاصل حروف تہجی" تو یہ غلطی دور ہوسکتی ہے ۔

(۲) 'ا' عربی حروف کا پہلا حرف نہیں۔ اس لئے کہ یہاں عربی
کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس سے پڑھنے والا یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ 'ا'
اردو اور عربی الاصل (عربی نہیں) حروف کا پہلا حرف ہے عربی
حروف کا پہلا حرف کوئی اور ہوگا ۔

یہ ساری خرابی عبارت کے غیر منطقیانہ الجھاؤ کی وجہ سے
پیدا ہوئی۔ یہ عبارت یوں ہونی چاہئے تھی ۔
"عربی نیز جملہ عربی الاصل (اردو، فارسی، سندھی، پشتو
وغیرہ) حروف تہجی کا پہلا حرف " ۔ ۔

" اصول کتابت میں تین قط کی کھڑی لکیر، نسخ میں ا یا ا،
نستعلیق میں ا، دیگر تحریروں میں ان شکلوں سے مماثل طرزی
میں کبھی مدور یا منحنی، اکثر ایک کھڑی لکیر سے شناخت ہوتا ہے
پہلے ہندسے "۱" کا مشابہ "

اس عبارت میں "تین قط کی کھڑی لکیر، کھڑی لکیر سے
شناخت ہوتا ہے، پہلے ہندسے "۱" کا مشابہ " یہ تصریحات لاطائل

ہیں۔ ایک کھڑی لکیر دے کر جب آپ کہیں کھڑی لکیر یا ہندسے '1' کے مشابہ، تو اچھے بھلے آدمی کو ہنسی آئے گی۔

"اصول کتابت میں" بے معنی بات ہے۔ "اصول کتابت کی رُو سے" کہیے۔ کتابت (خطّاطی) ایک فن ہے جس کے کچھ اصول ہیں ان کی رو سے آپ کہتے ہیں '۱' تین نقطہ کی کھڑی لکیر ہے۔

طغرا کو عربی زبان کا لفظ سمجھ کر طغریٰ (یٰ) سے لکھا ہے عربی الفاظ کے املا کے سلسلے میں 'زکوٰۃ' اور 'ہٰذا' کے ساتھ طغریٰ کو 'یٰ' سے لکھ کر کہا ہے "تلفّظ زکات، ہاذا، طغرا" (صفحہ ۳۰ سطر ۱) یہ انتہائی بے خبری ہے۔ طغرا '۱' سے ہے، یہ ترکی لفظ ہے۔ فارسی اور عربی دونوں نے اسے '۱' سے لکھا ہے۔ 'یٰ' سے اس کا املا یکسر غلط ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی صحیح نہیں کہ طغرا میں کبھی مدور یا منحنی طغرا عربی الاصل ارقام و اقلام کی کوئی خاص قسم نہیں، ایک انداز تحریر ہے جس میں '۱' کو حسب ضرورت مدور، منحنی، مستقیم، قصیر، طویل ہر طرح لکھا جا سکتا ہے۔

"کھڑی لکیر سے شناخت ہوتا ہے" '۱' خود کھڑی لکیر ہے کھڑی لکیر سے شناخت ہونے کا مطلب تو یہ ہوا کہ '۱' کوئی اور چیز ہے۔ کھڑی لکیر اس کی صفت ہے جس سے اس کی شناخت کی جاتی ہے۔

"پہلا ہندسہ" غلط اردو ہے۔ ایک کا ہندسہ کہنا چاہیے۔ ایک کا ہندسہ، دو کا ہندسہ، تین کا ہندسہ (۱، ۲، ۳) پہلا ہندسہ، دوسرا ہندسہ، تیسرا ہندسہ کسی جملے کا پہلا، دوسرا، تیسرا عدد ۷۸۶ ایک جملہ ہے اس کا پہلا ہندسہ ۶ ہے، دوسرا ۸، تیسرا ۷

"ترتیب ابجد کا پہلا حرف، جمل میں عدد واحد (۱)"

"ابجد" سے کیا مراد ہے؟ اگر حروف تہجی مراد ہیں تو اس کا ذکر اوپر کی سطروں میں آ چکا ہے، جہاں کہا گیا ہے '۱' عربی الاصل حروف تہجی کا پہلا حرف ہے، اس کو یہاں دہرانے سے فائدہ؟

حروف تہجی کی دو ترتیب ہیں۔ ترتیب ابجد، ترتیب ابتث دونوں میں '۱' پہلا حرف ہے۔ اگر اس کی صراحت ضروری تھی تو اوپر کی سطروں میں "حروف تہجی کا پہلا حرف" کہنے کی بجائے "ترتیب ابتث کا پہلا حرف" کہنا زیادہ مناسب اور بہتر قیاس ہوتا۔

اور اگر "ابجد" سے جمل کا حساب مراد ہے تو "ابجد" اور "جمل" (جو ہم معنی الفاظ ہیں) کی بجائے تنہا ابجد کہیے اس طور پر: -

"ابجد" کا پہلا حرف، قیمت میں عدد واحد (۱)"

ایک جگہ ابجد دوسری جگہ جمل کہنے سے شبہ ہوتا ہے کہ ابجد جمل سے مختلف کوئی اور چیز ہے۔ لغت کے لئے یہ روش نگارش خطرے سے خالی نہیں۔

"مفرد کلمے کے شروع میں ہمیشہ متحرک اور صوتیات کی رُو سے حرف صحیح یا صامت، آخر میں ہمیشہ اور درمیان کلمہ اکثر ساکن اور حرف علت یا مصوتہ۔ استثنائی صورتیں۔ مآل، مآثر، لا وغیرہ (عربی) نیز فارسی اور اردو مرکب الفاظ بے ارادہ، دو آتشہ سب سے بڑی فروگزاشت یہ ہے کہ اس میں '۱' متحرک کو حرف صحیح بتایا گیا ہے اور '۱' ساکن کو حرف علت۔ حالاں کہ '۱' متحرک ہو یا ساکن دونوں صورتوں میں حرف علت ہے۔ قدیم اصطلاح کی رُو سے بھی اور جدید اصطلاح کی رُو سے بھی۔ چناں چہ انگریزی 'a' '!'، 'u' اور سنسکرت अ، इ، उ جو اردو 'اَ'، 'اِ'، 'اُ' (یعنی '۱' متحرک) کے ہم وزن یا مرادف ہیں انگریزی میں (VOWELS) اور سنسکرت میں स्वर (حرف علت) ہیں۔ حقی صاحب صوتیات کی رو سے انہیں حرف صحیح بنائے دے رہے ہیں۔

درمیان کلمے کے '۱' کو حقی صاحب اکثر ساکن بتاتے

اور دیگر متحرک۔ یہ غلط ہے۔ درمیان کلمے کا "ا" اگر "ا" ہے "آ"
نہیں اور کلمہ کے درمیان ہے (دو کلموں کے درمیان نہیں) تو
ہمیشہ ساکن ہوگا۔ متحرک ہرگز نہ ہوگا۔ حقی صاحب نے فارسی اور عربی
سے جو چند مثالیں اپنے خیال کی تائید میں پیش کی ہیں۔ ان میں سے "آل"
اور مآثر میں "آ" (ممدود) ہے جو خود حقی صاحب کے نزدیک "برابر ہے"
لفظوں کے "ا" اور "لاابالی"، "بے ارادہ"، "فامادہ" کلمے ہیں (لا + ابالی،
بے + ارادہ۔ ف + اما) ان کا "ا" دو کلموں کے درمیان واقع ہوا
ہے اور "دو آتشہ" میں ممدود "آ" بھی ہے اور دو کلمے بھی ہیں۔

حقی صاحب سے یہاں دو غلطیاں ہوئیں :۔

۱۔ "ا" اور "آ" میں فرق نہیں کیا۔

۲۔ کلمے اور مرکب کو ایک سمجھا۔

ان اصولی لغزشوں کے علاوہ "صامت" کو انہوں نے
مذکر لکھا ہے اور "صائتہ" کو مونث، یہ دونوں الفاظ "حرف" کی
صفت ہیں۔ "حرف" اگر مذکر ہے اور اس لحاظ سے انہوں نے
"حرف صحیح صامت" لکھا تھا تو حرف علت "صائت" لکھتے۔ اور
اگر مونث ہے تو "صائتہ" کی طرح "صامتہ" لکھتے۔ وہ اپنے بھول پن
سے "صحیح" کی نسبت سے "صامت" "علت" کے تعلق سے "صائتہ" لکھ گئے
مگر یہ نہ سوچا کہ صامت اور صائت "علت" اور "صحیح" کی نہیں بلکہ حرف کی
صفات ہیں۔

(باقی آئندہ)

بقیہ

## اداریہ

(بسلسلہ ص ۲)

تحریروں کے طلسم سے آزاد کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ سنجیدہ ادبی
تحریروں کے انتخابات کم سے کم قیمت پر مہیا کئے جائیں۔ اس وقت
ہمارے ملک میں دو ایک ایسے رسالے بھی شائع ہوتے ہیں جو اچھے ادب کا
انتخاب ہر ماہ باقاعدگی سے پیش کرتے ہیں یہ طریق کار ممکن ہے کچھ نفع اندوز
اور مخالص کاروباری لوگوں کے نزدیک قابل اعتراض ہو لیکن اردو زبان
و ادب کے سچے بہی خواہ ان رسالوں کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں، یہ رسالے
پڑھنے والوں کے سامنے کم قیمت میں اچھا ادب پیش کر کے قابل تحسین
ادبی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ رسالے عوام میں بہت مقبول ہیں
یہ مقبولیت غیر صحت مند تحریروں کے مضر اثرات کو کم کرنے میں بڑی مدد و
معاون ثابت ہو رہی ہے۔ جو لوگ انتخابی رسالوں کو اچھی نظر سے نہیں
دیکھتے ان کا کہنا ہے کہ یہ، تمام ادبی رسائل سے مضامین نقل کر لیتے
ہیں اور اس طرح دوسرے رسائل کی اشاعت پر اثر پڑتا ہے۔ یہ خیال
کسی طرح صحیح نہیں، ادبی رسالوں کے کم چھپنے کا سبب، یہ انتخابی
رسالے نہیں، بلکہ وہ رسالے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا
ہے اور جو ادب کے نام پر اپنی تجارت کو فروغ دے رہے ہیں۔۔۔ الغرض
ان دنوں جو سب سے اہم کام ہے وہ یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو اچھے
ادب کی طرف متوجہ کیا جائے اور یہ کام جو بھی انجام دے وہ قابل
تحسین ہے، اس میں ادبی رسائل یا انتخابی رسائل کی بحث چھیڑنا
کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ ادب و زبان
کا فائدہ کس بات میں ہے۔

سید جعفر طاہر

# آغا حشر کی شاعری

نام محمد شاہ ۔ کاشمیری النسل سید تخلص حشر۔ دنیائے ادب میں شاعرانہ، عالمانہ اور مصلحانہ خوبیوں کا حامل یہ عظیم نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ تاریخ ولادت یکم اپریل ۱۸۷۹ء ہے اور وطن کعبۂ آتش پرستان۔ قبلہ گاہ ناقوسیان۔ معبد آذر منشان اور شہر بتان یعنی کاشی ہے جس کا دوسرا نام بنارس ہے، وہی بنارس جس کی شان میں شیخ علی حزیں کا ارشاد ہے، ؎

از بنارس نروم کعبۂ عام است ایں جا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است ایں جا

جمعہ کے روز ناریل بازار محلہ گوبند پور کلاں میں جنم لیا آپ کے والد کے ماموں سید حسن شاہ کاشمیری، کشمیر سے ہجرت کر کے بنارس آگئے تھے بعد ازاں آپ کے والد بزرگوار آغا غنی شاہ بھی کشمیر سے اپنے ماموں کے پاس بنارس چلے آئے اور یہیں تجارت کرنے لگے۔ آغا حشر سات برس کی عمر میں داخل مکتب کیے گئے اور دس برس کے تھے کہ آپ نے ابتدائی تعلیم ختم کر لی۔ عربی و فارسی اپنے والد گرامی سے اور دینیات کی تعلیم بنارس کے مشہور "حافظ مولوی عبدالصمد" سے حاصل کی۔ کلام پاک کے سولہ پارے حفظ کیے تھے کہ انگریزی پڑھنے کا شوق چرایا مگر والد صاحب چونکہ انگریزی تعلیم کے حق میں نہ تھے لہٰذا آغا صاحب اس زمانے میں انگریزی نہ پڑھ سکے لیکن بعد میں کسی نہ کسی طرح انگریزی خود سیکھ لی۔ ابھی گلستاں بوستاں بھی اچھی طرح نہ پڑھی تھیں کہ شاعری کا چسکا پڑ گیا چنانچہ پہلے حافظ مقبول احمد کوکب کی شاگردی اختیار کی اور پھر حضرت فائز بنارسی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ اسی اثنا میں ایک تھیٹریکل کمپنی بنارس آئی جس کے ساتھ اردو زبان کے مشہور ڈرامہ نگار منشی مہدی حسن احسن لکھنوی بھی تشریف لائے تھے۔ آغا صاحب شعر سننے سنانے کے لیے منشی صاحب سے ملنے لگے تو وہاں باتوں باتوں میں ڈرامہ نویسی پر بحث ہونے لگی اور بحث نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ ان کی منشی صاحب سے جھڑپ ہو گئی، اسی جھڑپ کے نتیجے میں انہوں نے اپنا پہلا ڈرامہ "آفتاب محبت" لکھا جو ۱۸۹۷ء میں مطبع جواہر اکبر سے طبع ہوا اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ ہندوستانی ڈرامے کے اسٹیج پر ان کا طوطی بولنے لگا اور ان کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ اگست ۱۹۳۵ء میں بمقام لاہور ۵۶ سال کی عمر میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔

سرخ و سپید رنگ، موزوں قد و قامت، پیشانی کشادہ جسیم و وجیہہ، عالی حوصلہ، عالی ظرف، بلند ہمت، خوش پوش خوش وضع اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اگرچہ انگریزی لباس پہننے سے احتراز نہ کرتے تھے لیکن مشرقی لباس کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے ریشمی کرتہ ریشمی مشہدی تہبند اور پاؤں میں پشاوری کامدار جوتا ان کا محبوب لباس تھا کبھی کبھی سرحدی کلاہ اور پگڑی بھی استعمال فرماتے تھے۔ طبیعت میں بخل، بغض و حسد، غرور اور تکبر نام کو نہ تھا۔ البتہ زود آمیز اور احباب ساز نہ تھے۔ یوں ان کے حلقۂ احباب میں مولانا عبدالمجید سالک

مرحوم، پروفیسر عبداللطیف تپش مرحوم، حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم اور حکیم احمد شجاع (جو ان کے شاگرد بھی تھے) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان یاران باصفا کے ساتھ سڑکوں پر گھومنا۔ کباب اور مونگ پھلیاں کھاتے پھرنا ان کے لئے کوئی بری بات نہ تھی۔ وہ انتہا پسند تھے خواہ وہ علم و فن کی دنیا ہو یا ان کی نجی زندگی، ان کے کردار کی یہ نمایاں خصوصیت ہر مقام اور زندگی کی ہر منزل میں واضح طور پر نمایاں تھی تنک مزاج ضرور تھے لیکن تنگ دل نہیں تھے۔ ایک آنکھ میں کجی تھی لیکن کج بین نہ تھے۔ ایک پاؤں سے لنگڑے تھے لیکن بنارس کے لنگڑے کی طرح ان کی شخصیت دلچسپ اور ہر دل عزیز تھی۔ غریبوں اور بیواؤں کی امداد سے کبھی دریغ نہ تھا، ایک اچھے شوہر ایک محبوب باپ، ایک مرنجان مرنج دوست اور ایک با اخلاق انسان تھے۔ خوش پوشی، سادگی، ہنسی، دل لگی، سنجیدگی اور جلال و کمال کا ایک زندہ و بیدار پیکر تھے۔ والدین کے نہایت سعادت مند فرزند اور والدہ سے ان کی محبت تو ان کے کردار کی وہ تابناک اور روشن خوبی ہے جو ضرب المثل بن چکی ہے۔ ان کے کردار کی یہ خوبیاں ان کی تحریروں سے بخوبی نمایاں ہوتی ہے۔ سٹیج اور ڈرامے کا شوق انہیں بمبئی لے گیا۔ ابتدا میں دشواریاں ضرور پیش آئیں لیکن ان کے عزم و ہمت نے ان سب مشکلوں پر قابو پا لیا اور زمانے نے دیکھا کہ بڑے بڑے پارسی ساہوکاروں نے ان کے قدموں پر نہ صرف اپنی پیشانیاں رکھ دیں بلکہ ان کے کمال فن کے اعتراف میں اپنی تجوریوں کے منہ بھی کھول دیئے "آفتاب محبت" کا گمنام مصنف جب فوت ہوا تو وہ انڈین شیکسپیئر کی حیثیت سے مقبول خاص و عام ہو چکا تھا۔

انہوں نے شاعری کو باقاعدہ ایک فن کے طور پر اختیار نہیں کیا البتہ شاعری کا ملکہ انہیں روز ازل سے ملا تھا اور وہ جب چاہتے اور جہاں چاہتے موتیوں کا مینہ برسا دیتے۔ ان کی دو قومی نظمیں "شکریہ یورپ" اور "موج زمزم" ہماری قومی شاعری کی نہایت خوب صورت مثالیں ہیں، بلکہ یہ نظمیں اپنی جگہ پر لاجواب ہیں۔ قومی شاعری کے علاوہ آپ کا رنگ تغزل نہایت پاکیزہ اور ارفع ہے۔ آپ نے غزل میں حسن و عشق کے معاملات اور واردات قلب و نظر کے علاوہ فکر و فلسفہ کو بھی سمونے کی جرات کی ہے اور ان سب باتوں نے آپ کے کلام میں ایک عجیب حسن اور ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا ہے۔ چناں چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اگرچہ ایک صاحب فن ڈرامہ نگار تھے لیکن باکمال شاعر بھی تھے۔ بے حد قادر الکلام اور بدیہہ گو شاعر۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے یہ شعر کہا تھا

موت کے ہاتھوں سے بچ جانا بہت دشوار ہے
حشر اب صحت مری گرتی ہوئی دیوار ہے

**کلام:-**

روتا ہے دل جفائے محبت سے ٹوٹ کے
اچھا ہے آبلہ جو یہ بہہ جائے پھوٹ کے

دل چھیدتی ہے شرم سے سمٹی ہوئی نظر
خنجر بنی ہے آپ کی تلوار ٹوٹ کے

غم نے ہیں ان کے اور مرا سرمایۂ نشاط
حصے لگا رہے ہیں مرے دل کی لوٹ کے

اک لطف کی نظر ہے علاج شکست دل
جڑ جاتا ہے یہ آئینہ سو بار ٹوٹ کے

دل ہے ادا پرست، تغافل بھی ہے ادا
عاشق ہیں ہم تو وعدہ وفا تیرے جھوٹ کے

کتنی گھٹائیں آئیں برس کر نکل گئیں
آنسو مگر مرے نہ تھمے تجھ سے چھوٹ کے

دیکھا فریب رہزن دنیا میں کہ حشر
یوں لٹ کے خوش ہے گویا کہ آیا ہو لوٹ کے

(باقی صفحہ پر)

تبسم کاشمیری

# سرسیّد احمد خانؒ کے دو خط

سرسید احمد خان کے مکاتیب پر دورِ حاضرہ میں بڑی تحقیق سے کام ہو رہا ہے اور اس عظیم کام سے پاک و ہند میں یکساں دل چسپی لی جا رہی ہے۔ جہاں جیسے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی صاحب نے مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک ضخیم مجموعہ مکاتیب بڑی چھان بین اور عرق ریزی سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے اس وقت تک سرسید کے جتنے بھی مکاتیب مل سکتے ہیں۔ وہ تقریباً سب کے سب بڑی صحت کے ساتھ اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ "ہماری زبان" میں پڑھا تھا کہ ہندوستان میں ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب آرزو بھی ایک مجموعہ مرتب فرما رہے ہیں نہ معلوم ان کا مجموعہ ابھی تک شائع ہوا ہے یا نہیں۔

سرسید احمد خان نے اپنی زندگی میں ان گنت خطوط لکھے ان کے تعلقات ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے انہیں ہر روز بیسیوں خط ملتے تھے جن میں انہیں گالیاں بھی سنائی جاتی تھیں کفر کے فتووں کی بوچھاڑ بھی ہوتی تھی اور بعض میں ان کے قومی کاموں کو سراہا جاتا تھا۔ ان میں سے کئی خطوں کے جواب انہیں دینے پڑتے تھے کالج کے سلسلے میں اور بعض قومی امور کے بارے میں انہیں دن رات خط و کتابت کرنی پڑتی تھی اور اس طرح انہوں نے زندگی بھر نہ جانے کتنے خطوط لکھے ہوں گے لیکن آج ان کا عشر عشیر بھی دستیاب نہیں ہوتا سرسید کے مکاتیب کو منظر عام پر لانے کی بڑی ضرورت ہے تاکہ ان کی تحریک کے نقوش زیادہ سے زیادہ واضح ہو سکیں۔

راقم کو سرسید کے دو خط ملے ہیں جن میں ایک ۵ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کے اخبار "وفادار" لاہور میں شائع ہوا ہے اور دوسرا ۱۸ر اپریل ۱۸۹۴ء کو لاہور کے مزاحیہ اخبار "ملاں دو پیازہ" میں چھپا ہے۔ دوسرے خط کے پڑھنے سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس خط میں بظاہر سرسید نے سفر پنجاب کا ارادہ ملتوی کیا ہے مگر وہ اس خط کی اشاعت کے چند ہفتوں بعد پنجاب کے دورے پر آئے تھے۔ یہاں اس زمانے میں محرم علی چشتی اور ان کی پارٹی کی وجہ سے سرسید کی مخالفت پورے شباب پر تھی۔ چشتی صاحب کی حکمت عملی اور ان کے تدبر نے اہل پنجاب کو پوری طرح بھڑکا دیا تھا۔ آخر یہ مخالفت رنگ لا کر رہی اور سرسید اس دورے میں کسی حد تک ناکام رہے آپ ایک خط ملاحظہ فرمائیں۔ اخبار "وفادار" کے ایڈیٹر نے خط سے پہلے ایک نوٹ بھی کچھ لکھا ہے وہ بھی دیکھئے:۔

آنریبل سرسید اور نیشنل کانگریس کے متعلق تازہ خیالات

سرسید احمد خاں صاحب بہادر کے خلاف بعض ملکی و قومی بدخواہوں نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ گورنمنٹ کے برخلاف ہو کر نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے ہیں اور اس بدخواہی کی وجہ یہ مشہور کر دی کہ آنریبل سرسید بہادر نے اپنے بیٹے مسٹر جسٹس محمود جج ہائیکورٹ الٰہ آباد کے مستعفی ہونے کے باعث ایسا کیا ہے۔ ہم ایسے افترا پرداز لوگوں کے ایسے گندے خیال

کا جواب تک نہیں دیا سوائے اس کے کہ آنریبل سر سید احمد صاحب بہادر کی اس چٹھی کا خلاصہ شائع کر دیں جو انہوں نے اس ہفتے اخبار "پائنیر" الہ آباد میں شائع کرائی ہے۔ ملک کے معقول لوگ ایسے بازاری لوگوں کے خیالات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور وہ خلاصہ یہ ہے کہ :-

• لوگ غلط مشہور کرتے ہیں کہ میں نیشنل کانگریس کے ساتھ شامل ہو گیا ہوں ایک اخبار نے یہ لکھا تھا کہ میں اس سلوک سے ناراض ہو کر جو میرے فرزند مسٹر جسٹس محمود جج ہائی کورٹ الہ آباد کے ساتھ کیا گیا ہے، کانگریس میں شریک ہو گیا ہوں۔ ملکی امور کی بابت جو خیالات میں رکھتا ہوں ان سے بدل گیا ہوں۔ یہ بھی کسی اخبار نے لکھا تھا کہ میں اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ امتحان سول سروس ہندوستان میں ہونا چاہئے۔ میں ان تمام بیانات کی پرزور الفاظ میں تردید کرتا ہوں میری پولیٹیکل رائیں اس زمانے سے قائم ہیں جب کہ سید محمود ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے پس یہ خیال کرنا کہ میں ایسے اعتقادات کو جو تمام عمر کے تجربے پر مبنی ہوں۔ مسٹر جسٹس محمود اور ان کے ہم جلیسوں کے باہم ایک تنازع کے واسطے ترک کر دوں گا، ایسا ناممکن اور بعید از قیاس ہے۔ بجز بجز جاہل مطلق کے اس کو کوئی باور نہ کرے گا اور نہ بجز بدخواہ پُر کینہ کے کوئی اس کو مشہور کرے گا۔ یہ بات قابل دید ہے کہ میری پالیٹی جو ہندوستان کے تمام اہل اسلام ہیں یا اس میں کسی قدر تفاوت بھی ہے[1]

"وفادار" لاہور

۸ / اکتوبر ۱۸۹۳ء

## نمبر (۲)

دوسرا خط ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے نوٹ بھی ملاحظہ فرمائیے :-

"مندرجہ ذیل خط سر سید احمد خان صاحب کی طرف سے ابھی ہمارے پاس پہنچا ہے جب کہ اخبار کی کاپیاں تیار ہو گئی تھیں اگرچہ یہ خط بغرض اشاعت نہیں آیا تھا مگر تاہم دوسری کاپیوں کو کٹوا کر بعینہٖ ضروری اس کو چھاپا جاتا ہے"

عنایت فرمائے من مشفق الہ دین صاحب ایڈیٹر اخبار "ملاں دو پیازہ" !

آپ کے پرچہ اخبار اور دیگر اخبارات پنجاب سے مجھے اس مخالفت کا حال معلوم ہوا جو میرے سفر پنجاب کی نسبت پنجابیوں میں ظاہر ہو رہی ہے اور میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں نے اب اپنے سفر پنجاب کا ارادہ سر دست دل شکستہ ہو کر فسخ کر دیا ہے زندہ دل پنجاب سے مجھے کبھی اس قدر مخالفت کی امید نہ تھی۔ پنجاب کے اہل ہنود پہلے عام طور پر میرے نہایت مداح اور معتقد تھے، مگر بدقسمتی سے چند واقعات ایسے پیش آ گئے کہ مجھے عام طور پر بعض پولٹیکل وجوہات سے ہندو قوم کی مخالفت کرنی پڑی اور اس طرح سے عام ہندو میرے مخالف ہو گئے۔ پھر بھی خاص تعلیم یافتہ ہندوؤں کو مجھ سے ہمدردی تھی چنانچہ میرے گذشتہ سفر پنجاب میں ہندو پارٹی کے معزز ارکین نے ایسوسی ایشن کی وساطت سے مجھے ایڈریس بھی دیا مگر بدقسمتی سے نیشنل کانگریس کا معاملہ پیش آ گیا جس کے باعث وہ تعلیم یافتہ ہندو بھی یک قلم میرے مخالف ہو گئے اور اس طرح سے ہندوؤں کی قوم کلہم اجمعین میرے خون کی پیاسی ہو گئی اب رہ گئے مسلمان، سو مسلمانوں میں سے پرانے فیشن کے علماء اور مولوی اور مقدس اعتقاد کے رؤسا تو پہلے ہی سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ نوجوانوں میں سے مجھے بڑا بھروسہ مشفقی منشی محرم علی چشتی صاحب اور ان کی پارٹی پر تھا جنہوں نے ہمارے گذشتہ سفر پنجاب میں کمال درجہ کی سرگرمی کے ساتھ ہماری امداد کی اب وہ اور بالعموم تمام اخبار نویس کا فرقہ بھی ہمارے سخت مخالف

---

[1] اس آخری فقرے کا مطلب کچھ واضح نہیں ہے غالباً مترجم کو اس کی صحیح طور پر سمجھ نہیں آسکی

ہوگئے۔ انجمن حمایت اسلام کے معزز ممبران سے بھی ہم کو امداد کی توقع تھی مگر میں اپنی اس نامراد راست بیانی کی عادت سے جو ہمیشہ سے مجھ میں تھی چند نہایت آزاد مگر غیر مخالفانہ ریمارک ان کے کالج کی نسبت کئے جو میرے احباب کو بھی ناگوار گزرے اور میری نسبت یہ سمجھا گیا کہ میں ان کے کالج کی نسبت رشک اور رقابت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، اور ان کا حصہ چھیننے آتا ہوں اور اس طرح سے میں دیکھتا ہوں، کہ چاروں طرف مخالفت کے لعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مکرمی مولوی نذیر احمد صاحب اور رفیق ہند کا مقدمہ بھی میرے مخالف خیالات کو بھڑکانے کا باعث ہوا اور اب مجھے صرف ایک قلیل گروپ اپنے احباب، سرکاری عہدہ داران اور ملازمان کا دکھائی دیتا ہے جو اس مخالفت کے طوفان اب بھی صرف بوجہ ہمدردئی قوم میری رفاقت سے پہلو تہی کرتا معلوم نہیں ہوتا جو کہ مجھے ہمیشہ سے بہبودی اور بھلائی اپنی قوم کی مدنظر ہے۔ اس لئے میں اس قلیل جمعیت کے بھروسے پر اپنی قوم سے سرکہ آرائی کرنی نہیں چاہتا۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ ایک قوم کی بھلائی کا کام ہے اور اگر قوم اس کی امداد کرنا نہیں چاہتی تو یہ قوم کا اپنا قصور ہے۔ ؎

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می‌گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

مہربان من! آپ نے بھی اپنے پرچے میں میری نسبت اپنی جودت طبع کا بہت کچھ اظہار کیا ہے مگر آپ جانتے ہیں میں اوّل درجہ کا چکنا گھڑا ہوں، اور گالیاں کھاتے کھاتے بے حیا بن گیا ہوں۔ میں نے آج تک نہ تو کفر کے فتوؤں کی اور نہ اخبارات کی تحریروں کی کوئی پرواہ کی ہے۔ اور جب کہ آپ نے سن لیا ہے کہ میں نے اپنے سفر پنجاب کے ارادہ کو بالکل ترک کر دیا ہے تو امید ہے کہ آپ بھی اس بارے میں زیادہ خامہ فرسائی نہ فرمائیں گے۔ والسلام۔

مقام علی گڑھ ۔ ۷ر اپریل ۱۸۹۱ء الوقت بارہ بجے شب

خاکسار :۔ سید احمد

(" ملاں دو پیازہ " لاہور - ۱۹ر اپریل ۱۸۹۱ء)

---

بقیہ :۔

## آغا حشر کی شاعری

بسلسلہ صفحہ ۱۴

بے مہر التجائے تمنا پہ ہنس پڑا
کتنے خجل ہوئے نگہ التجا کے بعد
لب سی دیئے ہیں خون شکست امید نے
کس سے کریں گے تیر نگہ پر گلہ کے بعد
ممنون التفات ہے بیمار آرزو
کیجئے مدد غریب کی لیکن دوا کے بعد
سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد
تسکین کے ساتھ عمر خضر بھی تو دیجئے
کیوں کر جئیں گے وعدہ صبر آزما کے بعد
وہ زمزمے جو درد کو کہتے ہیں مست حشر
پھر سن رہے ہیں عرفی رنگیں نوا کے بعد

(لاہور کا دبستان شاعری)

---

سنگ اٹھانا تو بڑی بات ہے اب شہر کے لوگ
آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے دیوانے کو

(احمد مشتاق)

نصیر الدین ہاشمی

# خواتینِ حیدرآباد دکن کی

# اردو مطبوعات

گذشتہ نصف صدی کے عرصے میں حیدرآبادی خواتین کی جو کتابیں طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں ان کی مختصر صراحت اس مضمون کا مقصد ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ حیدرآبادی خواتین نے اردو زبان اور ادب کی خدمت کے سلسلے میں کیا کام کیا اور ان کے کارناموں سے ادبیات اردو میں کیا اضافے ہوئے ہیں ۔

اس امر کا خیال رہے کہ آج سے ۷۵ سال پہلے حیدرآباد میں کوئی زنانہ مدرسہ نہیں تھا اور نہ تعلیم نسواں کا رواج تھا البتہ خانگی طور پر بعض اصحاب علم و فن ، اپنی اولاد کو تعلیم دیا کرتے تھے ، میں نے اپنی کتاب "حیدرآباد کی قدیم تعلیم" میں حیدرآباد کی تعلیم نسواں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اس لئے یہاں مکرر وضاحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی تاہم اس مضمون کے پس منظر کے لئے مختصر صراحت ضروری ہے ۔

حیدرآباد کا پہلا نسوانی مدرسہ ۱۸۸۱ء میں ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے نے قائم کیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب آنجہانی محترمہ سروجنی نائیڈو صاحبہ کے والد بزرگوار تھے ۔ اس نسوانی مدرسہ میں پچاس ہندو اور چھتیس مسلمان لڑکیوں نے شرکت کی تھی اور یہاں اردو ، تلنگی ۔ تامل ۔ انگریزی زبانوں کے علاوہ تاریخ ، جغرافیہ ۔ اور امورِ خانہ داری کی تعلیم دی جاتی تھی ، اور ہندوستانی موسیقی بھی نصاب میں شامل تھی ۔

حکومت آصفیہ کی جانب سے پہلا نسوانی مدرسہ مکراج پیٹھ ضلع ناندیڑ میں ۱۸۸۲ء میں قائم ہوا ۔ اس کے قائم ہونے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ ناندیڑ کے صدر مدرس صاحب کا انتقال ہو گیا اور اس زمانے میں بیوہ کے وظیفے کا طریقہ نہیں تھا اس لئے اول تعلقدار ناندیڑ نے مرحوم صدر مدرس صاحب کی لڑکیوں کو جو قرآن شریف اور مذہبی علوم سے واقف تھیں ، امداد دیکر لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کر دیا تھا ۔

۱۸۸۲ء ہی میں وسلیین مشن کی جانب سے حیدرآباد اور سکندرآباد میں ایک ایک نسوانی مدرسہ قائم ہوا ۔ تاہم پہلا سرکاری نسوانی مدرسہ ۱۸۹۰ء میں قائم ہوا مگر ایک عرصہ دراز تک اس مدرسہ میں لڑکیوں کی تعداد نہایت کم ہوتی تھی ۔ یعنی ۱۹۱۱ء تک یہاں ابتدائی وسطانی اور فوقانی جماعتوں کی طالبات کی تعداد ایک سو کے اندر تھی ڈاکٹر الحمنہ لیپ کے آنے کے بعد ( ۱۹۱۷ء ) اس مدرسہ کی ترقی شروع ہوئی اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں اس مدرسہ میں زنانہ کالج کا افتتاح ہو گیا ۔

۱۸۹۰ء کے بعد دوسرے اضلاع میں نسوانی مدرسے قائم ہوئے [illegible] نسوانی مدرسہ میں [illegible] نور النساء بیگم کے نسوانی مدرسہ [illegible]

کی بہنیں مسز شجاعت علی (والدہ نواب زین یار جنگ) کے نوبلز
اسکول کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو ۱۹۰۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے حیدرآباد میں تعلیم نسواں کا شوق زیادہ
ہوتا گیا، آو تشابہ خاتون جامعہ عثمانیہ کی پہلی گریجویٹ خاتون ہیں جنہوں نے
کالج کے قائم ہونے کے پہلے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی ڈگری حاصل
کی تھی اس سے پہلے چند حیدرآبادی طالبات مدراس اور لکھنؤ
کی یونیورسٹی سے بی اے ہوئی تھیں جن میں مس اسینو ملنا چٹوپادیا
نورالنسا بیگم وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ہے وہ مختصر روئداد جو حیدرآبادی خواتین کی علمی شغف
کے متعلق واضح ہوتی ہے۔

حیدرآباد کا پہلا پریس ۱۸۳۶ء میں نواب شمس الامراء
امیر پائیگاہ نے قائم کیا ۱۸۶۰ء کے بعد دوسرے مطابع قائم ہوئے
خواتین حیدرآباد کی پہلی مطبوعہ کتاب دیوان چندا ہے جس کو گلزار
ماہ لقا کے نام سے ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ میں غلام صمدانی خاں گوہر نے شائع
کیا تھا۔ دیوان ۱۲۱۳ھ، ۹۹-۱۶۱ میں مرتب ہوا تھا۔ [1]

اس تفصیل کے بعد بلحاظ فن خواتین حیدرآباد کی مطبوعات
کا تذکرہ کیا جاتا ہے ان کو چند فنون میں تقسیم کرسکتے ہیں یعنی ادبیات
تاریخ و سوانح۔ ڈومسٹک سائنس۔ مذاہب وغیرہ۔

## ادبیات

ادبیات کو ناول۔ مختصر افسانہ۔ مقالات۔ تنقید۔ مزاحیہ
ادب اور نظم پر منقسم کرنا چاہئے۔

(الف) ناول :- اب تک جو ناول شائع ہوئے ہیں وہ یہ ہیں

(۱) انوری بیگم (۲) حشمت آرا۔

یہ دونوں ناول طیبہ بیگم بلگرامی والدہ نواب علی یاور جنگ
کی مصنفہ ہیں ان میں حیدرآبادی معاشرت۔ رسم و رواج۔ پردہ
تعلیم نسواں وغیرہ کو نہایت خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ تمدنی خرابیوں
اور برے رسم و رواج کی پابندیوں کے نقصانات بتائے ہیں
پلاٹ میں دلکشی اور طرز بیان میں بے تکلفی و سادگی ہے۔
انوری بیگم کے مقدمہ میں مولانا ڈاکٹر عبدالحق نے جو صراحت کی
ہے اس کا ایک مختصر اقتباس قابل ملاحظہ ہے۔

"لائق مصنفہ نے بڑی خوبی سے حشمت النسا کی تمام زندگی
کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شریف حیدرآبادی گھرانے
کی معاشرت کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔
بیان میں کہیں مبالغہ نہیں بلکہ ایک سیدھی سادھی زندگی کو
بے تکلف طور پر صاف صاف بیان کردیا ہے۔ کہیں کہیں
ظرافت کا چٹخارا بھی ہے جس سے کتاب اور دلچسپ ہوگئی
ہے۔ حیدرآباد کے عوام کی گفتگو ان کتابوں کے سوا کہیں
دوسری جگہ نہیں ملے گی۔ اسے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ
قطب شاہیہ عہد کی زبان کی شان اب تک یہاں پائی جاتی
ہے۔"

(۳) سرگزشت ہاجرہ (۴) موہنی (۵) آواز غیب
(۶) مشیر نسواں۔

ان چاروں ناول کی مصنفہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا مرحومہ
ہیں۔ سرگزشت ہاجرہ میں یہ واضح کیا ہے کہ ایک عقلمند باسلیقہ
عورت کس طرح اپنے شرابی شوہر کو راہ راست پر لاکر شراب سے
ہمیشہ کے لئے توبہ کراتی ہے اور ازدواجی زندگی کی بدمزگی کس طرح
دور ہوسکتی ہے۔ علامہ شبلی، علامہ اقبال اور مرحوم شیخ عبدالقادر

[1] مگر اس امر کا خیال رہے خواتین حیدرآباد کا یہ پہلا دیوان
نہیں ہے بلکہ پہلا دیوان لطف النسا بیگم امتیاز کا ہے۔

جیسی ہستیوں نے ان ناولوں کی تعریف کی ہے ۔

(۷) لیلیٰ کی مصنفہ عظیم النساء اور (۸) مسلم سماج کی مصنفہ فاطمہ ثریا صاحبہ ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں حیدرآباد کی سماجی تصویر پیش کی گئی ہے۔ (۹) ضیغم۔ مسز پرل بک کے ایک طویل افسانے کو سعیدہ مظہر صاحبہ ایم اے نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کو کامیاب ترجمہ کہا جاسکتا ہے ۔

(ب) مختصر افسانے : ۔

خواتین حیدرآباد کے مختصر افسانے حیدرآباد سے زیادہ ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں اگر ان کے مجموعے شائع ہوں تو کئی جلدیں بن سکتی ہیں۔ اب تک جن خواتین نے اپنے مختصر افسانوں کے مجموعے شائع کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں : ۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ بی بی نوری کا خواب | صغرا ہمایوں مرزا |
| ۲۔ رفتار خیال | جہاں بانو نقوی ایم اے |
| ۳۔ کچے دھاگے | ڈاکٹر رفیقہ سلطانہ ایم اے پی ایچ ڈی |
| ۴۔ جلترنگ | زینت ساجدہ ایم اے |
| ۵۔ تم بڑی سنگ دل ہو | عزیز النساء حبیبی بی۔ ایس سی |
| ۶۔ روشنی کے مینار | جیلانی بانو |

رفتار خیال پہلی کتاب ہے جو مختصر افسانوں کے متعلق شائع ہوئی ہے ۔ جہاں بانو نقوی نامپلی ہائی اسکول کی ان طالبات میں شامل ہیں جنھوں نے زنانہ کالج میں اردو کی پروفیسری کی اور اب بھی وینکٹراما ریڈی کالج میں علم کی خدمت کر رہی ہیں ۔

رفتار خیال میں طبع زاد اور ترجمے دونوں شامل ہیں ان سے جہاں بانو کی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ طبع زاد افسانے مختلف النوع ہیں ان میں تخیل۔ کردار۔ پلاٹ۔ مکالمہ کا اچھا نمونہ پیش ہوا ہے ۔ ان کا اسلوب نرم، نازک سنجیدہ ہوتا ہے۔ ان میں شیرینی اور لطافت بھی پائی جاتی ہے۔ زبان صاف سادہ۔ رواں ہوتی ہے جہاں بانو نثر میں شاعری کرتی ہیں ۔

(۲) "کچے دھاگے" یہ کتاب ڈاکٹر رفیقہ سلطانہ کی ہے اس میں کئی افسانے شامل ہیں ان میں حیدرآباد کی موجودہ معاشرت۔ موجودہ سماج کی ذہنیت اور کردار کو پیش کیا گیا ہے ان افسانوں سے اصلیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے ۔ ان افسانوں میں انسانی فطرت، اور تلون رنج و مسرت حزن و ملال یاس اور مظلومی کا تذکرہ اچھی طرح کیا گیا ہے۔ کردار کے تحت شعوری کیفیتوں کو بھی واضح کیا ہے جنسی کش مکش بھی ان افسانوں میں موجود ہے مگر کہیں بھی عورت کے وقار کو صدمہ نہیں ہوا ۔

(۳) جل ترنگ ۔ یہ زینت ساجدہ کے افسانوں کا مجموعہ ہے، زینت ساجدہ اپنے علمی ذوق اور پاکیزہ مذاق کے باعث خاص شہرت رکھتی ہیں۔ جل ترنگ ترقی پسند ادب میں شامل ہے۔ ان افسانوں میں حقیقت نگاری کی جھلک نظر آتی ہے ۔ ان میں خاکہ (پلاٹ) اور کردار دونوں نہایت خوبی سے پیش کئے گئے ہیں ۔ ان میں جان ہے اور شگفتگی ہے۔ انسانی نفسیات سے واقف ہونے کے باعث افسانوں میں اس پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے، اگرچہ ان میں عریانیت نہیں ہے مگر جدید رجحانات کے آئینہ دار ہیں ۔

(۴) "تم بڑی سنگ دل ہو" اس کی مصنفہ عزیز النساء حبیبی جنھوں نے جامعہ سے بی ایس سی میں کامیابی حاصل کی اور اب پاکستان میں ہیں۔ اس مجموعے میں تمام تر رومانوی افسانے شامل ہیں۔ مشرق کی رومانی زندگی جس میں زیادہ تر موت ہوتی ہے ان افسانوں میں [illegible] ہیں ان افسانوں میں لوچ ہے۔ میٹھی میٹھی دھڑکنیں ہیں جوان دلہا جوان دلہنوں اور جوان جسموں کی سرگوشیاں ہیں۔ رومانی افسانے عورت کی زبانی ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

مولوی سخاوت مرزا
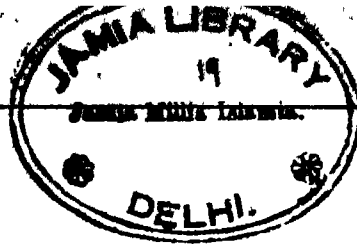
# کیا تفسیرِ وہابی اردو کی سب سے پہلی تفسیر ہے؟

مکرمی مولانا انتظام اللہ شہابی صاحب نے اپنے مضمون سخنوران اکبر آباد مطبوعہ رسالہ کنول میں تحریر فرمایا ہے کہ حکیم خواجہ محمد شریف خان دہلوی (۱۱۳۸/۱۲۲۲ ھ) نے کلام مجید کا ترجمہ اردو میں کیا تھا سنہ ترجمہ درج نہیں۔ ممکن ہے موصوف کے پاس اس کا کوئی نسخہ ہو مگر حکیم شریف خان مرحوم کی تالیفات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو تذکرۃ الخواجگان (حکما، دہلی) مولفہ احسان اللہ خاں انجینئر مطبوعہ ۱۹۴۹ء) لیکن مولوی صاحب موصوف نے ایک اور تفسیر چراغ ابدی تالیف ۱۱۴۴ھ کا مترجمہ شاہ عزیز اللہ کا ذکر فرمایا ہے مگر یہ اورنگ آبادی تھے یا اکبر آبادی؟ ان کا تخلص ہمرنگ تھا اور اورنگ آبادی مشہور ہیں، یا اورنگ آباد آکر توطن پذیر ہو گئے تھے؟ بحث طلب ہے ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر دہلوی تو ۱۲۰۵ھ کا ہے۔ لیکن سوائے چراغ ابدی کے جو صرف پارہ عم کی تفسیر ہے متذکرہ صدر سب ترجمے ہیں۔ ہم یہاں تفسیر وہابی مولفہ مولوی عبدالصمد دلیر جنگ مدراسی پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں جس کے سنہ تالیف ۱۰۸۷ھ کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق مدظلہ نے غالباً ۱۲۸۷ھ مشتبہ ظاہر فرمایا تھا اور مولوی نصیر الدین ہاشمی اس کو ۱۲۵۰ھ کی تالیف قرار دیتے ہیں۔ ہم اپنے ناچیز خیالات درج ذیل کرتے ہیں:۔

مولوی عبدالصمد دلیر جنگ ابن عبدالوہاب خاں نصیر الدولہ شکوہ الملک برادر عینی نواب محمد علی خان والاجاہ (۱۱۹۱/۱۲۱۰ ھ) نواب عمدۃ الامرا ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دلیر جنگ (مولوی عبدالصمد) ان کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔ اس لحاظ سے مولوی عبدالصمد کی ولادت تقریباً ۱۱۶۵ھ معلوم ہوتی ہے تفسیر وہابی کے کاتب نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۸۷ھ، بالفاظ "فی شہر جمادی الثانی یوم السبت من عشرین ہذا شہر سنہ ثمانین وسبع بعد الالف من ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ڈاکٹر مولوی عبدالحق بابائے اردو نے اپنے ایک مضمون مندرجہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ میں اس سنہ کو مشتبہ قرار دیا ہے (اردو جنوری ۱۹۵۲ء ص ۱۹) مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس کا سنہ تالیف تقریباً ۱۲۵۰ھ قرار دیا ہے، اور سنہ ۱۲۵۰ھ اس لئے غلط قرار دیا ہے کہ اس وقت مولف کی عمر ۸۳ سال کی ہوگی۔ اس ضعیف العمری میں اس تفسیر کا لکھنا دشوار ہے وغیرہ۔ ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ نہ تو اس کا سنہ تالیف ۱۰۸۷ھ صحیح ہے اور نہ ۱۲۵۰ھ اور نہ ۱۲۸۷ھ بلکہ کاتب سے سنہ کتابت کے لکھنے میں قیاس غالب ہے کہ "مائتہ" کا لفظ متروک ہو گیا یعنی "ثمانین وسبع ومائتہ بعد الالف" ہونا چاہئے۔ اگر مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کا مبینہ سنہ ولادت بہ لحاظ بیان تقریباً ۱۱۹۴ھ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو عبدالصمد دلیر جنگ اپنے چچا زاد بھائی نواب عمدۃ الامرا (ولادت ۱۱۶۱ھ) سے چونتیس پینتیس سال چھوٹے تھے۔ آپس کے چچا زاد بھائیوں میں اتنا

بزاوق قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ہماری ناقص رائے میں مولوی عبدالصمد تقریباً ۱۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور تفسیر وہابی اپنے والد ماجد کی زندگی میں اپنے والد کے نام سے ۱۱۸۷ھ میں لکھی ہوگی اور اس وقت ان کی عمر (۲۴) سال کی ہوگی۔ بہت سے علما ایسے گزرے ہیں جو اندرون بیس سال ہی فارغ التحصیل ہو چکے تھے اس لئے یہ امر کوئی تعجب خیز نہیں۔ مدراس میں خود باقر آگاہ اس عمر میں صاحب تصنیف تھے۔ ان کے پدر بزرگوار نواب نصیر الدولہ (عبدالوہاب خان) نیلور کے فوجدار تھے۔ منعم خان ہمدانی مولف سوانح دکن کہتا ہے "چہارمی برادر او (والاجاہ) عبدالوہاب خان نصیر الدولہ از طرف والاجاہ نیلور دُمر وا پلی از تصرف اوست حیدر علی خان بہ تعلقہ او تاخت و تاراج نمودہ اورا با زن و فرزند اسیر ساخت (سوانح دکن قلمی ص۱۲۵ آصفیہ) گویا دلیر خاں عبدالصمد کو ان کے والدین کے ساتھ، سلطان حیدر علی وفات ۱۱۹۵ھ نے قید بھی کیا تھا۔ نیز ان کے والد ماجد کے تعلقات مشہور بزرگ حضرت شاہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ المتوفی ۱۱۹۵ھ سے بھی تھے۔ مولف عقیدۃ الطالبین (تالیف ۱۱۸۱ھ) (ملفوظ شاہ رحمت اللہ قدس اللہ سرہٗ) کا بیان ہے کہ "عبدالوہاب خان فوجدار نیلور بخدمت جناب عالی بار رخصت م آمد و رقت میداشت و می ماند بلکہ از آرزوئے کمال، خان موصوف حضرت قبلہ ہم بہ نیلور تشریف فرمودہ بودند" جس سے واضح ہے کہ مولوی عبدالصمد کے والد ماجد بھی عالم فاضل تھے اور فرزند بھی۔ نصیر الدولہ عربی میں گفتگو کیا کرتے تھے شاہ صاحب سے مولانائے روم کے اس شعر پر

ع جملہ معشوق است و عاشق پردہ

پر بڑی بحث ہوئی تھی اور شاہ رحمت اللہ کے جواب اور نغمہ سے تمام مجلس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی تھی (عقیدۃ الطالبین مطبوعہ اولیائے دکن ملکاپوری)

تفسیر وہابی کی زبان کے متعلق بابائے اردو کا خیال ہے کہ یہ پرانی نہیں صاف ہے اور تقریباً ایسی ہی زبان ہے جیسی آج کل جنوبی ہند میں مروج ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ ایسی زبان عوام کی ہو سکتی ہے مگر تعلیم یافتہ طبقے کی نہیں ہے۔ مولوی عبدالرحمن شاطر محمد منور گوہر کی زبان مسلمہ ہے، نیز خود اس زمانے میں عمدۃ الامرا اور باقر آگاہ کی زبان صاف تھی البتہ ان کی زبان غوث جامی مولف ترجمہ قصص الانبیا الموسوم ریاض مسعودیہ کی طرح سلیس مگر اس سے زیادہ صاف ہے۔

بہ ہر حال مولوی عبدالصمد علوم متداولہ عربی و فارسی کے فارغ التحصیل تھے اور ۱۲۲۴ھ یعنی تالیف قصص الانبیا تک بقید حیات تھے سنہ وفات کا پتہ نہیں چلا۔

**اولاد** :۔ چھ لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑیں، ان میں قابل ذکر نعیم اللہ خاں شرف الامرا، عماد الدین خان ممتاز الامرا اور ندیم اللہ خاں ہیں شرف الامرا کی ایک لڑکی یا پوتی محمد اللہ خان ضیغم مولف تذکرہ یادگار ضیغم سے منسوب تھی، اور ان کی صاحبزادی برہان النساء، غلام حسین خان سکندر جنگ اول سے جو ایک اردو مثنوی نگار فالوتن اثیمہ، مولف گلشن نہرشان وغیرہ کے خسر تھے اور اثیمہ مدراس کے ایک مشہور شاعر عبدالرحمن شاطر اور محمد منور گوہر مولف سخنوران بلند فکر کی جدامجدہ تھیں، نواب عظیم الدولہ $\frac{۱۲۱۶}{۱۲۴۴}$ھ بھی مولوی عبدالصمد کے داماد تھے (خلاصۃ الانساب تالیف ۱۲۹۱ھ مولفہ قدرت احمد گوپاموی)

**تصنیفات** :۔ تفسیر وہابی چار جلد، اوراق بحیثیت مجموعی ۱۳۲۶ یا ۲۷۲۶ صفحات، مسطر ۱۳ سطر فلس کیپ سائز، گویا تفسیر اندازاً ڈھائی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

**آغاز** :۔ اللہ تعالیٰ ایسا بڑا ہے کہ تمام آسمان کا اور زمین کا اور فرشتوں کا اور بہشت کا اور دوزخ کا اور ان میں کی چیزوں کا اور تمام عالم کا پیدا کرنہارا، اور ہی اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ ہے کہ فضل کرنہارا اور گناہوں کا بخشنہارا۔ الخ

نام تفسیر و وجہ تالیف :۔ بعد حمد اور نعت کے
ا ہوں کہ اس تفسیر کا نام تفسیر وہابی رکھا ہوں ۔ اور اس تفسیر کے بنانے
۔ ے کا نام عبد الصمد بیٹا نواب شکوہ الملک نصیر الدولہ عبد الوہاب
ن بہادر نصرت جنگ کا فرزند ضعیف کے خاطر میں آیا کہ بہوت
سیراں عربی اور فارسی ہیں لیکن دکھنی تفسیر شاید کہ کم ہیں بلکہ نہیں ہیں
ں واسطے سب مرداں اور عورتوں کو قرآن مجید کے معانی معلوم ہو کر
م فائدہ ہونے کے واسطے دکھنی زبان سے بنایا ہوں ۔

لد اول :۔ سورۂ فاتحہ سے سورۂ اعراف ( ۲۹۶ ۔ اوراق )
لد دوم :۔ تا سورۂ یٰسین شریف ( ۳۰۴ ۔ اوراق )
لد سوم :۔ سورۂ یٰسین کی آیت اجراؤھم مھتدون تک ۳۶۵ اوراق
د چہارم :۔ تا آخر سورۂ والناس ۳۰۱ ۔ اوراق

تیمہ :۔ فی شہر جمادی الثانی فی یوم السبت من عشرین ہذا شہر سنہ
ثمانین وسبع بعد الالف من ہجرۃ النبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

مگر یہ سنہ غلط اور سہو کتابت پر مبنی ہے اس لئے کہ مولف کا
انہ حیات تقریباً $\frac{۱۱۶۴}{۱۲۳۴}$ ھ ہے ممکن ہے کہ حسب بیان متذکرہ صدر
کا ہندسہ متروک ہو گیا ہو ۔

مولف نے اشارہ کیا ہے کہ عربی اور فارسی تفاسیر بہت ہیں
دکھنی میں کوئی نظر سے نہیں گزری ۔ اس زمانے میں شمالی ہند کے
ا و فضلا کی آمد علاقہ مدراس میں تھی ۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی
ترجمہ تالیف ۱۲۰۵ ھ سے مولف ناواقف معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر تفسیر
ابی زیر بحث بقول نصیر الدین ہاشمی ۱۲۸۷ ھ کی تالیف ہوتی تو شاہ
احب کا ترجمہ قرآن کا ضرور ذکر کرتے ۔ کیوں کہ ترجمہ مذکور اس
نے میں عام طور پر مقبول ہو چکا تھا اور یہ صرف ترجمہ تھا نہ کہ تفسیر
تفسیر وہابی کی عبارت آسان ہے ۔ عربی فارسی الفاظ سے احتراز
کیا ہے اور نہ مفسرین کے زیادہ تر حوالے ہیں ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض مستند مفسرین کے
حوالے ہیں ۔

صفحہ ۲۹۷ جلد ۲ ۔ حدیث ۔ سورۂ بنی اسرائیل ۔
سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
حدیث متواتر سے معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسم سے اور
اپنی روح سے اور جاگنے کی حالت میں جب کہ ستائیسویں تاریخ تھی مکہ سے
بیت المقدس کو جا کر دو رکعت نماز پڑھے بعد پیغمبروں کی قبروں کی زیارت کئے
بعد جبرائیلؑ براق پر سوار کرا کر اوّل آسمان پہ لے گئے ۔ ۔ ۔ ۔

" جب شمعون پیغمبر کہے کہ ہمارے خدایاں کے سوائے دوسرا کوئی
خدا ہے کیا ؟ تم ان کو بلاؤ میں ان سے پوچھتا ہوں بعد بادشاہ تا ردش اور مارکوں
کو بلوایا بعد وہ پیغمبراں آ کر شمعون پیغمبر بادشاہ کے نزدیک بیٹھے ہوئے
دیکھ کر بہوت خوش ہوئے ۔ بعد شمعون اوں پیغمبروں کو نہیں جانے سریکا
پوچھے کہ تمہارا خدا کون ہے اور کیا کمال رکھتا ہے ۔ اور تم اس قوم کو کس کے
طرف بلاتے ہو ۔ تب وہ پیغمبراں کہے کہ ہم اوس خدا کے طرف بلاتے ہیں
کہ جو زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور مُردے کو جلاتا ہے "

( جلد ۴ ۔ ورق ۱-۲ )

بقیۂ ہمارے رومانی انشا پرداز ( بسلسلہ صفحہ ۲۱ )

آج کے ٹھوس مادی تقاضوں کی سیاہ پرچھائیوں سے انشاپردازی
کے رومانی نقوش دھندلائے جا رہے ہیں لیکن شرر سے بخیر احمد تک ہمارے ان
مضمون نگاروں نے ہمیں جو جذباتی تجربے جمالیاتی احساس ،
رعنائی بیان ، لطافت اظہار اور فکر و فن میں تخلیق سے آشنائی
بخشی ہے ، وہ ہمیشہ ہمارے ادب کے رگ و پے میں خون تازہ کی طرح
دوڑتی رہے گی ۔ ( بشکریہ خیاباں " پشاور )

سید امجد الطاف

# ہمارے رومانی انشا پرداز[1]

## (ایک مطالعہ)

ایک بار فرانس کے مشہور سرپھرے مفکر والٹیر نے کسی ناٹک میں ایک مشہور المیہ اداکار کو کام کرتے دیکھا تو کہنے لگا کہ اس کی اداکاری بہت غیر جذباتی قسم کی ہے، اداکار نے یہ تنقید سنی تو اس نے ازرہِ شکایت والٹیر سے کہا کہ قبلہ! آپ جس بات کی مجھ سے توقع رکھتے ہیں اس کے لئے تو ضروری ہے کہ انسان کے جسم میں شیطان حلول کر جائے۔ والٹیر نے جواب دیا بے شک! فن میں کمال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب فن کار کے جسم میں شیطان ہو ــــــــ والٹیر کی اس سے مراد یہ تھی کہ ہر تخلیقی فن کا وجود اور ظہورِ جذبے کا مرہونِ منت ہے جو ایک شیطانی قوت ہے۔

سرسید کے زمانے میں جب اردو انشا پردازی کا آغاز ہوا تو یہ شیطانی قوت ہماری شاعری میں سرایت کر چکی تھی اور ایک مستقل صنف یعنی غزل بہت حد تک صرف اسی کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی اور اس میں وہ جذبہ اور مستی پوری طرح رچ بس چکی تھی جسے والٹیر حقیقی شاعر کے لئے لوازماتِ فن میں سے سمجھتا ہے۔ سرسید کے پیشِ نظر ایک مقصد تھا اور ان کی مقصدیت کا ایک تقاضا تھا کہ عقلی دلائل و براہین کی مدد سے وہ اپنے سامعین اور قارئین کو اس کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیں۔ تہذیب الاخلاق کا اجرا اسی مقصد کے حصول اور اسی مشن کی تکمیل کے سلسلے میں ایک اہم قدم تھا۔ سرسید کے اس رسالے کا ہماری زبان میں وہی مقام ہے جو ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کا انگریزی ادب میں، لیکن جس طرح اسٹیل اور ایڈیسن کے خلاف لیمب اور ہیزلٹ نے علمِ بغاوت بلند کر کے وجدان اور جذبے کو عقل و حکمت سے بلند مقام دینے کی کوشش کی اسی طرح یہاں بھی تعقل پسندی اور استدلالی طرزِ بیان کے خلاف ایک تحریک شروع ہوئی جو اگر سوچا جائے تو دراصل اس عہد کے حقیقت بین اور سادگی پسند مصلحین کی بے نمک پھیکی اور سپاٹ نثر کے خلاف ایک ردِعمل کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ شرر کے دشتِ وحشت کا یہ ٹکڑا دیکھئے۔

> ہائے! کسی کا پتہ نہیں۔ خدا جانے کدھر نکل گئے، اور کہاں کھو رہے۔ اے خانماں برباد مسافرو! یہ دشتِ وحشت تمہیں دھوکا دے کر کہاں پہنچا دیتا ہے کہ پھر ہمیں تمہاری صورت نظر نہیں آتی۔ یا تو اس صحرا ہی میں کوئی ایسی دلچسپیاں ہیں جو تمہارا دل لبھایا کرتی ہیں یا ہماری بامذاق صحبتوں سے تم کچھ ایسے بدمزہ ہو کر رہ گئے کہ پھر لوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔ کوئی بات ضرور ہے۔ یارانِ انجمن کو داغ دے کے یک بیک غائب ہو جانا بے وجہ نہیں۔ تمہاری انجمنیں اور تمہاری محفلیں بے تمہارے سست

---

[1] یہاں انشا پرداز بہ معنی ESSAYIST استعمال ہوا ہے۔

اور افسردہ پڑی ہیں۔ جن مکانوں میں لطف صحبت اٹھایا کرتی اور جن جن مقامات پر تم جا جا کے ٹھہرا کرتے تھے، تمہارے یاد کرنے والے وہاں جا کر رو لیا کرتے ہیں۔ کوئی ایسا بھی نہیں ملتا جو تمہاری خبر بتائے۔ ہائے! یہ بھی نہیں معلوم کہ تم زندہ ہو یا اس دنیا سے گزر گئے۔ ریگ رواں کے ساتھ دوڑتے دوڑتے کیا تم بھی اس میں مل گئے!"

اس جذباتی اندازِ فکر اور شاعرانہ طرزِ بیان نے اردو انشاپردازی میں اس تحریک کو جنم دیا جو رومانیت کے نام سے مشہور رہی۔ رومانیت کی کوئی ایک جامع اور بلیغ تعریف پیش کرنا بہت مشکل ہے، پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں "رومانیت ایک بتِ ہزار شیوہ ہے، اس کے ان گنت روپ رنگ ہیں اور اسی لئے نقادوں نے اس کی متعدد تعریفیں کی ہیں، کوئی اسے عشق کی داستان کہتا ہے کوئی جذبے کی پرستش، کسی کو اصرار ہے کہ یہ فطرت کا دوسرا نام ہے، چاہے وہ سماج سے ہو یا مروجہ نظامِ اخلاق سے کوئی اسے تخیل کی علم برداری کا نام دیتا ہے، کوئی انسان کی آزاد فطرت کی آواز۔ یہ ضرور ہے کہ کلاسیکی رجحان کے مقابلے میں جو مروجہ قدروں کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور روایت کا پرستار ہے رومانیت تجربے کی قائل ہے اور زمانے کے پیر تسمہ پا سے آزاد ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ چناں چہ تخیل کی پرواز، جمالیاتی احساس اور انفرادیت کے حصول کے لئے مروجہ سماجی اقدار سے رہائی کی کوشش، رومانیت کے ارکانِ ثلاثہ کہے جا سکتے ہیں۔"

سرور صاحب کے اس تجزیہ سے آگے بڑھیں تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رومانیت نے ایک جانب تو اس فلسفے کی تبلیغ کی جو جذبات کو فکر و عمل اور علم و فن کا حقیقی ذریعہ قرار دیتا ہے، اور دوسری طرف اس نے حسن ــــ خواہ وہ حسن مجرد ہو یا حسن نسوانی ــــ اور جمالیاتی کیف کو جگہ دی ہے۔ حسن ایک ایسی قوت ہے جس کے سامنے ہر ذی شعور مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہر ایک کو اپنا شیدا بنا لیتی ہے۔

کیٹس نے حسن کو مسرت جاوداں یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا، دراصل قدرت نے بنی نوع آدم کے ہر فرد میں ہر خوب صورت چیز سے پیار کرنے کی صلاحیت ودیعت کر رکھی ہے۔ بقول ایمرسن اگر آنکھیں دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں تو تخلیق حسن کا باعث بھی یہی ہیں۔ حسن کی جستجو، حسن کی تخلیق اور حسن کی پرستش ہمیشہ سے صاحب نظر اور صاحب دل فن کاروں کا مطمح نظر رہی ہے۔ چناں چہ ہمارے انشا پردازوں کو حسن مجرد کی تلاش مابعد الطبیعات کی راہوں پر چلاتی، ماورائیت اور روحانیت کی طرف لے گئی اور حسن کی پرستش نے نثر میں تغزل کا رنگ پیدا کر دیا۔ یہ رنگ تغزل مہدی افادی کے خوابِ طفلی اور آرزوئے شباب میں ملاحظہ فرمائیے۔

"حسین تو ایک معمولی اور سرسری لفظ ہے .....
عذرا تو نظم زندگی یعنی پوری شاعری ہے اس کی
آواز کامل موسیقی، اس کا تبسم میر اعظم حیات ہے۔
وہ قطعاً توبہ شکن ہے ـــ توبہ شکن اور کافر ایمان
..... حصول آرزو، جسے شعرا اپنی اصطلاح میں
"وصل" کہتے ہیں، ایک طرح کی خود غرضی ہے ناتمامی
و ناکامی میں ایک لذت خاص ہے اور چونکہ مجھ کو
عذرا کے ساتھ روحانی تعلق ہے اس لئے گو وہ مجھے
گلے کا ہار نہ بنا سکے تاہم میں اس کی پرستش سے جیتے جی
کبھی دست بردار نہ ہو سکوں گا۔ وقت گزر جائے گا
قصے رہ جائیں گے!"

مہدی افادی کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی خوش مذاقی ہے وہ حسن کو صرف انسانی پیکر ہی میں محدود نہیں رکھتے بلکہ ان کی نگاہ حسن، ایک اچھی کتاب کو بھی ہر حسن جمیل کے روپ میں ڈھال لیتی ہے وہ کہانے یونان خصوصاً فلسفۂ مسرت کے عالم پر ماہرین سے شدید طور پر متاثر ہیں مگر اپنے ملک و قوم کی مٹی ہوئی عظمت اور شوکت پاستاں کے بھی نوحہ خواں بھی ہیں۔

ان کے رومانی تصورات میں مغرب اور مشرق کا ایک دل آویز امتزاج نظر آتا ہے۔ رنگینیٔ فکر، رنگینیٔ نظر اور رنگینیٔ بیان کا ثبوت ان کے مضامین میں جا بجا ملتا ہے۔ ان کے برعکس نیاز فتح پوری بہت حد تک صرف حسنِ نسوانی کے طلسم میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ان کی نگارشات میں آغازِ شباب کا ہیجان اور تلاطم نظر آتا ہے۔ وہ اپنے تصور کدے میں حسن کو صرف دیکھنا ہی نہیں بلکہ چھونا اور بھینچنا بھی چاہتے ہیں۔ لذتیت انہیں عریانی اور فحاشی کی طرف لے گئی، جس پر پردہ ڈالنے کے لئے انہوں نے فارسی کی خود نما اور گراں بار ترکیبوں اور خالص شعری ترکیبوں اور استعاروں سے کام لیا اور وہ نثر میں صنفِ نازک کا بے باکانہ ذکر نہ ہونے کے برابر تھا اور تھا بھی تو افسانہ و داستان میں۔ اگر رومانیت مروجہ نظام کے خلاف بغاوت ہے تو اس اعتبار سے نیاز فتح پوری کو باغیوں کا امام کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک شب کی ~~تمنیت~~ کا آغاز یوں کرتے ہیں :-

" شبستانِ ناز کے پرلطف دقیقہ ہائے برق کسی کی
آرمیدہ مژگانی کی آغوش میں تھک کر سو گئے ہیں مگر
ایک حسرت آلود انتقامِ عشق ان لانبی گھنی پلکوں کا
ماجرا، جو آسودہ آنکھوں کی لذت سے مست و سرشار
ہیں سننے کے لئے بے تاب ہے، سمجھنے کے لئے تڑپ
رہا ہے "

نیاز احمد کے علاوہ ل۔ احمد، ریاض خیر آبادی، سید ناصر علی اور سب سے بڑھ کر شاہ دلگیر مدیر نقاد وہ ہمدرگ ہیں جنہوں نے اس آشوبِ خیال " اور " ارتعاشِ رنگیں " کی دولت سے اپنے پڑھنے والوں کو خوب نوازا۔

جہاں تک اردو مضامین میں حسنِ مجرد، ماورائیت اور روحانیت کے عناصر کا تعلق ہے وہ ہماری متصوفانہ شاعری کی بدولت پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیکن ٹیگور کی گیتانجلی کے ترجمے نے اس کو دو چند کر دیا۔ روحانیت سے مراد وہ کیفیات اور احساسات ہیں جسے صرف دل محسوس کر سکتا ہے جس کا تعلق ظاہر سے زیادہ باطن سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ان واردات کے اظہار کے لئے اندازِ بیان کا موہوم ہونا ہی حسن میں داخل ہوگا۔ چنانچہ یہی موہومیت ٹیگور کے کلام کی خصوصیت ہے :-

" تو مجھ سے کتنی دور ہے اے پھول !
میں تیرے ہی دل میں پوشیدہ ہوں اے پھول !
میں ایک راستوں کی دنیا میں ہوں۔ رات آتی ہے اپنا
دروازہ کھول،
اے میرے گھر کی دنیا ! "

نیاز فتح پوری، ل۔ احمد، سلطان حیدر جوش وغیرہ نے اس کا بڑا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ اردو نثر میں مجرد احساسات اور مبہم تصورات کا عنصر غالب ہوتا چلا گیا۔ حسین و جمیل الفاظ کے پیکر میں ان کے معنی تلاش کرنے کے بجائے ماورائیت یا کائنات کی اصطلاح میں عالمِ ہوش سے عالمِ بالائے ہوش تک پہنچنے کی کوشش ہونے لگی۔ نیاز فتح پوری ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر کہتے ہیں :-

" اے بادلوں کی طرح اپنی خانہ بدوش آوارگیوں میں
گم رہنے والے صحرائیو ! کیا مجھے بھی تم اپنے نشۂ وارفتگی
میں شریک کر سکتے ہو، جس سے تم نے صحرا کے ذروں
کو مخمور اور پہاڑ کی وادیوں کو معمور کر رکھا ہے۔ کچھ تو
بتاؤ کہ میں کیوں کر تمہاری اس لبریز سکون پراگندگی
کی جمعیت کو اپنے دل میں بھر لوں، میں کس طرح تمہاری
اس متحمل معاشرت کے اندر چھپا ہوا جنگلوں کا سکوت
راتوں کا سکون چھین کر اپنی حیات کو دے دوں "۔

سجاد حیدر یلدرم بھی کچھ اسی قسم کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن دیکھئے

ان کے جذبے میں شدت کے باوجود ہیجان نہیں بلکہ ایک ٹھہری ہوئی کیفیت ہے۔ ان کے ہاں کھٹ درو ہاں موجیں نہیں بلکہ ایک ایسا ہلکا مد کا تموج ہے جو روح کو اضطراب کی بجائے بالیدگی بخشتا ہے، اظہار شاعرانہ ضرور ہے مگر بے ساختہ اور تکلف سے بری :-

"اگر میں صحرا نشین ہوتا تو طلوع و غروب آفتاب کے
نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا۔ چاندنی رات کو میں
دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ کر ہنس رہے
ہیں۔ اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز
کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حیات
محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گذر رہا ہوتا۔ پر فضا
گھاٹی میں پھول اور ان پھولوں کو دیکھ کر رنگین اور
لطیف گانے والی بلبل، ہلکی آواز سے گرنے والے
آبشار، جیسے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پر مسرت
زندگی بسر کرتا۔"

یہ توازن فکر اور متوازن اظہار جذبات ہمیں اس دور میں سجاد حیدر یلدرم کے علاوہ صرف قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتا ہے :-

"صبح جب پرانی تتلیوں کا فانوس ٹوٹ جائے گا تو نور
کا ایک آخری جھونکا نور کو اپنے پردوں میں لپیٹ کر نہ جانے
کہاں لے جائے گا۔ کیا معلوم شاید میں بھی ——
وہ "میں" جو میرے اندر ہے وہ بھی —— اسی نور پر
پڑ ان کے ساتھ موجوں کی آغوش سے نکل کر ہمیشہ کے لئے
وہاں چلا جائے جہاں نہ سورج ہے نہ چاند نہ تارے
نہ طوفان نہ موجیں —— اس سکون مطلق میں!"

جب فکر صرف فکر جمیل اور فن صرف فن لطیف ہو کر رہ جائے تو یہ شعر منثور کی صورت اختیار کر جاتا ہے مثلاً حجاب امتیاز علی :-

"گرمی کے دن آ گئے
وہ دن —— جو شاعر کے خواب کی طرح چمکیلے اور
مشک کی طرح گرم ہوتے ہیں۔
اور معبود! معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگینیاں پیدا کرنے
کے دن ہیں۔
دوست! دیکھو! گرمیوں کے شفاف آسمان پر
ستارا کیسے چمک رہا ہے۔
جیسے کسی ہرن کی آنکھ میں روشنی کانپ رہی ہو۔
خوبصورت پرندوں کے پروں پر سورج کی تیز
کرنیں کیسی پھسل رہی ہیں۔
—— جیسے ہلکی ہلکی برف پر سے پھسل رہی
ہوں۔
گرمی کے دن آ گئے، ہر طرف ایک نور کا دریا لہریں
مار رہا ہے"!!

لیکن جب ہر کہ دمہ نے یہ حسن پرستی ایک پیشے یا فیشن کے طور پر اختیار کر لی تو اہل نظر کی آبرو بھی خاک میں مل گئی۔ رومانیت کی آڑ میں عبارت کو آراستہ کرنے کے لئے خوشنما لیکن مہمل الفاظ کی ایسی بازی گری دکھائی گئی کہ معنی کا دم گھٹ گیا "نغموں کی ضیا باری"، "سنہری کرنوں کا تقطر"، "ساز ہستی کا طلائی تبسم"، "نغمہ بر دوش"، "ترنم در آغوش" ایسی ان گنت ترکیبیں ایجاد ہوئیں ٹیگور کی تقلید میں ایسی منثور شاعری شروع ہوئی جو صرف ونحو ہی سے نہیں بلکہ مطلب اور مفہوم سے بھی بے نیاز تھی اور جسے پڑھ کر بقول رشید احمد صدیقی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی عالم نزع میں وصیت کر رہا ہو —— اور لطف کی بات یہ تھی کہ اس "چیز" کا نام "ادب لطیف" رکھا گیا! یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سجاد انصاری اعجاز مسیحائی نہ دکھاتے تو عین ممکن ہے کہ اس نام نہاد ادب لطیف کے ہاتھوں

ادبی تحریک ہمیشہ کے لئے سمٹ کر رہ جاتی جس نے داخلی اور جذباتی تجربو
ں کو واقعی اہمیت دے کر تعلیم یافتہ طبقے میں انفرادی شخصیت کا گہرا احساس
پیدا کر دیا تھا۔ سجاد انصاری نے بتایا کہ لطیف طرز انشا مضمون نگاری کا
اعلیٰ ترین مقام ہے کیوں کہ صرف حسین الفاظ کی مرصع کاری سے کام نہیں
چل سکتا، احساس اور بصیرت میں انفرادیت اور جذبے کا اصلی اور واقعی
ہونا بھی ضروری ہے۔ دوسرے رومانی انشا پردازوں کی طرح سجاد انصاری
بھی حسن پرست تھے اور جمالیاتی قدروں کے دلدادہ، ان کی رائے تھی کہ "حسن
کائنات کا ایک لطیف راز ہے۔" لیکن ان کے جذبے میں شدت کے ساتھ
ساتھ گہرائی بھی ہے اور وہ ایک حکیمانہ شعور اور نکتہ سنجی کے بھی مالک ہیں چنانچہ
ان کے ادب لطیف میں فلسفے کا ایک حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے اور ایک
ایک ایسی جرات فکر کہ جس سے آسکر وائلڈ کے "قول محال" (PARADOX)
کی یاد تازہ ہو جاتی ہے :-

"جماعت محض جاہل، کمزور اور بزدل افراد کا اتحاد ہے
جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ بلند نظر اور بلند
حوصلہ افراد کی قوتوں کو ابھرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ جماعت
چاہتی ہے کہ برگزیدہ شخصیتوں کی قوت ارادی اور قوت
عمل دونوں ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائیں۔ نظام اخلاق
جماعت کے بزدلانہ اتحاد کا دوسرا نام ہے بلند نظر
افراد کا فرض اور اہم ترین فرض یہ ہے کہ جماعت کے
اخلاقی قوانین کو پامال کر دیں ورنہ ایک دن وہ ان
کی انفرادی عظمت کو پامال کر دے گی۔"

جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے، رومانیت کے اس دوسرے دور میں
جس کا آغاز سجاد انصاری سے ہوتا ہے، اگرچہ جذباتیت غالب ہے لیکن
خود فراموشی اور سادہ رنگیت دب گئی ہے اور خود آگہی کی شمع اور بھی روشن
ہو گئی ہے۔ فلک پیما کے ہاں ہمیں انفرادی خود آگہی کے ساتھ ساتھ ایک گہرے
اجتماعی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ سجاد انصاری کی طرح وہ بھی باغی ہیں نظام
اخلاق ہو یا نظام سیاست، فلسفہ ہو یا تصوف، شعر و ادب ہو یا
سائنس ــــ وہ ہر موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک بے مثال جرات
فکر کا ثبوت دیتے ہیں، ان کے ہاں گرمی احساس بھی ہے اور شوخی اظہار
بھی ان کا ایک مضمون ہے "عقل مردہ باد" جس میں وہ دو انگریزی
کتابوں The Idea of Soul in Western
Philosophy and Science -
By - William Ellis
2- Living Religons and World
Faiths — By - William Hocking
پر یوں ریویو کرتے ہیں :-

"پہلی کتاب کی قیمت ۱۲ شلنگ اور دوسری کی قیمت
۱۰ شلنگ ہے گویا روح کے متعلق تحریر مذاہب
کی بحث سے گراں تر ہے۔ دونوں کتابوں سے
یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ روح مذہب کے لئے
ہے یا مذہب روح کے لئے۔"

ڈاکٹر ایلس نے لکھا تھا کہ سائنس نے "روح کا مقام تلاش کر لیا ہے،
اور آئندہ انسانی دماغوں میں روح کے لئے کسی قسم کا خیر مقدم جائز
نہیں۔ فلک پیما سے اس کا جواب سنئے :-

"اجی ڈاکٹر ایلس صاحب، سیدھے سادے اردو
خواں کی آپ کو نصیحت یہ ہے کہ آپ اپنی تاریخ
اور سائنس کو زندہ درگور کیجئے، بڑے آئے آپ
ایشیا والوں کی رزق مار کرنے۔ روح ہو کہ ہو،
ہمیں اس کی سخت ضرورت ہے کالی ہی، میلی ہی،
مگر اس کے بغیر ہمارا گزارا ناممکن ہے۔"

اسی طرح ہوکنگ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ صرف عیسائیت ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ممکن ہے دنیا پر چھا جائے مگر وہ عیسائیت موجودہ عیسائیت سے قطعاً مختلف ہوگی، پیشتر اس کے کہ ساری دنیا اسے قبول کرے اسے اور زیادہ ایشیائی بننا ہوگا۔ اس پر فلک پیما کا تبصرہ ملاحظہ ہو: ۔

"پروفیسر ہوکنگ! خدا تیرا بھلا کرے۔ برسوں کے بعد کسی فاضل کے قلم سے ایشیا کی نسبت امید افزا جملہ نکلا ہے۔ پروفیسر ہوکنگ! خدا کرے تیرا جھوٹ سچ نکلے۔ کچھ تو (ایشیا) کے حصے میں بھی آئے۔ مگر پروفیسر ہوکنگ! یہ غضب کیا کہ آگے چل کر یہ لکھ دیا کہ سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو اس زندگی کے لئے معیشت مہیا کرے اور سونے کے ورق میں لپٹی ہوئی "اگلی دنیا" میں طاقتور سونے کی گولیوں کا تاجر نہ ہو۔ پروفیسر ہوکنگ! خدا کے لئے کچھ تو خیال کیا ہوتا، روح کو ڈاکٹر ایلس لے گیا۔ اگلی دنیا پر آپ نے چھاپہ مارا، تو ہمارے پاس کیا رہ گیا۔ تم عالم آدمی بھی اپنے ملک کے سیاستیوں کی طرح جو بائیں ہاتھ سے دیتے ہو، وہ دائیں ہاتھ سے واپس لے لیتے ہو تمہارے علم و فضل پر لعنت!

خوابیدہ ایشیا کے یہ دو خواب کہ روح ہے اور آنے والی دنیا ہے تم کبھی نہ لوٹ سکو گے تمہارے بم اور تمہارے بموں سے بدتر تمہارے بنک کبھی ایشیا کے ان لازوال خزانوں کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم کچھ ہی کہو ہم تو یہی نعرے لگائیں گے ـــــــ

روح زندہ باد ـــــ اگلی دنیا زندہ باد!!
عقل مُردہ باد ـــــ سائنس جہنم آباد!!

فلک پیما کے مضامین میں خلوصِ جمال، پاسِ اخلاق، روحانیت کا گہرا احساس اور جذبے کی پاکیزگی نظر آتی ہے۔ یہی کیفیات ان کے معاصر میاں بشیر احمد کی نگارشات میں بھی موجود ہیں۔ ان کے ہاں بھی جذبے کو اولین اور فکر کو ثانوی حیثیت حاصل ہے لیکن وہ خود فراموشی کے عالم میں بھی اپنے تخیل کو بھٹکنے نہیں دیتے ان کے بیان کی سادگی، لطافت اور کیف کا کچھ اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے:۔

"یہ ہے میری تمنا کہ جو کچھ میں نے تجھے دیا ہے وہ ہمیشہ ہی تجھے دوں۔ یہ ہے میری تمنا کہ میں یوں ہی تجھ سے محبت کروں یوں ہی خدمت کروں تیری خواہ اس محبت اور خدمت میں مصیبت کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔

یہ ہے میری تمنا کہ میں اپنے خیالوں کو یوں پاکیزہ ہی رکھوں۔ یہ ہے میرا ارادہ کہ میں اپنی بے تابیوں کو کم کئے جاؤں تاکہ اس طرح نیکی کا چاند میری تاریک راتوں میں جلوہ گر ہو، تاکہ اس طرح تیری محبت کا پھول میرے مرتے دم تک دنیا کے لق و دق صحرا میں میری اور تیری روح کو معطر رکھے۔

اگر تو وہ نہیں جو میں تجھے سمجھتا ہوں اور اگر میں وہ نہیں جو تو مجھے سمجھے ہوئے ہے تو میں تجھ سے اور تو مجھ سے ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے وہی کچھ ہو جانے والے ہیں جس کا تصور بھی ہماری باہمی محبت کے دل میں ہے۔

ہماری کوتاہیوں پہ دنیا ہمیں کیا خبر ملے گی، کہ اعتراف پر ہی ہماری محبت کا انحصار ہے۔

خدا نہ کرے کہ ہم لغزشوں کی پردہ پوشی کئے جائیں
خدا نہ کرے کہ یوں ہماری محبت کا خاتمہ ہو جائے
خدا نہ کرے کہ ہم کہیں کچھ اور، اور کریں کچھ اور۔"

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

# غ

## عمر انصاری

○

کم رونقِ بازارِ نگاراں تو نہیں ہے
ہر جلوہ مگر جلوۂ جاناں تو نہیں ہے

منسوب ہے جو حشر کے عنوان سے واعظ
میرا ہی کوئی خوابِ پریشاں تو نہیں ہے

جس طرح بھی تم چاہو تسلی اسے دے لو
ناداں ابھی اتنا دلِ ناداں تو نہیں ہے

میخانہ ہے جس طرح بھی ہم چاہیں لٹائیں
زاہد یہ تری دولتِ ایماں تو نہیں ہے

کیوں نام سے دوزخ کے لرزتا ہے زمانہ
دوزخ ہی کہیں بزمِ رقیباں تو نہیں ہے

خالی ہی سہی میرا ہر اک جامِ سفالیں
سر پر کوئی بارِ غمِ احساں تو نہیں ہے

کرتا ہے جسے خُلد سے تعبیر زمانہ
اے دوست ترا گوشۂ داماں تو نہیں ہے

کیا فکر تمہیں جو بھی مرے دل پہ گزر جائے
چہرے سے مرا حال نمایاں تو نہیں ہے

بے صبرِ محبت مجھے اتنا تو بتا دے
تو بھی کسی کم ظرف کا احساں تو نہیں ہے

**دامن جو گزرتے ہوئے کانٹوں سے بچا لے**
**کچھ بھی ہو عمر فصلِ بہاراں تو نہیں ہے**

## والی آسی

○

گھٹائیں جھوم اٹھیں آسماں کو وجد آئے
یہ کس نے گیسوئے پرخم ہوا میں لہرائے

یہ آرزو ہی رہی جانِ آرزو اپنی
تمام عمر تری آرزو میں کٹ جائے

زمانے والوں نے پھینکے ہیں ہم پہ انگارے
مگر ہمارے تبسم نے پھول برسائے

تمام عمر کی ناکامیاں سر آنکھوں پر!
مگر یہ شرط کہ تو بھی نہ مجھ کو یاد آئے

تری تلاش میں اے دوست تیرے دیوانے
ہزار بار غمِ زندگی سے ٹکرائے

تری جفائیں وہاں تک کبھی پہنچ نہ سکیں
ہم اہلِ درد جہاں نقدِ جاں لٹا آئے

تمہاری یاد کبھی اس طرح دل میں آتی ہے
کہ جیسے رات گئے قافلہ گزر جائے

**بھلا کے بھی انہیں والی کبھی بھلا نہ سکے**
**ہم ان کی یاد سے بازی لگا کے پچھتائے**

احمد رفاعی

خاور صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ ادبی دنیا کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے، ارباب فکر بالعموم اس قسم کے اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا رہے ہیں۔ آرٹ کے فلسفیانہ نظریے دو دھاری پہلو رکھتے ہیں جو براہ راست کبھی فن کار کو متاثر کرتے ہیں اور کبھی صاحبان نقد و نظر کو۔ نظریات کا رد و قبول در اصل ان کی جامعیت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ جامعیت جتنی وقیع ہوگی، اس کے اثرات اتنے ہی دور رس ہوں گے۔ ہنگامی نظریات پانی کے بلبلوں کی مانند سر اٹھاتے ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ صالح تنقید کے لئے متوازن اور خوشگوار حالات ہی سازگار ہوتے ہیں لیکن ہیجان و خلفشار کے غیر یقینی اور ناخوشگوار حالات میں بھی نقادان فن کی کوئی کمی نہیں ہوتی، فرق صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ غیر یقینی حالات میں ہر صاحب نقد اپنی کہے جاتا ہے اور ادب کا پر شکوہ ایوان ایک اچھا خاصا مچھلی بازار بن کر رہ جاتا ہے جس میں ہر سمت سے بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی سی کی نہیں سمجھتا۔ غالباً اسی سبب سے جانسن کو یہ کہنا پڑا کہ ناقدین ایک قسم کے خیالی بازی گروں کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے اچھائی کی توقع کم ہوتی ہے اور بگاڑ کی زیادہ۔

جانسن صرف اپنے وقت ہی کے ذہنی رجحانات سے باخبر نہیں تھا، قدیم ادبیات پر بھی اس کی نظر بہت گہری تھی۔ اس کی تحقیقات اور بیانات اس کی علمی قابلیت اور عمیق مطالعہ کی روشن دلیل ہیں۔ وہ جس وقت شاعروں کی حمایت میں یہ کہتا ہے کہ "شاعروں کا صحیح پارکھ صرف شاعر ہی ہو سکتا ہے" تو ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کرتا ہے کہ "اس کا حق صرف بہترین شاعر ہی کو ہے ہر شاعر کو نہیں۔"

ڈرائیڈن جو اپنے وقت کا ایک زبردست نقاد تھا نام نہاد ناقدین کا خاص طور پر رشاکی ہے اس کے نزدیک شاعروں کی بے راہ روی کے اصل ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔"

فن کو صرف فن کارانہ نقطۂ نظر سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ نظریاتی افراط و تفریط کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں براہ راست مزاحم ہو جاتی ہے۔ ادبی دنیا میں رد و قبول کی جو معرکہ آرا تحریکات اٹھی ہیں ان کا بنیادی سبب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر جماعت اپنے پیش کردہ نظریات کے جواز میں نت نئی تاویلات کی تراش خراش کرتی رہی ہے۔ یورپ میں رومانی اور کلاسیکل تحریکات کا بیشتر عبوری زمانہ اسی قسم کی بے معنی رسہ کشی کی نذر ہو گیا۔ اس ضمن میں دو ممتاز ناقدین رائمر اور ڈرائیڈن کے معرکے خاص طور پر یادگار ہیں۔ رائمر کے خیال میں فطرت کا عمل دخل ہر عالم پر یکساں ہے اور اس لحاظ سے ایک ملک کی تخلیقات دوسرے ملک کے لئے ویسی ہی قابل قبول ہو سکتی ہیں جیسی کہ خود اس ملک کے لئے جہاں وہ تخلیق ہوئی ہیں۔ برخلاف اس کے ڈرائیڈن کی رائے میں مخصوص ملکی ماحول، آب و ہوا، اور زمانے کا لعصر بـ لوگوں کے وجدان و مزاج کی تشکیل میں خصوصیت سے اثر انداز ہوتا ہے اس بنا پر ممکن ہے کہ جو چیز [illegible]

یونانی وجد کرتی ہوں انگریزوں کو مطمئن ہی نہ کر سکے "۔

خاور صاحب کی رائے راقم سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ بہرکیف کسی رائے سے اتفاق و اختلاف بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل چیز ہے نقطۂ نظر کی ماہیت، جس کی بابت گزشتہ سطروں میں عرض کیا جا چکا ہے۔ اردو ادب میں اصلاح کا خیال خصوصیت سے غدر کے بعد کی پیداوار ہے۔ صرف سرسید ہی نے نہیں مولانا محمد حسین آزاد نے بھی اردو کے جمود پر آنسو بہائے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی ایسی انتہا پسندانہ روش کے قائل نظر نہیں آتے جیسا کہ خاور صاحب کا مطمع نظر ہے۔ خاور صاحب کو غالباً مغالطہ ہوا ہے۔ حالی نے "پیروی مغربی" کی تلقین ضرور کی ہے لیکن تنسیخ روایت کا فتویٰ کہیں صادر نہیں کیا۔ زبان و بیان کے جزوی اختلافات کو ہوا دینا مناسب و مستحسن نہیں۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کو ادب جدید کا منشور قرار دینا محض خوش عقیدگی ہے۔ حالی خود اس سیلاب سے بے خبر تھے جو براہ راست صنعتی انقلاب کا نتیجہ تھا اور جس نے خصوصیت سے سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل میں درمیانی عرصے میں یورپ کی ذہنی سطح کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ دور یورپ کے تنقیدی ادب کا بہترین دور ہے لیکن حالی نے اپنے مقدمے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ خاصے بیش پا افتادہ ہیں، وہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو تو ضرور پورا کرتے ہیں لیکن ادبی زندگی کے ہر موڑ پر انہیں مطمع نظر نہیں بنایا جا سکتا، اور جب خاور صاحب خود بھی اسی رائے سے متفق ہیں تو پھر یہ کہنا کہ "اگر ہمارا ادب اسی نہج پر آگے بڑھتا رہا جس کی نشان دہی ابتدا میں کی گئی تھی اور ہم پیچ در پیچ تقاضوں کے جھمیلے میں سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے ایسی سمت کا تعین کرتے جو برجستہ اقدامات کی ضامن ہوتی تو آج ہمارا ادب کہیں کا کہیں ہوتا" سر تا سر حسن ظن ہے۔ یہ ادب کو پروپیگنڈہ بنا دینے والی بات ہے جو وقت اور ماحول کے بنیادی تقاضوں سے براہ راست روگردانی سکھلاتی ہے۔

خاور صاحب کا یہ فرمانا کہ "اس وقت تمام دنیا کا تخلیقی سرمایہ ہمارا سرمایہ ہے اور ہم اس سے اپنے ادب و فن میں زیادہ سے زیادہ وسعت، تازگی اور توانائی پیدا کر سکتے ہیں" قدرے وضاحت طلب ہے اور خصوصیت سے ایسے دور میں جبکہ دنیا کے مختلف ممالک ایک شدید قسم کی نظریاتی رسہ کشی کا شکار ہیں اس تخلیقی سرمائے کا تعین کس نقطۂ نظر سے کیا جا سکے گا، اپنانے کا سوال تو بعد کی چیز ہے۔

لب و لہجہ اٹھان اور اسی قسم کی دوسری خصوصیات جن پر خاور صاحب نے خاص طور پر زور دیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کس وقت ہمارے شعر و فن کی بنیاد نہیں مانی گئیں۔ ہمارے ادب میں تاثراتی تنقید کا جو ایک انبار نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ بجز اس کے کچھ اور نہیں کہ ہمارے بزرگوں کا زاویہ نظر خالص جمالیاتی رہا ہے جو طبع و سرشت کے احترازآگیں تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر جابجا انتہائی لطیف اور پر پیچ و تاب ہو گیا ہے۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ خاور صاحب کے ذہن و خیال پر بری طرح چھایا ہوا ہے اور اس سے ان کی خوش اعتقادی غلو کی حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ اعلیٰ، اچھوتے اور پائیدار معیاروں کو اپنانے پر کون معترض ہوگا لیکن یہ فرمانا کہ "اب شاعری کی طرح، خاصی پیچیدہ اور مرکب ہو چکی ہے لہذا شاعری میں پرانی قسم کی بحثیں مثلاً صحت لفظی، محاورہ، سرقہ وغیرہ بے کار ہیں۔ بوالعجبی کی ایک ایسی نادر مثال ہے جس کا جواب نہیں اس دور میں بے چارہ شاعر ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہے اگر وہ عام مشاہدات و تجربات سے ہٹ کر اپنی دنیا الگ بسا لیتا ہے، تو اس پر فراریت پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے اور اس کی شاعری کو وقت اور ماحول کے اہم اور بنیادی تقاضوں سے معرا کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں اگر وہ زندگی کے روزمرہ پیش آنے والے واقعات

کی عکاسی کو اپنا شعار بناتا ہے تو کبھی "یاران طریقت" چیں بر جبیں نظر آتے ہیں جیسا کہ ہمارے خاور صاحب نے بڑی معصومیت کے ساتھ فرمادیا ہے۔

"اقبال کے بعد ہماری شاعری کچھ خالی الذہن سی معلوم ہوتی ہے اور ہنگامی حالات یا میلانات کے مطابق ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور ایک لَے سے دوسری لَے کی طرف جست کرتی رہی ہے "رفت از یک بند تا افتاد در بندے دگر" کبھی انقلاب کبھی حب وطن کبھی ترقی پسندی، کبھی رومانیت، کبھی فسادات، کبھی کشمیر چلو، کبھی یہ وہ سحر تو نہیں اور کبھی ایک خلا! اس افتاں وخیزاں قسم کی شاعری میں کسی بھرپور بات کی توقع کم ہے۔ اس مسلسل دقیانوسی وضع سے قطع نظر جو بعض غزلیات اور بعض اسی قسم کی قدیم وجدید پیوندی نظموں میں دکھائی دیتی ہے اور آج بھی نظم ونثر اور نقد ونظر میں ہماری دنیائے ادب پر کافی حد تک حاوی ہے، ایک خاص قسم کی سہل انگار شاعری بھی رائج ہوگئی ہے، جو اپنی مقبولیت اور سرسری اپیل کی وجہ سے ایک سد گراں بن گئی ہے کیوں کہ ہمارے اذہان اس سے ہٹ کر زیادہ وسیع کوششوں کی طرف مائل نہیں ہوتے۔"

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس قسم کے اعتراضات محض ادعائے نقد ونظر کا بھرم رکھنے کی خاطر کئے جاتے ہیں جن کی افادی اہمیت کچھ نہیں۔ اچھوتے آئیڈیل خوابوں کے جزیروں سے ڈھونڈ کر نہیں لائے جاتے۔ زندگی جس وقت حقائق کو تجرباتی انداز میں محسوس کرنے لگتی ہے تو فکر از خود پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور اس کے بعد ہی کسی بلند اور واضح نصب العین کی روشنی میں وسیع اور نادر تخلیقی کوششوں کا آغاز ممکن ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ شعر ہی تخلیقات ہمہ وقت کسی نہ کسی تعمیری مقصد ہی کی حامل ہوں، شاعر بہرحال شاعر ہوتا ہے فلسفی نہیں۔

خاور صاحب اپنی سابقہ روش کے تحت غزل پر بری طرح برسے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ "صنف سخن اقوام عالم کے گوناگوں سیر حاصل تجربوں اور خیال افروز پیرایوں، بیانی، تکنیکی، فنی وغیرہ ——— سے اغماض کی ترغیب دلاتی ہے" خاور صاحب کی رائے کس حد تک قابل قبول ہے میں اس کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہوں کیوں کہ یہ تو "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" جیسی کوئی بات ہے۔

البتہ خاور صاحب کی یہ شکایت ضرور قابل لحاظ ہے کہ ہمارے اسّی فی صدی شعرا اس کے دلدادہ ہیں اور بہت فرسودہ انداز میں یہاں تک کہ معروف شعرا بھی اسی قدامت نوازی کے ذیل میں آتے ہیں۔ مجھے اس معاملے میں خاور صاحب سے واقعی ہمدردی ہے لیکن ساتھ ہی انہیں میرا یہ مخلصانہ مشورہ بھی ہے کہ وہ غزل کی ہیئت اور تکنیک کا قدرے غیر جانبداری سے جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کا سراغ لگانے کی سعی فرمائیں جو اس کے ایک شعر میں ہمارے گرد وپیش پھیلی ہوئی زندگی کا سارا حسن سمیٹ کر جذبہ وخیال کی شیر ینیوں میں تحلیل کر دیتی ہے۔ اگر ہمارے اسی فی صدی شعرا اسی کے دلدادہ ہیں تو یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں اور نہ ہی اس پر دل میلا کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر اس میں کون سا جادو ہے جو سر پہ چڑھ کے بولتا ہے۔

خاور صاحب کا مضمون پڑھنے کے بعد ذہن ایک عجیب سی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ انداز بیان میں جا بجا تکرار اور تضاد کی سی کیفیت پائی جاتی ہے جس کے سبب کسی خاص نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ خاور صاحب اگر ایک جانب موجودہ عہد کے اضمحلال کی نشان دہی کرتے ہوئے اسے روشنی کے فقدان کا سبب قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف ان اجالوں سے مدد لینے پر اکساتے ہیں جو انہیں چاروں طرف پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں غالباً اس سے ان کی مراد مغربی ادبیات سے ہے۔ اس سلسلے میں خاور صاحب نے ایک عجیب بات کہی ہے لکھتے ہیں "آرٹ کا جو تصور کسی

کسی معقول تصور یا توجیہہ سے بلند ہوتا ہے معنی اور ہیئت کی مطابقت اور مزید جدت کا ضامن ہے۔ اس لئے ہم ہر نظریہ میں کسی نئی روشنی کا سراغ پائیں گے" یہ تاویل قطعی ناقابلِ فہم ہے۔ خاور صاحب کا یہ ارشاد بھی کہ ہمارا مطمح نظر اپنی تخلیقات کو معنویت سے حتی الامکان قریب تر لانا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم آرٹ کی ماہیت اور لوازمات کو سمجھیں" وضاحت کا محتاج ہے۔ خاور صاحب یہاں بلاوجہ ہر کس و ناکس کو اس کی ذہنی سطح کا لحاظ کئے بغیر کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں غالباً وہ لیسنگ ( LESSING ) کا یہ مقولہ ذہن سے فراموش کر گئے کہ "آرٹ کا ہر نقاد جینیس ( GENIUS ) نہیں ہوتا بلکہ ہر جینیس پیدائشی طور پر آرٹ کا نقاد ہے"۔

مجموعی طور پر خاور صاحب کا مقالہ دعوت فکر ضرور دیتا ہے لیکن مطالعہ کے بعد جو چیز شدت سے کھٹکتی ہے وہ ہے وحدت فکر کا فقدان۔ خاور صاحب نے بار بار اس امر کی شکایت کی ہے کہ ہماری تخلیقات معنویت سے دور جا پڑی ہیں۔ ہمارے اذہان سہل انگار شاعری سے ہٹ کر زیادہ رفیع کوششوں کی طرف مائل نہیں ہوتے ہمارا انتہائی مقصود پیچ در پیچ تقاضوں کے جھمیلے میں گم ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ، بایں ہمہ ان کی توضیحات کا بغور مطالعہ کرنے پر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاور صاحب کو غالباً خود نہیں معلوم کہ وہ رفیع اور نادر تخلیقی کوششیں، وہ بلند نصب العین اور وہ اچھوتا آئیڈیل کیا ہے جس کا وہ اس شدومد سے پرچار کر رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں انہوں نے دانستہ پہلو تہی کی ہو یا پھر وہ اس کے اظہار سے معذور رہے ہیں۔ بایں ہمہ خاور صاحب کے بعض ارشادات ان کی خلوص نیتی کے مظہر ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ مغربی انداز فکر و نظر کے فدا اور جدت سے زیادہ قائل نظر آتے ہیں۔ یہ روش مستحسن نہیں کہی جا سکتی۔

آخر میں عرض کروں گا کہ خاور صاحب شعر و فن سے متعلق اگر واقعی کوئی بلند نقطۂ نظر رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ اسے حسن انضباط کے ساتھ پیش کریں۔ اور موقع و محل کی مناسبت سے ضروری امثال کی روشنی میں بخوبی وضاحت فرمائیں ورنہ دوسری صورت میں ہمیں باور کرنا ہوگا کہ یہ کوشش "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے مصداق ایک قسم کی "ادبی شگوفہ کاری" ہے۔

---

# گرد و پیش

## پروفیسر عبدالسلام کا نیا عہدہ

راولپنڈی۔ ۱۸ اگست راولپنڈی کے قریب ایٹمی سائنس اور ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ قائم ہونے والا ہے عالمی شہرت کے پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر سلام اس کے انچارج ہوں گے اس وقت وہ امپیریل کالج آف سائنس ٹیکنالوجی (لندن) میں طبیعات کے پروفیسر ہیں اس انسٹی ٹیوٹ میں پچاس واٹ کا ایٹمی ری ایکٹر لگایا جائے گا یہ انسٹی ٹیوٹ وسیع پیمانے پر ریسرچ اور ریڈیو آئسوٹوپ بھی تیار کرے گا جو ملک بھر کے ہسپتالوں میں استعمال ہوں گے۔

## پنجاب یونی ورسٹی کی نئی عمارت کی تعمیر

لائل پور۔ ۱۹ اگست کرنل شہباز خان ڈائرکٹر یونی ورسٹی پراجکٹ نے بتایا ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی کی نئی عمارت کی تعمیر کا کام لاہور میں آئندہ اکتوبر شروع ہو جائے گا۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں ڈیزائن کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور تعمیر کا کام شروع کرنے کے لئے ٹینڈر طلب کر لئے گئے ہیں۔

## علی گڑھ یونی ورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی

نئی دہلی ۱۹ اگست۔ بھارتی وزیر تعلیم ڈاکٹر شری مالی نے آج راجیہ سبھا میں بتایا کہ حکومت ہند نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے امور کی چھان بین کے لئے جو تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی توقع ہے وہ ۱۹۶۰ کے آخر سے قبل ہی یونی ورسٹی کی ایگزیکٹیو کونسل کو اپنی رپورٹ پیش کر دے گی آپ نے کہا پارلیمنٹ کے دو ارکان مسٹر ن سپرو اور مسٹر ایم اے شاہ کو تحقیقاتی کمیٹی کے زائد ارکان مقرر کیا گیا ہے ناکہ اس سے زیادہ وسیع بنیادوں کا حامل بنایا جا سکے۔

وزیر تعلیم سے دریافت کیا گیا کہ آیا یونی ورسٹی حکام کی طرف سے کمیٹی کو تمام ریکارڈ اور معلومات مہیا کی گئی ہیں ڈاکٹر شری مالی نے کہا ”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تحقیقات کمیٹی کر رہی ہے اور مجھے اس کا کوئی علم نہیں کہ یونی ورسٹی کی طرف سے کون سے ریکارڈ پیش کئے گئے ہیں کون سے پیش نہیں کئے گئے۔

## کراچی یونی ورسٹی کے لئے ۲۳ لاکھ روپے کی گرانٹ

کراچی ۱۸ اگست حکومت پاکستان نے اندرون و بیرون ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں کے لئے (۵۱۸۵۰۰۰) روپے کی رقم منظور کی ہے اس میں ۲۳ لاکھ روپے کراچی یونی ورسٹی کے لئے اور ۲۵ لاکھ روپے ملک کی دیگر یونی ورسٹیوں کے لئے منظور کئے گئے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف پبلک اینڈ بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی کے لئے تین لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے جہاں تک بیرونی ملکوں کی یونی ورسٹیوں کا تعلق ہے ملایا یونی ورسٹی کے لئے ۷۱ ہزار روپے تہران یونی ورسٹی کے لئے ۱۳ ہزار روپے اور بہاولپور یونی ورسٹی کے لئے ۱۳ ہزار روپے منظور کئے گئے ہیں۔ قاہرہ یونی ورسٹی میں اردو اور پاکستانی علوم کے شعبہ کے لئے ۱۵ ہزار روپے اور کراچی یونی ورسٹی میں اطالوی زبان کے شعبہ کے لئے ۱۲ ہزار روپے مخصوص کئے گئے ہیں امید کی جاتی ہے کہ کراچی یونی ورسٹی کو جو امدادی رقم دی گئی ہے اس سے نئے کیمپس کی تعمیر مکمل کی جائے گی۔

## ماہنامہ ”بنیادی جمہوریت“ شائع ہوگا

کراچی ۱۸ اگست۔ کراچی سے ایک نیا باتصویر اردو ماہنامہ ”بنیادی جمہوریت“ شائع ہوا کرے گا جس کا پہلا شمارہ آئندہ ہفتے شائع ہوگا یہ رسالہ ملک کے دونوں حصوں کی بنیادی جمہوریتوں کی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہوگا۔ اس کے علاوہ اس میں سماجی معروضیات تاریخ تعلیم ثقافت اور آرٹس سے متعلق بھی مضامین شائع ہوں گے۔

## سعادت حسن منٹو کے خطوط

راقم الحروف سعادت حسن منٹو کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر رہا ہے
حباب کے پاس منٹو مرحوم کے خطوط ہوں یا انہیں ان اصحاب کا علم ہو جن
س ان کے خطوط موجود ہوں تو راقم الحروف کو مندرجہ ذیل پتے پر مطلع
ے ممنون فرمائیں تمام خطوط استفادے کے بعد نہایت حفاظت سے واپس
ریئے جائیں گے۔

احمد ندیم قاسمی
عقب دیال سنگھ لائبریری نسبت روڈ لاہور

## اردو کو دہلی کی سرکاری زبان بنانے کی مخالفت

نئی دہلی، ۱۹ اگست۔ دہلی کارپوریشن میں اردو کو دوسری
رکاری زبان قرار دینے کے متعلق کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کی پیش کردہ
رارداد کی پرزور مخالفت کی جن سنگھی لیڈروں نے کہا کہ اگر اردو کو کارپوریشن
ل سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا تو اس سے ملک میں تفرقہ ڈالنے والے عناصر
و تقویت پہنچے گی۔ اس قرارداد پر بحث کا سلسلہ جاری تھا کہ کارپوریشن کا
اجلاس ختم ہو گیا۔ قرارداد کارپوریشن کے ۴۶ ممبران کی طرف سے پیش کی گئی
ہے۔ آج کی بحث میں صرف ۱۶ ممبروں نے حصہ لیا۔

## چودھری محمد علی پاکستان پر کتاب لکھ رہے ہیں

چھانگاؤں، ۲۰ اگست۔ پاکستان کے سابق وزیراعظم چودھری محمد علی
نے آج یہاں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وہ ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا
عنوان ہوگا "پاکستان کیوں قائم ہوا؟" اس کتاب میں یہ بھی بتایا جائے گا
کہ پاکستان کے ابتدائی دور میں ملکی استحکام کے لئے کیا جدوجہد کی گئی۔ انہوں
نے کہا کہ یہ کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی اور ۱۹۶۱ء میں چھپ کر تیار ہو جائے گی

## بھارت میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار

بمبئی ۲۰ اگست۔ بھارت کے تمام اخبارات و رسائل میں اس وقت د
سنڈے سٹینڈرڈ" سب سے زیادہ چھپتا ہے۔ اس بات کا انکشاف رجسٹرار
اخبارات کی سالانہ رپورٹ میں کیا گیا جو ۱۸ اگست کو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی ہے
یہ رپورٹ وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر کیسکر نے پیش کی تھی رپورٹ کے
مطابق ۱۹۵۹ء کے دوران اس اخبار کی اشاعت ایک لاکھ بیاسی ہزار
نوسو چھپن تک پہنچ گئی تھی اس طرح ۱۹۵۸ء سے اس کی اشاعت
ہزار پانچ سو تیس کا اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ آج تک ایک سال میں کبھی کسی اخبار
میں نہیں ہوا۔

## صاحب ذوق چور

سرگودھا، ۱۸ اگست۔ آپ مشکل سے یقین کریں گے کہ گزشتہ رات
مٹھ ٹک کے پرائمری اسکول میں نقب زنی کر کے کسی نے علامہ اقبال کی تمام
تصنیفات چرا لیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اسکول موسم گرما کی چھٹیوں کی وجہ سے
بند تھا۔ گزشتہ صبح لوگوں نے اسکول کی کھڑکیاں وغیرہ کھلی دیکھیں اس پر
اسکول کے منتظمین نے اندر جا کر دیکھا تو اسکول کی لائبریری سے علامہ اقبال
کی تصنیفات غائب تھیں۔ تھانہ صدر سرگودھا کی پولیس نے علامہ اقبال کے
کلام کے پرستار صاحب ذوق چور کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع
کر دی ہے۔

## اندھوں کو پڑھانے والی مشین

ماسکو، ۱۸ اگست روسی خبر رساں ایجنسی تاس نے خبر دی ہے کہ
ایک ایسی بات چیت کرنے والی مشین تیار کر لی گئی ہے جو سگنلوں کے ذریعے
لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ کر اندھوں کو سناتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کوئی کتاب ایک
چھوٹے ڈبے میں رکھ دی جاتی ہے جو موٹر سے چلتا ہے۔ الفاظ کا عکس اس
آئینہ نما ڈبے میں پڑتا ہے جو بجلی کے آٹھ چھوٹے چھوٹے خانوں سے گزر کر
خصوصی سگنل دیتا ہے، اندھا ان سگنلوں کے ذریعے کتاب پڑھ لیتا ہے۔
ایک اندھا ایک منٹ میں تین سو سے چار سو سگنل سن سکتا ہے۔ (رائٹر)

---

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کاروان روانہ ہوا

(آتش)

## ادارہ ثقافت اسلامیہ - لاہور

ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۱۹۵۰ء میں اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ دور حاضر کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق فکر و خیال کی از سر نو تشکیل کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو موجودہ حالات پر کس طرح منطبق کیا جاسکتا ہے اس ادارہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ارتقاء پذیر تصور حیات ہے جس کی بنیادیں اٹل اور ناقابل تغیر ہیں لیکن جن کے تحت اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاق قوانین میں بلحاظ حالات ترمیم اور تبدیلی ہوسکتی ہے۔

ادارہ کے ممتاز اہل قلم اور محققین انہی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہیں ان حضرات کی لکھی ہوئی جو کتابیں شائع کی گئی ہیں ان سے مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارنامے منظر عام پر آگئے ہیں اور اسلامی لٹریچر میں نہایت مفید اور خیال آفریں مطبوعات کا اضافہ ہوا ہے۔

انگریزی و اردو مطبوعات کی فہرست مفت طلب کیجئے

**ماہنامہ ثقافت** بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں ادارہ کے رفقا اور دیگر ممتاز علماء کے علمی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں

سالانہ چندہ آٹھ روپیہ۔ فی پرچہ بارہ آنہ نمونہ مفت

**محمد اشرف ڈار سکرٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔**

# طلوع اسلام

ایک بلند پایہ دینی و علمی مجلہ

جس نے گذشتہ تئیس برس میں ہزار نوجوانان ملت کے دل و دماغ کو قرآنی فکر بصیرت کی روشنی عطا کی اور ان کے قل و نگاہ میں ایک صحیح و صالح انقلاب عقابی روح بیدار کی۔

## ادارہ طلوع اسلام کا سوید سلسلہ پیشکش!

۱۔ **لغات القرآن** (ازعلامہ پرویز)۔ قر معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائ پیڈیا۔ سالہا سال کی فکری کاوشوں دیدہ ریزیوں کا دلآویز شاہکار۔ قیم پندرہ روپے)

۲۔ **انسان نے کیا سوچا؟** (ازعلامہ پرو چارسو صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتا کا نچوڑ ہے اور مصنف کے تبحر علمی کا آئی (روز نامہ نوائے وقت) — قیمت بارہ رو

۳۔ **سلیم کے نام خطوط** (جلد ا دوم و سوم)

علامہ پرویز کا مخصوص دلکشی، چ اور آسان فہم الفاظ تحریر خطوط کا حقیقت کشا سلسلہ قلب سلیم میں ابھر ہوئے سینکڑوں سوالات کا تفصیلی جوا

**ملنے کا پتہ۔ مکتبہ طلوع اس ۲۵ شاہ عالم مارکیٹ لا**

QUOMI ZUBAN Karachi

## مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

**خطبات عبدالحق ۔**

بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لیکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے یہ کتاب انجمن نے دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی تھی مگر وہ ایک مدت سے ختم ہو کر کمیاب ہو چکی ہے ، اور اس کے نسخے بمشکل دستیاب ہوتے ہیں ، چنانچہ ملک میں اس کی بہت مانگ تھی اس بنا پر یہ نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مطبوعہ خطبات کے علاوہ بعد کے خطبات اور بعض تقریریں بھی شامل کردی گئی ہیں ۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے ۔ ۵۵۴ + ۱۲ صفحات ، لکھائی چھپائی خوش نما کاغذ اعلیٰ قسم کا لگایا گیا ہے ۔ قیمت فی جلد ساڑھے چھ روپے ۔

**سب رس ۔**

یہ کتاب سلطان عبد اللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ء اس کا سنہ تصنیف ہے ۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جست و جو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے ۔ شروع میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے ۔

**تلخیص الاردو ۔**

انجمن ترقی اردو کے رسالہ' اردو کے سی سالہ پرچوں سے بہترین مضامین کا بہترین انتخاب ہے جسے انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی کی یادگار میں مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے اور سب کے سب کارآمد اور عمدہ معلومات سے پر ہیں ۔ کتاب کی جان دو مضامین ہیں : (۱) روسو، نطشے اور اقبال از ڈاکٹر عبدالحکیم (۲) نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے ۔

ملنے کا پتہ

**اردو اکیڈیمی سندھ مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی**

# سب کو مارا جگر کے شعروں نے

یہ ترا جمال کاکل، یہ شباب کا زمانہ — دل دشمناں سلامت، دل دوستاں نشانہ

مری زندگی تو گذری ترے ہجر کے سہارے — مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہئے بہانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہدوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں

ترا درد، درد تنہا، مرا غم، غم زمانہ

مرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا — مجھے اے جگر مبارک! یہ شکست فاتحانہ

کسی صورت نمود سوز پنہانی نہیں جاتی — بجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی

چلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر — حضور شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے — کہ آنسو خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

دل کو سکون روح کو آرام آگیا — موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

احباب مجھ سے قطع تعلق کریں جگر — اب آفتاب زیست لب بام آگیا

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس نہ آسکے — کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے

زہے خلوص محبت! کہ حادثات جہاں — مجھے تو کیا، مرے نقش قدم مٹا نہ سکے

نہ اب مسکرانے کو جی چاہتا ہے — نہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

تجھے بھول جانا تو ہے غیر ممکن — مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

تواضع کر اے عشق چند آنسوؤں سے — بہت مسکرانے کو جی چاہتا ہے

زندگی ہے مگر پرائی ہے — مرگ غیرت تری دہائی ہے

جب مسرت قریب آئی ہے — غم نے کیا کیا ہنسی اڑائی ہے

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا — کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

ارے غضب ارے ستم، وہ اک نگاہ سحر فن — جھکے اگر تو بت کدہ، اٹھے اگر تو بت شکن

انجمن ترقی اردو پاکستان کا
پندرہ روزہ
قومی زبان
نگران:۔ بابائے اردو
جلد - - - - ۱۷
شمارہ - - - - ۶-۷
۱۶ ستمبر و یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء



# جگر مرادآبادی

جگر مرادآبادی کی رحلت ایک ایسا سانحہ ہے جو اردو دنیا کو ایک عرصے تک اشک بار رکھے گا۔ ان کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن کی بنا پر کوئی شخص بڑا فن کار اور بڑا انسان کہلایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نصف صدی تک جس انداز سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی، وہ ہماری تاریخ ادب کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اسے ہماری شاعری میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ قدیم دبستان شاعری کے علم بردار ہوتے ہوئے بھی جدید تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے قدیم و جدید میں جو خوشگوار توازن قائم کیا وہ ہماری غزل کی آبرو ہے۔ انہوں نے ایک ایسے پرآشوب زمانے میں جبکہ "جدت" کے نام پر ماضی کے ادب سے رشتہ توڑنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، ادبی روایات کا احترام ہی نہیں تحفظ بھی کیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ قدیم شعری اسالیب اور ادبی روایات سے وابستہ رہ کر بھی اچھا اور صحت مند ادب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جگر قدیم اور جدید شعری دبستانوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان کی زندگی اس صداقت کی تفسیر تھی۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

جگر کی وفات یقیناً ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہمارا ادب ایک عظیم [illegible] اور ہمارا معاشرہ ایک عظیم فرد سے محروم ہو گیا ہے۔

## متحدہ عرب جمہوریہ میں اردو

ان صفحات میں دنیا کے مختلف ممالک میں اردو کی مقبولیت کے بارے میں بارہا لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلے کی تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ عنقریب متحدہ عرب جمہوریہ کی یونی ورسٹیوں میں بھی اردو کے شعبے قائم ہو جائیں گے۔ مشرق وسطیٰ کی خبر رساں ایجنسی کے بیان کے مطابق متحدہ عرب جمہوریہ میں پاکستان کے سفیر خواجہ شہاب الدین نے احمد نجیب ہاشم (وزیر تعلیم عرب جمہوریہ) سے گفتگو کی ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ کی یونی ورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم کئے جائیں تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان گہرے ثقافتی تعلقات قائم ہوں۔ اردو دوستوں کے لئے یہ خبر بڑی مسرت انگیز ہے، اردو اہل مصر کے لئے کوئی اجنبی زبان نہیں، عرب جمہوریہ کی بندرگاہوں پر یہ زبان ایک عرصے سے بڑی مقبول ہے اور اب اس کی باقاعدہ تعلیم و تدریس یقیناً پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ میں بہتر ثقافتی تعلقات قائم کرنے میں بڑی مدد دے گی۔ عربی پاکستان کی تمام یونی ورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی ہے۔ عرب ممالک اس کا جواب اسی طرح دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کریں۔ ہمیں امید ہے کہ خواجہ شہاب الدین اور احمد نجیب ہاشم کی گفتگو کا جلد ہی کوئی عملی نتیجہ منظر عام پر آئے گا۔

## قومی زبان

استنبول اور ترکی کے بعض دوسرے بڑے شہروں میں طلبہ کی طرف سے اس مضمون کے اشتہار چسپاں کئے گئے ہیں کہ ترک باشندوں کو صرف ترکی زبان میں بات چیت کرنی چاہئے۔ استنبول کے گورنر جنرل نے بھی ایک پریس کانفرنس میں اس بات پر زور دیا ہے۔ ایک امریکی اخبار نے ترکیہ میں قومی زبان بولنے کی اس تحریک کو "ترک عوام میں قومیت کا ایک نیا جذبہ ابھرنے" سے تعبیر کیا ہے۔ قومیت کے تعین و تشخص میں زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ترکی میں اس معاملے میں انتہا پسندی سے بھی کام لیا جاتا رہا ہے اور ایک زمانے میں عربی میں اذان تک کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ لیکن انتہا پسندی کی ایسی مثالوں سے قطع نظر یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آزاد قوموں کو اپنی قومی زبان کے بارے میں پوری طرح حساس بلکہ غیرت مند ہونا چاہئے۔ اس معاملہ میں ہم اہل پاکستان بڑے کوتاہ دامن ثابت ہوئے ہیں کہ آزادی کے بعد بھی ہم اپنی قومی زبانوں کا مناسب احترام کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ انگریزی سے ہماری مرعوبیت کم ہونے کی جگہ بڑھتی جا رہی ہے اس کا اندازہ انگریزی طرز کے اسکولوں کی تعداد میں روز بروز اضافے سے ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں حب وطن، قومی غیرت وغیرہ کو کما حقہٗ فروغ نہیں مل سکتا۔ ہم اہل پاکستان ترکوں کے بڑے عقیدتمند ہیں، کاش ہم اپنی قومی زبان کے بارے میں ان کی ایک اچھی اور قابل فخر تحریک سے کچھ سبق حاصل کر سکیں۔

(نوائے وقت، ۹ر ستمبر ۶۰ء)

# یادوں کے چراغ

(گذشتہ سے پیوستہ)

مسٹر بیک بھی ان ہی انگریزوں میں تھے جن کی طرف سر سید نے اپنے لکچر میں اشارہ کیا تھا۔ مسٹر بیک خود بھی کبھی عبا قبا اور ترکی ٹوپی پہن کر کھانے کے ہال میں یا کسی دوسرے موقع پر آ جاتے جس کا مقصد اس لباس کی خوبی ظاہر کرنا تھا۔ دو چار طالب علم جو مولویوں کی صحبت میں اس قسم کا لباس پہننے لگے تھے ان کو دیکھ کر خوش ہوتے اور اس لباس کی تعریف کرتے جو طالب علم جلسوں میں وہ لباس پہن کر آتے جو ڈرل کے لئے تجویز کیا گیا تھا یعنی ریشمی ململ کی اچکن اور عمامہ، تو بہت خوش ہوتے اور ان کو انگریز جنٹلمین اور لیڈیز سے ملاتے اور اس لباس کی تعریف کرتے۔ یونیفارم سے اور خصوصاً اس قسم کے لباس سے جو سر سید نے تجویز کیا تھا قومیت اور قومی اتحاد کی شان نظر آتی تھی اور یہی انگریز نہیں چاہتا تھا۔

کالج جب نیا نیا قائم ہوا تھا تو سید صاحب کا یہ معمول تھا کہ جب صبح کو کالج کی عمارت، باغ وغیرہ دیکھنے آتے تو بچوں کے کمروں میں جا پہنچتے، ان سے باتیں کرتے اور لکھنے پڑھنے کا حال دریافت کرتے اور چہل کی باتیں بھی کرتے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے تھے وہ ان کے اکثر بزرگوں سے واقف تھے اور بہت شفقت فرماتے تھے کبھی کبھی وہ یونین کی عمارت میں ڈی بیٹ (مباحثہ) کے روز آ جاتے اور کسی ایک پارٹی کی طرف سے تقریر بھی کرتے۔ لیکن جب کام کا ہجوم بہت بڑھ گیا تو اس معمول میں فرق آ گیا تاہم وہ عموماً ہر روز شام کو آتے اور تعمیر کا جو کام دن بھر میں ہوتا اس کا معائنہ کرتے رسی یا ٹیپ لے کر ناپتے ایک ایک اینٹ کو دیکھتے اگر تعمیر میں غلطی نظر آتی تو اس کی اصلاح کرتے یا اس حصے کو گرا دیتے اور دوبارہ تعمیر کرنے کی ہدایت کرتے اگر اس میں مغرب کا وقت ہو جاتا تو مسجد میں آ کر طالب علموں کے ساتھ نماز پڑھتے وہ نماز میں رفع یدین کرتے اور آمین بالجہر کہتے بعض اوقات وہ اپنی آواز میں زور سے آمین کہتے تو کچھ لڑکے چونک پڑتے اور بعض اپنی ہنسی مشکل سے ضبط کرتے۔

کالج کی تعمیر کی نگرانی سعید احمد خاں صاحب کے سپرد تھی یہ گڑھ کپتان کے لقب سے مشہور تھے۔ اپنے لباس، رفتار و گفتار اور چال ڈھال میں سب سے نرالے تھے ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ بغیر گالی کے بات نہ کرتے اور اس میں نئی نئی ایجادیں کرتے ان کو گالیاں بکتے وقت کبھی یہ خیال نہ آتا کہ وہ گالیاں دے رہے ہیں۔ خان صاحب کو تصوف سے بھی لگاؤ تھا بعض مرتبہ وہ ہمارے کمروں میں آ جاتے اور صوفیانہ دوہے وغیرہ سناتے۔

سید محمود کی چیف جسٹس (ہائی کورٹ الہ آباد) سے ان بن ہو گئی تھی اور استعفیٰ دے کر علی گڑھ آ گئے تھے ایک بار جو سید صاحب کے پاس گیا تو مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ کوٹھی میں سب سے بڑا کمرہ یہی تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ چیف جسٹس کا جواب لکھ رہے ہیں چیف جسٹس نے ان کے خلاف گورنمنٹ میں دو صفحے کی رپورٹ بھیجی تھی سید محمود نے اس کی تردید میں پانسو صفحے کا جواب لکھا تھا اس میں کبھی کبھی میں شریک ہو جاتا تھا، مثلاً کسی حوالے کی تلاش کرنے میں یا کسی اقتباس کی نقل کرنے میں [illegible]

[illegible] نے اسی زمانے میں تالیف کی، ایک اور اچھی اور مفید تالیف بھی شروع کی اور وہ محمڈن لا تھی۔ اس کے پروف کئی بار میرے سامنے آئے۔ نواب محسن الملک جو اس زمانے میں علی گڑھ آ گئے تھے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا مانگتے تھے کہ یا اللہ محمود کی پنشن نہ ہو، وہ یہ سن کر ہنس دیتے تھے، ممکن ہے دل میں برا مانتے ہوں لیکن محسن الملک کی دعا بے جا تھی۔ چنانچہ جب تک پنشن کے ملنے نہ ملنے کا معاملہ حکومت کے زیر غور رہا یہ محمڈن لا پر کام کرتے رہے مگر جس دن پنشن کے منظور ہونے کی اطلاع آئی کام بند ہو گیا۔

میں روزانہ سہ پہر کو سید محمود کے پاس چلا جاتا جس روز دیر ہو جاتی تو آدمی بھیج کر بلا لیتے۔ رات کے کھانے کے لئے روک لیتے اس طرح کوئی ڈیڑھ سال شب کا کھانا میں سید صاحب اور سید محمود کے ساتھ کھاتا رہا۔ کھانے پر کبھی کبھی ایک آدھ اور بھی شریک ہو جاتے۔ کھانے کی صحبت بھی بہت دلچسپ ہوتی تھی کھانے کے بعد پھر سید صاحب کے ساتھ ان کے کمرے میں چلا جاتا اور مختلف امور اور موضوعات پر گفتگو رہتی۔ سید محمود عالی دماغ شخص تھے۔ ان کا حافظہ بہت زبردست اور معلومات بہت وسیع تھیں۔ خیام اور حافظ کے تو وہ حافظ تھے ان سے کسی موضوع پر گفتگو کیجیے اس میں کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا کر دیتے وہ بہت بے تکلف سادہ مزاج اور درویش صفت شخص تھے ایسا معلوم ہوتا ہے وہ [illegible] پہ گئے تھے۔ کبھی چائے آتی تو ایک پیالی مجھے بھی دیتے میرے زمانے میں چائے کا رواج نہ تھا۔ میں ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتا تو وہ میری جھوٹی چائے پی لیتے اور کہتے "سور المومنین شفاء" گالیاں بھی کبھی کبھی خوب دیتے تھے۔ ایک بار مولانا شبلی سے کہنے لگے مولانا! آپ بہت دنوں سے ادھر نہیں آئے، مولانا نے کہا آپ گالیاں بہت دیتے ہیں آبرو موتی کی یہی آب ہے، آب جاتی رہی تو وہ موتی کچھ بھی نہیں۔ سید محمود نے کہا مولانا میں آدمی کو دیکھ کر گالی دیتا ہوں۔ وہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔ افسوس شراب نے کہیں کا نہ رکھا۔ رات کو جب میں ان کے پاس بیٹھا ہوتا تو کچھ کچھ دیر کے بعد وہ غسل خانے میں جاتے اور پی کے چلے آتے۔

اسکول کے معلمین میں مولوی خلیل احمد صاحب کی وضع بھی نرالی تھی وہ عربی کے استاد تھے۔ چھوٹے قد کے ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ کرتا نظر وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ ان کا کمرہ وہاں تھا جہاں پکی بارک ختم اور کچی بارک شروع ہوتی ہے۔ دونوں کے بیچ میں تھا عربی کے فاضل تھے۔ اسلامی تاریخ اور جغرافیہ پر بھی ان کی نظر تھی اپنے کمرے میں بیٹھے یا لیٹے آنکھوں سے لگائے کتاب پڑھتے رہتے تھے جب کمرے کے سامنے سے کسی کے آنے جانے کی آہٹ سنتے تو کہتے کون؟ کوئی طالب علم یا استاد ہوا تو چپ ہو جاتے اور جو کوئی بیرا یا ملازم ہوتا تو کہتے چلم بھر لاؤ۔ بہت سیدھے سادے شخص تھے تنخواہ ملتی تو چپکے سے ایک طرف دری کے نیچے رکھ دیتے۔ بیرا کچھ نہ کچھ اس میں سے چرا لیتا۔ ایک بار انہوں نے کہیں سے آم منگا اور کمرے میں لا کر رکھے۔ لڑکوں کو معلوم ہوا تو غیر حاضری میں چٹ کر گئے۔ واپس آئے تو دیکھا۔ آم غائب ہیں۔ کہنے لگے۔ خیر آم کھا مضائقہ نہیں گٹھلیاں تو چھوڑ جاتے۔ میں نے یہ آم باغ میں بو کے لئے منگائے تھے۔ کبھی کبھی چھٹیوں کے بعد گھر سے آتے تو بہ سی کھیر یا رساول لاتے اور اپنے بعض طالب علموں کو بھی کھلاتے مجھے اپنے ساتھ فالیز پر لے جاتے۔ چاقو جیب میں رہتا خربو کاٹ کاٹ کر خود بھی کھاتے اور مجھے بھی کھلاتے۔ کھانے شوقین تھے جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عر تھی۔ علی گڑھ آ کر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔ میں خوش میں نے فارسی لی اور اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے صاحب ذو ملے، اردو بیچاری کی اس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں،

ذ تھی۔ مولوی خلیل احمد مجھ سے کہا کرتے عربی پڑھو یہ تمہارے کام آئے گی چنانچہ انہوں نے مجھے الف لیلیٰ پڑھانی شروع کی کہتے تھے اس کی زبان بہت فصیح اور سادہ ہے اور اس میں قسم قسم کے معاملات کا ذکر آتا ہے عربی سے اردو میں اور اردو سے عربی میں ترجمہ بھی کرتا یعنی الف لیلیٰ کا جو سبق پڑھتا اس کی کچھ سطروں کا ترجمہ اردو میں کرتا اور دوسرے روز اس اردو کا ترجمہ عربی میں کرتا۔ صرف و نحو کے قواعد وہ مجھے زبانی لکھوا دیا کرتے تھے، خوب آدمی تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ اسکول سے کالج میں لے لئے گئے وہ اسکول کی گوں کے نہ تھے بعد میں شمس العلماء کا خطاب بھی ملا۔ باتیں کرتے تو ان کے جملے نامکمل ہوتے فعل اکثر ندارد ہوتا تھا۔ اسماء صفات اور حروف ربط سے مطلب ادا کر لیتے۔

سید صاحب مولویوں سے بدگمان تھے اور وہ کالج کی مسجد میں باہر کے مولویوں کو وعظ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، نواب محسن الملک وہ میدان سیاست کے شہسوار اور آتا رچڑھاؤ کے بادشاہ اور بڑے فصیح البیان تھے۔ ایسے لوگوں کو منا پر چا کرا لائے جو سرسید کی تحریک کے مخالف تھے یا اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بدرالدین طیب جی سیاسی اختلاف کی وجہ سے روٹھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب زمانہ قیام بمبئی میں ان سے ملے کالج اور اپنی تعلیمی پالیسی کی طرف توجہ دلائی گلے شکوے ہوئے کالج کے لئے ایک ہزار کا عطیہ لیا اور ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت قبول کرالی۔ سید امیر علی جو سرسید کی تحریک سے ہمیشہ الگ رہے ان کو بھی نواب صاحب نے شیشہ میں اتار لیا۔ کلکتہ میں جو ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہوا اس کی صدارت ان ہی سے کرائی۔ انہی نواب صاحب نے بہت سی فتوحات کیں، اچھے اچھے مولویوں کو انہوں نے شیریں بیانی خوش اخلاقی اور تحریروں سے رام کر لیا تھا اور بعض کو وہ ایجوکیشنل کانفرنس میں ساتھ لئے پھرتے تھے اور ان سے گرم و نرم تقریریں کرائیں۔

یہ سرسید کی وفات کے بعد کی باتیں ہیں۔ لیکن سید کے زمانے میں نواب محسن الملک کو سب سے بڑی فکر مولویوں کی تالیف قلوب کی تھی وہ چاہتے تھے کہ کالج میں کسی مولوی کو لا بٹھائیں، تاکہ مولویوں کی خشونت کم ہو جائے اور ان کے دل نرم پڑ جائیں، کالج پر نظر کرم یہی نظر گرم کی صدت تو دھیمی ہو جائے سرسید کو رضامند کرنا مشکل تھا وہ پیچھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے۔ طرح طرح کے جتن کئے دوسروں کو اپنے ساتھ لا کر سید صاحب پر دباؤ ڈالا آخر رجھا لیا اور مولوی عبداللہ داماد مولانا محمد قاسم بانی دار العلوم دیوبند کا تقرر کالج میں کرا دیا۔ یہ شعبہ دینیات کے ڈین کہلاتے تھے ان کا شمار علماء میں نہ تھا نرے ملا تھے۔ درس نظامیہ کی کتابیں چاٹ رکھی تھیں۔ علم و عقل سے بیزار اور حالات زمانہ سے بے خبر تھے ان کے وعظ بے مغز ہوتے تھے اور ایسی پھر باتیں بیان فرماتے تھے کہ سن کر شرم سے آنکھیں جھک جاتی تھیں وہ "شرع میں کیا شرم" کے قائل تھے۔ اور بڑی بے باکی سے ایسی باتیں کہہ جاتے تھے کہ جنھیں نہ میں زبان پر لا سکتا ہوں اور نہ قلم سے ادا کر سکتا ہوں اگر لکھوں تو یہ کاغذ شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ سال بہ سال ایک چھوٹا سا پوسٹر شائع کیا کرتے تھے جس میں دو چار واہی تباہی باتیں ہوتی تھیں جیسے "جس شخص کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا اس کے جسم کا وہ حصہ نار جہنم کی نذر ہوگا" اس پر دوسرے ارشاد کا اندازہ کر لیجئے۔

میرے زمانے میں بورڈوں کی تعداد کوئی تین سو تھی۔ ہندو طالب علم بھی تھے۔ زیادہ تر ڈے اسکالر تھے شہر سے پڑھنے آتے تھے۔ میرے ہم جماعت بھی کئی ہندو تھے میرے ہم جماعت جنہوں نے بعد میں نام پایا اور مشہور ہوئے تھے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین۔ مولوی حمید الدین۔ مولوی ظفر علی خان، حافظ ولایت اللہ۔ سید محفوظ علی۔ شیخ عبداللہ۔ انٹرنس میں سیٹھ یعقوب حسن میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انٹرنس میں کامیاب ہونے کے بعد [illegible]

جوش ملیح آبادی

# زندگی کا ایک اور ساتھی بچھڑ گیا

اس انیسویں صدی کا نصف اول اردو شاعری کے حق میں غیر معمولی طور پر ساز گار رہا۔ اس لئے کہ اس دوران میں اتنے ممتاز شعراء پیدا ہوئے جس کی اس سے پیشتر کوئی نظیر نہیں ملتی۔ میں اپنے ساتھیوں میں کس کس کے نام گناؤں کس کس پر روؤں اور کس کس کا ماتم کروں۔

صد حیف کہ کبھی جو نام شیشوں کی طرح کانوں میں کھنکتے تھے اب نشتروں کے مانند دل میں کھٹک رہے ہیں۔

میں بدنصیب وہ گونجتی گرجتی راتیں اب کہاں سے لاؤں جب کہ میرے عشرت کدے میں آغا شاعر، آزاد انصاری۔ مجاز لکھنوی، سیماب اکبر آبادی۔ فانی بدایونی۔ اختر شیرانی۔ شاہ دلگیر اکبر آبادی۔ اور جگر مراد آبادی ہنستے بولتے گنگناتے، چہکتے، لہکتے اور بہکتے تھے۔

ان رنگین راتوں میں وہ سب کے سب کس قدر سچ مچ کے جیتے جاگتے انسان نظر آتے تھے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب حباب تھے جو ٹوٹ چکے ہیں محض خواب تھے جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

جو لوگ شعراء کو ان کے نام کلام کی معرفت جانتے ہیں یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جن لوگوں کو ان کی زندگی و ذات سے وابستگی و شیفتگی ہوتی ہے وہ ان کی موت کو کیوں کر محسوس کرتے ہیں۔

میرے پلنے خلوت و جلوت کے گنے چنے دو چار ساتھیوں میں جگر ایک بڑی عجیب شخصیت کے مالک تھے سو وہ بھی مجھ سوختہ جاں سے منہ پھیر کر چلے گئے۔

اکثر انتہائی شرمندگی اور کرب کے ساتھ یہ سوچتا ہوں کہ میں آخر کب تک اپنے ان منہ پھیر پھیر کر جانے والوں کا ماتم کرتا رہوں گا اور میں دے یہاں سے خود منہ پھیر کر چلے جانے والوں میں کیوں اس قدر مجرمانہ دیر لگا رہا ہے اور یقیناً یہ میری عبرت ناک سخت جانی ہے کہ مجھے اس دشمن ادب ایشیا کی سرزمین پر اب تک جلائے ہوئے ہے ؎

جہاں بسمل گہِ درد است، آسائش کہ دید ایں جا
بقدر سخت جانی ہر کسے برخود تپید ایں جا

میں بدبخت کس سے کہوں کہ راتوں کے اندھیرے میں کتنے بچھڑے ہوئے کے چہرے میرا تعاقب کیا کرتے ہیں۔ ہائے ان چہروں میں اب میرے جگر کا چہرہ بھی شامل ہو کر مجھے اپنی جانب پکار رہا ہے ؎

یاں جیسی دھوپ ہے گلابی سایا
رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے بزم ارواح
آیا۔ یاران رفتہ! آیا۔ آیا

(مرحوم جوش)

---

ڈاکٹر شوکت سبزواری

# بزمِ ادب

## (۲)

(بسلسلہ گذشتہ)

"عربی میں الف فتح کے کھینچنے (اشباع) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بالذات ساکن ہے۔ متحرک الف کو ہمزہ کہتے ہیں اس پر جزم اور تشدید نہیں آتی"

الف کو اشباع فتحہ سے تعبیر کرنے کا مفہوم ہے الف کو اشباع فتحہ سے موسوم کرنا عربی میں الف کو اشباع فتحہ سے موسوم نہیں کرتے۔ عربی زبان کے کسی عالم نے الف کو اشباع فتحہ نہیں کہا۔ الف اشباع فتحہ کی پیداوار ہے وہ دو فتحوں کی برابر ہے (َ + َ = ا) 'بَ' کو اگر بقدر ایک فتحہ کے اور کھینچیں تو 'با' ہوگا اس لئے عربی زبان کے قواعد دان اور نحوی الف کو "اُخت فتحہ" (زبر کی بہن) کہتے ہیں۔

الف الاشباع البتہ الف کی ایک قسم ہے جسے الف المدبھی کہا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے فتحہ کی علامت ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا ماقبل مفتوح ہے جیسے خاتام (بجائے خاتَم)۔

الف کو اشباع فتحہ قرار دینا بھی درست نہیں۔ فتحہ کا اشباع 'الف' (اسم) نہیں 'ا' (مسمیٰ) ہے۔

"بالذات ساکن ہے" کا مطلب ہے کہ اصل وذات کے لحاظ سے ساکن ہے کسی اور لحاظ سے متحرک۔ عربی گرامر میں 'ا' کبھی اور کسی لحاظ سے متحرک نہیں ہوتا اس لئے بالذات کی بجائے "ہمیشہ ساکن ہوتا ہے" زیادہ صحیح اور واضح تھا۔

متحرک الف کو عربی میں ہمزہ کہتے ہی نہیں لکھتے بھی ہیں۔ وسط کلمے کی حد تک تو عربی اور اردو یکساں ہیں۔ دونوں زبانوں میں وسط کلمے کا متحرک الف ہمزہ ہے اور ہمزہ سے لکھا جاتا ہے، جیسے جرأت، مسائل (عربی نیز اردو) سَئَلَ، سئِمَ (عربی) ہوئے، تائی، بھلائی، جنوائی (اردو) البتہ شروع کلمے کا متحرک 'ا' اردو میں الف ہے، الف سے لکھا جاتا ہے عربی میں ہمزہ ہے، ہمزہ سے لکھا جاتا ہے۔ اس طور پر 'أ' مصر کے مطبوعہ مصاحف میں، جو مصحف عثمان کی رسم تحریر کے مطابق چھپے ہیں، ہمزہ متحرک الفات کے اوپر یا نیچے ہمزہ بنا ہے۔ مثلاً أنزل الیک۔ ہمزہ کا یہ انداز تحریر عربی میں عام ہے اس لئے عرب لغوی الف کو حامل ہمزہ کہتے ہیں مشہور لغوی جیب النطون سلمونی لکھتا ہے:۔

*The 'ا' is often only a seat of 'ء' Hamza.*

خان صاحب کے اس جملے سے، "عربی میں متحرک الف کو ہمزہ کہتے ہیں" حسب ذیل چار باتیں مستفاد ہوئیں:۔

۱۔ متحرک الف عربی میں ہمزہ ہے لیکن الف ضبط کیا جاتا ہے۔
۲۔ اردو میں متحرک الف ہمیشہ الف سمجھا جاتا ہے۔
۳۔ عربی میں متحرک الف اور ہمزہ دونوں ایک ہیں۔
۴۔ ہمزہ ساکن نہیں ہوتا۔

یہ چاروں باتیں غلط ہیں۔ عربی میں متحرک الف ہمزہ ضبط کیا جاتا ہے اردو میں ایسے متحرک الف بھی ہیں جو ہمزہ سے لکھے گئے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں ان مفروضوں کی وضاحت کر چکا ہوں۔

صوتی لحاظ سے متحرک الف اندک کی آواز ہے جیسے اَب، اُس، اِن وغیرہ۔ یہ حرف علت ہے۔ ہمزہ (ء) عربی (نیز فینیقی و عبرانی) صوتیہ (phoneme) ہے۔ یہ حرف صحیح ہے مخرج اس کا حلق ہے 'اَ' اور 'ء' جدا جدا اور مختلف المخرج آوازیں ہیں۔ 'ا' کا جب ہم تلفظ کرتے ہیں تو منہ کھلا رہتا ہے۔ حنجرہ (LARYNX) کے آخری حصے میں خفیف سا ارتعاش ہوتا ہے اور ہوا سر سرا کر نکل جاتی ہے (ء) کے تلفظ میں آواز حلق میں کسی قدر رک کر اور جھٹکے سے نکلتی ہے (ء) جب ساکن ہوتا ہے تو یہ جھٹکا (ضغط) زیادہ واضح طور سے محسوس ہوتا ہے۔ شان صاحب نے ان آوازوں کے نازک فرق کو محسوس نہیں کیا اور وہ بات لکھ گئے جو کبھی انہوں نے مکتب میں سنی تھی۔

ہمزہ ساکن بھی ہوتا ہے، اس کا اور الف ساکن کا فرق بیان کر چکا ہوں۔ یہ غلط ہے کہ الف پر جزم نہیں آتا۔ جزم سکون کی علامت ہے اور الف ساکن ہوتا ہے (عربی میں ساکن ہی ہوتا ہے) پھر اس پر جزم کیوں نہ آئے؟ دراصل بات یہ ہے کہ عربی الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اس لئے اس پر سکون کی علامت غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اردو میں درمیان اور آخر کلمے میں ساکن ہوتا ہے، اول کلمے میں متحرک۔ اس لئے اوّل کلمے میں حرکات دے کر تلفظ کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ درمیان اور آخر کلمے میں اس کی ضرورت پیش نہیں آتی "جزم نہیں آتا" کی بجائے صحت سے زیادہ قریب یہ تھا کہ کہا جاتا "الف پر جزم نہیں دیا جاتا" شان صاحب کو شاید اس کا علم نہیں کہ مصر کے مطبوعہ مصاحف میں الفات سب کے سب جزم سے ضبط کئے گئے ہیں۔ اس طور پر:۔

تظنون باللہ الظنونا۟

" اردو املا میں اعراب (= زیر، زبر، پیش) و دیگر حروف علت (و، ی) کے ساتھ مل کر دس مختلف علتوں کے لئے مستعمل ہے۔"

اوپر الف متحرک کو مصوتیات کی مدد سے حرف صحیح صامت " بتایا گیا تھا .. - - - - - - - - -

.. .. - - - یہاں فرماتے ہیں الف زیر، زبر، پیش کے ساتھ مل کر تین علتوں کے لئے مستعمل ہے۔ اور ان کی تین مثالیں پیش فرماتے ہیں۔

اَ (مفتوح جیسے اَب) اِ (مکسور جیسے اِس) اُ (مضموم جیسے اُس)۔

بہت خوب! الف متحرک حرف صحیح ہے لیکن زیر، زبر، پیش کے ساتھ مل کر حرف علت ہو جاتا ہے۔ اَ، اِ، اُ کے سوا وہ کون سا متحرک الف ہے جسے شان صاحب حرف صحیح بتاتے ہیں۔

اعراب اور حرکت میں بڑا فرق ہے۔ اعراب کی جگہ 'حرکات چاہیئے۔'

"اعراب و دیگر حروف علت" سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر، زبر، پیش حروف علت ہیں حالانکہ یہ حرکتیں ہیں۔ حروف علت میں سے 'ا' کو حذف کرنے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ آ (ممدودہ) دو الفوں کے برابر ہے۔ یہ (آ) "اعراب و دیگر حروف علت (و، ی)" کی ترکیب سے نہیں بنا۔ اَ (مفتوح) اور 'ا' (ساکن) کا مجموعہ ہے۔ اس کو شامل کرنے کے لئے شان صاحب کو اپنی عبارت میں یوں ترمیم کرنی پڑے گی:۔

" اردو املا میں حرکات ثلاثہ (= زیر، زبر، پیش) 'ا' اور دیگر علل (ی، و) کے ساتھ مل کر درج ذیل دس علتوں کے لئے مستعمل ہے"

اس صورت میں "دیگر" کا لفظ زائد نہ ہوگا۔

" آ، ا (ممدود یا مع مد برابر ہے دو الفوں کے جیسے

کبھی ا ا بھی لکھتے ہیں جیسے ا ا میں، نیز آخر کلمہ حرف ماقبل سے مل کر ہی قائمہ رکھتا ہے۔ مثال اچھا، بجڑا۔

۲ (ناگری आ) بے شک اردو فارسی میں الف ممدودہ ہے۔ (عربی میں الف ممدودہ 'اء' ہے) اور دو الفوں کی برابر ہے لیکن 'ما' کیا بلا ہے؟ اس کا الف 'لا' کے الف کی طرح سادہ اور بسیط ہے۔ وہ ممدود (دو الفون کی برابر) کیسے ہوا؟ عربی ماءٌ (پانی) کا 'ا' البتہ ممدود ہے لیکن اس کے بعد ہمزہ ہے اور وہ صرف اس صورت میں ممدود ہو سکتا ہے جب ہمزہ برقرار رہے۔ شان صاحب نے اسے حذف کر دیا اس لئے عربی یا اردو کسی زبان کے اصول و قواعد کے لحاظ سے بھی 'ما' کا الف ممدود نہیں۔

شان صاحب کو اس کا علم تو نہ ہوگا کہ آ (ممدودہ) کو مصر جدید کے عالم اور رقاری مد یا چھوٹے بڑے دو الفوں سے نہیں لکھتے وہ اسے ہمزہ (ء) اور الف (ا) سے لکھتے ہیں۔ محمد علی خلف الحسینی اور مصر کے چند بڑے بڑے عالم کہتے ہیں :-

ولا تستعمل هذه العلامة للدلالة على الف محذوفة بعد الف مكتوبة مثل آمنوا كما وضع غلطًا فی کثیر من المصاحف بل تکتب 'ءامنوا' بهمزة والف بعدها

ترجمہ :- "یہ علامت (یعنی مد) اس موقع پر استعمال نہ کی جائے جہاں دو الف ہوں۔ ایک حذف کر دیا گیا ہو، دوسرا لکھا جا رہا ہو جیسے آمنوا۔ اکثر مطبوعہ مصاحف میں یہ علامت غلط استعمال ہوئی ہے۔ اس قسم کے الف کو ہمزہ اور الف سے لکھا جائے [illegible] ءامنوا"

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ صوتی اعتبار سے اردو فارسی آ (سنسکرت आ) عربی 'مَدّا' سے مختلف ہے۔ اردو فارسی آ مخرج ـــ لیکن انگریزی ā اور سنسکرت आ کی طرح طویل یعنی LONG

یا आ ā۔ حرف علت ہے جسے لسانیات میں اولین یا بنیادی علت قرار دیا گیا ہے۔ اس کا تلفظ کرتے وقت منہ پوری طرح کھلا رہتا ہے اور دونوں ہونٹوں کے درمیان کا فاصلہ نسبتہً زیادہ ہوتا ہے۔ عربی 'ءا' ہمزہ اور الف سے مرکب ہے جن میں سے ہمزہ حلقی وقفیہ (GLOTTAL STOP) ہے اور الف حرف علت صغیر (short vowel) ڈاکٹر چیٹرجی 'ءا' کو "ہمزہ الف" کہتے ہیں۔

"آخر کلمہ حرف ماقبل سے مل کر ہی قائمہ رکھتا ہے" یہ عبارت بہت الجھی ہوئی ہے۔ شان صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آخر کلمے کا حرف 'ا' قبل کی حرکت سے مل کر کھنچ جاتا ہے اور ممدود ہو جاتا ہے۔ اس کی تائید میں انہوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں، اچھا، بجڑا۔

میرے نزدیک آج تک شاید ہی کسی کے قلم سے اتنی غلط بات تراوش پا کر ایک موقر جریدے میں اشاعت پذیر ہوئی ہو۔ 'اچھا' اور 'برا' کے آخر کا 'ا' ممدود (یا مع مد) نہیں اور نہ دو الفوں کی برابر ہے۔ یہ مقصور و بسیط ہے اور دو فتحوں کی برابر ہے۔ جو فتحہ کے کھینچنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہی الف ہے جس کی بابت شان صاحب لکھ چکے ہیں: "آخر میں ہمیشہ ساکن اور حرف علت یا صائتہ"۔ آخر کلمے کا الف اگر ممدود ہو تو پھر مقصور الف کہاں اور کون سا ہوگا؟ اس کے علاوہ آخر کلمے کے الف کی کیا خصوصیت ہے، یہ الف تو وسط کلمے میں بھی ہوتا ہے۔ کیا وسط کلمے کے الف کو بھی شان صاحب حرف قبل (یا ماقبل حرکت) سے ملاتے اور اسے ممدود بتاتے ہیں؟ 'ساتھ' اور 'رات' کا الف کیا شان صاحب کے نزدیک حرف ماقبل سے مل کر ہی قائمہ رکھتا ہے؟

شان صاحب انگریزی میں مستند [illegible] میں لکھے ہیں۔ انگریزی دیوناگری میں BURĀ (ناگری बुरा) طویل ā (ناگری طویل आ کی ماترا) سے لکھا جاتا [illegible]۔

اسے محدود سمجھے۔ اور یہ نہ سوچا کہ عربی حروف و اصطلاحات کو وہ انگریزی حروف و اصطلاحات کے قالب میں ڈھال رہے ہیں۔

'حرف ماقبل سے مل کر' بے معنی بات ہے حرکت ماقبل کہنا چاہئے۔

اس کے بعد شان صاحب نے 'او' اور 'اے' کے مرکبات کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے بڑی بڑی بوالعجبیاں سرزد ہوئی ہیں۔ 'اوچھا' کے 'و' کو وہ مجہول بتاتے ہیں اور 'اَوْر' کے 'و' کو ساکن۔ 'ایک' کی 'ی' ان کے نزدیک مجہول ہے اور 'ایسا' کی 'ی' ساکن۔ 'و' مجہول اور 'ے' مجہول مشہور اصطلاحیں ہیں۔ وہ تمام واوات اور یاآت مجہول ہیں جن کا اشباع نہیں ہوتا اور جنہیں کھینچ کر نہیں پڑھا جاتا۔ یہ سب ساکن ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کو مجہول اور دوسرے کو ساکن کہنا غلط بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ 'اوچھا' کے 'و' کو مجہول بالضم اور 'اور' کے 'و' کو مجہول بالفتح۔ 'ایک' کی 'ے' کو مجہول بالکسر اور 'ایسا' کی 'ے' مجہول بالفتح کہتے تو درست ہوتا سمجھنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہ آتی۔

'و' معروف اور 'ی' معروف کو مضموم و مکسور کہنے کی ضرورت نہیں۔ 'و' معروف سے پہلے ضمہ ہوگا اور 'ی' معروف سے پہلے کسرہ۔ ان سے پہلے اور کوئی حرکت نہ ہوگی۔

"کبھی تنوین کے ساتھ حرف صحیح 'ن' کی آواز شامل رکھتا ہے (عربی کلمات کے ساتھ مخصوص) جیسے فوراً حکماً، قطعاً (مع دو زبر یا فتحتین) نسلاً بعد نسلٍ (مع دو زیر یا کسرتین) کبھی اردو کے موضوعہ کلمات میں نخالی انداز؟ (شاذ، غلط العام) ضمتین کے ساتھ بشکل ہمزہ مثلِ داءٌ دواءٌ (اردو میں شاذ)"

اس پوری عبارت میں ایک بات بھی صحیح نہیں بعض بعض باتیں صد درجہ مضحکہ خیز ہیں۔

'کبھی' کا مفہوم ہے 'گاہے'۔ یعنی گاہے الف مع تنوین 'ن' کی آواز دیتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ "الف مع تنوین" ہمیشہ 'ن' کی آواز دے گا۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ "الف تنوین کے ساتھ 'ن' کی آواز شامل رکھتا ہے" الف یہاں خاموش ہے۔ یہ تنوین کی آواز ہے چنانچہ الف ہو یا نہ ہو تنہا تنوین سے 'ن' کی آواز نکلتی ہے۔ جیسے مثلِ داءٌ دواءٌ (اس میں ہمزہ ہے) مثل علمٌ عالمٌ (اس میں میم ہے) نیابۃً نسبۃً، قدرۃً وغیرہ الفاظ اردو میں عام طور سے مستعمل ہیں اور ان کا صحیح املا بغیر الف ہے۔ الف مع تنوین اور 'ۃ' مع تنوین کی صورت میں بحالت وقف 'ن' کی آواز غائب ہو جاتی ہے۔ الف یا ۃ کی آواز باقی رہ جاتی ہے، اس لئے اس تنوین کو 'الف' اور 'ۃ' سے لکھتے ہیں جیسے مثلاً حالاً، اصل میں اصلاً اور رہ گئے اور نیابۃً نسبۃً اصل میں نیابۃً اور نسبۃً۔

'تنوین' کہنا بھی صحیح نہیں۔ دو زبر کہئے، اس لئے کہ الف صرف دو زبر کے ساتھ آتا ہے۔ دو زیر اور دو پیش کے ساتھ الف نہیں لکھتے اوپر کی دو مثالوں میں داءٍ، دواءٌ، علمٍ، عالمٌ میں دو زیر اور دو پیش الف کے بغیر استعمال ہوئے ہیں۔ شان صاحب غلطی سے دو زبر کی جگہ تنوین لکھ گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد نسلٍ کو انہیں بعد نسلاً (الف سے) لکھنا پڑا اور ایک کے بعد دوسری غلطی ہوئی (تختی پہ تختی تختی پہ دانہ) لیکن ضمتین کو وہ نہ نباہ سکے اور دواءٌ کو دواءًا (الف سے) لکھنے کی ہمت نہ پڑی اور شاید اس مجبوری سے کہ وہ دو پیش والی تنوین کو الف کے بغیر لکھ رہے ہیں اس کے ساتھ کی دو زیر والی تنوین (داءٍ) کو بھی الف کے بغیر لکھا (حالانکہ اس سے پہلے نسلٍ لکھ چکے تھے) لیکن بشکل ہمزہ کہہ کر دل بہلا لیا کہ آخر ہمزہ بھی تو الف ہی کا بھائی ہے الف نہ ہوا ہمزہ سہی۔ مثل علیمٌ عالمٌ والا جملہ انہوں نے نہیں سنا تھا ورنہ بشکل

ہمزہ والا مثلاً نہ تراشتے اور داءٌ، داعٌ، علم، عالمٌ ان تمام کلمات کو ا سے لکھتے۔ اس طرح داءٗا، دواعٗا، علماً، عالماً، اور پھر اصرار کرتے کہ یہ سب کلمے الف سے ہیں۔ ان کے لغت (اردو بورڈ کے مجوزہ جامع لغت) میں الف سے لکھے جائیں۔

"اردو کے موضوعہ کلمات" کا "موضوعہ" شان صاحب کے گھر کا لفظ ہے۔ حضرات اہل اردو اس موقع کے لئے "وضع کردہ" کہیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ "انداز" "نہ موضوعہ کلمات میں سے ہے نہ وضع کردہ کلمات میں سے۔ یہ فارسی لفظ انداز (= تخمین، اٹکل، قیاس) کی ایک طرح سے تعریب یا فارسی لفظ کا عربی قاعدے سے استعمال ہے۔

"صوتیات کے لحاظ سے جدید اردو تلفظ میں بعض
حروف صحیحہ یعنی ح، ع، ل، ہ کے شروع
میں آکر تین مزید علل پیدا کرتا ہے۔ مثال:۔
(۱) احاطہ، احسان، احتیاط، اعلان، اعتنا
اعتذار، لاالہ، الی الآن، اہانت (مکسور
مخفف راجع بیائے مجہول) (۲) احد (مضموم
مخفف راجع بہ واوِ مجہول) (۳) اہل، احسن،
احقر (مفتوح راجع بیائے ساکن) یہ املائی مسلّمہ
و مذکورہ بالا دس علتوں سے زائد مگر عام تلفظ میں
موجود ہیں۔"

یہاں شان صاحب پھر ایک غلط فہمی ـــ اور بڑی غلط فہمی ـــ کا شکار ہوئے۔ اردو میں عام طور سے 'ح' اور 'ہ' سے پہلے حرف کی حرکت (زبر، زیر، پیش) کا تلفظ اردو کے معہود تلفظ سے کسی قدر مختلف انداز سے کیا جاتا ہے۔ الف کی خصوصیت نہیں، خصوصیت ان حروف (ح، ہ) کی ہے۔ ان حروف سے پہلے جو حرف بھی ہو اس کے زبر کا تلفظ زبر اور یائے مجہول الفتح کے درمیان ہوگا جیسے احمد، محمود، بہروز وغیرہ۔ زیر کا تلفظ زیر اور یائے مجہول بکسر کے درمیان ہوگا جیسے بہتر، بہتر وغیرہ اور پیش کا تلفظ پیش اور واوِ مجہول بضم کے درمیان یا بین بین جیسے محمد، جُہد وغیرہ۔ شان صاحب نے ایک طرف 'ح'، 'ہ' کے اس مخصوص انداز تلفظ کا 'ا' سے جوڑ لگا کر تین مزید علل پیدا کر لیں اور یہ نہ سوچا کہ اگر یہ مذکورہ بالا دس علتوں کے علاوہ ہیں تو ان کی تخلیق میں الف کو کیا دخل؟ نہ وہ ان کی ماں ہے نہ باپ۔ ان کے جنم داتا 'ح' اور 'ہ' ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے 'ع' اور 'ل' کو 'ح' اور 'ہ' کی صف میں لا کھڑا کیا اور بے سوچے سمجھے اعلان، اعتذار، اِلٰہ وغیرہ مثالیں اپنے خیال کی تائید میں پیش کر دیں۔ وہ خود ان الفاظ کا باشعور تلفظ کر کے دیکھ لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان کا اردو تلفظ عربی تلفظ کے مطابق ہے۔ ان الفاظ میں 'ا' مکسور ضرور ہے لیکن راجع بیائے مجہول نہیں۔

"بعض عربی الفاظ کے املا میں ساکت مثال: بالکل
بالفعل ..... الخ"

'بالکل' وغیرہ، کلمات کا الف تلفظ میں ساکت (خاموش) ہے اور املا یعنی تحریر میں ناطق (گویا)۔ 'بالکل' (الف سے) لکھ کر ہم 'بلکل' (الف کے بغیر) پڑھتے ہیں۔ شان صاحب املا یعنی تحریر میں خاموش بتاتے ہیں۔ یہ ان کی بھول ہے۔ "بعض عربی الفاظ" میں ابہام ہے۔ عربی آلہ تعریف "ال" کا 'ا' کہئے۔ یہ شروع کلمے میں گویا ہوتا ہے۔ وصل کی صورت میں خاموش یعنی جب اس سے پہلے کوئی حرف یا کلمہ آتا ہے تو الف کا تلفظ نہیں ہوتا۔ جیسے: بالفعل، علی الدوام، رسم الخط (یہاں 'ا' کا تلفظ نہیں ہوا) العلم، الفرقان، القاموس (یہاں 'ا' کا تلفظ ہوا ہے)۔

"کبھی ساقط مگر مفروض اور تلفظ میں موجود جیسے
زکوٰۃ، ہٰذا، طغریٰ، تلفظ زکات، ہاذا
طغرا"

'زکوٰۃ' اور 'ہٰذا' میں الف تحریر میں موجود ہے چھوٹی کھڑی لکیر کی شکل

ہیں۔ اسے ساقط اور مفروض نہیں کہہ سکتے۔ اس الف میں اور اعلیٰ، ادنیٰ یا الٰہی کے الف میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں بشکل قصیر ہیں۔ دونوں عام خط سے چھوٹے ہیں۔ دونوں نصف الف ہیں اس کے باوجود شان صاحب زکوٰۃ اور ہٰذا کے الف کو ساقط بتاتے ہیں اور الٰہی وغیرہ کلمات کے الف کو موجود بشکل قصیر۔ ملاحظہ فرمائیں:-

"کبھی بعض حروف کے اوپر بشکل قصیر (عام خط سے چھوٹا یا نصف الف) اور الف مفتوحہ کا ہم آواز جیسے اعلیٰ۔ ادنیٰ۔ لیلیٰ۔ عیسیٰ۔ الٰہی"

طغرا کی بابت پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کا املا عربی اور فارسی میں جہاں یہ لفظ اپنا لیا گیا ہے طغرا (الف سے) ہے۔

الف مفتوحہ اس الف کو کہتے ہیں جس پر فتحہ (زبر) ہو۔ شان صاحب اعلیٰ، ادنیٰ وغیرہ کلمات کے آخری الف (نصف الف) کو جو ساکن ہے الف مفتوحہ کا ہم آواز بتاتے ہیں،

"کبھی تشدید کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے اور حرف مشدد کے ساتھ مفتوح جیسے اللّٰہ۔ حتّٰی، منقّٰی"

زکوٰۃ، اعلیٰ، حتّٰی، وغیرہ کلمات کے الف تلفظ اور کتابت میں یکساں ہیں۔ سب بشکل قصیر لکھے گئے ہیں اور اس اعتبار سے گویا نصف الف ہیں اور ان کا تلفظ ایک عام 'ا' کی طرح ہوتا ہے یعنی دو فتحوں کی برابر ان کو کھینچا گیا ہے۔ ان کی جدا جدا تین قسمیں قرار دینا بوالعجبی ہے۔ ان الفوں کا طرز املا بتانا مقصود تھا تو کہا جاتا:-

کبھی 'ا' عربی الفاظ میں ایک قط کی کھڑی لکیر ہوتا ہے جو کسی حرف کے اوپر بنا دیا جاتا ہے جیسے ہٰذا، الٰہی، اللّٰہ۔ لیکن یہ 'ا' زیادہ تر 'و' اور 'ی' کے اوپر ہوتا ہے اور اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ 'و' یا 'ی' کا بدل ہے مثالیں:-

زکوٰۃ، حیوٰۃ (وسط کلمے میں) اولیٰ، اعلیٰ تقویٰ، دعویٰ (آخر کلمے میں)۔

"حرف مشدد کے ساتھ مفتوح" بے معنی بات ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں، یہ الف ساکن ہے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ

## مشرقی پنجاب میں اردو

(بسلسلہ صـ۱۹ـ)

اردو پر جو مصیبت آئی ہے یہ تو آپ لوگوں ہی کی لائی ہوئی ہے آپ نے پنجابی اور سکھ صوبے کی حمایت کی اس لئے کہ آپ ہندو اور ہندی کے خلاف اپنی دشمنی کا مظاہرہ کر سکیں۔ ہندی کو تو نقصان ہوا ہی ہے ساتھ ہی اردو بھی ختم ہو گئی۔ معاصر کے یہ الفاظ خاص غور کے محتاج ہیں، "چار لاکھ ناگا اپنا مسئلہ حل کر لیں مگر اردو کے کروڑوں حامی اپنا مسئلہ حل نہ کر سکیں"۔ کیا ان الفاظ میں "اردو کے کروڑوں حامیوں سے یہ کہنا مقصود ہے کہ اپنا مسئلہ حل کرانے کے لئے جو حربہ ناگوں نے استعمال کیا ہے وہی یہ بھی کریں لیکن وہ اردو کے کروڑوں حامی ہیں کہاں؟ ہوتے تو اس کو پھانسی کیوں ملتی۔ اردو تو پنجاب، دلی، اتر پردیش اور حیدرآباد تک محدود ہے۔ باقی صوبوں کے مسلمانوں کی بھاشا اردو نہیں ہے اور اسی لئے اس کا کچھ بنا نہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی

# حرفِ چند

اردو ادب کی تشکیل نو کا سلسلہ جنوری ۷۰ء کے پرچے میں حضرت رفیق خاور نے شروع کیا۔ صاحب موصوف کا خلوص اور شوق ان کے طویل مضمون سے نمایاں ہے، وہ اردو ادب کو ایک دوراہے پر کھڑا دیکھ رہے ہیں وہ اس کا غدر سے لے کر اب تک کا حال بیان کرتے ہیں اس وقت کے لوگوں کی خامیوں پر نشتر چلاتے ہیں۔ ترقی نہ ہونے کے اسباب بتاتے ہیں۔ نظم، نثر، افسانہ، سب سے زیادہ تنقید کی کمزوریوں کو واضح کرتے ہیں اور جدید ادبا کو اک دم سے کھڑے ہو جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس مضمون سے تشکیل نو کرنے والے ادیب کا ایک تصور نکلتا ہے وہ کلوسس کے ایک عظیم بت کی طرح کی کوئی چیز ہوگا جس کا ایک قدم ایک راہ پر اور دوسرا دوسری راہ پر ہوگا تمام علوم، تمام زبانیں اس کے پیٹ میں اتری ہوئی ہوں گی اور ایک ایک قدم پر وہ صدیوں آگے بڑھتا جائے گا۔ پروفیسر حمید احمد خان اس عظیم بت پر تیر چلاتے ہیں۔ دوراہا ان کے تیر کی زد میں آتا ہے۔ مغرب کی راہ کٹ جاتی ہے۔ عظیم بت کو ایک ہی راہ پر قدم رکھنا چاہئے۔ پھر نواب جعفر علی خان اثر اپنی لکھنوی کمان سنبھالتے ہیں۔ بہت سی انگریزی درسی کتابوں کی اصطلاحوں کے پھندے اس کمان میں لٹک رہے ہیں مگر تیر کا نشانہ وہی صحت محاورہ اور زبان ہے جس پر لکھنؤ والے مرتے مگر جس کا خاور صاحب کا عظیم بت ایک حد تک منکر ہے۔ ان کے بعد جعفر طاہر صاحب تشریف لاتے ہیں اور پاکستانی زبانوں کو نشانہ بنا کر اپنا تیر مار کر الگ ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایم اسلم صاحب عظیم بت کے اس حصے پر چوٹ دیتے ہیں جس پر افسانے کا نام لکھا ہوا ہے۔ ایم اسلم کا تیر کہاں لگا یہ سمجھ میں نہیں آتا اور کیسے سمجھ میں آئے جبکہ ان کی اصلاحی ناولیں بھی، سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر جا رہی ہیں۔ پھر ایک گمنام تیر "سخن در سخن" کی سرخی لئے ہوئے سارے گلشن کو سمجھوتے آنکھ کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ کچھ حضرات انچ انچ بھر کے تیر اسی طرح چلاتے ہیں جس طرح لیلیپُٹ کے رہنے والوں نے گلیور پر چلائے تھے جن کا اثر بھی ویسا ہی ہے جیسے کہ لیلیپُٹ والوں کے تیروں کا گلیور پر ہوا تھا۔ راجندر ناتھ شیدا "صدی را تیز تر می خواں" کا نعرہ لگاتے ہوئے بڑے زوروں میں سامنے آتے ہیں ان کے ہاتھ میں تیر نہیں تلوار ہے مگر یہ بنیادی محسوسات میں فاضل مقالہ نگار کے ہم نوا ہیں گو چہ تفصیلات میں کہیں کہیں اختلاف کرتے ہیں یعنی ان کی تیغ زنی حکومت کے لئے نہیں بلکہ کرتب دکھلانے کے لئے ہے۔ پھر تیر فگنی شروع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مومن سنگھ دیوانہ اپنا نیا تیر مارتے ہیں جو نشانے پر بیٹھ ہی تو جاتا ہے۔ لکچرر گوپی چند نارنگ تنقید کو زد میں لاتے ہیں۔ عظیم بت کے تنقید والے حصے سے تیر پار کر دیتے ہیں۔ ایک کوئی احسن فاروقی جنون میں کیا کیا کچھ بک جاتا ہے، نہ اس کے پاس تیر ہے نہ کمان بس بے ڈھنگی زبان سے یہ کہتا نکل جاتا ہے کہ یوں کمان اٹھتی ہے اور یوں تیر چلتا ہے وہ تو کہئے ساتھ ہی ساتھ پروفیسر ابو محمد سحر لگے ہوئے ہیں جو اپنا تیر عظیم بت کے دل کے پار اتار دیتے ہیں۔ عابد رضا بیدار اور پروفیسر سید شبیر علی کاظمی بھی بڑے بڑے اور کاری تیر چلاتے ہیں مگر اس بات کا دھیان رکھتے ہوئے کہ عظیم بت کہیں زخمی نہ ہو جائے۔ جلیل حشمی، سید امیر حسن نورانی ندوی اور رجب صدیقی سے پہلے تیر اندازوں کی قطار سامنے آتی ہے اور اپنی بوچھار چھوڑ کر نکل جاتی ہے۔ سب سے آخر میں حضرت من موہن تلخ تشریف لاتے ہیں ان کے ہاتھ میں رام دھنش ہے اور راون کے مکھڑے پر وہ اس تلخ روئی سے تیر چلاتے ہیں کہ ان کا کارنامہ پورے رزمیہ کا بہت ہی زور دار خاتمہ نظر آتا ہے۔ غرض جنوری سے لے کر جولائی تک یہ سب وہی غدر۔ کون جیتا کون ہارا، یہ سب آج کل کی معرکہ آرائی میں نہیں ہوتا آج کل جو جیتا سو ہارا اور ہارا سو مرا۔ مگر یہاں نہ کوئی جیتا نہ کوئی ہارا اور نہ کوئی مرا اکثریت کی رائے سے تشکیل نو

ہونا چاہئے۔ چناں چہ ہو ضرور ہو، ہوگی یا نہیں اس کا خدا حافظ ہے۔ ان شاء اللہ ہوگی۔ مگر ان شاء اللہ جدید تجار اور آفیشل کا محاورہ ہے جس کے معنے وہ نہیں رہے جو پرانے مسلمانوں کے نزدیک تھے۔

چھ مہینے یہ سب ہوتا رہا۔ مگر یہ سب ہوا کیا؟ ایک فرنٹلی میچ جس کا نتیجہ نہ کپ نہ شیلڈ۔ ایک پارٹی ہی ہو جاتی اور ایک ایک چائے کی پیالی ہی مل جاتی۔ مگر کچھ تو ہوا ضرور۔ جدید تنقیدی زبان میں پرانی خطوط نویسی ہوئی یعنی "یہاں سب خیر و عافیت ہے اور آپ کی خیر و عافیت درگاہ خداوند کریم سے نیک مطلوب، دیگر احوال یہ ہے کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ ..... وغیرہ وغیرہ" واللہ خیر و عافیت بھی ہے اور انتقال بھی ہو گیا یہی اس پوری بحث کے بابت کہا جا سکتا ہے۔ کچھ کی رائے ہے کہ تشکیل تو ہو بھی چکی کچھ کہتے ہیں ابھی کہاں ہوئی ہونا چاہئے۔ کچھ اسے ہونے والی چیز ہی نہیں سمجھتے۔ زیادہ تر لوگ نہیں یوں ہو کہتے گزر گئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا نام بہت ہوا کچھ کہتے ہیں کہ ترقی پسند لوگ تشکیل نو کر رہے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہی کمبخت تشکیل نو نہیں ہونے دیتے۔ وہ چیز جسے نقاد کہا جاتا ہے بڑی اہم ٹھہرائی گئی ہے۔ یوں تو موٹے پرزے کسنے کے لئے تمام سائز کے رنچ الگ الگ ہوتے ہیں مگر نقاد اسکرو رنچ ہوتا ہے جس کا اسکرو گھما کر ہر سائز کے پیچ پر لگا یا جا سکتا ہے۔ زیادہ لوگوں کی رائے میں یہ رنچ زنگ کھا گیا ہے اس کے اسکرو پر گریز لگانے کی ضرورت ہے میری رائے میں اس پوری بحث میں حصہ لینے والے اور کچھ چاہے ہوں یا نہ ہوں نقاد ضرور ہیں۔ میں ان سے فرداً فرداً دریافت کرتا ہوں کہ آپ نے اقبال کے "ملا کے فرائض یعنی بحث و تکرار اسی اللہ کے بندے کی نمود کے سوا کیا کیا؟ میں اپنے مضمون کا ایک جملہ یہاں پھر دوہراتا ہوں "ارے میاں ادب کرنے کی بدیا ہے یہ وجود میں پہلے آتا ہے اور پھر اسی کے موافق زندگی کے تقاضے دیکھے جاتے ہیں تشکیل نو کرنے والا پہلے تشکیل نو کر جاتا ہے پھر وہ خود یا اس کے تلانے والے سر پر تنقید کا گدا باندھ کر اپنا سر دیواروں سے ٹکراتے پھرتے ہیں" کاش جن حضرات نے تشکیل نو پر بحث میں اتنی روشنائی صرف کی ہے وہ تشکیل نو کے لئے وہ روشنائی صرف کرتے۔ رفیق خاور صاحب کا مضمون پڑھ کر مجھے غالب کا شعر یاد آیا ؎

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

خاور صاحب کے مقالے میں دم خم کی کسی طرح کمی نہیں ہے مگر علم اور دالو وہ اردو کے عام تنقیدی مغالوں (منشیان تنقید کے ڈرافٹوں) سے نہیں بڑھتا: ہمارا ادب دوراہے پر ہے" بڑی عام بات ہے۔ ا کی تاریخ کا سطحی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ کچھ زمانوں میں ادب دوراہے پر آجا یہ بات درسی کتابوں میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ ادب کا گہرا مطالو ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر ادب ہر وقت اور ہر ادیب ہر لمحہ دوراہے پر ہی روایات بغاوت ہر وقت موجود ہی نہیں بلکہ ہم کنار نظر آتی ہیں۔ بغاو والے بھی روایات کو زندہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے مثلاً انگریزی ادب سب سے بڑے باغی شاعر وہ ہیں جن کو رومانی شاعر بعد میں کہا گیا۔ یہ لی نہیں کہتے تھے یہ اپنے حساب کوئی جدت نہیں کر رہے تھے بلکہ عہد الزبیتھ۔ پیدا ہیں جا رہے تھے انہیں دوہراہے پر بتایا جا سکتا ہے اور ایک ہوا لکھا یا جا سکتا ہے مگر یہ سب سطحیت ہے ان میں بہترین وہی ہیں ج روایت اور بغاوت دونوں ساتھ ساتھ آکر ایک نیا عالم بنا گئی ہیں یہاں بغاوت کے علم بردار سر سید اور ان کے ساتھی تھے مگر وہ کہاں تا کے اہل تھے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اقبال پورے پورے بغاوت اور پورے روایت کے اہل تھے اور وہی سب سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور درجے پر آجاتے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر اس شاعر کی طرح کے ہیں جو سطحی رہ سے بالاتر جا کر ہر قسم کے آفاقی رجحانات کو ایک انفرادی صورت دے ہر دور میں ایک بھیڑ نظر آتی ہے جس میں کچھ لوگ ایک طرف اور کچھ لو طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں، بکمل شعور کا خیال بھی اسکولی تاریخوں کی

ملتا ہے جن میں کسی دور کے نمایاں ترین آدمیوں کے رخ دیکھ کر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ تمام کائنات اسی رخ جا رہی تھی۔ کلیات قائم کرنے کے کھیل کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ کلیہ تو بن جاتا ہے مگر حقیقت غائب ہو جاتی ہے جیسے کہ ججوں کے فیصلوں سے مقدمہ تو فیصل ہو جاتا ہے مگر حقیقت جرم بالکل فنا ہو جاتی ہے کلیات سے دلچسپ ایک ہوائی سیر ہوتی ہے اور یہ سیر خاور صاحب نے خوب خوب دکھائی ہے۔ ہوائی جہاز دور لاہے سے اڑا اور مکمل شعور پر آ کر چکر کھا گیا۔ اب زہنی دھارے پر چلنے لگا۔ گرد و پیش کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی، اب سمجھ میں آیا کہ دور لاہے کا دوسرا رستہ اختیار کیا جا چکا ہے ہوائی جہاز کا میٹر بتاتا ہے کہ ہم پہلے سے کہیں زیادہ آگے نکل آئے ہیں۔ اب الگ الگ حصوں کے فوٹو کھینچنے کا وقت آ گیا۔ شاعری کا میدان سامنے ہے۔ فوٹو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تجربے کرنے کی بڑی گنجائش ہے۔ مغرب کی شاعری کے بڑے بڑے تجربے اور مشرق میں شعر و شاعری کا پڑا سرمایا یہاں لا کر پورے میدان کو جنت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ نثر کے میدان پر ہوائی جہاز پہنچا اپنے یہاں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ اسی میدان میں غزل کی سی چیز افسانہ ہے۔ اس میں افراد نے جو کچھ کیا وہ تو ہوائی جہاز سے دکھائی نہیں دیتا۔ عام طور پر یا جو ہوا یا زیادہ تر لوگوں نے جو کیا وہی نظر آ رہا ہے اور یہ سب گھاس ہے۔ یہاں خاور صاحب کا ہوائی جہاز انتہائی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ ان تک کون پہنچے جو انہیں بتلائے کہ ہر ملک کے ہر دور میں چند ہی لوگ ہوتے ہیں جو عام فیشن یا روش سے اوپر آتے ہیں اور ایک انفرادیت قائم کرتے ہیں ورنہ جو باتیں ہمیں آج فلموں اور زیادہ تر افسانوں میں نظر آتی ہیں وہی شیکسپیر اور اس کے چند ہم عصروں کو چھوڑ کر تمام عہد الزبتھ کے ڈراموں میں ملتی ہیں۔ اگر زمین پر آ کر دیکھا جائے تو ہمارے افسانے نے جس میں ناول بھی شامل ہے اس وقت چند ایسے لوگ ضرور نمایاں کر دیئے ہیں جو بایۂ ناز کہلانے کے قابل ہیں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے مگر ہر ایسے کے منتی تنقید کی طرح خاور صاحب کا بھی ایمان یہ ہے کہ ایک کلیہ جو بنا لیا گیا اس کو کسی طرح نہ توڑا جائے چاہے اس کے خلاف مثالیں کتنی ہی نمودار نظر آئیں۔ آخر میں تان تنقید کے زمین پر ٹوٹتی ہے۔ ہوائی جہاز اب اترنے لگتا ہے اور اپنے اڈے کی طرف رخ کئے ہوئے ہے۔ اب ہم ادب کے عالموں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تنقید کا ایک اڈا بنا لیا ہے ظاہر ہے یہاں سے جو ہوائی جہاز اڑتے ہیں ان کو لاسلکی کے ذریعہ راستہ بتانے کا فرض بھی ادا کرنے کے لئے ایک دفتر ہونا چاہیئے۔ اس دفتر کی تنظیم پر خاور صاحب نے بڑا زور دیا ہے۔ تاریخ ادب شاہد ہے کہ نقاد فن کار سے الگ کوئی چیز نہیں ہوا۔ فن کار ہی اپنے فن پر عمل کرتے کرتے اس کی ترکیب پر بھی غور کرنے لگتا ہے تو نقاد ہو جاتا ہے مگر ہمارے یہاں نقاد ایک الگ قسم کا جانور ہے جو نہ تخلیق کرنا جانتا ہے اور نہ یہی جانتا ہے کہ تخلیق کی دُم کدھر ہوتی ہے۔ کچھ رجسٹر کچھ فائلیں۔ کچھ خانے اس کے پاس ہیں اور یہ ادب کا انتظام کر رہا ہے شاید میکانکی طریقے پر کام کرتے کرتے یہ سوجھی جاتا ہے اس لئے خاور صاحب، اس کو جھنجھوڑ کر تشکیل نو کے کام کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور یہ اطمینان کر کے کہ اب انتظام ہو ہی جائے گا اپنا مضمون ختم کر دیتے ہیں۔

باقی مضامین کا ذکر کرنا فضول ہے اوپر میں نے خاور صاحب کے مضمون کو کوکس سے تشبیہ دی اور باقی کو تیروں سے۔ اگر وہ تشبیہ اچھی نہیں تو یہ ہوائی جہاز کی تشبیہ لے لیجئے باقی مضامین بھی ہوائی جہاز ہی ہیں چھوٹے چھوٹے بڑے کا فرق ہے کوئی خاور صاحب کے ہوائی جہاز کی دم چھو کر نکل جاتا ہے کوئی اپنا پنکھا اس کے پنکھے سے لڑا دیتا ہے کوئی اس پر چڑھا جاتا ہے کوئی اس کے بالکل نیچے اڑتا ہے مگر ایک آدھ دھکا دیتا ہی چلتا ہے۔ مقصد سب کا ہوائی کھیل دکھلانے سے آگے کچھ نہیں ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں تنقیدی ہوابازی کے بھی کچھ آداب مقرر ہو گئے ہر مضمون میں پہلے خاور صاحب کی تعریف کا پچارا پھر ان سے جھگڑا کا اظہار پھر ادب کی تعریف یا جدید ادب کی توہین آخر میں نتیجہ یہ سب قصیدے کے سے حصے معلوم ہوتے ہیں مگر قصیدے کے ہر حصے میں قصیدہ گو اپنی الگ بات کہا کرتا تھا۔ یہاں تنقید نگار سب ایک ہی بات کہتے ہیں "خاور صاحب فرماتے ہیں اس سے میں یہاں تک اتفاق کرتا ہوں اور یہاں سے اختلاف کرتا ہوں" غرض کہ یہ تو معلوم

جتا ہے کہ اتفاق اور اختلاف محض آداب مجلس ہے پھر ہر نقاد یہ بتاتا ہے
کہ ادب کیا ہے، زندگی کیا ہے عنوان کیا ہیں اور اس سلسلے میں سب اپنی اپنی
زبان میں ایک ہی قسم کی باتیں کہتے ہیں جو معمولی درسی کتابوں سے لی گئی ہیں اکثر
لوگ یہاں سے گریز کر کے کچھ صلواتیں ترقی پسندوں کو کچھ رجعت پسندوں کو
سنا دیتے ہیں اور پھر آپ حضرات کے لیے ختم دعا ہو جاتی ہے۔ کیا بتاؤں کہ کس
زحمت سے میں نے یہ سب مضامین پڑھے اور مجھے ان کو پڑھ کر کتنی تکلیف ہوئی۔
خدا گواہ ہے کہ اب تک اردو کا کوئی تنقیدی مضمون میں ایک پیراگراف سے
آگے نہ پڑھ پایا۔ کیا کروں دماغ چکرانے لگتا ہے۔ دماغی الٹی ہونے لگتی ہے
میں نے جدید منطق کا درس حاصل کیا ہے اور کچھ عرصہ درس دیا بھی ہے میں یہ
نہیں طے کر پایا کہ جدید منطق کی طرح پر سوچنا ٹھیک ہے یا ہمارے نقادوں کی طرح پر۔
تنقیدی بحثوں میں شریک ہونا بھول بھلیاں میں گم ہو جانا ہے۔ تاش کی چالیں
جاسوسی قصوں، معموں کے حل وغیرہ میں مجھے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ یہ تنقیدی
بحثیں بھی اسی قسم کی چیزیں ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ ان میں منطق کا پایا بہت
اونچا ہوتا ہے۔ اگر دکاندار سے بغیر دام چکائے ہوئے سودا لے آئیے تو پیڑھے
داڑھی باندھ کر حجت کر لی۔ خیر صاحب سب ایک بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ
اردو ادب کا معیار بلند کیا جائے، اور صاحب ترقی کرنے کے لئے اردو داں پارٹی
نوح کو "اٹنشن" کا حکم دے دیا ہے ہمیں امید ہے کہ اب سب ادیب "رائٹ
اباؤٹ ٹرن" کر کے مارچ ہو جائیں گے اور آگے جو ادب کا قلعہ ہے وہ ہمیشہ
سے ہماری ملکیت ہے ہی، دم کے دم میں فتح ہو جائے گا حافظ کے الفاظ میں
ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں ؎

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

---

وہ کون ہیں جنہیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

(آنند نرائن ملا)

جاں نثار افسر
(حیدر آباد دکن)

# غزل

کون سا غم ہے جو عطا نہ ہوا
مجھ سے خوش کب وہ خوش ادا نہ ہوا

کون سے روز تیری یاد نہ تھی
کون سی رات "رت جگا" نہ ہوا

زندگی کی برائی کرتے ہیں
جن کو جینے کا حوصلہ نہ ہوا

مر رہا ہے کوئی کہ جیتا ہے
تم سے اتنا بھی پوچھنا نہ ہوا

زندگی کیوں سکوں سے ہے محروم
کیا ہمارا کوئی خدا نہ ہوا

باغبانوں سے یہ شکایت ہے
ان سے گلشن کا دیکھنا نہ ہوا

عزم ظلمت شکن بھی کافی ہے
جو اجالے کو دیکھنا نہ ہوا

جب خزاں تھی تو لوٹ رہا تھا چمن
جب بہار آ گئی تو کیا نہ ہوا

---

مہاشے کرشن
یف ایڈیٹر روزنامہ پرتاپ دہلی

# مشرقی پنجاب میں اردو

اردو کی پنجاب سے جلاوطنی کا حکم صادر ہو گیا ہے۔ یکم اکتوبر ۶۰ء
ے اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔ جلاوطنی کا لفظ میں نے راجدھانی کے اکالی
از مسلم معاصر سے مستعار لیا ہے۔ یہ وہی معاصر ہے جو ہندی اور ہندو
ی میں اتنا اندھا ہو رہا ہے کہ وہ پنجاب کی مزید تقسیم اور سکھ صوبے کے قیام
، حمایت کرنے لگا ہے۔ اردو کو پنجاب سے کیوں نکالا جا رہا ہے، اس لئے
. پنجابی کو اس کی جگہ دی جا سکے۔ یہ فارمولا ۱۹۴۹ء میں نافذ کیا گیا۔ اسال
ب اس پر عمل نہ ہو سکا۔ کیوں کہ پنجابی اردو کی جگہ لینے کے قابل نہ تھی۔ لیکن
ب اکالی اندولن کے زیر اثر یکم اکتوبر سے پنجابی کو اردو کی جگہ دی جا رہی ہے
ں وقت تک اعلیٰ سطح پر انگریزی اور نچلی سطح پر اردو پنجاب کی زبان رہی ہے
ے پنجاب سرکار کے فیصلہ کے مطابق اعلیٰ سطح پر ہندی اور نچلی سطح پر پنجا
ابی کی زبان ہوگی۔ ہندی اعلیٰ سطح پر رہ سکے گی اس کا جواب تو وقت دے
ا کیوں کہ یونی ورسٹی کی سطح تک ریجنل بھاشا کے ذریعہ تعلیم کا اصول تسلیم کیا
ا جا چکا ہے اس لئے آج ہو یا کل پنجاب یونی ورسٹی میں پنجابی بحروف گورمکھی
ریعہ تعلیم ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ تکلف کے طور پر ہندی کو بھی اس کے ساتھ
انک دیا جائے۔ رہ گئے ہائی کورٹ بھاشائی جنون جس سرعت سے ترقی کر رہا
ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ ہائی کورٹوں پر بھی اثر انداز ہوئے بنا نہ رہے گی۔
مارت سرکار کے پریس رجسٹرار نے حال ہی میں اخبارات کی نسبت جو رپورٹ
کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے سب سے زیادہ اخبار پنجاب میں شائع
رتے ہیں اس پر بھی اس کا مستقبل محفوظ نہیں کیوں کہ آنے والی نسل اس زبان سے
کوری آ رہی ہے۔ ۱۹۴۹ء سے اردو کو پنجاب کے اسکولوں سے نکال دیا
گیا ہے۔ پھر بھی یہ وہاں زندہ و سلامت ہے تو اس لئے کہ ابھی تک صوبہ
کے شاسن میں اس کے لئے جگہ تھی لیکن اب اسے وہاں سے بھی جواب مل
گیا ہے۔ مسلم پرچے ہندی اندولن کے دوران اور اس کے بعد ہندی کے
مقابلے میں پنجابی کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ میں ان سے کہتا تھا کہ اپنے
پاؤں پر آپ کلہاڑا کیوں رکھ رہے ہو۔ اردو کا مقابلہ پنجابی سے ہے ہندی
سے نہیں۔ لیکن وہ ہندی دشمنی کے جوش میں اپنی اس حرکت سے باز نہ آئے اب
انہیں اپنے ہاتھوں اردو کی کفن پوشی کی رسم ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ دیکھئے اس پر
مقامی معاصر "الجمعیۃ" ان الفاظ سے اپنے رنج کا اظہار کرتا ہے: "سچ کی
بات یہ ہے کہ پنجابی اور ہندی کا جھگڑا اس مفاہمت پر کیا جا رہا ہے کہ اردو
کا قتل عام کر دیا جائے وزیر تعلیم نے جب لسانی فارمولے کا اعلان کیا تو یہ بھی
خوش خبری سنا دی کہ ۶۲ء تک اردو کو پھانسی دے دی جائیگی۔ گویا پنجاب
کا لسانی فارمولا اردو کے قتل عام کی خبر لایا ہے، جو لوگ اردو کے بارے میں
خوش فہمیوں کا شکار ہیں وہ دیکھ لیں کہ پنجابی اور ہندی کی خاطر اردو کا
جھٹکا کس طرح کیا جا رہا ہے؟ چار لاکھ تانگا اپنا مسئلہ حل کر لیں مگر اردو کے
کروڑوں حامی اپنا مسئلہ حل نہ کر سکیں" معاصر کی یہ بات غلط ہے کہ ہندی
کی خاطر اردو کا جھٹکا کیا جا رہا ہے۔ جھٹکا تو پنجابی کے لئے مخصوص ہے اور اس
کی خاطر ہی اردو کو جھٹکایا جا رہا ہے۔ میں اپنے معاصرین سے کہوں گا۔

خود کردہ را درمان نیست

(بقیہ صفحہ ۱۴)

# سرسیّد کی ایک نظم

"قومی زبان" کے پچھلے پرچہ میں سرسیّد احمد خان کے دو خطوط بعض پرانے پرچوں سے نقل کر کے تبسّم کاشمیری نے چھپوائے تھے یہ قابلِ قدر کام ہے اور اہلِ ذوق کو ان کی تلاش کا شکر گزار ہونا چاہئے۔
اس پر مجھے یاد آیا کہ بہت عرصہ ہوا غالباً اردو کے کسی نصاب میں میں نے سرسید کی ایک نظم "مرجھایا ہوا پھول" پڑھی تھی اور اپنی بیاض میں نقل کر لی تھی جہاں تک مجھے معلوم ہے سرسید کو اردو شاعر کی حیثیت سے شاذ ہی کوئی جانتا ہو گا حالانکہ ان کے فارسی اشعار بہت سے اصحاب کی زبان پر ہیں اور عام طور پر بعض مضامین اور تذکروں میں بھی ملتے ہیں
جسٹس لیل احمد رائی

## "مُرجھایا ہوا پھول"

ہے عجب عالم فضائے باغ پر آیا ہوا — ہر طرف تصویر کا سا ہے سماں چھایا ہوا
جس غنچہ کو دیکھئے تنتا ہے اپنے حسن پر — پھول جو دیکھو جوانی پر ہے اترایا ہوا
سیدھے منہ سے بات تک کرتے نہیں غنچے ذرا — اُن کا غرّہ آج کل زوروں پہ ہے آیا ہوا
دیکھئے موجِ صبا کو کچھ اکڑتی ہے اکڑ — کہتی ہے سارا جہاں ہے میرا مہکایا ہوا
یہ سماں بھی دیکھتا ہوں پھر اسی گلزار میں — اک طرف کو شاخ پر اک پھول مرجھایا ہوا

اس بھلے پھولے چمن میں یہ گلِ پژمردہ ہے
یا کوئی حسرت کا پتلا عاشقِ دل مردہ ہے

اے تماشائی مزے سیرِ چمن کے لوٹ کر — اس گلِ پژمردہ کی جانب ذرا کر نا نظر
ہوش کے کانوں سے سن یہ کہہ رہا ہے مُنا مُنا — اس دو روزہ زندگی کو اس طرح کر تو بسر
کاٹ دے ہنس کھیل کر اس مختصر ہستی کو تو — دے خوشی سب کے دلوں کو رہ ہنسنے کا مزہ
کل کو چھا جانے نہ ان پر موت کی پژمردگی — التفاتِ دوستاں کی آج نا داں قدر کر

ہے مری پژمردگی تعبیر رؤیائے حیات

میری کہانی نکھری تفسیر آئینِ حیات

# وقت کی اہم ضرورت

"امروز" کراچی ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء

بابائے اردو کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ جس چیز کو ہم روزانہ دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھتے ہیں اسے کبھی نہیں دیکھتے۔ یہ مقولہ اردو زبان پر پورے طور پر صادق آتا ہے ہم صبح شام چلتے پھرتے کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے اسی زبان میں اظہار خیال کرتے ہیں لیکن اس کی اہمیت پر کبھی غور نہیں کرتے۔ زبان ہر قوم کی معاشرت وتہذیب، تمدن و سیاست اور تاریخ و ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک طرف ملکی حالات، معاملات اور معاشرت سے اثر پذیر ہوتی ہے، تو دوسری طرف قوم کے ذہن اور مزاج، پسند و ناپسند اور عادات واطوار پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں آریہ تہذیب اور سنسکرت کے خاتمے کا سبب یہ ہے کہ آریہ اپنے درس و تدریس کے مراکز آبادیوں سے دور جنگلوں اور غاروں میں بناتے تھے تاکہ اشلوک کے الفاظ کسی غیر آریہ کے کان میں نہ پڑنے پائیں اور اگر اتفاقاً کسی غیر آریہ کے کان میں اشلوک کے الفاظ پڑ جاتے تھے تو پھر اسے زندہ واپس نہیں جانے دیا جاتا تھا لیکن اس کے برخلاف جب عرب کے مبلغین اور تاجر یہاں آئے تو انہوں نے عوام سے ربط ضبط مناسب سمجھ کر عوام ہی کی زبان کو لین دین میل جول اور تعلیم و تبلیغ کا ذریعہ قرار دیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور زیادہ دور جانے کی ضرورت کیا ہے انیسویں صدی عیسوی ہی میں جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تو اپنا کام چلانے کے لئے انہوں نے اپنے انگریز عملے کو یہاں کی ملکی تعلیم دینا بھی ضروری سمجھا اور اسی مقصد کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تھا۔

ان باتوں سے یہ مقصد واضح کرنا تھا کہ کسی بھی ملک کے سرکاری دفاتری تجارتی اور تعلیمی غرض تمام امور میں موثر اور کارآمد زبان وہی ہو سکتی ہے جو اس ملک کی زبان ہو اور جسے اس قوم کا ہر فرد سمجھ اور بول سکے اور تعلیم موثر اس وقت ہی ہو سکتی ہے جبکہ ذریعہ تعلیم قومی یا مادری زبان ہو ورنہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے صحیح معنوں میں لائق لوگ نہیں نکل سکتے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر زبان کا ایک تاریخی سیاسی تمدنی تہذیبی اور ثقافتی پس منظر ہوتا ہے اور اس لئے اپنے سے بالکل مختلف تہذیب، تمدن اور ثقافت رکھنے والی قوم کی زبان ہمارے لئے کبھی موثر نہیں ہو سکتی۔ ہمارے لئے موثر ذریعہ تعلیم صرف اردو ہی ہو سکتی ہے ایسی صورت میں بابائے اردو کا اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ قابل تحسین ہے۔ اردو یونیورسٹی کے قیام کا یہ خواب کوئی نیا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے اور ایک بار جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی صورت میں حقیقت بھی بن چکا ہے جس نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو صرف ادبی شہ پاروں کی جان نہیں بلکہ اس کے دامن میں تاریخ و فلسفہ، مذہب و معاشرت اور سائنس اور سیاست کے جواہرات بھی موجود ہیں اور اس میں ذریعہ تعلیم بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔

لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ پاکستان میں اردو کو پیش دفعہ اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی زبان کو مسلط کرنے کی کوششیں کی گئیں، اردو ایک ایسی مظلوم زبان ہے جس کے ساتھ اپنوں نے بھی غیروں کا سا سلوک کیا۔ گزشتہ بارہ سالوں میں ہر موقع پر اردو کو دیگر زبانوں کے مقابلے میں نظر انداز کیا

گیا۔ حالاں کہ اب یہ کوئی معمولی زبان نہیں ہے، یہ ایک بین قومی زبان بن چکی ہے اور دنیا کی تقریباً ہر بڑی یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اردو کی گزشتہ ایک صدی میں ہمیں صرف ایک نام بابائے اردو کا نظر آتا ہے جنہوں نے اپنی تمام عمر اس کے لئے جہاد کرتے گزار دی ہے اور آج بھی اس بڑھاپے اور پیرانہ سالی میں یہ عظیم اور جواں ہمت بوڑھا ایک عظیم کام کے لئے جوانوں کے عزائم اور حوصلوں کے ساتھ کمربستہ ہے۔ اس عمر میں جبکہ انہیں آرام کرنا چاہیئے یہ کڑی ذمہ داری وہ اردو اور قوم کے لئے سنبھال رہے ہیں جس سے ہمارا اور ہماری آئندہ نسلوں کا مفاد وابستہ ہے۔ لیکن اس کام کے لئے روپے کی ضرورت ہے بابائے اردو نے سرسید اور حالی کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھا لیکن افسوس ان سے سوال مانگنے کا گر نہ سیکھ سکے یہی وجہ ہے کہ زبان کی خدمت پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے کے باوجود بھی آج اردو یونیورسٹی کی تحریک کا دامن خالی ہے۔ آج بابائے اردو آپ کے سامنے قوم کے سامنے اردو سے محبت رکھنے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہیں اپنے لئے نہیں آپ کے لئے آپ کی اولاد کے لئے آپ کی قوم کے لئے اور آپ کے پاکستان کے لئے

اردو یونیورسٹی کی اس تحریک پر لوگوں نے بابائے اردو کو بہت سراہا ہے اور بہت سے لوگوں نے بابائے اردو کو تار اور پیغام بھیجے ہیں لیکن اس عظیم تحریک کی تکمیل اور بقا کے لئے بوڑھوں کے دماغ بزرگوں کی دعاؤں اور خالی خولی تمناؤں سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ اس کے لئے "دل گرمے نگاہ پاک بینے جان بیتابے" کی ضرورت بھی ہے اگر اردو سے آپ کو محبت ہے تو اردو آپ پر کچھ حق بھی رکھتی ہے اور آج اردو اپنا حق مانگنے آنچل پھیلائے آپ کے سامنے آئی ہے کہ دیکھیں اس گاڑھے وقت میں کون میری مدد کرتا اور میرا کلیجہ ٹھنڈا کرتا ہے۔ اردو کی یہ اپیل قوم کے ہر فرد بوڑھے، بچے، مرد، عورت، امیر، غریب، افسر، عوام غرض سب سے یکساں ہے دیکھیں آج کون اس اردو کے نام پر اردو یونیورسٹی کے نام پہلے پہلے، اپنی اولاد کے لئے اپنی آئندہ نسلوں کے لئے اور اپنی قوم کے لئے اردو یونیورسٹی فنڈ کے لئے چندہ کے اس نیک کام میں حصہ لیتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر نہایت ہی افسوسناک ہے کہ اردو یونیورسٹی فنڈ کے لئے اب تک بہت قلیل سی رقم جمع ہو سکی ہے۔ بابائے اردو کئی ماہ سے اردو یونیورسٹی فنڈ کے لئے چندہ دینے کی اپیلیں کر رہے ہیں، لیکن افسوس کوئی نہیں سنتا کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوم کا کیا ہوگا جس کی غیرت و حمیت زائل ہو چکی ہے اور جس کے احساسات مردہ ہو چکے ہیں۔ ہم اب تک اردو یونیورسٹی کے لئے کچھ نہ کر سکے اور اس معاملے میں اگر پہل کی تو بچوں نے بزم امر فنڈ کے اراکین نے دو سو ستر روپے کی رقم بابائے اردو کی خدمت میں پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگرچہ ہمارے بڑوں کی غیرت و حمیت زائل ہو چکی ہے لیکن ابھی ان میں اتنی رمق ضرور ہے کہ وہ اپنے جیب خرچ میں سے تھوڑا تھوڑا بچا کر اردو یونیورسٹی کے لئے یہ ایثار کر سکیں بعض بچوں نے چندہ دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر مہینے اپنے جیب خرچ میں سے ایک مقررہ رقم اس نیک کام کے لئے دیتے رہیں گے۔ یہ ایثار و قربانی کی بہت بڑی دلیل ہے بڑوں کو شرم آنی چاہئے کہ جو کام وہ نہ کر سکے اسے بچوں نے کر دکھایا۔ بچوں کے اس ایثار اور قربانی کے جذبے سے سبق لے کر بڑوں کو آگے بڑھنا چاہئے تاکہ اردو یونیورسٹی کی تحریک تیزی سے کامیابی کے منازل طے کر سکے۔

ممکن ہے ہماری یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہو لیکن ہم نے اس بات کا تہیہ کر لیا ہے اور بابائے اردو سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک ہمارے جسم میں جان اور قلم میں طاقت ہے ہم اردو یونیورسٹی کے قیام اور بقا کے لئے کوشاں رہیں گے۔ اگر ہمارے بڑوں کی غیرت و حمیت زائل ہو چکی ہے، ان کے احساسات مردہ ہو چکے ہیں تو ہم اپنے قلم کی تمام قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کے احساسات کو زندہ کریں گے اور ان کی غیرت و حمیت کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگائیں گے اور انشاء اللہ اردو یونیورسٹی کا قیام بہت جلد عمل میں آئے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اتنے انقلابات سے گزرنے کے باوجود بھی ہماری قوم کی بے حسی، شاید ان الفاظ کو بے اثر بنا دے لیکن میں اب اپنے ملک کے عوام کی خدمت میں اتنا

(باقی ۴۵ پر)

نظیر محسن

# "رکھیو غالب مجھے..."

"میری خواہش ہے کہ دُنیا میں تری آجاؤں
اپنے ویرانے میں یا تجھ کو بسالوں لا کر
مانگ کر تیرے سویروں سے اجالوں کی کرن
اپنی راتوں کے اندھیروں کو مٹا لوں آکر"

"خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے"

زیست کا آگ سے یہ پیار بہت مشکل ہے
تیری محفل میں مجھے بار بہت مشکل ہے

تری دنیا میں زر و سیم کی جھنکاریں ہیں
زندگی ریشم و کمخواب میں پلتی ہے وہاں
میری دنیا میں سسکتی ہوئی فریادیں ہیں
زیست افلاس کی آغوش میں جلتی ہے یہاں

مجھ کو معلوم ہے آہوں کے شرارے کیسے
گنگناتے ہوئے گیتوں میں بدل جاتے ہیں
کیسے اک بیکس و مجبور کے لرزیدہ قدم
تیری بزم طرب آثار میں ڈھل جاتے ہیں

یہ چمکتے ہوئے ایوان، فلک بوس محل
حسن شیشے کی صراحی میں جہاں ڈھلتا ہے
مرمریں طاق پہ رکھی ہوئی قندیلوں میں
میری دنیا کے غریبوں کا لہو جلتا ہے

مجھ کو معلوم ہے سرمائے کی دہلیز پہ کیوں
چوٹ کھائے ہوئے افلاس کا سر جھکتا ہے
میں نے دیکھا ہے زر و سیم کے بازاروں میں
ایک نادار کی غیرت کا کفن بکتا ہے

مجھ کو معلوم ہے کیسے تری راتوں کا شباب
لوٹ لیتا ہے جواں سال امنگوں کا سہاگ
تیرے ہونٹوں کے فقط ایک تبسم کے لئے
کتنے سینوں میں بھڑک اٹھتی ہے فریاد کی آگ

تو نے کلیوں کو سر شاخ چٹکتے دیکھا
میں نے پھولوں کے چمن زار لٹے دیکھے ہیں
تو نے ہنستے ہوئے ہونٹوں کی چمک دیکھی ہے
میں نے زخموں کے سمن زار کھلے دیکھے ہیں

تیرے محلوں کے طرب زار سجانے کے لئے
کتنی نادار جبینوں کے گہر بکتے ہیں
تیری عزت کے در و بام بچانے کے لئے
کیسے اجداد کے بوسیدہ کھنڈر بکتے ہیں

تیری فردوس کے گل پوش نظاروں کی قسم
یہ بہاریں مجھے ویران نظر آتی ہیں
تیرے پھولوں سے جلے خون کی بو اٹھتی ہے
یہ فضائیں مجھے شمشان نظر آتی ہیں

بات کڑوی ہے مگر جرأت اظہار معاف

"زیست کا آگ سے یہ پیار بہت مشکل ہے
تیری محفل میں مجھے بار بہت مشکل ہے"

رشید احمد صدیقی۔ آل احمد سرور
ضیا احمد بدایونی۔ ممتاز حسن

# یادگار احسن

مولانا احسن مارہروی کی تمام زندگی اردو کی خدمت میں گزری وہ ایک بلند پایہ شاعر، محقق اور استاد تھے۔ ان کا شمار ان محسنین اردو میں ہوتا ہے جنھیں اردو دنیا ہمیشہ عزت اور احترام کے ساتھ یاد کرتی رہے گی۔ ان کی برسی ہر سال بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے اس سال بھی یہ تقریب (بیسویں برسی) ۳۰ جولائی ۱۹۶۰ء کو کراچی میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے اہتمام سے منعقد ہوئی۔ اس روز سہ پہر کو مشہور نقاد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں شہر کے معززین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس جلسے کی ابتدا پیغامات سے ہوئی جو اس تقریب کے لئے موصول ہوئے تھے۔ پیغامات بھجوانے والوں میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، جناب آل احمد سرور، جناب رشید احمد صدیقی، جناب ممتاز حسن اور مولانا ضیا احمد بدایونی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ بعد ازاں مولانا احسن مرحوم کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں تقاریر ہوئیں تقریر کرنے والوں میں جناب حسن امام اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام قابل ذکر ہیں اسی دن رات کو دس بجے جناب اے ڈی اظہر کی صدارت میں طرحی مشاعرہ ہوا جو بڑی کامیابی سے رات کے دو بجے تک جاری رہا اس بار ہم "پیغامات" شائع کر رہے ہیں۔ (بابائے اردو کا پیغام شائع ہو چکا ہے) آئندہ شمارے میں طرحی غزلوں کا انتخاب شائع کیا جائے گا

(ادارہ)

## پروفیسر رشید احمد صدیقی

مولانا احسن مارہروی ضلع (ایٹہ دیوپی) کے بڑے اونچے اور محترم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۳۰۔۳۵ سال اُدھر ایسے گھرانوں کی عام و خاص میں بڑی مان دان تھی۔ مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی شرافت و شفقت تھی جس نے ان کی شخصیت کو بہت مل اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا جو بھی ملنے والے کو چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، تونگر ہو یا تنگدست جاہل ہو یا عالم، آشنا ہو یا نا آشنا اپنا گرویدہ کر لیتی تھی۔ کچھ اس طور پہ جیسے مولانا نے اپنی یہ صفات مخصوص طور سے ملنے والوں میں پیدا کر دی ہیں اگر اس میں نقصان ہوا۔

یہ بات یہاں اس لئے کہنی پڑی کہ جہاں تہاں بعض پڑھے لکھے سمجھدار لوگ اس قلمی یا کتابی رقص کے انداز سے ملتا اور عربی بنا ہوا شعر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں یا کبھی بے اختیار ہنسنے یا بھاگ کھڑے ہونے کو جی چاہنے لگتا ہے مولانا اپنی ذات سے اتنے مخلص و کرم تھے کہ یہ برائی بھی ان کی ہر ادا اور دل میں اتر جاتی تھی اور گھر کر لیتی تھی۔

مولانا کو اردو شاعری پر غیر معمولی قدرت تھی اس کے فنی رموز سے وہ جتنے واقف تھے اس کی مثال اب کم ملتی ہے اس کے باوجود شاعروں کی خود پسندی اور تصنع ان میں بالکل نہ تھا عورتوں کی مانند جو طبعاً دوسری عورتوں سے بدگمان و بیزار رہتی ہیں اردو شعرا بھی احتیاطاً ایک دوسرے سے بدگمان و بیزار رہتے ہیں۔ مولانا بالکل ایسے نہ تھے وہ ساتھی شعرا کا بڑا احترام کرتے تھے یونی ورسٹی میں ان کے ساتھ کام کرنے کا مجھے عرصے تک فخر و امتیاز حاصل رہا وہ زبان اور شعر و ادب کے بڑے شیدائی اور مبصر تھے وہ اپنی عمر سے بہت چھوٹے اور مختلف انداز کے شعر کہنے والوں کی بھی بڑی عزت و محبت کرتے تھے مولانا کو ترقی پسند شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن وہ ان کے نقطۂ نظر کو اس انہماک و احترام سے سنتے جیسے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے ہوں۔

مسلم یونی ورسٹی میں اردو کے معلم تھے ایک طور پر پرانے زمانے کے معلم لیکن ان کی طبیعت کا یہ انداز عجیب تھا کہ جہاں وہ نوجوان طالب علموں کو قدیم شعر و ادب کے معنی مطلب اور اس کے وزن و وقعت سے آشنا کراتے ہیں

وہ رعایت سے کام نہ لیتے اور طالب علموں کی شوخی یا بے توجہی سے آزردہ ہو
وہ نئی زندگی اور ادب کے نئے رجحانات اور تقاضوں کا ذکر ان ہی طالب علموں
سے بڑے تحمل اور دلچسپی سے سنتے اور اسی طرح ذہن میں محفوظ کر لیتے جیسے کوئی
قیمتی متاع محفوظ کرتا ہو وہ نوجوانوں کو سکھانے بتلانے میں جتنی شدت کرتے
تھے اتنا ہی ان سے سیکھنے پر آمادہ رہتے۔ وہ طرز کہن پر اڑتے تھے اور آئین
نو سے ڈرتے بھی نہ تھے۔

زبان کی صحت و صفائی کا ایسا التزام رکھتے تھے جیسے کوئی متقی پاکی
اور ناپاکی کا رکھتا ہے۔ شعر و ادب سے متعلق کوئی بات پوچھیے اور مولانا کو اپنی
معلومات پر شک گزرا تو جب تک اس کی سند اساتذہ کے ہاں تلاش نہ کر لیتے
کچھ نہ کہتے۔ تحقیقات مکمل کرنے کے بعد پوچھنے والے کو چین سے نہ بیٹھنے دیتے۔
برابر تعاقب میں رہتے۔ کہیں ہو کیسا ہی موقع ہو غریب کو اپنی تحقیقات کے
نتائج سے آگاہ کرتے رہتے اب ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں جن سے کوئی مسئلہ
پوچھیے تو وہ اس کی تلاش و تحقیق میں اتنا اہتمام کرتے ہوں اور اتنے خوش
ہوتے ہوں جیسے آپ نے پوچھ کر ان پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے اور وہ
اس احسان کا بدلہ اس سے بڑے احسان سے کرنا چاہتے ہوں!

مولانا نے گراں قدر علمی خدمات انجام دی ہیں انھوں نے اردو نثر
کے معیار پر بڑی اچھی اور ضخیم کتاب لکھی اور اس زمانے میں یہ خدمت انجام دی
جب ہمارے لکھنے والے اس طرح کے موضوعات کی طرف مائل نہ تھے۔ داغ
کے رنگ کلام سے چاہے جتنے لوگ لطف اٹھاتے ہوں داغ کے شاگرد کی حیثیت
سے مولانا نے زبان و ادب کی بڑی اہم اور پائیدار خدمت اس طور پر انجام دی
کہ اردو کے محاوروں اور ضرب الامثال پر اساتذہ سے صحیح محل استعمال کی بھرپور
شاگرد کی عقیدت اور بصیرت کی یہ مثال تو قابل فخر ہے شاگرد ہمیشہ استاد
کا احسان مند رہتا ہے لیکن ایسے شاگرد کم گزرے ہیں جو استاد کے احسان کو اس
طرح سے اتارنے کی کوشش کرتے ہوں۔ شاگرد اور استاد کے باہمی تعلقات پر
مولانا نے ایک بڑی [illegible] ہے۔ مولانا [illegible]

نہ اپنا مال چھپا سکتے تھے نہ دوسرے کا۔ اردو کی کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔
قرض لینے میں مطلق تامل نہ کرتے۔ جیسے قرض کو قرض نہیں آمدنی سمجھتے ہوں۔
قرض کا یہ عظیم تصور معمولی آدمی کے ذہن و ظرف میں نہیں آسکتا۔

مولانا سے جدا ہوئے کم و بیش بیس سال ہوئے۔ انگریزی کی ایک
مثل کے مطابق اسی دوران میں کتنے دریاؤں کا پانی کتنے پلوں کے نیچے سے
بہتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچا ہوگا۔ ماضی کے دھندلکے میں تصور کی نگاہ پہنچتی
ہے تو مولانا کا بھاری بھر کم جثہ، اخلاق و مروت سے [illegible] چہرہ اور متوجہ
کر لینے والی محترم شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ شعبہ میں ساتھی کام کرنے والے
جمع ہیں طالب علم آ جا رہے ہیں روزانہ کے معمولات جاری ہیں کہ چلمن ہٹا کر
مولانا داخل ہوتے ہیں سب حسب معمول بے اختیار کھڑے ہو جاتے ہیں۔
مولانا جھک کر سب کو تسلیم کرتے ہیں اور جلد سے جلد سب سے پہلی اور قریب
کی نشست پر بیٹھ جاتے ہیں۔ شفقت و محبت کے کچھ کلمات کہتے ہیں۔ ہر
شخص مسرور و مخاطب ہوتا ہے کمرے کی فضا میں جیسے سامنے کے خیابان سے
تازہ ہوا اور بھینی خوشبو کا ایک جھونکا آگیا ہو۔ دعا ہے کہ مولانا کی یاد منانے
کی یہ تقریب کامیاب ہو اور اس کے نتائج بہتر سے بہتر شکل میں ہمارے
سامنے آتے رہیں آمین۔

## آل احمد سرور

نئی نسل کو کیا معلوم کہ مولانا احسن مرحوم کا کارنامہ کیا ہے'
اس کا علم تو انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے مولانا کی ساری تصانیف
پڑھی ہیں ان سے قریب رہے ہیں اور انہیں مختلف حیثیتوں سے دیکھنے
اور برتنے کا موقع ملا ہے یہ خوشی کی بات ہے کہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی
ایشن کراچی ہر جولائی کو یوم احسن منا رہی ہے اپنے مشاہیر کی یاد سے
نئی نسلوں کو احساس علم و عرفان سب ہی کچھ مل سکتا ہے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا اور ادبیات کی [illegible]
[illegible] احسن کا اکثر تذکرہ سننے میں آیا۔ [illegible]

مولانا کے شاگرد تھے اور حسبِ ادب اور احترام سے ان کا ذکر کرتے تھے اس کی وجہ سے مولانا کی بزرگی کا ایک گہرا نقش بچپن سے میرے ذہن میں تھا جب میں انگریزی میں ایم اے کرنے علی گڑھ پہنچا تو رشید صاحب کے علاوہ دوسرے ادیبوں سے بھی ملنے گیا۔ مولانا احسن کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ مولانا بڑی شفقت سے پیش آئے تو انہوں نے اپنی بزرگی کا رعب بالکل نہیں ڈالا۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ ایک ایسے باکمال شخص سے ملاقات ہو رہی ہے جو صرف ماضی کی سنہری یاد میں کھویا ہوا نہیں ہے بلکہ ادب کی دنیا میں نو واردوں کی بھی ہمت افزائی کرتا ہے۔ پہلی ہی گفتگو میں کسی لفظ پر بحث ہو رہی تھی۔ مولانا نے عربی اور فارسی قواعد کے بجائے اردو کے چلن کی حمایت کی۔ کسی نے کہا مشکور کو شکرگذار کے معنی میں استعمال کرنے کی بدعت بہت عام ہو گئی ہے۔ مولانا نے کہا کہ جو الفاظ عام استعمال میں آ گئے ہیں انہیں اسی طرح استعمال کرنا چاہیئے۔ میں ساری گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔ مولانا کی روشن خیالی مجھے بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ کچھ دن بعد انجمن معلقۃ الشعر کا سالانہ مشاعرہ ہوا۔ مولانا کے یہاں سب شاعروں کا مجمع تھا۔ میں بھی گیا۔ سب مولانا کو بڑی عقیدت اور رغبت سے دیکھتے تھے۔ دوسرے دن اصغر گونڈوی مرحوم میرے ساتھ مولانا کے یہاں پھر پہنچے۔ مولانا نے ان سے تازہ غزل کی فرمائش کی۔ اصغر مشاعروں میں خود نہیں پڑھتے تھے اس صحبت میں انہوں نے بڑے دھیمے اور دلکش لہجے میں ایک نئی غزل سنائی۔ مولانا نے بڑی تعریف کی معلوم ہوا کہ معاصرین کے کمال کے اعتراف میں بعض لوگوں کی طرح بخیل نہیں ہیں اس کے بعد مولانا سے خاص قربت رہی۔ ۱۹۲۶ء میں شعبۂ اردو میں آ گیا۔ علاوہ درس و تدریس کے گھنٹوں ادبی مسائل پر باتیں رہتیں الفاظ کی تحقیق محاورے کی صحت زبان کے نوک پلک کا مولانا کو خاص خیال تھا۔ وہ شعر و ادب کے ہر رنگ سے واقف تھے۔ خود کلاسیکل طرز کے علم بردار تھے مگر تجربوں سے بدکتے نہیں تھے شعبے میں سب سے برابری برتتے تھے طلبا سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ خالی گھنٹوں میں یا تو ادبی گفتگو ہوتی تھی یا مولانا فرمائشوں کی تعمیل میں غزلیں، نظمیں، تاریخیں، ادبی سوالات کا جواب لکھتے تھے۔ اپنے استاد داغ کے عاشق تھے۔ ایک دفعہ بشیر احمد ہاشمی صاحب نے جو اس زمانے میں ٹریننگ کالج میں لکچرر تھے داغ پر ایک مضمون پڑھا مضمون میں چکبست کے نظریے کی تائید کی گئی تھی کہ داغ کا طرز عیاشانہ ہے۔ مولانا کیسے خاموش رہتے۔ مضمون کے بعد بڑے مزے کی تقریر کی اور کہا آج آپ جو چاہیں کہہ لیجئے مگر داغ کے کلام میں اردو کی ساری لطافتیں اور نزاکتیں جس طرح جمع ہو گئیں ہیں وہ اوروں کے یہاں مشکل سے ملیں گی۔ مولانا کی شاعری کا میں کبھی قائل نہ ہوا۔ یا تو بڑے ڈھلے ڈھلائے ٹکسالی درست مگر سپاٹ شعر کہتے یا ایسے شعر جو ان کی زبان سے عجیب معلوم ہوتے تھے۔ ان کے یہاں اچھے اشعار بھی ہیں مگر یہ اشعار زیادہ تر سند کے طور پر استعمال کئے جا سکتے ہیں، وہ بصیرت اور کیفیت کم رکھتے ہیں جو شاعری کا تحفہ ہے مگر زبان کے اسرار و رموز اور انشا پردازی کے آداب سے کم لوگ اتنے واقف ہوں گے جتنے مولانا احسن تھے۔ بڑی صاف ستھری نثر لکھتے تھے تحقیق اور تنقید دونوں سے گہرا شغف تھا۔ کلیات ولی اور تاریخ نثر اردو کی آج بھی اہمیت ہے، اپنے استاد داغ کی نہ صرف انہوں نے ان کی زندگی میں بڑی خدمت کی بلکہ ساری عمر ان کی عظمت کو اجاگر کرنے میں صرف کر دی داغ کی لائف لکھی خطوط داغ مرتب کر کے چھپوائے۔ منتخب داغ کے نام سے ان کے ایسے اشعار جمع کئے جو ٹھیٹھ ہندوستانی میں ہیں ان کے بہت سے ایسے شاگرد ہیں جو آج استاد کہے جا سکتے ہیں۔

بزرگوں میں ایسی باغ و بہار شخصیتیں کم دیکھیں استادوں میں ایسے صاحب نظر کم ملے۔ ادب کے پرستار ملے ہیں۔ ادب کا ایسا سچا اور والہانہ عشق کم پایا۔ پرانوں میں نئے رنگ و آہنگ کی قدر کرنے والا ایسا کم نظر آیا مولانا کی یاد آتی ہے تو ذہن میں سینکڑوں شمعیں جل اٹھتی ہیں۔ ان شمعوں کی روشنی وقت گزرنے کے باوجود آج بھی ویسی ہی ہے۔

مولانا کی زندگی اور تصانیف پر ایک جامع کتاب کی آج کم

ضرورت باقی ہے دیکھئے یہ کب پوری ہو؟

## مولانا ضیا احمد صاحب بدایونی

حضرت مولانا احسن مرحوم ان معدودے چند اصحاب میں شمار ہوتے ہیں جو بہ یک وقت مشہور شاعر، ممتاز ادیب، نکتہ رس محقق، نامور مصنف اور بلند اخلاق انسان تھے۔ وہ بڑے باغ و بہار تھے اور جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا تھا وہ بھی شگفتہ ہو جاتا تھا۔

آج جب کہ مولانائے مغفور کی یاد منائی جا رہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سیرت کے بعض پہلو جنہوں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا، عرض کر دوں۔

(۱) وہ ہجوم افکار میں بھی خوش مزاج نظر آتے تھے۔ اور کوشش کرتے تھے کہ مخاطب کو بھی خوش کر دیں اور اگر احیاناً کسی پر غصہ فرماتے تو جلد ہی صاف ہو جاتے تھے۔

(۲) ان کو تحقیق کا صحیح ذوق تھا کسی لفظ یا مسئلے پر جب تک کسی مستند کتاب یا محقق سے رجوع کر کے شافی جواب حاصل نہ کر لیتے چین سے نہ بیٹھتے۔

(۳) مرحوم تحقیق مسائل میں اپنے سے چھوٹوں سے بھی استفادہ کرنے میں عار نہ کرتے تھے۔

(۴) بیماری یا سفر کی مجبوریوں کے علاوہ میں نے اکثر ان کو پڑھتے لکھتے یا ادبی مذاکرہ کرتے ہی دیکھا، بیکار کم دیکھا

(۵) ایک مدت مدید تک چھوڑ کر مولانائے مرحوم کو اکثر مالی مشکلات سے دوچار رہنا پڑا، اس کے باوجود وہ مہمان کی خاطر مدارات سے کبھی دریغ نہ فرماتے تھے۔

ضرورت ہے کہ مولانائے مرحوم سے تعلق رکھنے والے ان کی زندگی کے ان حسین پہلوؤں کو مشعل راہ کی حیثیت سے پیش نظر رکھیں، نیز کوشش کریں کہ ان کے بعض تصانیف جو ایسے کم یاب ہیں دوبارہ زیور طباعت سے آراستہ ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ مولانا کی یادگار میں ہونے والا یہ اجتماع ہر طرح کامیاب ہو۔ اور زبان و ادب کے سلسلے میں آئندہ اس سے مستفید نتائج برآمد ہوں۔

## جناب ممتاز حسن (صدر ترقی اردو بورڈ)

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی ہے کہ کراچی میں مولانا احسن مارہروی مرحوم کی یادگار منائی جا رہی ہے۔ احسن مرحوم کا شمار ان بلند پایہ اور باکمال بزرگوں میں ہے جنھوں نے ساری زندگی زبان اور ادب کی خدمت کرنے میں وقف کر دی۔ وہ اردو زبان کے مسلم الثبوت استاد اور اعلیٰ مرتبے کے شاعر تھے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وقتی جلسوں اور مشاعروں کے علاوہ ان کی یادگار کوئی مستقل صورت اختیار کرے۔ اگر ان کا سارا کلام احتیاط سے جمع کر کے چھپوا دیا جائے تو یہ اردو ادب کی خدمت ہوگی۔

بقیہ

## رفتار ادب (بسلسلہ ص ۲۵)

اب تک دو مضمون شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مضمون "نظم میں ابہام کی ایک مثال" فیض سے متعلق ہے اور "نظم میں افسردہ دلی کی ایک مثال" قیوم نظر سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی چابک دستی سے ان دونوں فن کاروں کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور اس اعتبار سے یہ مضامین واقعی مثالی حیثیت رکھتے ہیں ——— ادبی دنیا کی قیمت بہت کم ہے، سالانہ: چھ روپے اور فی شمارہ ایک روپیہ آٹھ آنے

پتہ:- ادبی دنیا - اکادمی پنجاب - مال روڈ - لاہور

کھینچنے میں انہوں نے بڑی چابک دستی سے کام لیا ہے۔ بہرحال دیکھ لیجئے تخلیقی فن کار نے ادیب نے اپنی پرانی معاشرت کو کیسا اجاگر کیا اور اس معاشرت کی کیسی اچھی نشان دہی کی ہے جسے پرانی تہذیب کی جگہ لینی تھی۔

بعض لوگ اور ان میں بدقسمتی سے پڑھے لکھے افراد بھی شامل ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ادیب خاص طور پر شاعر معاشرے سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ شاعر کے متعلق تو خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنی کیفیات و واردات کا اظہار کرتا ہے اور اسے اپنی ارد گرد کی دنیا سے اگر کوئی تعلق ہے تو وہ بس اتنا ہے کہ اپنے استعارات و تشبیہات کے انتخاب میں اپنے مشاہدے سے مدد لے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے پہلے اس بات پر غور کر لینا چاہئے کہ دنیائے خارج ایک ٹھوس حقیقت ہے اس کے وجود سے انکار یا نفی کرنا خود اپنے وجود سے انکار یا نفی کرنا ہے یہاں ایسے ان تصورات سے بحث مطلوب نہیں جہاں ؂

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

نہ تصوف کے اس حیرت کدے کی طلسم کشائی مقصود ہے جہاں قطرہ انا البحر پکارتا ہے اور اس کے بعد ہنکارتا ہے ؂

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

کیوں کہ ان تمام باتوں کے باوصف خواہ وہ ویدانت کا فلسفہ ہی ایک دنیا کے وجود کا اثبات تو کرنا ہی پڑتا ہے یہ کہہ کر کہ یہ دنیا وہم و خیال ہے انسان کی مشکلات رفع نہیں ہو جاتیں۔ میرے یہ سوچ لینے سے کہ مجھے سینے میں جو درد ہو رہا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کیوں کہ وہ دنیا ہی سر تا سر وہم ہے جس میں مجھے رکھا گیا ہے درد کی شدت میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ بہ ہر حال ان نکتہ سنجیوں اور نکتہ طرازیوں سے قطع نظر اس میں کوئی شک نہیں کہ جس مادی دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کے کوائف لمحہ بہ لمحہ اور پل پل بدلتے رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے افکار اور تصورات بھی پل پل نئے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں۔

میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ بہت سے جلیل القدر مفکروں کی تحریروں کے مطالعے پر مبنی ہے کہ فطرت اپنی تغیرات اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے پل پل نئے سانچوں میں ڈھلتے ہوئے کوائف سے کام لے کر بتدریج ارتقا کی راہ پر گام زن ہوتی ہے اور ایک منزل مقصود تک پہنچتی ہے یہ منزل مقصود کیا ہے اس کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے۔ بعض مفکروں نے تو یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ فطرت کا مقصد یہ ہے کہ تمام تخلیقات کو تہس نہس کر دے۔ اسی طرح انسان گناہ اور شر کے پھندے سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ مانی نے جو مشہور ایرانی مفکر تھا ساسانی عہد میں اسی قسم کے نظریات پیش کئے نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے نے جو اپنی بقا کا طالب ہے اور اپنی زندگی کا خواہاں ہے مانی کو راستے سے ہٹا دیا اور پھر زرتشت کا وہ مسلک مقبول ہو گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان دنیا میں پھلے پھولے یا اسلام کی اصطلاح میں تسخیر کائنات کے عمل میں مصروف ہو۔

بعض مفکر یہ کہتے ہیں کہ فطرت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو جو حقیقت مطلقہ کا ایک جزو ہے اور اس سے جدا ہونے کے بعد مانند نے نالاں ہے اور جب تک یہ جزو اپنے کل سے نہ مل جائے گا انسان درد فراق اور اضطراب شوق میں تڑپتا رہے گا یہاں تک کہ خدا اور بندے کا یوں اتصال ہو جائے کہ دونوں میں تمیز ممکن نہ رہے یہ ارباب صوفیا کا عقیدہ ہے اور مولانا روم نے اسے بہت پھیلا کر بیان کیا ہے ان کی مثنوی کے ابتدائی اشعار جو انگریزی میں SONG OF THE REAL کہلاتے ہیں وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی نغمہ نے۔ اقبال کہتے ہیں کہ انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ معاشرت کو ان سانچوں میں ڈھالے جو اس کے ذہن میں موجود ہیں اور خارجا اس دنیا کی تخلیق کرے جو اس کے بطون میں کروٹیں لے رہی تھی۔

عزیز احمد نے اپنی تصنیف "اقبال" میں علامہ مرحوم کے در لوز سے بہت مفصل بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

اقبال تلوار کا کلمہ استعمال کرتے ہیں تو عام طور پر ان کی مراد اسلامی معاشرے کے افراد سے ہوتی ہے کہ وہ تمام نظام ہائے کہنہ کو برباد کر کے اور تمام ناصحت مند اقدار کو مسترد کر کے تسخیر کائنات کے عزائم میں مشغول ہو جاتے ہیں اور یوں اپنا معاشرتی اور مذہبی منصب پورا کرتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور معاشرت میں کوئی جدائی نہیں ہے اور اسلام میں یہ بات نہیں کہ جو عیسوئیت میں ہے کہ کلیسا اور شاہانہ طاقتیں برسوں برسرپیکار رہیں تا آنکہ سیاسی اور ملکی معاملات میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہ رہا، اور بادشاہوں نے یہ اصول منوا کر دم لیا کہ راہبوں اور پادریوں کو امور سلطنت میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ہر ادیب کسی معاشرے سے مربوط ہوتا ہے ہر معاشرے کا ایک مذہبی مسلک ہوتا ہے پھر وہ معاشرہ صحت مند ہو تا یا ناصحت مند، تو معلوم ہوا کہ ادیب کا معاشرے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے وہ اگر ناصحت مند معاشرے کی جگہ ایک صحت مند معاشرہ قائم کرنا بھی چاہے تو وہ مجبور ہے کہ کم از کم اپنی معاشرتی کوائف کی ترجمانی کرے۔

بڑا فن کار یا ادیب معاشرے کی ناصحت مندی کو دیکھ کر اس پر چاروں طرف سے حملہ کرتا ہے۔ پرانی معاشرتی اقدار کو از سر نو پرکھتا ہے۔ جن چیزوں کو ہم معاشرتی مسلمات گردان چکے ہیں ان کی صحت وہ استدلال کے بغیر تسلیم نہیں کرتا معاشرے کے جتنے گھناؤنے ناسور ہیں ادیب سب پر سے پردہ اٹھا دیتا ہے مختصر یہ کہ وہ گناہوں اور برائیوں کو دن کی روشنی میں لے آتا ہے۔ جو لوگ معاشرتی روایات اور مسلمات کے سائے میں پل کر بڑے ہوئے جب ان پر چند حیا دینے والی روشنی پڑتی ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔

صرف یہی نہیں بلکہ معاشرتی اقدار کو پرکھتے وقت ادیب اس بات کو ملحوظ رکھتا ہے کہ TIMELESS ہیں یا نہیں یعنی زماں سے ماورا۔ اگر اسے معلوم ہوتا ہے کہ پرانی اقدار زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں تو وہ انہیں ناصحت مند روایات کا مجموعہ سمجھ کر بے تکلف مسترد کر دیتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں مصروف ہو جاتا ہے جس کے خدوخال اس کے ذہن میں دھندلے دھندلے موجود ہوتے ہیں۔ اقبال نے بارہا تخلیقی فن کار کی صفت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس اعتبار سے اسے خالق کہا ہے۔ فارسی میں وہ کہتے ہیں ؎

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

اسی طرح اقبال اس بات کے قائل نہیں معلوم ہوتے کہ دنیا محض وہم و خیال ہے، غالب نے دنیا کو ویدانت کی عینک سے دیکھ کر کہا تھا ؎

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

لیکن اقبال یوں نہیں کہتے وہ سمجھتے ہیں کہ ادیب پر ایسی معاشرتی ... ذمہ داریاں آن پڑی ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا نہایت مشکل ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ادیب کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ اگر کچھ نہ کرے اور کوئی مثبت نظریہ حیات پیش نہ کرے تو کم از کم معاشرت کے موجودہ کوائف کی ترجمانی تو کرے۔ جہاں جہاں گھناؤنے ناسور ہیں انہیں نمایاں تو کرے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ فن کار پرانی روایاتی اخلاقی اقدار اور معاشرتی مسلک کو بالکل ناصحت مند سمجھتا ہے اس صورت میں اسے ایک قدم آگے بڑھنا چاہئے اور لکھنا چاہئے کہ عمارت کہاں کہاں سے بوسیدہ ہو چکی ہے طبعاً ادیب یہ فیصلہ کر لینے کے بعد بڑی سختی سے اپنی معاشرت کے خلاف جہاد شروع کر دے گا۔

یہ بات البتہ یہاں لکھ دینی چاہئے کہ فرائیڈ اور اس کے ہم نوا مفکروں کے خیال میں فن اصلاً ادیب کی خواہشات کی تخلیق ہوتا ہے جو اور کسی طرح تسکین نہیں پاتا، اور جس کا وہ تصفیہ کر لیتا ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ نظامِ عالم میں اقتصادی عوامل نہایت اہمیت رکھتے ہیں اور تاریخ
کی تاریخ سے بہت دخیل رہے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس نے
حقیقت کی پوری اور صحیح تصویر پیش نہیں کی کہ وہ خود معترف ہے کہ حقیقت
مطلق ہے اور ہمارا علم اضافی ہے ۔

بات یہ ہے کہ جب فن کار معاشرے کے رخ یا رجحان کا مطالعہ
کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ جس راہ پر معاشرہ گامزن ہے وہ منزلِ مقصود
کی طرف جا رہی ہے یا کسی اور طرف ۔ ادیب کا فرض ہے کہ وہ معاشرے
کے ارتقا اور رخ کے تعین کے بعد صحت مندانہ تصورات کی حمایت
کرے اس سلسلے میں غالباً روایاتی مسلمات اس کے راستے میں کھڑے
ہو جائیں گے اور وہ لوگ جو ان مسلمات کی آڑ میں زندگی بسر کرتے ہیں،
ادیب کو برا بھلا کہیں گے لیکن ادیب کو پروا نہ کرنی چاہئے۔ اگر ادیب کا
سماجی شعور ارتقا یافتہ ۔ درست، واضح اور روشن ہے تو وہ معاشرے کے
تمام صحت مند عناصر سے نکھرے گا اور اس بات سے بالکل پریشان نہیں ہوگا
کہ عوام الناس کی اکثریت اس کی مخالف ہے ۔

معاشرے کے غیر صحت مند عناصر کی تصویر کشی نہایت ضروری
ہے کہ بعض اوقات صرف ایک ناصحت مند کیفیت کو شعور میں لے آنے سے
وہ کیفیت مٹ جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ادیب کو اس بات کا خیال
رکھنا چاہئے کہ وہ جب معاشرے کی برائیوں کا ذکر کرے اور بزعم خود گھناؤنے
ماحول کی تصویر کھینچے تو ایسا نہ ہو کہ جو فنی تخلیق وجود میں آئے اس پر معاشرہ
کو بھی اعتراض ہو اور قانون کو بھی۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں جو جنسی بھوک
ہے اور جو جنسی حرماں زدگی ہے اس کا تو فن کار ضرور ذکر کرے گا لیکن اس
طرح اپنا دامن بچا کر کرے گا کہ وہ خود لذت اندوزی سے ملوث ہو،
اور نہ کتاب کا یہ مقصد ہو کہ پڑھنے والے چوری چھپے اس کا مطالعہ کریں
اور جنسی کوائف سے لطف اندوز ہوں۔ جنسی گمراہیوں کی صحت مندانہ اور
غیر صحت مندانہ کیفیات میں نہایت باریک فرق ہے اور ہر حال ادیب

کو یہ فرق ملحوظ رکھنا ہے۔ یہ فرق اجاگر ہو تو تصنیف فن پارہ ہے اور
قانون کی گرفت سے ماورا ہے ۔ یہ تصنیف معمولی گھٹیا اور ادنیٰ درجے
کی ہو تو صرف جنسی ناصحت مندی کا ذکر ہے قانون کو بھی اس پر اعتراض
ہے اور معاشرے کو بھی ۔

آخر میں یہ بات کہنی چاہئے کہ معاشرے کا تعلق ادیب سے اتنا
گہرا ہوتا ہے کہ جس وقت کسی تخلیق کو موردِ انتقاد بناتے ہیں تو ان معاشرتی
اور ثقافتی کوائف کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اس تصنیف سے متعلق ہیں
اور جنہیں اس تصنیف کا نظامِ نسبتی کہہ کر پکارا جا سکتا ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ادیب ایسی تخلیقات وجود میں
لاتے ہیں کہ زمان و مکان سے ماورا ہو جاتی ہیں لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ
ہر ادبی فن پارہ ہر فنی تخلیق اس معاشرت کو ملحوظ رکھ کر آنکی جاتی ہے جس
سے وہ مربوط ہے مثلاً رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب ۔ رتن ناتھ سرشار
کا فسانۂ آزاد اور مرزا رسوا کا امراؤ جان ادا ایک خاص معاشرتی ۔
تخلیق ہے ۔ اسی طرح سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کی تصانیف۔ حاجی بغلول
طرحدار لونڈی وغیرہ کا لطف صرف وہی حاصل کر سکتا ہے جو مربوط
متعلقہ۔ تہذیبی کوائف سے واقف ہو ۔

تو بہ اختصار کہا جا سکتا ہے کہ معاشرہ ادیب پر کچھ
ذمہ داریاں عاید کرتا ہے ، ادیب یہ ذمہ داریاں بطریقِ احسن
نبھاتا ہے تو اس کی تصانیف جلالت قدر کی حامل ہو جاتی ہیں ۔ وہ اپنی
ذمہ داریوں کو فراموش کر دے اور معاشرتی شعور سے صحیح کام نہ لے،
تو اس کی تخلیقات ادنیٰ درجہ کی ہوں گی ۔ معاشرہ افراد ہی کے مجموعے کا نام
ہے اور معاشرے کا اجتماعی مزاج وہ افراد متعین کرتے ہیں جن کو ہم فن کار
اور ادیب کہتے ہیں۔ انہیں کے ذریعے ہم خود قدر کا ایک پیمانہ ہاتھ میں لیکر
فنی تخلیقات کا مقام پہچانتے ہیں ۔

( بشکریہ استقلال لاہور )

سخاوت مرزا

# مؤلف تفسیر وہابی کی دوسری تصنیف

## ترجمہ قصص الانبیاء

قصص الانبیاء :۔ ترجمہ مولوی عبدالصمد
اوراق (۱۰۰) تقطیع ۷×۱۰ ۔ کاغذ ولایتی (دالٹرمارک)

انبیاء علیہ السلام از آدم تا خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور حضرت امام حسین کے واقعات شہادت اور اصحاب کہف بلکہ حجاج بن یوسف کے حالات بھی ہیں ۔

### آغاز

اللہ تعالیٰ ایک ہے اور سب سے بڑا ہے کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اور سب کوں پیدا کرنے ہارا ، مارنے اور جلانے ہارا ہے ۔

### خاتمہ

اللہ تعالیٰ جب حجاج بن یوسف کوں اپنے فضل و کرم سیں بخشا توں اپنے کرم سیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بخش .....

### ترقیمہ

حسب خواہش بہاؤالدین صاحب حوالدار دسویں رجمنٹ برائے خواندن راجہ محمد صاحب ... منگلور در ما شعبان المعظم ۱۲۴۴ ہجری کاتب قادر محی الدین ۔

سن تالیف قاسی نے ۱۲۳۳ھ اور نصیرالدین ہاشمی نے ۱۲۳۴ھ بیان کیا ہے گویا یہ سن تالیف سے چند سال بعد کا نسخہ ہے۔

### نمونۂ زبان

ہود پیغمبر علیہ السلام کا قصہ ہے، جب سام کی اولاد اراق میں بہت ہوئی اور اولاد نا خدا لکوں جانتے تھے اور ان کے قدان تین سو گز کے تھے اور ان میں جمع ہم کرکے ایک شخص تھا سو بادشاہ ہوا ، اور ان میں سات سو برس تک کوئی نہیں آیا۔ جب لوگ موت کوں بھول گئے تب بہوت مغرور ہوئے ، ایک روز ابلیس آکر ان سیں پوچھا کہ تم کس کے عبادت کرتے ہو ، اور لوگ جواب دیئے کہ ہم کسی کی بھی عبادت کرنا جانتے نہیں پھر ابلیس جواب دیا ، اور سیں دو بت لا دیکر کہا کہ تمارے بزرگاں ایسے کا پوجا کرتے تھے تم بھی اس کا پوجا کرو ، بعدہٗ او لوگ بت پرستی کرکر کافر ہوئے اور اس قوم میں عاد نام ... ہوئے ، ان میں عبادت کا قد سب سیں بڑا تھا ، اس قوم میں بڑا قد چار سو گز تھا اور چھوٹا قد ستر گز کا تھا ۔ بعدہٗ اللہ تعالیٰ عاد کی قوم میں نوح علیہ السلام کے بعد سات سو برس کے ہود علیہ السلام کوں پیدا کیا ۔ پھر اللہ تعالیٰ ہود علیہ السلام کوں پیغمبری اور نبوت دے کر حکم کیا کہ تم خلق کوں ... زبان ... تعالیٰ کا ... [illegible]

(باقی صفحہ 4)

# بھارت میں اردو

بھارت میں اردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ ایک دلچسپ ناٹک سے کم نہیں، قومی بھاشا کی حیثیت سے ہندی کی ناکامی کے بعد صورت حال اور بھی مضحکہ خیز ہو گئی ہے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے بھارت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اردو کو ایک علاقائی زبان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہیئے، لیکن وہ علاقہ کون سا ہے جہاں اردو کم از کم صوبائی زبان کی حیثیت ہی اختیار کر سکے؟ یو۔پی اردو کا گھر تھا لیکن وہاں اسے زبردستی دیس نکالا دیا جا رہا ہے اور اس کی جگہ نامانوس ہندی کو سرکاری ڈنڈے کے زور سے مسلط کرنے کی مہم جاری ہے۔

لکھنؤ کی طرح دہلی بھی اردو کی جنم بھومی ہے لیکن فرقہ پرست یہاں بھی اس کے گلے پر چھری رکھے بیٹھے ہیں۔ اگست ۱۹۵۸ء کی بات ہے دہلی کارپوریشن نے ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ دہلی کمشنری میں ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کو بھی رائج رہنے دیا جائے چنانچہ ۲۰ اگست ۱۹۶۰ء کو میر کارپوریشن نے مذکورہ ریزولیشن کی تائید میں ایک قرارداد پیش کی جس میں میئر کو اختیار دیا گیا کہ وہ پانچ ممبروں کی ایک کمیٹی بنائیں جو وزارت داخلہ سے درخواست کرے کہ دو سال پہلے کے سرکلر پر عمل درآمد کیا جائے اور اردو کو پبلک امور کے لئے دوسری زبان کی حیثیت سے جاری رکھا جائے۔

ابھی قرارداد اچھی طرح پڑھی بھی نہیں گئی تھی کہ جن سنگھ کے ممبروں نے شور مچا دیا کہ دہلی کمشنری میں اردو کو ثانوی زبان قرار دیئے جانے پر شدید احتجاج کیا جاتا ہے۔ راوی ہے کہ مسٹر شیو چرن گپتا نے ریزولیشن کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ہندی تو بہر حال قومی زبان ہے لیکن اردو کی حما کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے ہندی کے مقابلے پر جگہ دی جائے ارد کا درجہ محض ثانوی ہوگا البتہ مسٹر فتح سنگھ نے حقائق کا سہارا لیا اور بتایا ک اردو نے اس ملک کی تاریخ اور کلچر کی تعمیر و ترقی میں نمایاں رول ادا ک ہے اس میں دوسری زبانوں کو اپنانے کی بھی صلاحیت ہے لہذا اسے اس کا جائز مقام ملنا ہی چاہیئے۔

جن سنگھ کے نمائندے مسٹر دیو پرکاش شاستری نے قرارداد مخالفت کی، اردو کی خدمات کا انکار کیا اور کہا ماضی کی طرح اردو اب زیادہ دیر اپنے مقام پر نہیں رہ سکے گی۔ مسٹر شاستری نے اس سلسلے میں دلچسپ دلیل پیش کی ہے کہ دہلی میں کم سے کم ایک لاکھ سے زیادہ آ پنجابی بولتے ہیں لہذا یہ امر غور طلب ہے کہ اردو کسی جائز مقام کی مستحق بھی یا نہیں؟ لیکن جب کانگرس اور کمیونسٹ ممبروں نے ۴۲ ووٹوں سے ریزولیشن پاس کر دیا تو جن سنگھ کے نمائندے بطور احتجاج ہال سے وا آؤٹ کر گئے۔

دہلی کمشنری میں تو اردو کی ثانوی حیثیت برقرار رہے گی لیکن م پنجاب میں کیرون سرکار اردو کا جھٹکا کر رہی ہے چنانچہ حکومت نے ت اضلاعی حکام کو ایک سرکلر بھیجا ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ اردو کی بجا اب سرکاری دفتروں میں ہندی اور پنجابی کو جگہ دی جائے۔ اردو کو سے نکالنے کی سرکاری مہم دو قسطوں پر مشتمل ہے اکتوبر ... تک اردو

تعبیر ہو جانی چاہیے لیکن رہا سہا کام اکتوبر ۶۲ء کو مکمل ہو جائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ دو سال کے بعد سرکاری طور پر مشرقی پنجاب سے اردو کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔

۱۹۴۹ء میں سچر گورنمنٹ نے اردو کو پرائمری اسکولوں کے لئے لازمی قرار دیا تھا لیکن اردو دشمنوں نے سچر فارمولا کو عملاً ناکام بنا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ کاروباری طبقے میں شاید اردو کچھ عرصہ تک زندہ رہے لیکن سرکاری ملازموں کو ہندی اور پنجابی تعلیم دینے کے لئے کیرون سرکار نے اتنی مرکز قائم کئے ہیں۔ چنڈی گڑھ اور دہلی میں معلموں کی ایک کھیپ کی کھیپ اردو کے خلاف تیار ہو رہی ہے لیکن "موت کے وارنٹ" جاری ہونے کے باوجود یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ بھارتی پنجاب کے ۷۵ فی صد اخبارات اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں اور لوگ انہیں دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سرکاری حلقوں میں انگریزی اور اردو کے سوا کوئی زبان بھی نہیں بولی جاتی دیکھنا اب یہ ہے آیا پنجاب گورنمنٹ ۱۹۶۲ء تک اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں؟ (بشکریہ نوائے وقت لاہور)

بقیہ

## وقت کی اہم ضرورت

بسلسلہ صفحہ ۲۲

ضرور عرض کروں گا کہ اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کا گلا تو آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا لیکن کیا آپ اپنی زبان کو، اس زبان کو جو کھانے پینے ہی کی طرح ہمارے اور آپ کے لئے ناگزیر ضرورت بن چکی ہے، یونہی تہی دامن دیکھنا چاہتے ہیں۔ خدارا ایک بار اردو کے ساتھ اپنے رویے پر تنقیدی نظر ڈالیے اور بچوں کے ایثار سے سبق لیتے ہوئے اس نیک کام میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھیے اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اردو یعنی وطنی ادب کو اپنی جانب بلا رہی ہے۔ اگر آپ کے احساسات جاگ جائیں تو اب بھی آپ اپنی گزشتہ ہیبت کی تلافی کر سکتے ہیں۔

شاہ حسین بخاری، رکن بزم طلوع، کراچی



(ت)

## "ستاروں سے ذروں تک"

جگن ناتھ آزاد کا مجموعۂ کلام

ادب لطیف لاہور۔

۴۷ء کے ہنگامۂ گیر و دار نے آزاد کے شعور پر بہت گہرا اور بسیط اثر ڈالا ہے ـــ اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر شاعر نے اپنے ذہن کی باگ زندگی کے ارضی مسائل کی طرف موڑ دی ہے زندگی کی عریاں حقیقتوں اور کثافتوں نے ان کے اندر ایک عمیق معنویت اور دیک بلیغ اشاریت پیدا کر دی ہے اور وہ تاروں کی نیلگوں بلندیوں سے نیچے اتر کر ارضی مسائل کی تحلیل کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیتے ہیں آزاد کے افکار میں وہ عنصر کہاں ہے جس نے جہان کی سطح چھیڑ دی ہے جو زندگی کی تمام علیم قدروں کو [illegible] کر رہا ہے اور جو بکھیرے میں انسانی زندگی کو جہنم بنا رہا ہے [illegible] [illegible] ہے وہ جو [illegible]

[illegible]

[illegible]

شہلا عاصم

# کچھ جدید ادب کے بارے میں

جدید اردو ادب جس کا دھارا مشرقی اور مغربی تہذیب کے اشتراک سے پھوٹا، آج اس کی رفتار اس قدر مدھم ہو گئی ہے کہ ہمارے ادبی حلقوں میں ادب کی پست رو بڑی مشکوک نظروں سے دیکھی جا رہی ہے اسی وجہ سے بعض حضرات کو موجودہ دور کے ادب پر جمود چھایا ہوا نظر آتا ہے اور وہ ادب کے دھارے کو آگے بڑھانے کی تجاویز پیش کرتے ہیں۔

رفیق خاور نے بھی اپنے مضمون میں " اردو ادب کی تشکیل نو " کے عنوان سے جدید ادب پر ایک اچھے مبصر کی طرح تبصرہ کرتے ہوئے ادب کی وسعت اور ترقی کے لئے بعض اہم اور مفید مشورے دیے ہیں۔ اگر یہ مشورے اور تجاویز اردو ادب کی مدھم رو کو تیز کر سکتے تو آج جدید ادب پر جمود کا شبہ ہرگز ہرگز نہ ہوتا کیوں کہ ہمارے ادب میں یہ تجاویز کچھ نئی نہیں ہیں بلکہ اس سے بہت پہلے جدید ادب کی بنیاد رکھتے ہوئے ان اہم مشوروں کو مد نظر رکھا گیا تھا آج بھی یہ بیتی ہوئی باتیں مولانا حالی کے ایک شعر سے یاد آ جاتی ہیں ؎

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

دوسرے جہاں تک ان تجاویز کا تعلق ہے اگر تخلیقی قوت کسی خاص لائحہ عمل یا انتظام کے تحت ممکن ہے تو یقیناً ادب کے سلسلے میں ایسی تجاویز اور مشورے مفید اور معاون ہو سکتے ہیں لیکن نہ صرف اردو ادب بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادبیات میں بھی کہیں ایسی مثال نہیں ملتی کہ ادب کی تخلیق سے پیشتر اصول و ضوابط بنائے گئے ہیں۔

بہر حال رفیق خاور کے مضمون سے ہماری ادبی دنیا میں ایک "چھیڑ چھاڑ" کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں متعدد حضرات نے اپنی بعض تجاویز کے ذریعے ادب سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اہم نقادوں کے مضامین بھی اس سلسلے میں نظر سے گزرے خصوصاً "ایک مشہور نقاد، طنز نگار اور انشا پرداز نے جو کچھ "سخن در سخن" عنوان سے لکھا ہے اس سے ہمارے انتقادی ادب کے سرمائے میں ایک قیمتی مضمون کا اضافہ ہوا ہے۔ اس میں ایک اچھے نقاد کا تحمل اور آزاد غیر جانبداری ہے۔ بعض باتیں انہوں نے بہت کام کی کہی ہیں مثلاً:

" یہ بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہمارے فن کار تخلیق سے زیادہ تنقید کے زلیقہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اچھی تنقید تخلیق کا درجہ رکھتی ہے لیکن یہ جو اچھی کی شرط لگا دی گئی ہے اس کا احترام کیوں نہیں کیا جاتا۔ شاید ہم نے اس کا ابھی احساس نہیں کیا کہ اچھی تنقید اچھی تخلیق سے بدرجہا مشکل کام ہے، اس امر کو ہم شاید اس لئے ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں کہ دوسرے اور تیسرے درجے کی تنقید لکھ ڈالنا بہت آسان ہے۔ اول درجہ کی دونوں چیزیں نہایت مشکل اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں "

ڈاکٹر احسن فاروقی نے "جدید ادب کی ترقی" کے عنوان سے مضمون ان اہم تحقیقات کا انکشاف کیا ہے جو اب تک ہماری نظروں سے

مثلاً:-

۱) "حالی، نذیر احمد وغیرہ کی بس یہی فوقیت تھی کہ ان کے نتیجے درست ہوتے تھے وہ مطابق کوئٹ سے نہ لکھ جاتے، 'سبز' لکھنے میں نہ گڑبڑاتے کہ زاد ان میں سے کون ساحرف ہے مگر اس سے آگے معاملہ صاف تھا، ان میں سے ہر ایک کی زبان ایک سادگی اور انفرادیت رکھتی ہے مگر اصناف ادب کا تصور ان کا اس قدر ابتدائی ہے کہ اس وقت کا معمولی سے معمولی لکھنے والا ان سے میلوں آگے ہے"

۲) "بے تکے پن کی سب سے بڑی مثال شبلی کے یہاں نظر آتی ہے جو اپنی طباعی میں پیراگرافوں کی ریڑھ لگانے کی سب سے نمایاں مثالیں پیش کرتے ہیں"

۳) "آج کل کے نشیان تنقید میں بہت سے کتے ہیں جو بغیر سمجھے بوجھے (بقول پطرس) دوغزلے اور سہ غزلے بھونک جاتے ہیں مگر ان کی بھونک میں بھی حالی اور شبلی سے زیادہ علم اور زیادہ معنی ہیں"

۴) "... مارکسی تنقید نگار یک طرفہ سہی مگر مذاق ادب کو اس طرح نہیں بگاڑتے جیسے حالی اور شبلی"

فاروقی صاحب کے یہ جملے ہمارے لئے انکشاف کا مقام رکھتے کیوں کہ اب تک حالی اور شبلی کی ادبی صلاحیتوں کا اس طرح کسی نے جائزہ نہیں لیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے جملے حالی اور شبلی جیسی شخصیتوں کے مقام میں کوئی تزلزل تو نہیں پیدا کر سکتے البتہ نلخیتہ ذہنوں للطاراہوں پر ڈال سکتے ہیں۔

بہر مرد ہے کہ موجودہ دور میں ہماری علمی پہنچ کا دائرہ اس قدر ...ح ہوگیا ہے کہ آج ہم نہ صرف مشرقی بلکہ مغربی زبانوں سے بھی بڑی آسانی ساتھ استفادہ کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کا فن محض تعریف و تضعیف سے آگے بڑھ چکا ہے اور مختلف علوم سے استفادہ کرکے اس نے بہت ترقی کی ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ آج بھی اگر کوئی اردو تنقید کی تشکیل جدید کو سمجھنا چاہے تو وہ بغیر حالی اور شبلی کا سہارا لئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

فاروقی صاحب کے مضمون میں بعض جملے ابہام کے نادر نمونے ہیں اور ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک جگہ مولانا حالی اور آل احمد سرور کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"حالی کو میں نقاد کہتا ہوں اور آل احمد سرور کو نقاد کہتے جھجکتا ہوں، مگر یہ صاف ظاہر ہے کہ سرور کے سامنے حالی طفل مکتب تھے"

باوجود کوشش کے اس جملے سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ موصوف حالی کو آل احمد سرور سے بہتر نقاد سمجھتے ہیں یا آل احمد سرور کو مولانا حالی سے۔

اس قسم کے اور بھی جملے اس مختصر سے مضمون میں مل سکتے ہیں جہاں تک حالی، شبلی، نذیر احمد اور آزاد کا تعلق ہے ان پر ادب کا خاتمہ نہیں ہوگیا یا ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ ان سے بہتر کوئی ادیب، نقاد یا ناول نگار نہیں ہو سکتا۔ امکانات تو یہی بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں سماج نے جو ترقی حاصل کی ہے اور ہمارے یہاں تعلیم کا رواج جس زور سے ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں دوسری زبانوں سے استفادہ کرنے کی جو سہولتیں حاصل ہیں ان کی وجہ سے موجودہ دور میں یقیناً ایسی تصنیفات منظر عام پر آتیں جو حالی کے مقدمے اور شبلی کے شعر العجم اور نذیر احمد کے ناولوں سے کہیں مستند اور معتبر ہوتیں۔ لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ باوجود تمام سہولتوں کے ایک مدت گذر جانے کے بعد بھی ہمارے ادب میں کوئی ایسی تصنیف وجود میں نہ آسکی اور یہ بات قابل غور ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

حالی کی تنقید میں لاکھ خامیاں سہی لیکن کیا آج حالی کے مقدمے کی جگہ کوئی اور تصنیف پیش کی جاسکتی ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں کے کردار تمثیلی سہی لیکن یہ ان کے ماحول، زمانے تہذیب اور معاشرت کے نمونے ہیں ان ناولوں میں سب کچھ وہی ہے جو اس وقت کی معاشرت میں تھا اگر یہ ناول اخلاقی معلم کا درجہ رکھتے ہیں تو بھی یہ اپنے وقت اور دَور کے لحاظ سے اہم ہیں لیکن سوال تو یہ ہے نذیر احمد کے بعد کونسا ایسا شاہکار ناول وجود میں آیا جس پر آج ہم فخر کر سکیں ۔

یہاں حالی شبلی اور نذیر احمد نے جو کچھ کیا اس کا جائزہ مقصود نہیں بلکہ ان کے بعد جو کچھ نہیں ہوا اس کا ذکر کرتا ہے اور یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر آج ہمارے ادبی حلقوں میں ادبی جمود کی شہرت ہے ۔

جہاں تک ادب اور جمود کا تعلق ہے ان میں اس طرح کا تضاد ہے جس طرح ہم زندگی کو غیر متحرک کے لفظ سے تعبیر کریں جس طرح بغیر حرکت کے زندگی کا وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ادب کے ساتھ جمود کا لفظ بھی بے معنی ہے ۔

ادب چونکہ زندگی کا آئینہ دار ہے اور اس کے ذریعہ جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ وہی حالات اور واقعات ہوتے ہیں جو ہماری روزمرّہ کی زندگی میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور ادیب ہماری دنیا کا وہ فرد ہوتا ہے جو ہر لحظہ بدلتی زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر ان تمام تغیرات کو اپنے فن کی صورت میں وجود میں لاتا ہے اس طرح ہم ادب کو وہ آلہ قرار دے سکتے ہیں جس میں کسی قوم کی ہلکی سے ہلکی دھڑکن بھی بڑی صاف سنائی دیتی ہے ۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں ادب پر جمود کا شبہ کیوں کیا جاتا ہے جبکہ ہمارے متعدد رسائل آج بھی بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے مزین نظر آتے ہیں تصانیف آئے دن چھپ رہی ہیں ۔ اگر موجودہ ادب پر جمود ہے تو ادب میں یہ سرگرمیاں کہاں سے نمایاں ہوتیں ۔

یہ ضرور ہے کہ کوئی بھی تصنیف یا تخلیق مصنف کی صلاحیتوں کا بیش سرمایہ ہوتی ہے لیکن کیا ہر تصنیف اس قابل بھی ہوتی ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو اس طرح متاثر کرے کہ وہ عرصۂ دراز تک نہ بھلائی جا سکے ہمارے ادب میں آج کل بہی کچھ ہو رہا ہے ۔ ادب میں جمود بالکل نہیں ہے ۔ مضامین تنقید، ناول، افسانے سب کچھ لکھے جا رہے ہیں لیکن ان میں وہ عظمت، حقیقت واقعیت، گہرائی اور خلوص نہیں جو کسی تخلیق کو اس عظمت سے ہم کنار کر سکے جس کو وقت اور زمانے کی تیز روی بھی نہیں روند سکتی ۔

موجودہ دور میں ادب میں جو انتشار ہے وہ دراصل خود ہماری زندگی کا پرتو ہے، اور یہ انتشار تہذیب و ثقافت اور اخلاقی اقدار کے غیر معین ہونے اور معاشی زندگی میں اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے مصنف میں خلوص اور محنت کا فقدان نظر آتا ہے ۔ آج کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنی قدرتی صلاحیتوں کی بنا پر لکھتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو محض ادبی حلقے میں داخل ہونے کی وجہ سے لکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

نصیر الدین ہاشمی

# خواتین حیدرآباد دکن کی

# اردو مطبوعات

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۵) روشنی کے مینار :۔ مختصر افسانوں کی نوع میں روشنی کے مینار ۔ ایک مینار کی حیثیت رکھتی ہے اس کو مختصر افسانوں کی معراج کہا جائے تو غلط نہیں ہے ۔ اس کی مصنفہ علامہ حیرت بدایونی کی دختر جیلانی بانو ہیں جو انور معظم صاحب کی شریک زندگی ہو چکی ہیں ۔ جیلانی بانو نے نہایت کم عرصہ میں اچھی شہرت حاصل کرلی ہے ۔ مختصر افسانوں اور مزاحیہ لٹریچر کے باعث حیدرآباد کی ہی نہیں بلکہ دنیائے اردو کی ممتاز خاتون ہیں ۔ ان کی یہ کتاب پاکستان کے بین القومی ادب کے مقابلے میں درجہ اول کا انعام پا چکی ہے ۔ روشنی کے مینار کے تمام افسانے بلند معیار کے حامل ہیں ۔ ان میں عصر حاضر کی سماجی اور سیاسی حقیقتوں کو موضوع بنا کر کئی کہانیاں لکھی گئی ہیں ان کو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے ۔

جیلانی بانو کی افسانہ نگاری کے متعلق زینت ساجدہ نے "حیدرآباد کے ادیب" میں حسب ذیل صراحت کی ہے جو حقیقت پر مبنی ہے ۔

" نئی نسل کے لکھنے والوں میں جیلانی بانو کا نام سرفہرست آتا ہے ان کے افسانہ نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن اس تھوڑی سی مدت میں انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ پرانے لکھنے والوں کے لئے بھی قابل رشک ہے "

(ج) ادبی مقالات کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔

| | |
|---|---|
| (۱) مقالات صغرا | صغرا ہمایوں مرزا |
| (۲) رسائل طیبہ | طیبہ بیگم بلگرامی |
| (۳) ماتم سرگرشش | سارا بیگم |
| (۴) فتراک | جہاں بانو نقوی |
| (۵) نذر دکن | سکینہ بیگم |
| (۶) بزم ادب | مقبول فاطمہ |

مقالات صغرا : ۔ صغرا ہمایوں مرزا کے چند مضامین اور تقاریر کا مجموعہ ہے خصوصاً وہ تقاریر قابل ذکر ہیں جو انگلستان میں کی گئی ہیں ۔

رسائل طیبہ : ۔ کی مصنفہ طیبہ بیگم بلگرامی ہیں جن کے ناولوں کا تذکرہ ہو چکا ہے اس کتاب کو آپ کی دختر سکینہ بیگم نے مرتب کر کے شائع کیا ہے ۔

طیبہ بیگم ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ تھیں جو صدیوں سے علم کا خدمت گزار رہا ہے اور خود طیبہ بیگم کی زندگی بچپن سے مرتے تک علمی ماحول میں بسر ہوئی ۔ حیدرآبادی خواتین میں علم پھیلانے، جہالت کو دور کرنے اور بے جا رسومات سے اور اسراف کی عادت کو دور کرنے کے لئے جد و جہد کرتی تھیں ۔ رسائل طیبہ میں آپ کے بعض مضا

تقاریر اور خطوط شامل ہیں جن سے آپ کے قومی درد اور علمی انہماک کا ثبوت ملتا ہے ۔

ماتم سروش : اس کی مولفہ سارا بیگم دختر احمد مدنی مرحوم ہیں اور مدنی صاحب مدرسہ دارالعلوم کے لکچرار تھے " سروش " آپ کے فرزند کا تخلص تھا جن کا ایچ سی ایس میں انتخاب ہوگیا تھا ۔ سارا بیگم نے اپنے جواں مرگ بھائی کے مختصر حالات ان کے کلام وغیرہ کا تذکرہ ماتم سروش میں کیا ہے ایک غم زدہ بہن کے حقیقی تاثرات ماتم سروش میں نظر آتے ہیں ۔

قزاق : جہاں بانو نقوی صاحبہ کے مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف النوع موضوعات پر لکھے گئے ہیں ۔ ان مضامین کے اسلوب کی دل کشی اور زبان کی سادگی و شستگی کے ساتھ معلومات آفرینی قابل داد ہے ۔ ایک عرصہ تک یہ کتاب نسوانی مدرسوں کے نصاب میں شامل تھی ۔

(۵) نذر دکن کو سکینہ بیگم نے مرتب کیا ہے ۔ سکینہ بیگم طیبہ بیگم بلگرامی کی دختر ہیں جن کو علمی ذوق اور دل چسپی گویا ورثہ میں ملی ہے ۔ یہ کتاب ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شائع ہوئی ہے ۔ اس میں حیدرآباد کے چند صاحب ذوق خواتین اور طالبات کے مختلف النوع مضامین اور نظمیں شامل ہیں ۔ یہ مضامین تاریخی ، ادبی ، معاشرتی وغیرہ موضوعات پر ہیں جو حیدرآباد کی ادبی تاریخ میں جگہ پاسکتے ہیں اور اپنے موضوع کے لحاظ سے کافی دل چسپ ہیں ۔

(۶) بزم ادب ۔ مضامین اور نظم کا وہ انتخاب ہے جو دسویں جماعت کے نصاب میں ہے ۔

## (د) تنقید

اگرچہ فن تنقید مشرقی علوم میں شامل ہے مگر مغربی ادب نے فن تنقید کو جس قدر بلند کیا اور تنوع پیدا کیا ہے وہ پوشیدہ نہیں اب ادب کی ہر شاخ کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے ۔ تنقید کے اصول خصوصیت سے اہمیت رکھتے ہیں ۔

اگرچہ فن تنقید کے متعلق کوئی خاص کتاب خواتین حیدرآباد نے مرتب نہیں کی ہے مگر تنقیدی اصول کے لحاظ سے کئی کتابیں مرتب کی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں ۔

| | |
|---|---|
| (۱) محمد حسین آزاد | جہاں بانو نقوی |
| (۲) نذر دلی | لطیف النساء بیگم ۔ نعیم النساء بیگم<br>نجم النساء بیگم ۔ جہاں بانو نقوی صاحبہ |
| (۳) کنارے کے موتی | امتہ الکریم خورشید نذیر صاحبہ |
| (۴) حیدرآباد کے ادیب | زینت ساجدہ صاحبہ |
| (۵) مہ لقا | ثمینہ شوکت صاحبہ ایم اے |

محمد حسین آزاد : جہاں بانو نقوی صاحبہ کے امتحان ایم اے کا مقالہ ہے اس کی اہمیت کے مدنظر ادارہ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے یہ کتاب محمد حسین آزاد کے متعلق اردو میں پہلی تحقیقاتی کتاب ہے اس سے پہلے آزاد کے متعلق کوئی تحقیقی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی جہاں بانو نے بڑی تلاش و جستجو اور تحقیق کے ساتھ ساتھ یہ کتاب مرتب کی ہے ۔ اس میں مولانا آزاد کی حیات اور ان کے علمی کارناموں کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور تنقیدی موشگافی کی داد دی ہے سلیقہ سے ترتیب دیا ہے اور سنجیدگی سے ہر ایک مسئلہ پر بحث کرکے اردو ادب میں آزاد کے مقام کو ثابت کیا گیا ہے اس کتاب میں بعض جگہ خود آزاد کے ادبی رنگ کی جھلک نظر آتی ہے ۔ بہر حال جہاں بانو نے بڑی محنت اور کاوش سے اس کو مرتب کیا ہے ۔

نذر دلی ۔ میں چار خواتین کے مضامین شامل ہیں اس کتاب کی ترتیب یوم دلی کے موقع پر ہوئی ۔ ایم اے کی چار طالبات نے اس میں حصہ لیا ہے ۔ اس میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں ۔

| | |
|---|---|
| (۱) دلی کا تخیل | لطیف النساء بیگم ایم اے |
| (۲) دلی کی معلومات اور خصوصیات شاعری | نعیم النساء بیگم اے ایم ایڈ |

(٣) ولی اور تصوف — نجم النساء بیگم ایم اے

(۴) ولی کا فن شاعری — جہاں بانو ایم اے

اگرچہ ہر ایک مضمون اپنی خوبیوں کے لحاظ سے قابل داد ہے مگر پہلا مضمون زیادہ تفصیل سے لکھا گیا ہے اور آخری مضمون اپنے آخری ادبی جواہر کی وجہ سے بہت گرانقدر ہے ۔ علامہ سلیمان ندوی نے آخری مضمون کی بڑی تعریف کی اور داد دی تھی ۔

(٣) حیدرآباد کے ادیب : یہ کتاب زینت ساجدہ ایم اے کے قلم حقیقت نگار کی منت پذیر ہے اس میں حیدرآباد کے (٥٣) نثر نگاروں کا تعارف ، تنقید اور نثر کا نمونہ پیش کیا گیا ہے ۔ زینت ساجدہ نے اس کتاب میں نہ صرف ادیبوں کے مختصر حالات اور ان کی نثر کا نمونہ پیش کیا ہے بلکہ اپنے اچھوتے اور دلکش انداز میں ان کے نثر پر مختصر تنقید بھی کر دی ہے جس کو حقیقت نگاری کا صحیح نمونہ کہا جا سکتا ہے ۔

(۴) جھنکار کے موتی : عبدالقیوم خان باقی مرحوم کے چند شعروں پر خورشید نذیر صاحبہ نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں ۔

(٥) مہ لقا : تمینہ شوکت صاحبہ کی تالیف ہے اگرچہ مولفہ صاحبہ نے کافی محنت کی ہے مگر پوری طرح تلاش اور جستجو سے کام نہیں لیا اور حیدرآباد کی تاریخ اور سیاست ، رسم و رواج سے اچھی طرح واقف نہ ہونے سے اس میں بڑی فاش غلطیاں ہو گئی ہیں ۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین میں تلاش اور جستجو کا جذبہ کارفرما ہے ۔

## (ھ) مکتوبات

(١) بربط ناہید — جہاں بانو نقوی

(٢) میرے موسومہ خطوط — صغرا ہمایوں مرزا

" بربط ناہید " جہاں بانو کے ذہنی خطوط کا مجموعہ ہے جو نازک خیالی شگفتگی شیرینی کے جواہرات سے آراستہ ہے ان خطوط میں رنگینی ، ظرافت کی چاشنی اپنی بے تکلفی راز دنیا نہ کے جلوے نظر آئیں گے ۔ شوخ طنز اور طعنوں کے تیر اور چبھتے ہوئے نشتر دستیاب ہوں گے ۔ مکتوبات کے شعبہ میں اس کو صف اول میں جگہ دی جا سکتی ہے ۔

" میرے موسومہ خطوط " صغرا بیگم نے اپنے موسومہ مردوں اور عورتوں کے خطوط کو شائع کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرحومہ کی دوستوں میں کیسی ہمہ گیری تھی ۔ ہر طبقہ اور ہر ذہنیت کی خواتین آپ کے دوستوں میں شامل تھے ۔

## (و) مزاحیہ ادب

(١) گل خنداں : کے نام سے آصف جہاں بیگم کی تصنیف ہے جو اب پاکستان چلی گئی ہیں ، اس کا پیش لفظ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب جیسے مزاحیہ نویس نے لکھا ہے ۔ گل خنداں کے معیار کے لئے مرزا صاحب کے خیالات کا ایک اقتباس پیش ہے ۔

" ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضامین لکھنا صرف مردوں ہی کا حصہ ہے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ صنف نازک بھی ہمارے حصہ دار بن گئی ہیں بلکہ یوں کہو کہ صنف نازک بننے سے قبل ہی لڑکیوں نے ہمارے مال پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے ۔ ہم مذاق سے مطلب کسی ہنسی کی بات پر نہیں لیتے تھے مگر یہاں ہر فقرے میں چٹکیاں لی گئی ہیں اور مزا یہ ہے کہ ہر فقرے پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے "

## (ز) نظم

ادب کی اہم شاخ شاعری ہے ۔ مغرب میں شاعری کو مختلف اقسام میں تقسیم کرنے کے بجائے صرف " نظم " کا نام دیا جاتا ہے مشرق میں شاعری کے کئی اقسام ہیں یعنی مثنوی ۔ قصائد ۔ غزلیات ۔ رباعیات ۔ قطعہ وغیرہ ۔ مثنویاں بھی تاریخی ، سوانحی افسانوی وغیرہ ہیں جن کو موضوع کے لحاظ سے اس فن میں بیان کر سکتے ہیں ۔ بہرحال شاعری کا علاقہ ہے ۔ جو کتابیں منظومات کے ذیل میں شمار ہوتی ہیں ، وہ حسب ذیل ہیں

(١) دیوان مخفی — بدر النساء بیگم

| | |
|---|---|
| (۲) دیوان کمال | کمال النساء بیگم |
| (۳) غم گسار ہمدم | کمال النساء |
| (۴) موج تخیل | نوشابہ خاتون بی اے |
| (۵) انیسیات | انیسہ بیگم شروانی |
| (۶) آبگینۂ شعر | بشیر النساء بیگم |
| (۷) رافت سلطانی | بشیر النساء |
| (۸) درد غم | بشیر النساء |
| (۹) سرمۂ دل خوش | بشیر النساء |
| (۱۰) انوار | صغرا ہمایوں مرزا |
| (۱۱) نذر علی | صغرا ہمایوں مرزا |
| (۱۲) نغمۂ توحید | مسز برکت رائے |
| (۱۳) ذکر و فکر | تہنیت النساء بیگم زور |
| (۱۴) صبر و شکر | " " |
| (۱۵) ہدیہ مولا | لطیف النساء |
| (۱۶) ہدیہ طاہرہ | بانو طاہرہ سعید |
| (۱۷) دیوان داؤد | مرتبہ خالدہ یوسف |

بدر النساء بیگم مخفی اور کمال کا کلام پرانی وضع کا ہے جب کہ غزل اپنے تغزل کے لیے مشہور رہتی۔ موج تخیل نوشابہ خاتون کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں نظمیں بھی شامل ہیں اور غزل بھی جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ نوشابہ خاتون جامعہ عثمانیہ کی پہلی گریجویٹ خاتون ہیں۔ کم سنی سے ان کو شاعری سے دل چسپی رہی۔ خلافت کے جلسوں میں ان کی نظموں نے بڑی شہرت حاصل کرلی تھی۔ ان کی نظمیں بہ اسلوب بیان اور پرواز تخیل کے لحاظ سے اور غزلیات اپنی صفائی و شستگی کے لحاظ سے قابل داد ہیں۔

" آبگینۂ شعر " یہ بشیر النساء بیگم بشیر کے ہر قسم کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں نظمیں اور غزلیات شامل ہیں۔ بشیر اقبال کے طرز اور رنگ میں طبع آزمائی کرتی ہیں اور ان کی کوشش کامیاب ہے ان کا کلام۔۔ بلندیٔ خیال اور گہرائی کے ساتھ جدت آفرین ہوتا ہے سادگی اور صفائی کا بھی آئینہ دار ہے۔

" انیسیات " انیسہ بیگم شروانی کے کلام کا مجموعہ ہے اس میں نظمیں اور غزلیات دونوں شامل ہیں۔ نعتیہ کلام کم ہے۔ انیسہ کا کلام شاعری کی خوبیوں سے مالامال ہے۔ تخیل کی بلندی، خیالات کی جدت زبان کی صفائی اور پاکیزگی کے جوہروں سے آراستہ ہے۔ " ذکر و فکر اور صبر و شکر " تہنیت النساء بیگم کے کلام کے دو مجموعے ہیں جو کچھ عرصہ قبل شائع ہوئے ہیں۔ تہنیت زور کا کلام تمام تر نعتیہ ہے۔ عشق رسول میں ڈوبا ہوا یہ کلام اپنی نظیر آپ ہے۔ محترمہ کا زور قلم اور فکر ہر طرح قابل داد ہے۔ اس سے جذبۂ صادق اور پاکیزہ مذاق کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

نغمۂ توحید :۔ مسز برکت رائے حیدرآباد کی ایک مشہور سماجی خاتون ہیں جو مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں آپ کو اردو سے خاص دل چسپی ہے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ نغمۂ توحید میں آپ نے وید کے کئی اشلوک کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

ھدیہ طاھرہ :۔ بانو طاہرہ نے نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام اردو دنیا میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ ہدیۂ طاہرہ میں موصوفہ کا صرف وہ کلام شامل ہے جو نعتیہ ہے یا منقبت اور مدح اہل بیت او ماتم شہدائے کربلا سے متعلق ہے۔ یہ کلام اپنی جدت خیال اور صفائی اور سادگی کے مد نظر قابل داد ہے۔ بانو طاہرہ فارسی اور اردو کی ایک باکمال شاعرہ ہیں ان کے کلام میں بلند پرواز تخیل ملتا ہے۔

ھدیہ مولا :۔ یہ لطیف النساء بیگم ایم اے کے مرثیوں اور نعتیہ کلام

کا مختصر مجموعہ ہے۔ لطیف النساء بیگم ان پانچ طالبات میں شامل ہیں جو پہلی مرتبہ زنانہ کالج سے ایم اے کامیاب ہوئی ہیں۔ ان کا مقالہ "اردو شاعری میں تصوف" بڑے معرکہ کا مقالہ ہے۔ دریہ مولا کا کلام پاکیزہ اور تخیل کا اچھا نمونہ ہے۔

"دیوان داؤد" مرتبہ ڈاکٹر خالدہ یوسف صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے اس کو مرتب کیا ہے یہ اورنگ آباد کے مشہور شاعر ولی کے ہم عصر داؤد کا دیوان ہے۔ خالدہ نے ایک بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ داؤد کا دیوان شائع کیا ہے۔

## تاریخ و سوانح

اب تک اس عنوان پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ تاریخی کہانیاں — خجستہ سلطانہ بیگم
۲۔ فغان ایران — ام الاعظم بلگرامی
۳۔ تذکرۂ خاصان خدا — مصطفائی بیگم
۴۔ یوسف دکن — مصطفائی بیگم
۵۔ حیات زرخ بخش صاحب — انیسہ بیگم شروانی
۶۔ بی بی فاطمہ — صغرا بیگم ہمایوں مرزا
۷۔ نیا روس — مسز سنہا

خجستہ سلطانہ بیگم تیموری حیدرآباد کی وہ صاحب علم خاتون تھیں جن کی قابلیت کو مشاہیر نے تسلیم کر لیا تھا۔ فارسی اور اردو کی اعلیٰ قابلیت رکھتی تھیں اور محبوبیہ گرلز اسکول میں اپنے علم کی روشنی پھیلاتی رہیں تاریخی کہانیوں میں انہوں نے دلچسپ اسلوب میں کہانی کے طرز پر تاریخی واقعات لکھے تھے۔

فغان ایران۔ مارگن شوسٹر امریکہ کے ماہر معاشیات کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو ایران کے خزانہ کی اصلاح پر مامور ہوا تھا۔ اس نے زار روس اور انگلستان کی قدیم ایران کش پالیسی کا انکشاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ زار روس اور انگریزوں نے کس طرح ایران کی قاچاری حکومت کو عاجز کر دیا تھا۔ یہ کتاب اپنے بہترین اسلوب کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مترجمہ بلگرامی خاندان کے ایک ممتاز خاتون ام الاعظم تھیں۔

(باقی)

بقیہ

# یادوں کے چراغ

بسلسلہ صفحہ (۷)

گئے۔ سوا شیخ عبداللہ کے باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شیخ صاحب اس قدر ضعیف اور نحیف ہو گئے ہیں کہ کلام کرنے سے معذور ہیں۔

وہ کالج جو کبھی مورد لعن وطعن تھا، مسلمانان ہند کی تہذیب و تعلیم اور سیاست کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے جو آواز اٹھتی وہ تمام مسلمانوں کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ اس کالج کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا۔ یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں بیداری اور حیات نو پیدا کرنے میں اس کالج نے جو کام کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔

(ختم شد)

بقیہ

## ترجمہ قصص الانبیاء

(بسلسلہ صفحہ ۳۳)

مستعمل متروک ہے۔ تفسیر کی جمع تفسیریں، مرد کی جمع مرداں، عقد کی جمع عقداں۔

بہ نسبت تفسیر واہبی کے قصص الانبیاء کی زبان اور صاف ہے اس لئے کہ یہ اس کے سالہا سال بعد کی تالیف ہے۔ ان کی زبان بہ نسبت معاصرین کے اس لحاظ سے صاف ہے کہ مولوی عبدالصمد عبد الرزاق کے بھائی تھے جنہوں نے ہندوستان میں صحبت پائی ہے مولوی عبدالصمد نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ عوام الناس اس سے مستفید کریں چنانچہ تفسیر واہبی کی تمہید میں اس کا اظہار کیا ہے۔

# رفتارِ ادب

## ماہنامہ 'ندیم' ڈھاکہ

(نذرالاسلام نمبر)

"ندیم" مشرقی پاکستان کا واحد اردو ماہنامہ ہے جس کا اجراء سال رواں کے شروع میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے مدیر ارشد کاکوی ہیں اور نگران ڈاکٹر عندلیب شادانی ——— حال ہی میں "ندیم" کا نذرالاسلام نمبر شائع ہوا ہے۔ قاضی نذرالاسلام بنگالی کے بہت بڑے شاعر ہیں اردو داں طبقہ اگرچہ - - ان سے اچھی طرح متعارف ہے لیکن ابھی اس کی ضرورت ہے کہ ان کے کلام اور پیغام کو اردو دنیا میں زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ ادارۂ ندیم نے "نذرالاسلام نمبر" شائع کرکے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پیدا کیا ہے۔ اس قسم کی کوششوں سے ملک کے دونوں حصوں کو قریب سے قریب تر لایا جا سکتا ہے، اسی طرح بنگالی رسالے بھی اردو کے شاعروں ادیبوں کے بارے میں خصوصی شمارے شائع کریں تو ملک میں خوشگوار ادبی ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں یونس حمز، وفا راشدی، سید حسن الامیرالاسلام مشرقی اور پروفیسر حسن عظیم آبادی وغیرہ نے نذرالاسلام کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب کے ایک افسانے اور چند نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔

'ندیم' چونکہ مشرقی پاکستان کا واحد اردو ماہنامہ ہے اس لئے ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ پرچہ زیادہ سے زیادہ مقبول ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تمنا بھی ہے کہ اہلِ ادارت نگارشات کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں اس کے بعض پرچوں میں ایسی چیزیں بھی چھپی ہیں جو ادبی معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس سلسلے میں ایک حقیر مشورہ یہ بھی ہے کہ ایسے خطوط جن میں مدیر کی تعریف[1] ہوتی ہے اور جو ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں شائع نہ کئے جائیں تو بہتر ہے۔ ایسی باتوں سے رسالے کی سنجیدگی مجروح ہو جاتی ہے۔ خیر ایسے خطوط کا جواز تو ہے کہ مدیرِ محترم کی انا کو تسکین پہنچتی ہوگی لیکن ایسے خطوط کو چھاپنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی جن میں زرِ سالانہ ارسال کرنے کی اطلاع دی گئی ہو ——— سالانہ قیمت، چھ روپے فی پرچہ آٹھ آنے پتہ :- ۳۰ - پرانا پلٹن ڈھاکہ ——— نذرالاسلام نمبر کی قیمت ۱۲ ؍ ہے۔

## نغماتِ لطیف

شاہ عبداللطیف بھٹائی سابق سندھ کے واحد مفکر اور صوفی شاعر گزرے ہیں 'نغماتِ لطیف' اسی بیدار دماغ شاعر کے کلام و پیام کا مظہر ہے۔

'وادیٔ مہران' میں اردو کی ترویج و اشاعت کا کام ادھر پانچ چھ سال میں کافی ہوا ہے چند اہلِ علم نہ صرف اردو کی نمایاں خد مت

---

[1] مثلاً :- ——— "آپ ابھی نہیں دو چار صدی بعد ایک شاعر اور مدیر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے" ——— یا ——— "آپ کی اس کاوش کو ستاروں پر کمند ڈالنے سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا"

کر رہے ہیں بلکہ سندھی زبان کو اردو داں طبقے سے متعارف کرانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں اختر انصاری اکبر آبادی کا نام سرِ فہرست آتا ہے تمام تر مشکلات اور دشواریوں کے باوجود اختر صاحب انتہائی خلوص اور جاں فشانی کے ساتھ وادیٔ مہران میں علم و فن کی خدمت کر رہے ہیں بحیثیت مصنف اور مرتب اختر صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی پر دو بڑی کتابیں مرتب کر چکے ہیں اب "نغمات لطیف" کی ترتیب بھی موصوف کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے "نغمات لطیف" شاہ بھٹائی پر ایک مکمل اور جامع کتاب کی حیثیت اس لیے رکھتی ہے کہ اس کتاب میں ان لاتعداد مطبوعہ مضامین کے اقتباسات نئے عنوانات کے ساتھ دیئے گئے ہیں جو کہ اب تک شاہ بھٹائی پر لکھے جا چکے ہیں ان اقتباسات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ کے یہاں ہر موضوع اور ہر عنوان کے تحت مفید و کارآمد خیالات کا ذخیرہ ملتا ہے۔ شاہ کے کلام کے چند شستہ و رفتہ ترجمے بھی شامل ہیں۔ چار غیر مطبوعہ مضامین ہیں جو کہ غلام محمد گرامی، لطف اللہ بدوی، رشید لاشاری اور اختر انصاری اکبر آبادی کے تحریر کردہ ہیں۔ لطف اللہ بدوی نے رومی کی شاعری کے شاہ پر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا غلام محمد گرامی نے شاہ کے مذہبی نظریے کی وضاحت کی ہے دوسرے مفکرین کے مقابلے میں شاہ عبد اللطیف بھٹائی پر سندھی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بہت کم لکھا گیا ہے اردو میں تو کوئی جامع کتاب ہی نہ تھی۔ اس کتاب کی اردو میں اشاعت ایک مستحسن کارنامہ ہے جس کے لئے محکمہ اطلاعات حیدرآباد کے ڈائرکٹر جمیل الزماں صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ ان کو یہ احساس ہوا کہ وادیٔ مہران کے عظیم شاعر کے پیام کو اردو داں طبقہ تک پہنچائیں۔ یہ کتاب یقین ہے ایک اچھی مثال قائم کریگی

## سہ ماہی "ادبی دنیا" لاہور

"ادبی دنیا" کا شمار اردو کے ان چند رسالوں میں ہوتا ہے جو محض رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، گذشتہ ربع صدی میں اس رسالے نے ادب کی جو خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے اس نے صحت مند ادب کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ کئی قابل ادیبوں کی صلاحیتوں کو بھی بیدار کیا ہے۔ آج کے لکھنے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں بجا طور پر "ادبی دنیا" کی "دریافت" کہا جا سکتا ہے۔

شاید ۱۹۵۶ء؟ کے شروع میں "ادبی دنیا" کی اشاعت ملتوی ہو گئی تھی اور اب پھر یہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مولانا صلاح الدین ہر اعتبار سے قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس رسالے کو ہمیشہ کے لیے بند نہ ہونے دیا۔ موجودہ حالات میں کسی ادبی رسالے کو جاری رکھنا بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ پہلے رسالے جو دو ایک اب تک نکل رہے ہیں وہ معیار کے "اپنی شکست کی آواز" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ "ادبی دنیا" کا معیار نہایت اعلیٰ ہے اور اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کوششوں کو بھی دخل ہے جو شریک مدیر کی حیثیت سے ادارے میں شامل ہیں۔

ادبی دنیا کے نئے دور کے دو شمارے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن میں ہند و پاکستان کے بہت سے اچھے لکھنے والوں کی نگارشات شامل ہیں۔ اس مختصر سے تبصرے میں ان سب نگارشات کا فرداً فرداً جائزہ تو نہیں لیا جا سکتا البتہ دو اہم "سلسلے" خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہر شمارے میں کسی شاعر کی ایک نظم شائع کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مختلف اہل علم حضرات کی نظم سے متعلق تنقید بھی۔ اس میں دلچسپی کی بات یہ ہے کہ نقادوں سے نظم کے مصنف کا نام مخفی رکھا جاتا ہے اور اس طرح شاعر کی ذات سے وابستہ تصورات نقادوں کی رائے کی تشکیل میں حصہ نہیں لیتے اور بحث صرف نظم کی خصوصیات تک محدود رہتی ہے، یہ سلسلہ اردو میں بالکل نئی چیز ہے امید ہے اسے ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔ پہلے شمارے میں مجید امجد کی نظم پر بحث ہوئی تھی اور دوسرے شمارے میں حمایت علی شاعر کی نظم موضوع تنقید بنی ہے۔

دوسرا سلسلہ ڈاکٹر وزیر آغا کے اردو نظم سے متعلق مضامین ہیں،

# گرد و پیش

# ملک کے دونوں حصّوں کے طلبا کے لئے یکساں نصاب تیار کیا جائے گا

## تعلیمی کمیشن کی سفارشات پر بتدریج عمل ہو رہا ہے —— وزیر تعلیم

ڈھاکہ، ۳۰ ستمبر وزیر تعلیم مسٹر حبیب الرحمن نے جو آج کراچی سے بذریعہ طیارہ یہاں پہنچے ہیں اخبار نویسوں کو بتایا کہ جہاں تک ممکن ہوگا طلبا کے لئے ملک کے دونوں حصوں میں یکساں نصاب تعلیم تیار کیا جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ نصاب کمیٹی کا کام ۱۷ ستمبر کو ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں نئی درسی کتابیں مرتب کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں گے۔ نصاب کمیٹی اس وقت اپنی سفارشات کو آخری شکل دے رہی ہے۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات پر بتدریج عمل کرنا چاہتے ہیں اگر ایک ساتھ بہت سی باتوں پر عمل شروع کیا گیا تو غلطیوں کے امکانات بڑھ جائیں گے ان سے دریافت کیا گیا کہ طلبا کے وظائف پر کس قدر رقم صرف کی جائے گی تو انہوں نے کہا کہ وظائف دینے کے لئے ایک اسکیم بنائی گئی ہے یہ اسکیم مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان وظائف کے سلسلے میں ایک ربط قائم کرے گی انجینیرنگ اور زرعی یونی ورسٹیوں کے قیام کی بابت انہوں نے کہا کہ دوست ملکوں کے ماہرین کی خدمات ان یونی ورسٹیوں کے قیام کے سلسلے میں صلاح و مشورہ دینے کے لئے حاصل کی جائیں گی۔

## نمایاں ادبی اور سائنسی خدمات

### صدر کے تمغہ کے علاوہ بھی انعامات تقسیم کئے جائیں گے

راولپنڈی، ۳۱ اگست، صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے زیر صدارت کابینہ کے اجلاس میں آج انعامات و اعزازات کی مجلس قائمہ کی سفارش بھی منظور کی گئی کہ ادب اور سائنس ۔ ۔ ۔ کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو صدر کا تمغہ کا طریقہ برقرار رکھا جائے لیکن ایسے کارناموں پر جو اتنے زیادہ نمایاں نہیں ہوتے جن پر صدر کا تمغہ دیا جا سکے ان کو اعزازانہ اکرام دینے کے لئے صوبائی حکومتوں سے اسکیم تیار کرنے کو کہا جائیگا تاکہ مقامی فنکاروں اور ہنرمندوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔

## مسلم یونی ورسٹی میں مولانا آزاد لائبریری

نئی دہلی ۱، ستمبر ہندوستان کے وزیر اعظم مسٹر جواہر لال نہرو ۸ نومبر کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں مولانا آزاد لائبریری کا افتتاح کریں گے اس کے علاوہ وہ علی گڑھ میں ٹیکا رام گرلز کالج کے کملا نہرو ہوسٹل کا بھی افتتاح کریں گے۔ مولانا آزاد لائبریری تقریباً چودہ لاکھ روپے کے مصارف سے قائم کی گئی ہے۔

## لیاقت لائبریری کے لئے زمین

کراچی ۳۰ ستمبر معلوم ہوا ہے کہ لیاقت نیشنل لائبریری کے لئے کنٹری کلب روڈ پر ۱۲ ایکڑ کا رقبہ حاصل کیا گیا ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا مرکزی حکومت نے لیاقت نیشنل لائبریری کے لئے ۲۰ لاکھ کی رقم منظور کی ہے توقع ہے کہ آئندہ پانچ سال میں لائبریری کی نئی شاندار عمارت بن کر تیار ہو جائے گی۔

## اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی آٹھویں جلد شائع ہو گئی

لاہور۔ ۳۰ ستمبر اردو میں لکھی ہوئی اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی آٹھویں جلد شائع ہو گئی ہے اور یہ اڑھائی قیمت پانچ روپے پنجاب یونی ورسٹی کے سیلز ڈپو سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

# جگر مراد آبادی انتقال فرما گئے

## لاسیکی دبستان تغزل کا آخری چراغ بجھ گیا!

لکھنؤ ۹ ستمبر آج گونڈہ میں میر، مومن، داغ، حسرت کے دبستان کا آخری چراغ بجھ گیا۔ جگر مراد آبادی طویل علالت کے بعد بعمر ۷۰ سال گونڈہ میں انتقال کر گئے اور ان کے ساتھ اردو تغزل کا وہ دور بھی ختم ہو گیا جس کے ارکان حسرت، فانی، اصغر اور خود جگر تھے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

حضرت جگر مراد آبادی جن کا اصل نام علی سکندر تھا ۱۸۹۰ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے ان کے پسماندگان میں صرف ان کی بیوہ ہیں گونڈہ تمام بازار آج ان کے سوگ میں بند رہے ٹیگور وائی علیہ گونڈہ نے ... ان کی طلائی جوبلی منانے کا فیصلہ کیا تھا اور ان کے گھر کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کا نام "شاہراہ جگر" رکھا تھا۔ پچھلے سال ہندی ساہتیہ سمیلن نے جس کے صدر وزیر اعظم نہرو ہیں ان کی ادبی و شعری خدمات کے صلہ میں ان کے مجموعہ غزلیات "آتش گل" پر اکادمی ایوارڈ دیا تھا اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی تھی

## جگر مراد آبادی کی وفات سے اردو شاعری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے

راولپنڈی، ۱۱ ستمبر پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری مسٹر قدرت اللہ شہاب نے جگر مراد آبادی کی وفات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا ہے ان کے پسماندگان کو انہوں نے جو پیغام تعزیت بھیجا ہے اس میں کہا ہے کہ جگر بلاشبہ اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے ان کی کمی سارے پاکستان اور ہندوستان میں ہمیشہ بری طرح محسوس کی جاتی رہے گی۔

اس سال لکھنؤ میں جو "یوم جگر" منایا جانے والا ہے اس میں پاکستان رائٹرس گلڈ کا ایک نمائندہ بھی شرکت کرے گا کل پیر کو ان کی یاد میں گلڈ کا دفتر بند رہے گا۔ مشرقی پاکستان رائٹرز گلڈ کی اردو شاخ نے بھی اس نقصان عظیم پر گہرے غم و اندوہ کا اظہار کیا ہے جو حضرت جگر کے اٹھ جانے سے اردو غزل کو پہنچا ہے ایک پیغام میں کہا گیا ہے کہ جگر نے اردو شاعری میں اپنا الگ مقام پیدا کیا اس مقام پر وہ تنہا کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ عظمت کبھی نہیں مٹ سکتی۔ انجمن ادب کے جلسے میں بھی ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت جگر نے اپنے تجربات و مشاہدات سے اردو غزل میں فکر و تخیل کی نئی جوت جگائی تھی، ان کے رخصت ہو جانے سے غزل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

## صحافت کی تعلیم کے لئے وظیفے

لاہور ۷ ستمبر مشرقی پاکستان کی حکومت نے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے کے دو وظیفے قائم کئے ہیں تاکہ مشرقی پاکستان کے طالب علم پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ شعبہ صحافت نے حکومت مشرقی پاکستان کی یہ تجویز منظور کر لی ہے کہ اس سال مشرقی پاکستان کے جو طالب علم ایم اے (جرنلزم) کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں انہیں ۲۰ ستمبر کی بجائے ۳۰ ستمبر تک داخلہ لینے کی اجازت دے دی جائے۔

## قومی تعمیر نو کے ادارے کی طرف سے لاہور میں

### ثقافتی مرکز کا قیام

لاہور۔ ۱۲ ستمبر صوبائی دارالحکومت میں کل قومی تعمیر کے ادارے نے مال روڈ پر ایک مرکز قائم کیا ہے جہاں پر ثقافتی اور ادبی ادارے بھی اپنے جلسے منعقد کر سکیں گے اس شہر میں یہ پہلا مرکز ہے جہاں کا ہال عام ادبی جماعتوں کو بھی جلسوں کے لئے بغیر کسی معاوضے کے ملا کرے گا یہاں ریڈنگ روم بھی کھولا گیا ہے جہاں ہر قسم کے اخبارات اور رسائل موجود ہوں گے۔

اس مرکز کے افتتاح کی رسم بھی اپنے انداز کی انوکھی رسم تھی اس کا افتتاح کسی اہم شخصیت نے نہیں کیا بلکہ اس کا افتتاح اس سال بی اے میں اول آنے والے طالبعلم محمد رفیق اور دوم آنے والی لڑکی مس ناہید وحید نے کیا ان کو مرکز کی طرف سے چاندی کے قلمدان بھی پیش کئے گئے اس موقع پر صوبائی محکمہ اطلاعات کے سکریٹری اور قومی تعمیر کے ڈائرکٹر مسٹر قیوم نے مرکز کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ اس شہر میں ۲۴ مراکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یہ تمام کے تمام قائم کئے جا چکے ہیں ان میں سے دو مرکز خواتین کے لئے مخصوص ہیں باقی ۲۲ مختلف علاقوں میں قائم کئے گئے ہیں۔ ان مرکزوں کا مقصد علاقے کے افراد کو مل بیٹھنے کے مواقع بہم پہنچانا اور مشترکہ مسائل پر اجتماعی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی عادت ڈالنا ہے۔ یہ مرکز جو کافی ہاؤس کے بالکل قریب ہے، خاصی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ یہ اہل علم و دانش کی نشست گاہوں کے قریب ہے۔ یعنی مدرسی کافی ہاؤس، چائنیز ریسٹورینٹ اور ساور تجارتی مرکز کے درمیان میں یہ مرکز واقع ہے اسی لئے اس میں ہال بھی الگ رکھا گیا ہے تاکہ یہاں پر اہل علم کے اجتماع منعقد کئے جا سکیں۔ یہاں پر ریڈنگ روم بھی ہے، جہاں پر ہر قسم کے اخبارات اور رسائل موجود ہوں گے۔ آج رسم افتتاح کے موقع پر معاشرے کے مختلف طبقوں کے نمائندے کافی تعداد میں موجود تھے ان میں غیر ملکی، پروفیسر، ڈاکٹر، طالب علم، خواتین بھی شامل ہیں۔

## سائنسی موضوعات پر اردو میں عالمانہ لیکچر دلانے کا وسیع پروگرام

لاہور ۴۔ ستمبر مغربی پاکستان میں اردو کو سائنسی علوم وفنون کے اظہار کے قابل بنانے کے لئے صوبائی دارالحکومت میں قائم شدہ غیر سرکاری ادارہ موسومہ "اردو اکیڈیمی" دو ایک ماہ میں سائنس سے متعلق موضوعات پر اردو میں عالمانہ لیکچر دلانے کے وسیع پروگرام پر عمل شروع کر دیگا۔

اردو اکیڈیمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اس سلسلہ میں ابتدائی انتظامات کر رہے ہیں اور انہوں نے ان پر مغز لیکچروں پر مشتمل ایک سہ ماہی رسالہ جاری کرنے کے لئے بھی مناسب کارروائی شروع کر دی ہے اب صرف صوبائی حکومت کی طرف سے منظور کردہ ۲۵ ہزار روپے کی گرانٹ کی ادائیگی کا انتظار ہے اکیڈیمی کے قومی زبان کے علمی ذخیرے کو وسعت دینے اور اسے سائنسی علوم وفنون کے اظہار کے قابل بنا کر دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی سطح پر لانے کے اغراض ومقاصد کے پیش نظر معلومات افزا کتابیں لکھوانے اور وضع اصطلاحات کا کام شروع کرنے کا بھی پروگرام بنا رکھا ہے لیکن اس پر فوری عمل نہیں ہو سکیگا۔ خیال ہے کہ اس کام کی ابتدا کرنے میں ایک ڈیڑھ سال لگے گا پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر بشیر احمد مرحوم کی تحریک پر دسمبر ۵۰ء میں اردو اکیڈیمی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اسی پاکستان اور رتبیل کانفرنس کے موقع پر اس کا رسمی افتتاح کیا گیا تھا اس موقع پر صوبے کے مشہور کارخانہ دار میاں نصیر احمد شیخ نے اس ادارے کے لئے ۵ ہزار روپے کی امداد دی تھی مگر یہ رقم بہت قلیل ہونے کے باعث استعمال نہیں ہو سکی حکومت مغربی پاکستان نے گزشتہ سال میزانیہ میں اس ادارے کے لئے ۲۰ ہزار کی گرانٹ منظور کی تھی مگر بعد میں یہ گرانٹ بہاولپور کی اردو اکیڈیمی کو دے دی گئی اور اس طرح صوبائی دارالحکومت کی علمی مجلس کا کام مالی مشکلات کے باعث بدستور معطل رہا تاہم سال رواں کے میزانیہ میں ۲۵ ہزار کی گرانٹ کی منظوری کا اعلان کیا گیا ہے اس گرانٹ کی ادائیگی پر کام شروع ہوگا۔ پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اس اکیڈیمی

کے نائب صدر ہیں اور ڈاکٹر سید عبداللہ جنرل سکریٹری، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولانا صلاح الدین احمد اور مسعود وغیرہ اصحاب ادارے کی مجلس انتظامیہ کے ارکان ہیں۔

## چغتائی کو باتصویر اقبال کی اشاعت کیلئے قرضہ کی سفارش

## اقبال کے کلام کے انگریزی ترجمہ کے لئے تیاری ہو رہی ہے

لاہور۔ صوبائی دارالحکومت میں قائم شدہ مجلس ترقی ادب نے حکومت
مغربی پاکستان سے سفارش کی ہے کہ یہاں کے نامور مصور مسٹر عبدالرحمان چغتائی
ان کی مرتبہ کتاب بعنوان "باتصویر اقبال" کی طباعت و اشاعت کے لئے
مجلس کی وساطت سے پچاس ہزار روپے بطور قرض دیئے جائیں۔

مجلس نے اس سلسلہ میں صوبائی حکومت کو مطلع کیا ہے کہ چغتائی
صاحب سے اس قرضہ کی واپسی کی شکل میں جو رقم وصول ہوگی مجلس وہ حکومت
کو واپس کرتی رہے گی اور اگر قرضہ مطبوعہ کتابوں کی شکل میں وصول ہوا تو ان کی
فروخت کا انتظام کیا جائے گا اور اس طرح وصول شدہ قیمت حکومت کو
واپس ہوتی رہے گی۔

چغتائی صاحب اس سلسلہ میں مجلس ترقی ادب کے ہاں اپنے کام
کی رپورٹ پیش کرتے رہیں گے اور مجلس کی ایک سب کمیٹی مشتمل بر مسٹر ایس ایم
اکرام اور میاں محمد شریف بھی کام کی رفتار کی نگرانی کرے گی۔

مزید بیان کیا جاتا ہے کہ مسٹر عبدالرحمان چغتائی اپنی اس کتاب
کی طباعت کے سلسلے میں بیشتر کام کر چکے ہیں اور اب وہ اس مقصد کے لئے
غیر ممالک سے اعلیٰ قسم کا کاغذ درآمد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں انہیں
ابھی اس مقصد کے لئے روپیہ درکار ہے تاہم محکمہ تعلیم کے متعلق اعلیٰ حکام نے
ابھی تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

دریں اثنا مجلس ترقی ادب کی طرف سے یہ کوشش کی جا رہی ہے
کہ اقبال کے اشعار کے انگریزی ترجمے کو بھی اس مرقع میں شامل کیا جائے
اس مقصد کے لئے مترجم کی تلاش ہو رہی ہے۔

## مصری یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم

قاہرہ ۸ ستمبر متحدہ عرب جمہوریہ میں پاکستان کے سفیر خواجہ شہاب الدین
نے کل متحدہ عرب جمہوریہ کے وزیر تعلیم احمد نجیب ہاشم سے ملاقات کی مشرق
وسطیٰ کی خبر رساں ایجنسی نے بتایا ہے کہ دونوں رہنما نے متحدہ عرب جمہوریہ کی
یونی ورسٹیوں میں اردو زبان کے شعبے قائم کرنے کے امکانات اور عرب
طلبا کو باہمی ثقافتی تعلقات مضبوط بنانے کی طرف راغب کرنے کے بارے
میں بات چیت کی۔

## اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کا مشورہ

## بابائے اردو نے کمرشل کالج کا افتتاح کیا!

کراچی ۱۱ ستمبر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے آج
شام فریئر روڈ پر امپیریل کمرشل کالج کا افتتاح کرتے ہوئے اردو شارٹ
ہینڈ اور اردو ٹائپ سیکھنے کا مشورہ دیا اور زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ انگریزی
کی جگہ لینے کے لئے ان سب کا سیکھنا بہت ضروری ہے انہوں نے کہا کہ ایک
زندہ زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ تغیرات زمانہ کو اپنا لے
جو زبان ان تبدیلیوں کو اپنا نہیں سکتی وہ مر جاتی ہے۔ بابائے اردو نے مزید
کہا کہ اردو رسم الخط بہت خوبصورت ہے اس زبان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں
حرفوں کو ملا کر لکھا جاتا ہے اس طرح لکھنے میں وقت کی بچت ہوتی ہے اس سے
پہلے کالج کے پرنسپل پروفیسر اسلام بیگ نے بابائے اردو کا خیر مقدم کیا۔

## طلباء کے محبوب شعرا

کراچی ۱۲ ستمبر۔ کراچی یونی ورسٹی کے طلبا اور طالبات کے محبوب
اور پسندیدہ شاعروں میں سر فہرست اقبال، غالب اور فیض احمد فیض
ہیں۔ یونی ورسٹی کے طلبا کے سماجی اور اقتصادی سروے کے مطابق
۵۰ فی صدی طلبا اقبال، غالب اور فیض کو، پندرہ فی صدی جگر مراد آبادی،
میر اور حالی کو پسند کرتے ہیں افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اور ادیبوں میں مولانا
ابوالکلام آزاد کو طلبا سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

## نہ کوئی جنازہ اٹھتا۔۔۔۔

نئی دہلی۔ ۹ ستمبر پنجاب کے شہر روہتک میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے سب سے پہلی بھینٹ ایک اردو شاعر کی لی۔ روہتک کے مشہور اردو شاعر خیام سہگل سنگوکل سیلاب کی طوفانی موجوں میں گھرے ہوئے گھر کی حالت دیکھنے گئے تھے کہ موجوں نے خود ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بہا لے گئیں ان کی لاش اب تک دستیاب نہ ہو سکی اور اس طرح غالب کی آرزو نے ان کی ذات میں اپنی تکمیل کی ؂

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کوئی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

## فرضی ناموں پر کتب کی اشاعت

دہلی سے ایک کتاب "ثمرہ" اے آر خاتون کے فرضی نام سے شائع ہوئی اور پچھلے دنوں لکھنؤ سے ایک کتاب "زیور" بھی میرے فرضی نام سے شائع ہوئی ہے حیرت یہ ہے کہ اب وہی کتاب "زیور" پاکستان کے ایک ناشر نے ماہ درخشاں کے نام سے اے این خاتون کے فرضی نام سے چھاپی ہے حالانکہ "زیور" میری کتاب ہے نہ اے این خاتون اس کی اصل مصنفہ ہیں یہ بھی ایک فرضی نام ہے اس کتاب کے اصل مصنف سلامت اللہ مہدی ہیں دائر شکرگڑھ، تاجران کتب، قارئین اور عوام اس فرضی اور ملتے جلتے نام کے دھوکے سے آگاہ رہیں۔ اے آر خاتون، ۱۲۔ لارنس روڈ۔ لاہور

## جامعہ عثمانیہ ہندی یونی ورسٹی نہیں بنے گی

نئی دہلی ۱۴ اگست۔ ہندوستان کے وزیر تعلیم ڈاکٹر شری مالی نے لوک سبھا میں بتایا ہے کہ یہ تجویز ترک کر دی گئی ہے کہ ان کی وزارت عثمانیہ یونی ورسٹی کو اپنی تحویل میں لے کر ہندی کو ذریعہ تعلیم بنا دے انہوں نے کہا کہ آندھرا کی حکومت کو اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔

## پنجاب یونی ورسٹی کو امریکی عطیہ

لاہور ۲ آج پنجاب یونی ورسٹی کو ہاورڈ یونی ورسٹی امریکہ کی جانب سے تصاویر اور کتابوں کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا۔ اس مجموعے میں مشہور امریکی نیگرو ماہر عمرانیات فرینکلن فریزیر اور مشہور امریکی نیگرو تاریخ داں جان ہوپ فرینکلن کی کتابیں شامل ہیں۔ تصاویر دو ممتاز امریکی مصوروں، چارلس پورٹر اور روی میلو جو ٹسکی بنائی ہوئی ہیں۔

## آردو یونی ورسٹی کا قیام قائد اعظم کی خواهش کی تکمیل هے

—محترمه فاطمه جناح کا پیغام

آردو یونی ورسٹی کی تیجویک کے افتتاح کے موقع پر محترمه فاطمه جناح نے حسب ذیل پیغام ارسال کیا هے :—

"پاکستان کی اولین آردو یونی ورسٹی کے افتتاح کی تاریخی تقریب کے موقعے پر سں ان حضرات کو مبارک باد دیتی هوں جو یه نیک مقصد لے کر اٹھے هیں ۔ یه یونی ورسٹی قائد اعظم اور هماری پوری قوم کی خواهش کی تکمیل هے۔ اور یه استحکام پاکستان کی راہ میں ایک سنگ میل ثابت هوگی ۔ میں آپ حضرات کی کامیابی کے لئے دست بدعا هوں" ۔

---

## عالی جناب سیدنا طاهر سیف الدین چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کا پیغام

"مجھے یه جان کر انتہائی مسرت هوئی هے که ۲ اکتوبر کو کراچی میں آردو یونی ورسٹی کے قیام کی تحریک کا افتتاح هورها هے ۔ آردو زبان (جس پر قرآن کی زبان، عربی کے اثرات بہت زیادہ هیں) دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں سے ایک هے اس لئے آردو یونی ورسٹی کا قیام وقت کی اهم ضرورت هے ۔ تمام اردو دوستوں کی دلی خواهش هے که یه تحریک کامیاب و کامران رهے ۔ میری بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ هیں اور میں دست بدعا هوں که خدا آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور آردو یونی ورسٹی کی تجویز کی عملی تشکیل جلد از جلد همارے سامنے آئے" ۔

## قطعۂ تاریخ تہنیت، بتقریب سعید جشن جوبلی
## بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب صدر کل پاکستان
## انجمن ترقی اردو

ملیں گے اور بھی اردو کے محسن
مگر بابائے اردو کی طرح کم

غم اردو میں عمر اپنی گنوادی
قریب آنے نہ پایا دوسرا غم

اسی محبوب کی خدمت سے آخر
خود اک دن ہوگئے مخدوم عالم

ہوئی تھی بسمل الفت جوانی!
ملا پیری میں زخم دل کو مرہم

نہیں یونہی یہ عظمت ہاتھ آئی
بڑی محنت سے بنتے ہیں مکرم

بڑے ریلے تھے کچھ دن دشمنوں کے
وہ سو دو سو، تن تنہا یہ ضیغم

مگر تیور پہ بل آنے نہ پائے
کہیں نرغوں سے گھبراتا ہے رستم

حق و باطل میں باہم ٹھن گئی تھی
مگر باطل تو باطل، کر گیا رم

ہوا نوے برس کا گو یہ بوڑھا
جوانوں کے مگر رکھتا ہے دم خم

اسی کی جوبلی کا جشن ہے یہ
سمٹ آیا ہے، جس میں ایک عالم

زبان صدق پر تاریخ آئی
فقط دو لفظ ہیں، شیخ معظم

انجمن ترقی اردو پاکستان کا
پندرہ روزہ

# قومی زبان

نگران :- بابائے اردو

جلد - - - ۱۷
شمارہ - - - ۸

۱۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء

اس شمارے میں



# اردو یونی ورسٹی کی تجویز

بعض حلقوں میں ہماری اس تجویز سے اختلاف کیا گیا ہے اور کہیں کہیں مخالفت بھی شروع ہوگئی ہے مخالفین کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ایجوکیشن کمیشن کے فیصلے کے مطابق پندرہ سال بعد بھی یونی ورسٹیوں کا ذریعہ تعلیم اردو ہوجائے گا اور مغربی پاکستان کی تمام یونی ورسٹیاں اردو یونی ورسٹیاں ہوجائیں گی۔ اول تو بقول ہمارے ایک رفیق کے پندرہ برس کس نے دیکھے ہیں، دوسرے حکومت کے پندرہ برس اور ہمارے پندرہ برس میں بہت تفاوت ہوتا ہے۔ حکومت کے پندرہ برس بعض اوقات بڑھتے بڑھتے پچاس تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اگر بالفرض تمام یونی ورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہوجائے تو بھی وہ مقصد پورا نہیں ہوگا جو ہماری یونی ورسٹی کے پیش نظر ہے اور اسی وجہ سے یہ اختلاف رونما ہوا ہے۔

ہماری مجوزہ یونی ورسٹی کا صرف یہی ایک مقصد نہ ہوگا کہ ذریعہ تعلیم اردو کر دیا جائے اور طالب علموں کو امتحان پاس کرا کر سندیں عطا کی جائیں۔ بلاشبہ ہماری یونی ورسٹی کا ایک مقصد یہ بھی ہے، مگر اس یونی ورسٹی کے مقاصد وسیع تر ہیں۔ اس ادارے میں لسانیات اور تالیف و ترجمے کے شعبے بھی ہوں گے۔ ریسرچ یعنی علمی و ادبی تحقیقات کا بھی انتظام ہوگا۔ امہات کتب قدیم و جدید کے ترجمے شائع کیے جائیں گے۔ جدید ادبی اور علمی تحقیقات کو اردو کے ذریعے سے ملک میں پھیلایا جائے گا۔ یونی ورسٹی کا اپنا پریس ہوگا۔ اور ایک ایسا عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جائے گا جس میں کتب اسناد لغت اور دوسری علمی کتابوں کے علاوہ

(باقی ص ۱۷ پر)

# ہمارے قومی احساس کا تقاضہ ہے کہ ہم اردو زبان کی عظمت اپنے عمل سے ثابت کر دکھائیں

(بابائے اردو)

## "اردو یونیورسٹی کا قیام پاکستان کے لئے مبارک ہوگا" (آغا خان)

## کراچی کی شاندار تقریب میں آغا خان نے اردو یونیورسٹی کی رسم افتتاح ادا کی

کراچی ۲ر اکتوبر۔ آج شام بیچ لگژری ہوٹل میں ایک شاندار اور پروقار تقریب میں پرنس کریم آغا خان نے اردو یونی ورسٹی کی رسم افتتاح ادا کی۔ اس موقع پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہمارے اسلاف کی یادگار اور ہمارے شعراء، ادباء اور علماء کی دماغی اور روحانی کاوشوں اور جاں فشانیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ہماری قومیت کی نشانی اور ہماری روایات و تہذیب و اسلاف کی حامل ہے۔ ہندوستان کے قبضہ کے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی تو مفلوج ہوگئی۔ اس نقصان عظیم کی تلافی اس طرح ہوسکتی ہے کہ اس کا نعم البدل اردو یونی ورسٹی کی شکل میں کراچی میں قائم کیا جائے۔ انجمن ترقی اردو نے اردو میں ذریعہ تعلیم کو کامیاب بنانے کے لئے سنہ ۱۹۴۹ء میں ڈگری کالج قائم کیا تھا جو اب تک کامیابی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے پرنس آغا خان نے اس سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اردو بڑی پیاری زبان ہے، میں نے بھی یہ زبان سیکھی ہے انہوں نے توقع ظاہر کی کہ مجوزہ اردو یونی ورسٹی تعلیمی پروگرام کے مطابق کام کرے گی۔ یہ کام انتہائی اہم ہے اور بہت احتیاط کا مقتضی ہے۔ اس تقریب میں محترمہ فاطمہ جناح اور ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے۔

پرنس عبدالکریم آغا خان نے آج یہاں اردو یونیورسٹی کی افتتاحی رسم انجام دیتے ہوئے کہا کہ اردو بڑی پیاری زبان ہے میں نے بھی یہ زبان سیکھی ہے اور میں کچھ کچھ اردو سمجھ لیتا ہوں۔

آج شام بیچ لگژری ہوٹل کے وسیع ہال میں معزز مہمانوں کے رنگا رنگ اجتماع میں آغا خان نے اردو یونی ورسٹی پاکستان کا رسمی طور پر افتتاح کیا۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے آغا خان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اردو کالج کے پرنسپل کرنل عطاء الرحیم نے اس موقع پر موصول ہونے والے مس فاطمہ جناح اور ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔ آغا خان نے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ مجوزہ یونیورسٹی قومی تعلیمی پروگرام کے حدود میں رہ کر کام کرے گی انہوں نے کہا کہ یونی ورسٹی کے قیام کا کام انتہائی اہم اور بڑی احتیاط کا مستحق ہے اس لئے اس کی تعمیر شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح منصوبہ بندی بہت ضروری ہے آخر میں انہوں نے توقع ظاہر کی کہ مجوزہ یونی ورسٹی بھی جامعہ عثمانیہ کی طرح اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ ثابت ہوگی۔ اس سے پہلے مسٹر فخر ماتری نے جو اردو یونیورسٹی کمیٹی کے سکریٹری ہیں آغا خان کا خیر مقدم کیا انہوں نے کہا ابھی کچھ عرصہ تک آپ خود طالب علم تھے اور مولوی صاحب کی ذات آپ کے اور طالب علموں کے لئے ایک نمونہ ہے انہوں

ہونے مہمانان کے استقبال افتتاح کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا یہ ... [illegible] ... ہماری ثقافت کی

# سپاسنامہ[1]

بملاحظہ اقدس عالی جناب فیض مآب ہز رایل ہائنس پرنس کریم آغا خان دام ظلکم

ہم ارکان اردو یونی ورسٹی کمیٹی جناب والا کے بے حد شکرگزار ہیں
[جن]ا بنے باوجود گوناگوں معروفیتوں کے ہماری درخواست کو شرف
[قبو]لیت بخشا۔

اردو یونی ورسٹی کا خیال سب سے پہلے سر سید احمد خاں کو آیا اور
[انہو]ں نے ۱۸۶۷ء میں ایک عرض داشت گورنر جنرل باجلاس کونسل کی
[خد]مت میں پیش کی۔ اگرچہ اس تجویز کو پسند کیا گیا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ تجویز
[حکو]مت کی تائید اور امداد سے محروم رہی اور اس طرح اس تجویز کو جو اعلیٰ
[مقاص]د کی دور رس نتائج پر مبنی تھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ نصف صدی
[کے بعد] سر سید کے اس خواب کی تعبیر عثمانیہ یونی ورسٹی کی صورت میں نظر آئی
[جو] سابق حکومت نظام کا عظیم الشان اور جرأت مندانہ کارنامہ تھا جس کو
آپ کے جد امجد سر آغا خاں مرحوم نے بارہا سراہا۔ ۱۹۲۰ء میں آل پارٹیز
[م]سلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے فرمایا :-

" عثمانیہ یونی ورسٹی کا قیام جو کہ نظام کی فیاضی سے عمل میں
آیا ہمارے ملک کی تعلیمی تحریکات میں بڑی مدد دیگا "

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر انہوں نے فرمایا :-

" نظام دکن کا یہ فیصلہ نہایت دانش مندانہ ہے کہ
اردو کو اعلیٰ [illegible] کے لئے ذریعہ تعلیم بنایا۔ "

اس سے یہ ظاہر [illegible] تعلیم کی اشاعت کے لئے اردو
کو ذریعہ تعلیم بنانا نہایت ضروری خیال کرتے تھے۔ افسوس کہ بھارت
کے قبضے کے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی مفلوج ہو گئی اور اس کی امتیازی
خصوصیت جس کے لئے خاص طور پر اس کی بنا ڈالی گئی تھی یعنی یونیورسٹی
کے تمام علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ اردو ہو، ختم کر دی گئی اور اس کو دار الترجمہ
موقوف کر دیا گیا۔ اس سے ہماری قومی زبان اور تہذیب کو بہت بڑا صدمہ
پہنچا۔

ہم نے اس نقصان عظیم کی تلافی کے لئے یہ لازمی قرار دیا، کہ
عثمانیہ یونی ورسٹی کا بدل بلکہ نعم البدل کراچی میں قائم کریں۔ ایسی یونیورسٹی
اب صرف پاکستان میں قائم ہو سکتی ہے اور آپ کی سرپرستی اور دیگر
بہی خواہان ملک و ملت کی ہمدردی شامل حال رہی تو ان شاء اللہ اردو
یونی ورسٹی ضرور بن کے رہے گی۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اردو نے اسی
ارادے سے اپنا ڈگری کالج کراچی میں قائم کیا جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے
یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد کالج ہے، اس میں جملہ مضامین کی تعلیم
بشمول سائنس اردو میں دی جاتی ہے۔ یہ طرز تعلیم بہت کامیاب رہا ہے
جس کی تائید ایجوکیشن کمیٹی کی رپورٹ سے ہوتی ہے جس میں اس کالج کی
خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔

اردو زبان [illegible]
شعراء ادباء اور علماء کی [illegible]

[1] یہ سپاسنامہ [illegible] اردو یونی ورسٹی کمیٹی کے اراکین کی طرف سے پیش کیا گیا۔

کا نتیجہ ہے۔ یہ ہماری قومیت کی نشانی ہے اور ہماری روایات و تہذیب و اخلاق کی حامل ہے۔ آپ کے نامور اور فاضل جد امجد سر آغا خاں مرحوم نے ہمیشہ اس زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کی بقا و تحفظ پر بار بار زور دیا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے فرمایا :۔

" اردو دنیا کی اہم ترین زبانوں میں سے ہے اور یہ وسیع طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس زبان کو مسلمانوں سے چھین لینا بہت بڑا ظلم ہوگا۔"

یہ الفاظ ایک ایسی عظیم ہستی کی زبان سے نکلے ہیں جس کی دنیا کی تاریخ اور قوموں کے عروج و زوال پر بڑی گہری نظر تھی اور جس نے مسلمانان ہند اور مسلمانان عالم کے لئے ایسے کارہائے نمایاں کئے کہ جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہ الفاظ ہمارے لئے کلمات ہدایت ہیں اور اگر ہم میں ذرا بھی قومی احساس اور اپنی تہذیب اور زبان سے محبت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ہدایت کی روشنی میں اپنی قومی زبان کی اہمیت و عظمت اور صلاحیت کو اپنے عمل سے ثابت کر دکھائیں۔

جناب والا - آپ کے نامور اور فاضل جد امجد نے مسلم یونی ورسٹی کے قائم کرنے اور اس کے لئے سرمایہ جمع کرنے کی جو بے نظیر کوششیں کیں ہم اس کے احسان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح سر آغا خاں مرحوم کی مساعی اور فیاضی سے مسلم یونی ورسٹی کو شاندار کامیابی ہوئی اسی طرح اس کے ہونہار اور قابل پوتے کی سرپرستی اور امداد سے اردو یونی ورسٹی کو بھی ویسی ہی کامیابی حاصل ہوگی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۱۸۹۶ء میں سر سید احمد خاں نے آپ کے نامور دادا کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا تھا جبکہ ان کی عمر (۱۹) انیس سال کی تھی اور سر سید کا سن (۸۲) بیاسی سال کا تھا اور آج (۶۸) چونسٹھ سال بعد آج میں اس نامور دادا کے لائق پوتے کی خدمت میں یہ سپاسنامہ پیش کر رہا ہوں جبکہ آپ کی اور میری عمروں میں تقریباً وہی تفاوت ہے جو آغا خاں مرحوم اور سر سید کی عمروں میں تھا۔ یہ مماثلت دلیل ہے ہماری خوش نصیبی اور کامیابی کی۔

ایک دوسرا عجیب اتفاق یہ ہے کہ تخمیناً (۴) چار سال ہوئے میں نے اپنی تالیف "پاکستان میں اردو کا المیہ" کا اختتام ان الفاظ پر کیا تھا :۔

" ہم بہی خواہان اردو کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ اردو یونی ورسٹی اپنی نظیر آپ ہوگی۔ یہ قومی زبان اور قومی تہذیب و روایات کو زندہ رکھے گی اور فروغ دے گی۔ اس کا سنگ بنیاد ایک ایسے شخص کا دست مبارک رکھے گا جس کے آنے کا انتظار ہے"

وہ شخص جس کا ہم انتظار کر رہے تھے معلوم ہوا کہ وہ آپ کی ذات بابرکت ہے اور آج ہمیں یقین ہو گیا کہ قدرت نے اس کام کی انجام دہی آپ ہی کے لئے مخصوص کی ہے۔

آخر میں ہم بہ کمال ادب عرض کرتے ہیں کہ اس یونی ورسٹی کو جس سے ہماری بہت سی قومی توقعات وابستہ ہیں اپنی سرپرستی اور تائید سے زیر بار منت فرمائیں۔ آج کا دن اردو یونی ورسٹی کے آغاز کا دن خیال کرتے ہیں اور یہ آغاز آپ کی نوازش اور معارف پروری کی بدولت وجود میں آیا ہے۔

# گرد و پیش

# جگر مرادآبادی نے اردو غزل کو زندہ کر دیا (بابائے اردو)

## نو ادبی انجمنوں کی طرف سے اردو کالج میں یوم جگر منایا گیا

کراچی یکم اکتوبر، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے آج رات یوم جگر کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ جگر مرادآبادی نے اردو غزل کو زندہ کر دیا ان کی شاعری، ان کے جذبات، سیرت، ذہنیت اور تفکر کی آئینہ دار ہے۔ رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے کراچی کی نو ادبی انجمنوں کی طرف سے آج رات اردو کالج میں یوم جگر منایا گیا جلسے کی صدارت بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے کی، اردو کالج کا وسیع احاطہ جگر صاحب کے ارادت مندوں اور ان کے شعر و فن کے قدردانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں کراچی کے تمام ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کے علاوہ ہر مکتب خیال اور ہر سن و سال کے افراد بھی موجود تھے۔ جلسے میں جگر کی کئی غزلیں خود ان کی آواز میں ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ سنائی گئیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سعدی اور حافظ سے لے کر میر و غالب تک بہت سے شاعر پیدا ہوئے مگر کوئی بھی سعدی و حافظ، میر و غالب جیسا نہ ہو سکا۔ کیوں کہ ہر باکمال شخص کا فن اس کی اپنی سیرت ذہنیت، طرز خیال و فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے اور جب وہ نہیں رہتا تو اس کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی دوسرا شخص ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا انہوں نے کہا یہی وجہ ہے کہ کسی اچھے شعر کا دوسری زبان میں ترجمہ اس لطف کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ شعر کے جذبات الفاظ سے ملے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر غزل تو کم بخت سراسر جذبات کی صنف ہے۔ مولوی صاحب نے کہا سچی شاعری صرف اپنی مادری زبان میں ہو سکتی ہے انہوں نے جگر کے فن اور شاعری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جگر اپنی خصوصیات کی وجہ سے زندہ رہیں گے انہوں نے غزل کو زندہ کر دیا ہے آج وہ ہم میں نہیں مگر ان کا کلام موجود ہے جس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ان کی سیرت میں تھیں۔ بابائے اردو کے علاوہ فضل کریم فضلی، جمیل الدین عالی اور طفیل احمد جمالی نے بھی تقریریں کیں۔ فضلی صاحب نے جگر کے آخری ایام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں روح جگر کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب اور ان کے خطوط کا مجموعہ شائع کرنے والا ہوں۔ انہوں نے جگر کی غزل پر اپنی تضمین بھی سنائی۔ جلسے کا اہتمام پاکستان رائٹرس گلڈ، ترقی اردو بورڈ، کراچی رائٹرس گلڈ، پی ای این، حلقہ ارباب ذوق، بزم جگر اور انجمن ترقی اردو نے کیا تھا۔

### قراردادیں

جلسے میں دو قراردادیں بھی منظور ہوئیں ایک قرارداد جگر صاحب کی وفات پر اظہار تعزیت کے لئے تھی، دوسری قرارداد جگر صاحب کی مستقل یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں تھی۔ دوسری قرارداد پر عمل درآمد کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے کنوینر فضل کریم فضلی مقرر ہوئے۔ حکیم اسرار احمد

کریوی نے تجویز پیش کی کہ کراچی میں مشاعروں اور ادبی جلسوں کے لئے ایک ہال تعمیر کیا جائے جس کا نام ایوان جگر رکھا جائے کمیٹی نے ان کی یہ تجویز منظور کرلی مسٹر فروغ احمد نے اس کے لئے سو روپے کا عطیہ دیا، جلسہ میں تفضل صاحب کے علاوہ حفیظ ہوشیار پوری، یاور عباس، جعفر بدایونی، نا صر کاسگنجوی، راغب مراد آبادی، جام نوائی نے جگر صاحب پر نظمیں سنائیں۔

# شاعروں کی بہتات

کراچی یکم اکتوبر۔ آج شام یوم جگر کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے کراچی میں شاعروں کی بہتات پر بڑا لطیف طنز کیا۔ انہوں نے کہا ابھی حال میں سرکاری ملازمین کی پنڈی منتقلی ہوئی تھی تو سات روز تک مسلسل اسپیشل ٹرینیں چلائی گئی تھیں اب اگر کراچی کے شاعروں کو پنڈی منتقل کرنے کی نوبت آئے تو سال بھر تک اسپیشل ٹرینیں چلانا پڑیں گی۔

# ممتاز ادیبوں کی جانب سے سالک مرحوم کو خراج عقیدت

"مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے" جسٹس ایس اے رحمٰن

لاہور۔ یہاں مولانا عبدالمجید سالک کی پہلی برسی کے موقع پر جسٹس ایس اے رحمٰن نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سالک مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے وہ صحافی تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک دوست تھے آج ہماری بدقسمتی ہے کہ پرانے لوگ اٹھتے جا رہے ہیں اور ان عظیم شخصیتوں کی موت سے جو جگہیں خالی ہو رہی ہیں وہ پر ہوتی نظر نہیں آتیں۔

جسٹس ایس اے رحمٰن نے سالک مرحوم کی تحریروں کی اشاعت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ افکار و حوادث کو مرتب کیا جائے اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے کیونکہ یہ صرف فکاہی کالم نہ تھا بلکہ سیاسی زندگی کی تاریخ تھا۔ جسٹس ایس اے رحمٰن نے مولانا سالک کے شعری کلام کے مجموعے کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا۔ یہ شعری کلام سالک مرحوم کے صاحبزادے

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مرتب کیا ہے۔ مولانا کی پہلی برسی کے موقع پر پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے یہ جلسہ منعقد کیا گیا۔ سینٹ ہال میں اس جلسے کی صدارت سپریم کورٹ کے جسٹس ایس اے رحمان نے کی اس موقع پر شہر کے تمام ادیب شاعر اور اہل علم و دانش موجود تھے۔

فیض احمد فیض نے اس موقع پر سالک مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت میں افکار و حوادث کے کالم کی وہی حیثیت اور مقام ہے جو اردو زبان و نثر میں غالب کے خطوط کو حاصل ہے۔ غالب نے جس طرح اپنے خطوط میں پہلی بار اردو نثر کو نئی طرح کی سلاست اور شگفتگی عطا کی اسی طرح سالک نے اپنے افکار و حوادث اور مضامین میں صحافت کی زبان کو سلاست اور شگفتگی بخشی ہے۔ فیض احمد فیض نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سالک کی صحافت کا زمانہ اس برعظیم کی سیاست کا سب سے اہم زمانہ تھا اس زمانے میں آزادی کی بڑی بڑی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تحریکوں کا ذکر کئی کتابوں اور مقالوں میں محفوظ ہے لیکن ان عظیم تحریکوں کی جزئیات کی جو منظر نگاری افکار و حوادث میں ہوئی ہے وہ کسی کتاب اور مقالے میں نہیں ملے گی۔

سالک مرحوم کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے فیض احمد فیض نے کہا کہ سالک کی استادی چار پشتوں پر حاوی ہے اور اس سلسلے میں فیض نے کہا کہ ان کے اپنے استاد پطرس اور تاثیر نے بھی سالک کو استاد کہا تھا۔ یہ درست ہے کہ سالک نے باقاعدہ درس نہیں دیا نہ ہی کسی کو شاگرد بنایا لیکن اس کے باوجود شاید ہی کوئی اہل علم ہو جس نے سالک مرحوم سے کسی نہ کسی انداز میں کسب علم نہ کیا ہو۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کہا کہ سالک کا نام دوستی خلوص اور محبت کی علامت ہے۔ سالک نے سیاست کے میدان میں قدم ہی رکھا تھا اور اس کے لئے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔

امتیاز علی تاج نے سالک سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے مضمون نگاری کی اصلاح سالک مرحوم سے ہی لی تھی اور ان کی صحبت ہی

یہ فیض تھا کہ ان کو ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی تاج نے کہا کہ وہ آخر دم تک سالک کی رہنمائی تسلیم کرتے رہے ہیں ۔

احمد ندیم قاسمی نے سالک مرحوم کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی انسان دوستی اور حاجت مندوں کی دستگیری کے کئی ایک واقعات سنائے۔ شورش کاشمیری نے بھی اپنے مقالے میں سالک مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ عبدالشکور بیدل نے سالک مرحوم کی دو غزلیں ترنم کے ساتھ پیش کیں۔

## ملک میں گلڈ کی ۲۳ شاخیں قائم ہو چکی ہیں

### خانپور میں قدرت اللہ شہاب کا اعلان

بہاولپور ۲۹ ستمبر۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے صدر مسٹر قدرت اللہ شہاب نے کل شام خانپور میں بزم فروغ ادب کے صدر مسٹر نذر احمد علوی کے استقبالیہ میں سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ اب تک ملک کے مختلف حصوں میں گلڈ کی ۲۳ شاخیں قائم کی جا چکی ہیں انہوں نے کہا کہ پاکستان رائٹرز گلڈ ملک بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو قریب تر لانے کی جدوجہد کر رہا ہے انہوں نے اس تحریک کا بھی مختصر سا جائزہ لیا جس کی بنا پر گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ گلڈ کے صدر نے بزم فروغ اردو کے لئے پانچ سو روپے کا عطیہ بھی دیا انہوں نے بہاولپور ڈویژن میں گلڈ کے نئے مسٹر اشتیاق اظہر کو کنوینر مقرر کیا مسٹر شہاب آج کراچی روانہ ہو رہے ہیں ۔

## یوم انقلاب پر اس سال کی بہترین اردو اور بنگالی کتاب کا اعلان کیا جائیگا

کراچی ۲ اکتوبر۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے کہا ہے کہ آئندہ مہینے خانوادۂ آدم جی انعام کی تقسیم کے موقع پر کئی ملکی نامور ادیب کراچی آئیں گے ۔

انہوں نے بتایا کہ آنے والوں میں ایک نوبل انعام پانے والا ادیب بھی شامل ہے یاد رہے کہ خانوادۂ آدم جی کی طرف سے ہر سال کی بہترین اردو اور بنگالی کتاب پر دس ہزار روپے نقدی کی صورت میں دیا جائے گا شہاب صاحب نے بتایا کہ انعام پانے والی کتابوں کے ناموں کا اعلان ۲۷ اکتوبر تک کر دیا جائے گا اور تقسیم انعامات کی شاندار تقریب نومبر میں کراچی میں ہوگی۔ شہاب صاحب نے بتایا کہ اس جلسے میں جن ادیبوں کے شریک ہونے کی توقع ہے ان میں کرشن چندر۔ فراق گورکھپوری۔ رشید احمد صدیقی پرل بک۔ ژاں پال سارتر اور فرانسیسی ناول نگار شامل ہیں۔ شہاب صاحب نے مزید بتایا کہ لاہور میں گلڈ ۳ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کی قیمت کی ایک بلڈنگ خرید رہی ہے جس کا نام گلڈ ہاؤس ہوگا اور جس میں گلڈ کا دفتر لائبریری، ریسرچ روم وغیرہ ہوگا۔ اس کے علاوہ باہر سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کی رہائش کا بھی وہاں بندوبست ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ لاہور کی طرح ایک گلڈ ہاؤس ڈھاکہ میں بھی قائم کیا جائے گا۔

شہاب صاحب نے مزید بتایا کہ گلڈ بہت جلد پاکستانی شاعروں کی منتخب نظموں کا انگریزی میں ترجمہ شائع کرنے والی ہے اسی طرح کی کوشش عربی اور فرانسیسی زبان میں بھی زیر غور ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ پاکستانی ادیبوں کو دوسری زبانوں سے متعارف کرایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ کراچی لاہور اور ڈھاکہ کی علاقائی شاخوں نے اشاعت کے لئے تقریباً ۵۰ کتابوں کی سفارش کی ہے اور توقع ہے کہ مرکزی گلڈ سلسلہ وار انہیں شائع کر سکے گی اور اس سلسلہ میں کچھ کتابیں آئندہ دو ایک مہینے میں چھپ جائیں گی۔ اس کے علاوہ کراچی اور ڈھاکہ سے گلڈ کا ترجمان اخبار شائع ہونا شروع ہو گیا ہے

---

اجنبی بن کے اداکرتے ہیں محبت کا مذاق
یہ ترے شہر کے لوگوں کا چلن آج بھی ہے

(منظر ایوبی)

# لک کی مختلف زبانوں میں رابطہ کی کوشش کامیاب ہوئی ہے!

## ائٹرس گلڈ مصنفین کے حقوق کا تحفظ کر رہا ھے، قدرت اللہ شہاب کی تقریر

بہاول پور، ۱۳ر اکتوبر۔ پاکستان رائٹرس گلڈ کے سکریٹری جنرل
ٹر قدرت اللہ شہاب نے کہا ہے کہ رائٹرس گلڈ نے نہ صرف مختلف مکاتب
کر اور مختلف طبقوں کے اہل قلم کے حالات کو بہتر بنانے میں کامیابی حاصل
ی ہے بلکہ اس کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ملک میں بولی جانے والی
ختلف زبانوں کے درمیان ایک مفید رابطہ پیدا کرنے میں بھی کامیابی
اصل کی ہے:

مسٹر قدرت اللہ شہاب نے رحیم یار خان میں مصنفین اور صحافیوں
ے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے، انہوں نے مزید کہا کہ مشرقی
پاکستان میں اردو کو مقبول بنانے کے سلسلے میں اس سے قبل دشواریاں پیش
آتی رہی ہیں لیکن رائٹرس گلڈ اور مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی اس کی شاخوں
نے اردو کو مقبول بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ مسٹر شہاب نے
کہا کہ اب وہاں یہ حالت ہے کہ جہاں کہیں بنگلہ زبان کے مشاعرے ہوتے
ہیں وہیں اردو کے مشاعروں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے اور لوگ ان مشاعروں
کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مسٹر شہاب نے اعلان کیا کہ پاکستان رائٹرس گلڈ کا سیاست
سے نہ تو کوئی تعلق اور نہ ہی ایسا ہونا چاہئے یہ ادارہ صرف اس لئے وجود میں
آیا ہے کہ مصنفین اور ادب کی خدمت کرے اور ان کے حقوق کا تحفظ کرے۔
مسٹر شہاب نے کہا کہ گلڈ مصنفین کی مشترکہ خواہشات پر وجود میں آیا ہے اس کا
مقصد یہ ہے کہ جن مصنفین نے اپنی زندگی میں انتہائی دشواریوں کا مقابلہ کیا
ہے اس کا حل تلاش کیا جائے۔ مسٹر شہاب نے کہا کہ گلڈ ایسے مصنفین کے حالات کو
بہتر بنانے کی پوری پوری کوشش کرے گا جو ناگفتہ بہ حالات سے دوچار رہے ہیں
انہوں نے کہا کہ ایسے لائق مصنفین جو اپنی زندگی میں غیر اطمینان بخش اور پریشان
کن مراحل سے دوچار رہتے ہیں وہ اپنی صلاحیتوں سے کوئی خاطر خواہ فائدہ پہنچانے
کے قابل نہیں رہتے۔ پاکستان رائٹرس گلڈ ایسے تمام مستحق اور لائق مصنفین کے
حقوق کا تحفظ کرے گا اور ان کی کوششوں کو کامیاب بنانے میں پوری طرح
تعاون کرے گا۔ مسٹر شہاب نے انکشاف کیا کہ موجودہ حالات میں پاکستان رائٹرس
گلڈ ایسے دس مصنفین کی مدد کر رہا ہے جو ایسی مجبوریوں سے دوچار رہتے ہیں کہ
وہ اپنی زندگی کو پیش آمدہ خطرات سے بچا نہیں سکتے تھے ایسی صورت میں جب
کوئی مصنف اپنی زندگی ہی کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہو وہ کون سی قلمی خدمت
انجام دے سکتا ہے۔ مسٹر شہاب نے چھوٹے شہر کے صحافیوں اور قومی اخبارات
کے علاقائی ادیبوں کے خدمات کی تعریف کی انہوں نے صحافیوں کو مشورہ دیا کہ وہ
کسی چیز کی اشاعت پر حق بیانی اور سچائی کو ترجیح دیں انہوں نے کہا کہ صحافیوں
کا حق پسندانہ اقدام ملک کی فلاح و بہبود پر مبنی ہونا چاہیے۔ انہوں نے اخباری
رپورٹروں اور نامہ نگاروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے بغیر ملک کے
اخبارات ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتے۔ صحافیوں کی انجمن کے نائب صدر مسٹر امانت علی
نے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس علاقہ میں صحافیوں کی جانب سے یہ
کوشش کی جا رہی ہے کہ عوام میں تہذیبی اور ادبی رجحانات پیدا کئے جائیں

# برٹرینڈ رسل کی سول نافرمانی

لندن۔ برطانیہ کے مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل اور پادری مائیکل
اسکاٹ ایٹم بم پر یک طرفہ طور پر پابندی عائد کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں
ان رہنماؤں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے سو افراد پر مشتمل کمیٹی مقرر کرنے
کا منصوبہ بنایا ہے انہیں سول نافرمانی کے لئے دو ہزار رضاکاروں کی خدمات
حاصل ہوں گی۔ اس کا انکشاف مورخ کرنل نے کیا۔ جو اس مہم کے خلاف ہیں

عابد رضا بیدار

# ادب کی رفتار

## (١٩٥٩ء)

پچھلے سال ماہانہ ادبی جائزے کی صورت میں 'ہماری زبان' (علی گڑھ) میں جو سلسلہ چلتا رہا تھا، ١٩٥٩ء میں چند متفرق خاص نمبروں پر تبصروں کے سوا مستقل حیثیت سے اسی سلسلے کو قائم نہیں رکھا جا سکا اور اب اتنا انبار ہو گیا ہے کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ١٩٥٩ء کی کتابوں اور رسالوں میں چھپنے والی اہم تحریروں کو محض کیٹلاگ کر دیا جائے۔ جزوی حد تک رسائل میں چھپنے والے مقالوں کو نوائے ادب کیٹلاگ کر دیتا ہے لیکن اس کی اپنی عائد کردہ حدود نے اس کے میدان کو تنگ کر دیا ہے اور یوں بھی اس میں اردو کے سارے اچھے رسائل کو جگہ نہیں ملتی اس لئے وسیع پیمانے پر سوچا جائے تو نوائے ادب سے آدھے سے زیادہ اہم مقالے چھوٹ جاتے ہیں اور افسانوں نظموں وغیرہ کے کیٹلاگ کا تو وہاں کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔

رسالوں کی اہم تحریروں کے علاوہ، ١٩٥٩ء میں جو کتابیں چھپی ہیں یا جن پر ١٩٥٩ء میں تبصرے ہوئے ہیں ——— اور ان کتابوں میں جن پر ١٩٥٩ء میں تبصرے ہوئے ہیں متعدد ایسی بھی تصانیف آ گئی ہیں جو ١٩٥٩ء سے قبل کی اشاعت ہیں ——— ان کے سوا جو قطعاً غیر اہم ہیں، میں نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتابوں کے نام دے سکوں جس سے حال کے پڑھنے والوں اور مستقبل کے تحقیق کرنے والوں کو مدد مل سکے۔

(مقالات)

### اسلامیات

اسلام ہندو پاکستان میں (احمد۔ مترجمہ ضیاء الحسن فاروقی) برہان۔

علی صرف تاریخ کی روشنی میں۔ (طٰہٰ حسین۔ مترجمہ عبدالحمید نعمانی) برہان

اسلامیات کے متعلق کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات (نصیر الدین ہاشمی) • برہان۔

تاریخ الردّہ (خورشید احمد فاروق) برہان

فقہ اسلامی کا تدریجی ارتقا (محمد تقی امینی) برہان

یونانی علوم کا مسلمانوں میں داخلہ (شبر احمد خاں غوری) برہان

جمال الدین افغانی (الہلال، یکم اپریل ١٩٠٩ء۔ ترجمہ محمد ثناء اللہ) برہان

چند دن وادیٔ دجلہ و فرات اور سرزمین قلوپطرہ میں (خواجہ احمد فاروقی) نگار، مئی

فلاسفہ کا تصور الٰہ (طالب صفوی) نگار۔ مارچ

احمدی جماعت (نیاز فتح پوری) نگار۔ ستمبر

مسلمان کیا کریں ( " ) " اگست

خلافت معاویہ اور یزید ( " ) " اکتوبر

علم مذہب۔ معلومات عامہ

عربی حبشی تعلقات اور مکاتیب نبوی (ڈاکٹر حمید اللہ) ثقافت، مئی

وحدت انسانی اور عقیدۂ توحید (خلیفہ عبدالحکیم) ثقافت مئی
فلسفہ کیا ہے (بشیر احمد ڈار) " "
لیکاؤس (رشید احمد) " "
شاہ ولی اللہ " " جون
سرسید " " اگست
روایت و درایت کے قرآنی پیمانے (محمد حنیف ندوی) " جون اگست
غزالی کا نظریۂ تعلیل " " جولائی
رواقیت (خلیفہ عبدالحکیم) " "
اسلامی تہذیب کا تصور " " جون
یونانی تصوف (بشیر احمد ڈار) فروری مارچ اپریل جون
رومی، نطشے اور اقبال (خلیفہ عبدالحکیم) ثقافت فروری
الفریڈ گلیوم کے ورثۂ اسلام پر ایک نظر (شبیر احمد خاں غوری)
معارف، اگست
مدارج سلوک (ڈاکٹر میر ولی الدین) معارف، اپریل جولائی اگست
صوبہ بہار میں ادارہ علوم اسلامیہ (شاہ معین الدین ندوی) معارف۔ مئی
مسلمان اور ہندستانی کلچر ( " ) " جنوری
فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان ( " ) " اپریل مئی
دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مسلم یونیورسٹی ( " ) " اگست
کیا انکم ٹیکس زکاۃ ہے (جعفر پھلواری) ثقافت، جولائی
حروف مقطعات ( " ) " "
کیا جہیز دینا سنت ہے ( " ) " اگست
جواز موسیقی ( " ) " فروری
ابی قوریت (خلیفہ عبدالحکیم) " اگست
یہودی تصوف (بشیر احمد ڈار) " "
"الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" پر تبصرہ (حبیب اللہ ندوی) معارف، جولائی

الجبر والمقابلہ (محمد عثمان عمادی) معارف، ستمبر، اکتوبر
علم کلام کا آغاز (شبیر احمد خاں غوری) " جنوری
دولت مایانیہ سنجان، بمبئی (اطہر مبارکپوری) معارف، مارچ،
فقہ اسلامی (محمد تقی امینی) معارف، فروری تا جون، ستمبر
مسالک کے ہندسی ادب کی ثروت (شبیر احمد خاں غوری) معارف،
نسائی اور ان کی سنن (ضیاء الدین اصلاحی) "
کلام ملکی سے عربی شعراء اور رادیار کا استفادہ (محمود حسن قیصر) معارف
ابوعبیدہ کی تفسیر مجاز القرآن (معصومی) معارف، مئی
فارسی کا مستقبل ہندستان میں (ڈاکٹر نذیر احمد) مسلم یونیورسٹی گزٹ
مسلم یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ (ہارون خاں شروانی) " ۱۴
" " (ڈاکٹر عابد حسین) " ۲۴
بچوں کی شخصیت کا احترام تعلیم کا بنیادی اصل (ذاکر صاحب) " ۸
" " : تعلیم کی تنظیم ( " ) " ۲۲
امین احسن اصلاحی کے مضمون کا جائزہ (ماہر القادری) فاران۔
تیموریوں کا فن تصویر (احمد نبی خاں) ماہ نو،
سید سلیمان کا ایک اہم مکتوب مورخہ ۱۳۶۳ھ۔ العلم،
عوامی تعلیم کا منصوبہ (شبیر بخاری) " ج
اتر پردیش کے لوک ناچ (خورشید احمد) نیا دور،
مرثیہ (محمد اسحٰق صدیقی) "
دیو مالا کا نفسیاتی پس منظر (شیر محمد اختر) صحیفہ۔
لائبریری سائنس کے موجودہ رجحانات (خواجہ محمد الٰہی) صحیفہ
چھ مہینے ایران میں (ڈاکٹر محمد باقر) "
عراق (شاہد حسن رزاقی) ثقافت،
آج کا علی گڑھ (کرنل بشیر حسین زیدی) غالب، ۲
ہندستانی موسیقی ہندستانی کی فنی اصطلاحات کی وضاحت میں دہلی

عبدالرحمٰن ) نیا دور۔ اگست، ستمبر

سودن (عبدالرحمٰن چغتائی) مارچ

ی تصویر کے دو رخ (شمس کنول) شاہراہ، جنوری

فلن تکلم (سرور صاحب) ہماری زبان، ۸ر جنوری

ے مشغلے ( " ) غالب، ۲۲ر جنوری

ہ نسبت کہاں سے ہے (مجنوں گورکھپوری) ہماری زبان، اپریل

ے روانی عمر ہے کہ در سفر گزرد (ڈاکٹر مختار الدین احمد) نقوش۔ ۸۱، ۸۲

ر دبیات (کسریٰ منہاس) " ۸۱، ۸۲

نتے اور اسلام (ڈاکٹر عبدالعلیم) علی گڑھ میگزین

خطاطی کا ایک نادر ذخیرہ (ایوب قادری) العلم، جولائی

بوہ علمی شاعری (اعجاز قریشی) صبا، مئی

۱۹۱۰ کی ہندوستانی فلمیں ( " ) " ، جون

## اردو

ئے اردو کا مکتوب صدر مملکت پاکستان کے نام۔ قومی زبان

۱۶ر اکتوبر تا ۱۶ر نومبر

لبۂ صدارت (مولانا صلاح الدین احمد) قومی زبان، یکم جولائی

مشرقی کتب خانہ (ڈاکٹر مختار الدین احمد) نیا دور، جنوری

لک بھائی قلم کی زبانی (عبدالوہاب) ہماری زبان۔ ۲۲ر جون

بریلیوں کے ذریعہ اردو کی ترویج، ادارۂ فروغ ادب رام پور

(حسرت آزاد) ہماری زبان، یکم جون

دو زبان کی ہندی لکھاوٹ (غلام رسول) " ۱۵ر مئی

دو رسم خط ( " ) " یکم ستمبر

ب خانہ سالار جنگ میں تعلیق میں لکھی ہندی کتاب (نصیر ہاشمی)

نوائے ادب، جنوری

دو زبان اور ہندی لکھاوٹ (شمس) ہماری زبان، ۸ر اپریل

کتب خانہ سالار جنگ اور میوزیم (نصیر ہاشمی) ہماری زبان، یکم فروری

ٹونک کے دو قدیم کتب خانے (منظور الحسن برکاتی) معارف، اگست

اردو کا ایک اور نام (مسعود حسین) ہماری زبان، یکم مئی

زبان زنانِ دہلی (سید شبیر علی کاظمی) سہ ماہی اردو "

اردو اور اتر پردیش (مسعود حسین) " ۱۵ر جولائی

علی گڑھ اور اردو (سرور صاحب) " ۸ر "

اردو تحریک احتجاج سے عمل تک " " یکم مارچ

نہرو اور اردو " " ۸ر "

اردو کانفرنس " " ۱۵، ۲۲ر جون

اردو میں انگریزی الفاظ (سرور صاحب، انشا، نارنگ، عبداللطیف اعظمی)

ہماری زبان، مارچ، اپریل، مئی

عام فہم زبان لکھئے (سرور صاحب) ہماری زبان، یکم اپریل

کیا ہم اپنا رسم خط بدل دیں " " فروری

## ادب

ادب کے نئے تقاضے (نیاز) اکتوبر

اردو میں خندہ زنی اور اقسام ظرافت (فرحت) صبا، جون

ابوالاثر حفیظ (رفیق خاور) ماہ نو، مئی

حافظ میری نظر میں (رضیہ بیگم) صبا، ستمبر

اردو نظم میں ہیئت کے تجربے (سیدہ جعفر) " ، اگست

رباعی کا فن (سلام سندیلوی) آج کل، جولائی

نادرات آسکر وائلڈ (نیاز) نگار، اکتوبر

طبقات سخن۔ مبتلا (نیاز احمد فاروقی) " ستمبر

آلھا (حسن عباس فطرت) آج کل، جون

روہیلکھنڈ کے لوک گیت (محمود نیازی) " جولائی

قطب مشتری (مرتاض الدین) " جون

نیاز فتح پوری سے انٹرویو (احتشام حسین) ادب لطیف ، جولائی

اردو ادب کی تشکیل نو (رفیق خاور) ماہ نو ، جون

ہماری معاشرت پر قصہ خانی کے تبیع اثرات (مظہر عزیز) آجکل ، ستمبر

مسدس مد و جزر اسلام کے تین جواب (مبارز الدین رفعت) اردو ، جنوری

میرامن سے پہلے کی ایک نثری داستان (نادم سیتاپوری) صبا ، اگست

میرامن کا سال وفات ہماری زبان ، یکم اکتوبر

" (محمد عتیق صدیقی) " ۱۵ر "

خطبۂ صدارت (مولانا صلاح الدین احمد) ادب لطیف ، جولائی

غزل میں وحدت تاثر (شہاب جعفری) " "

مکتوب سلام مچھلی شہری : غزل اور نظم ۔ انشا ، جنوری

مکتوب وامق جون پوری : علی گڑھ پنچ کے پہلے اور آخری نمبر مورخہ

۷ر اپریل ۹۵ء کے سلسلے میں انشا ، جون

حقیقی شاعری کے عناصر (فراق) ہماری زبان ، ۲۲ر نومبر

ادب اور مقصد " " یکم دسمبر

" (مجنوں) " ۸ر نومبر

## کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے — سمپوزیم

ڈراما و افسانہ ، قرۃ العین ، کرشن ، عصمت ، احمد عباس

خدیجہ ، کشمیری لال ذاکر ۔ صالحہ عابد حسین ۔ ابو سعید قریشی

واجدہ تبسم ، عشرت رحمانی

شاعری : جوش ، فراق ، میکش ، مجید امجد ، جگن ناتھ آزاد ، سلام ۔

تنقید و تحقیق : نذیر احمد ۔ نیاز ، دریابادی ، زور ، احسن فاروقی

محمد حسن ، مظفر علی سید ، نصیر ہاشمی ۔

مزاح : شوکت ، کپور ، فکر تونسوی (نقوش ۷۵-۷۷)

## غالب

اردو ادب غالب کے عہد تک (احتشام حسین) شاعر ، جون

غمگین دہلوی ثم گوالیاری (مسعود احمد) فاران ، ستمبر

غالب کی یاد میں (سرور صاحب) ہماری زبان ، ۱۵ر فروری

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام ذکا (مبارز الدین رفعت) نگار ، اپریل

غالب کی ایک ناموزوں رباعی ع دکھ جی کے الخ

(حامد علی خاں رام پوری) نگار ، جون

غالب کے خطوط (اقرار احمد عباسی) علی گڑھ میگزین

غالب پر سرقہ کا الزام (خواجہ احمد فاروقی) معارف ، فروری ، اگست

" (مالک رام) " مئی

ناسخ اور مرزا غالب (ایس ایم حسن) نوائے ادب ، اپریل

دیوان غالب اردو کا ایک اور نسخہ ، مکتوبہ ۱۸۴۵ء (خلیل الرحمن داؤدی)

ماہ نو ، فروری

غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب (سید قدرت نقوی) ماہ نو ، "

اردو شاعری پر غالب کا اثر (امتیاز علی عرشی) نیا دور ، مارچ

تلامذۂ غالب ، مصنفہ مالک رام (تمکین کاظمی) تحریک ، اپریل

" " (نثار احمد فاروقی) نقوش ۷۵-۷۷

غالب کے بعض مطالب کی نئی تحقیق (سعید الدین شیرکوٹی) قند ، ستمبر

غالب کی چند نئی اردو تحریریں (امتیاز علی عرشی) شاعر ، مئی

غالب کا معجز سخن (عابد رضا بیدار) قومی زبان ، یکم اپریل

غالب اور عارف (شاہد صدیقی) آج کل ، فروری

نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ پنجم (مالک رام) آجکل ، "

کچھ غالب کے بارے میں (فرخ جلالی) " "

مرزا یوسف (مالک رام) نوائے ادب ، اپریل

مثنوی مہر و ماہ ( " ) آج کل ، مئی

(باقی آئندہ)

نظیر محسن

# گریز

میرے محبوب نہ کر میرے تغافل کا گلہ — مجھ کو ہر حال میں منظور تری دلجوئی
میری غیرت کو محبت کی ترازو پہ نہ تول — امتحاں اس سے بڑا اور نہ ہوگا کوئی

مجھکو معلوم کہ ہے تجھ کو بہاروں کی تلاش — میری دنیا میں مگر پھول نہیں کانٹے ہیں
شکریہ شرکتِ غم کا مرے محبوب مگر — غم و آلام بھی دنیا نے کہیں بانٹے ہیں

تجھکو پانا مری معراج ہے لیکن اے دوست — اپنی غیرت کا جنازہ میں اٹھاؤں کیوں کر
مانگ کر تیرے شبستاں سے اجالوں کی کرن — اپنے اس خانۂ ویراں کو سجاؤں کیوں کر

زندگی میری ہے طوفانِ حوادث کی شکار — اپنے آلام میں کیسے تجھے شامل کر لوں
تلخیٔ زیست کے آغاز سے واقف ہو کر — اپنے انجام میں کیسے تجھے شامل کر لوں

پیار تیرا ہے بڑی چیز مگر جانِ وفا — تجھ سے مانگی ہوئی قسمت مجھے منظور نہیں
اپنی دنیا کے یہ آلام گوارا مجھ کو — تیری بخشی ہوئی راحت مجھے منظور نہیں

# وقت کا اہم تقاضا

(روزنامہ "امروز" لاہور کا اداریہ)

شہزادہ کریم آغا خان یہ امید ظاہر کرنے میں حق بجانب ہیں کہ "اردو یونیورسٹی کا قیام پاکستان کے لئے مفید ثابت ہوگا۔" یہ خیال تلخ سہی مگر حقائق اور تجربات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اپنی ہی زبان اپنانے اور اختیار کرنے کے لیے ہم کسی غیر معمولی اور بھرپور کوشش کے منتظر ہیں بلا یقین کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہے کہ جب تک کسی بڑی کوشش کے نتائج سب کو قائل نہیں کر لیں گے اس وقت تک "ذریعہ تعلیم" موضوع بحث رہے گا جب تک یہ بحث ختم نہیں ہوگی، اس وقت تک انگریزی کی برتری برقرار رہے گی اور اس دفتر معاملے میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر احساس کمتری کا شکار رہیں گے اور جب تک یہ احساس کمتری ہمیں پابند رکھے گا اس وقت تک ہماری ذہنی آزادی کی تکمیل ملتوی رہے گی۔ ہمارا قومی شعور پختگی سے محروم رہے گا۔ ہمارا نظام تعلیم اور تعلیمی مزاج جزواً مفلوج رہے گا اور ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اپنے ہی وطن میں "اجنبی" رہے گا۔ اس سے انکار نہیں کہ قومی زندگی میں اردو کو اس کا حق دلانے کے سب خواہاں ہیں مگر یہ حق محض الفاظ کے بل پر یا اقوال کے سہارے نہیں دیا جاسکتا اس کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے اور کام کا عالم یہ ہے کہ حصول آزادی کے تیرہ برس بعد بھی ہم علم حاصل کرنے کے لئے غیر ملکی زبان کے محتاج ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہمیں اور خصوصاً ہمارے ماہرین تعلیم کو ان نقصانات کا اندازہ نہیں ہے جو ایک غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے سے پہنچے ہیں بلکہ مسلسل پہنچ رہے ہیں ان کا علم اور اعتراف سب کو ہے مشکل مگر یہ ہے کہ کوئی اس چکر کو توڑنے کی جرأت نہیں کرتا۔ کیا یہ المیہ نہیں ہے کہ اس معاملے میں تعلیم کمیشن بھی اپنے آپ کو معذور پاتا ہے اور فی الحال ثانوی درجوں سے آگے قدم بڑھانے پر آمادہ نہیں ہے؟

تعلیم کمیشن کی رپورٹ اس اعتبار سے یقیناً قابل قدر ہے کہ اس کی بدولت ذریعہ تعلیم کے متعلق ایک حقیقت پسندانہ اور معین نقطۂ نظر سرکاری پالیسی کا حصہ بنا ہے لیکن صرف اصول تسلیم کر لینا کافی نہیں ہے اس کے مطابق عمل کرنا اصل کارنامہ ہے۔ اس کے لئے تعلیم کمیشن نے مزید پندرہ برس کی مہلت مانگی ہے۔ بظاہر یہ مدت زیادہ معلوم نہیں ہوتی مگر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے اس ارشاد سے بھی اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ جب ایک صدی قبل دلی کالج میں ادب اور سائنس کی تعلیم اردو کے ذریعہ دی جاتی تھی، اور جب عثمانیہ یونیورسٹی کی درخشاں مثال ہمارے سامنے ہے۔ اور جب ضرورت کے مطابق ہر علم و فن میں نصابی کتابوں کا ذخیرہ بھی اردو میں موجود ہے تو پھر ہم پندرہ سال کیوں انتظار کریں۔ اردو میں تعلیم کا جو تجربہ سوا سو سال پہلے دلی کالج میں کیا گیا اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ہر شعبے میں تیس سال تک بڑی کامیابی سے

جاری رہا۔ اس کی کامیابی میں کیوں شکوک شبہات ہیں؟" بالغرض یہ مان بھی لیا جائے کہ پندرہ برس کا انتظار ابھی مجبوری ہے تو جب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ۱۹۷۵ء میں یہ مجبوری واقعی باقی نہیں رہے گی؟ ماضی کو اگر معیار ٹھہرالیا جائے تو اس بارے میں خوش فہمی کی گنجائش نہیں ہے، پندرہ برس کے بعد بھی وہی مجبوریاں گنائی جاسکتی ہیں اور اردو کی "تہی دستی" کی وہی فرسودہ داستان دہرائی جاسکتی ہے جس میں بعض اچھے خاصے سمجھدار لوگ بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ لازمی ہے کہ اردو یونی ورسٹی جلد سے جلد قائم ہو اور پندرہ برس سے پہلے پہلے یہ ثابت کردے کہ ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی بڑی آسانی سے مکمل ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اردو یونی ورسٹی قائم کرنے کا فرض عمر کے اس حصے میں قبول کیا ہے جب انسان سکون اور گوشۂ تنہائی کی تلاش میں ہوتا ہے اور آرام کی طلب شدید تر ہوجاتی ہے ان کا یہ عزم اور حوصلہ جوانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اور اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ مقصد معین ہو اسے حاصل کرنے کی خواہش ہو اور خلوص اور ایثار کا جذبہ ہو تو انسان زندگی کے کسی حصے میں بھی جدوجہد جاری رکھ سکتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی کوششیں اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہیں جب ہر محب وطن ان کا ہاتھ بٹائے اور ان سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو۔ یونی ورسٹی کے لئے پچاس لاکھ روپے درکار ہیں۔ یہ رقم پچاس اہلِ ثروت بھی مل کر پیش کرسکتے ہیں، مگر صرف اہلِ ثروت پر تکیہ کرکے بیٹھ رہنا موزوں نہیں ہے ان میں کتنے اصحاب ایسے ہیں جو اس مہم کی اہمیت محسوس کرسکتے ہوں؟ اس لئے بیشتر سرمایہ عوام ہی سے حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ایک باقاعدہ فنڈ قائم کرنا ہوگا چاہئے۔ اور چندہ جمع کرنے کے لئے ہر شہر میں ایک منظم مہم کا آغاز کرنا چاہئے۔ ہمیں یقین ہے کہ عام لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق اس نیک کام میں ضرور شریک ہوں گے ::

(۴ راکتوبر ۱۹۶۰ء)

بقیہ

# اداریہ

(بسلسلہ ص ۳)

اردو زبان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا جائے گا۔ دنیا میں جہاں جہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہے ایسے تمام ادارو اور درسگاہوں سے یونی ورسٹی اپنا تعلق قائم کرے گی اور جہاں ابھی اردو کا رواج نہیں ہوا اس کی ترویج کی کوشش کی جائے گی، اور جہاں تک ممکن ہوگا ایسی درسگاہوں کی مدد کی جائے گی۔ ہم اس کے ذریعے اردو زبان کو بین اقوامی زبان بنانے کی کوشش کریں گے یہ مقاصد ایسے ہیں جنھیں صرف اردو یونی ورسٹی ہی پورا کرسکتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو زبان کو ایک اعلیٰ درجے کی علمی اور عالمی زبان بنانے کے لئے ایک ایسی یونی ورسٹی کا قائم کرنا از بس لازم ہے

---

بقیہ

# نقد و نظر

بسلسلہ ص ۴۴

کتاب میں بعض باتوں کی تکرار بھی پائی جاتی ہے، مگر یہ تکرار ویسی نہیں جیسے کسی شعر میں کسی لفظ کے بار بار آنے سے شعر کا لطف بڑھ جاتا ہے اس کتاب کی اشاعت سے ایک اہم ادبی ضرورت پوری ہوئی ہے، ناول اور افسانے کا ایسا بھرپور اور فکر انگیز تجزیہ کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ اردو اکیڈیمی نے یہ کتاب بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔ (۶۶۰)

---

کم نہ تھے نازک مزاجی میں کسی سے ہم مگر
رنج دینے والے کو پہچان کر چپ ہوگئے (طفیل احمد علی)

# اردو یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ

## مخیر سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی امداد و اعانت کی ضرورت

(روزنامہ عوام کراچی کا اداریہ)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اردو یونیورسٹی کے قیام کی جو مہم شروع کی ہے یقیناً ہر محب وطن اور اردو دوست نہ صرف اس مہم سے اتفاق کرے گا بلکہ حتی الامکان اس منصوبے کو عملی حیثیت سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں امداد بھی کرے گا۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اس ملک میں جہاں اردو قومی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اس کو ابھی تک کالجوں اور یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا گیا ہے۔ جو لوگ انگریزی سے دلدادگی اور فریفتگی کے باعث اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے مخالف ہیں ان کی طرف سے اس زبان کی کوتاہ دامنی کے افسانے ہم بہت سن چکے ہیں لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ان وسعتوں کا کھلے دل سے اعتراف کر لیا جائے جو اردو اپنے دامن میں رکھتی ہے سنہ ۱۹۶۰ء کی بات تو اور رہی ہے لیکن اردو تو اپنی اس وسعت کا سنہ ۱۸۵۵ء سے پہلے ہی ثبوت دے چکی ہے جب دہلی کالج میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر یہ ثابت کر دیا گیا تھا کہ دوسرے علوم و فنون کو اپنے اندر سمو لینے کے لئے اردو کا دامن بہت وسیع ہے کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ جو بات آج سے سوا سو اور ڈیڑھ سو سال پہلے عملی طور پر ثابت ہو چکی ہے آج اس سے انکار کیا جائے۔ دوسرا تجربہ پہلے تجربے کے تقریباً ۸۰ سال بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوا جہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کیا گیا کہ اردو کا دامن تنگ اور کوتاہ نہیں ہے اور یہ کہ وہ ہر علم و فن کے لئے کافی وسعتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگرچہ آج عثمانیہ یونیورسٹی اپنی اس شان کے ساتھ موجود نہیں ہے اور وہاں اردو کے ذریعے تعلیم ہونے کی خصوصیت کو ختم کر دیا گیا ہے لیکن یہ جو کچھ ہوا اس لئے نہیں ہوا کہ خدانخواستہ یہ تجربہ ناکام رہا بلکہ اس لئے ہوا کہ سقوط حیدرآباد کے بعد جب حیدرآباد پر اردو کے نادان دشمنوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے اردو کے ساتھ اپنے جذبات معاندت کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

تیسرا تجربہ غیر منقسم ہندوستان میں دہلی میں جامعہ ملیہ کی صورت میں ہوا اور یہ بھی اردو کا امتیاز ہے کہ یہ تجربہ بھی کامیاب رہا آج تک جامعہ ملیہ میں اردو ذریعہ تعلیم کے طور پر نہ صرف علوم و فنون بلکہ ملک و قوم کی بھی گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے ان تجربوں کی روشنی میں پاکستان میں اردو کی اس برتری سے انکار یا انحراف زمانے کی ایسی ستم ظریفی ہے جس کی مثال شاید دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شاید پاکستان وہ ملک ہے جہاں مادری زبان کے علاوہ ایک غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم برقرار رکھنے پر زور دیا جا رہا ہے اور اس ذریعہ کو اس غیر فطری صورت سے بدل کر فطری صورت میں لانے کے لئے ۱۵ سال کی مدت رکھی گئی ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اردو کے ان خادموں میں سے ہیں'

جنھوں نے اس شیریں پاکیزہ اور لطیف زبان کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے ۔ اگرچہ ان کی عمر نوے سال تک پہنچ چکی ہے لیکن جہاں تک اردو اور اس کی خدمت کا سوال ہے ان کے حوصلے جوان اور ان کے ارادے بہار شباب لئے ہوئے ہیں انہوں نے کراچی میں تمام پاکستان کے لئے اردو یونی ورسٹی کے قیام کا جو حوصلہ کیا ہے وہ اردو کی ایک عظیم تر خدمت تو بہرحال ہے ہی لیکن اس مبارک منصوبے سے انگریزی کی طرف ہمارے غیر فطری میلان اور رغبت کی جو اصلاح ہوتی ہے وہ خود اپنی جگہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش ایسی نہیں کہ اس کو نظر انداز کیا جائے یا ان کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے ۔ ظاہر ہے کہ یہاں سوال روپیہ کا ہے اور اس ملک کے غریب عوام اپنی مادری زبان اردو کے فروغ کے لئے سوائے زبانی ہمدردیوں کے اور کیا کرسکتے ہیں دراصل یہ کام مخیر سرمایہ داروں، بڑے تاجروں اور دولت مند صنعت کاروں کا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی طلب کے مطابق چند لاکھ روپیہ فراہم کرکے اس یونی ورسٹی کے قیام میں امداد کرسکتے ہیں اس ملک کے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں نے کسی اچھے مقصد کے لئے مالی امداد میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا ہے اور یہ ہماری ہی نہیں بلکہ پوری قوم کی توقعات ہیں کہ اس مقصد میں بھی یہ سرمایہ دار اور صنعت کار اپنی پوری پوری فیاضی سے امداد و اعانت کرکے اردو یونی ورسٹی کے قیام کا امتیازی سہرا اپنے سر باندھیں گے ۔

( ۳ ستمبر ۱۹۶۰ء )

بقیہ

# اردو مطبوعات ( سلسلہ ص ۲۵ )

( ۵ ) سفینۂ نجات ۔ صغرا بیگم ہمایوں مرزا کی تصنیف ہے اس میں مذہب اور اخلاق کے متعلق بہت اچھا مواد درج کیا گیا ہے ۔

( ۶ ) گلزار اولیاء ۔ یہ میری والدہ مرحومہ کی تالیف ہے اس میں بزرگان دین، صوفیائے کرام کے کرامات اور عادات کو عام فہم اردو زبان میں لکھا گیا ہے ۔

( ۷ ) حمایت الاسلام کی مولفہ حسینی بیگم صاحبہ باطن تخلص ہیں اس کتاب میں مذہبی۔ فقہی اور اخلاقی عنوان کے تحت ضروری مواد پیش کیا گیا ہے ۔

( ۸ ) مجموعہ نصائح ۔ یہ بھی صغرا بیگم ہمایوں مرزا کی تالیف ہے ۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے اس میں اخلاقی نصیحتوں کو جمع کیا گیا ہے جو عموماً خواتین کے لئے اور بچوں کے لئے ضروری ہیں ۔

## ڈومسٹک سائنس

ڈومسٹک سائنس کے فن کے متعلق جو کتابیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں : ۔

۱ ۔ بخت سکندری — سکندر بیگم
۲ ۔ امور خانہ داری — جہاں بانو نقوی
۳ ۔ علم خانہ داری — محمودہ بیگم
۴ ۔ من کی بیتا — لطیف النساء بیگم
۵ ۔ گھریلو درزی — راحت بیگم
۶ ۔ اچھی لڑکی — راحت بیگم
۷ ۔ شمیم سوزن کاری — سعیدہ ضمیر الدین
۸ ۔ رسالہ جات ڈومسٹک سائنس (۶) حصے — منیر فاطمہ بی۔ ایس۔ سی

سکندر بیگم محبوبیہ گرلز اسکول کی پکوان کی معلمہ تھیں اس میں حیدرآبادی پکوان کی تفصیل اور ان کے طریقے بتلائے گئے ہیں ۔ (باقی آئندہ)

شریف ترزمی

# سخن در سخن

گذشتہ چند سالوں سے اردو ادب کی جانِ ناتواں پر جیسی کچھ بیت رہی ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ایک طبقے نے اسے جمود کے صحرا میں لاکر چھوڑ دیا ہے اور دوسرے نے ادب کو مریض سمجھ کر بزعم خود اس کی فرسٹ ایڈ شروع کر دی ہے۔ ادب کی تشکیل۔ تطہیر یا تنظیم کے نعرے اسی طبقے کی طرف سے بلند ہوتے ہیں ان نعروں میں جوش و خروش بھی ہوتا ہے اور خلوص بھی لیکن ذہن کی پختگی اور شعور کی کارفرمائی ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔ حالات کا تجزیہ ہوتا تو ہے لیکن نامکمل اور قدرے یکطرفہ جس کی بنا پر اخذ کردہ نتائج کی صحت بالعموم مشکوک ہی رہتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ملکی تقسیم اور فسادات کے بعد ہماری اقتصادی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ڈھانچا ہی بدل کر رہ گیا ہے پرانے معاشرے کی شکست و ریخت اور کسی نئے آدرش کے فقدان کی بنا پر ہماری روز مرّہ زندگی میں نہ سکون باقی رہا ہے اور نہ ہی نظم و ضبط۔ اب افراد کو دیگر افراد معاشرہ کے سامنے جواب دہی کا خوف بھی لاحق نہیں رہا۔ محاسبے کا تصوّر اور فکر و نظر کے مروجہ معیار بہت سی بے اعتدالیوں کی روک تھام کا باعث ہوتے ہیں۔ نئی زندگی میں یہ تصور مفقود ہے جس سے پوری نسل بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ حالاں کہ نئی زندگی کے قرائن سے اجنبیت اور موجودہ انتشار کی بنا پر ہمارے بیشتر ادیب ذہنی بے بسی کے عالم میں گرفتار ہیں لیکن لکھنے والے برابر لکھ رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔ شیرازۂ حیات میں مکمل ابتری اور برہمی کے باوجود ان کا قلم گلستان ادب کی حد بندیوں میں برابر مصروف ہے۔

لکھنے والوں کی یہ جماعت دو گروہوں میں منقسم ہے، ایک وہ حالات سے غیر مطمئن ہے، نئے معاشرے کی تعمیر اور اعلیٰ انسانی اقدار اس کا مطمح نظر ہے جس کے لیے جس کے لئے وہ دل و جان سے کوشاں ہے کوششوں میں ہمواری اور تنظیم چاہے نہ ہو لیکن اس میں حوصلے اور کا فقدان نہیں ہے۔

دوسرا گروہ ایسے کم ہمت اور نا اہل لوگوں پر مشتمل ہے جو اندر مقابلے کی سکت نہ پا کر حالات سے مفاہمت کر چکے ہیں اور اب وہ کے موافق بہ رہے ہیں۔ ان حضرات نے کوئی اور ذریعہ معاش نہ پا کر کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ ایسے تمام لوگ بے تکان لکھ رہے ہیں اور جنسی اور سنسنی خیز ادب کی تخلیق کے ذریعے اپنے ذہن کی غلاظتوں کو گلی میں بکھیر رہے ہیں۔ گندگی کے ان ڈھیروں کی فراوانی کا اندازہ ہم ممالک میں چھپنے والے اخبارات، رسائل اور کتابوں سے ہو سکتا۔ غلاظت کی یہ تقسیم اب مستقل تجارت اور نفع بخش کاروبار بن چکا ہے افسوس ہے کہ اب اچھے خاصے مشہور و معروف اہل قلم نے بھی حصہ لینا کر دیا ہے۔ مادی اقدار، روحانی اقدار حیات پر غالب آ چکی ہیں ادیب۔ قاری، ادب اور ناشر کے باہمی تعلق اور رشتے کی نوعیت بدل گئی ہے، اس صورت حال نے صرف اچھی چیزوں کی مارکیٹ ہی کم نہیں کر دی، عمومی ذوق کو بھی اس قدر بگاڑ ڈالا ہے کہ اب

شکل تمام ہی منضم ہوتی ہے۔ عام معاشرتی اقدار۔ لوگوں کے حسن
کے معیار اور فکر و فن کی جملہ صورتیں ذوق عامہ کی تشکیل بھی کرتی ہیں
زیب بھی۔ چوں کہ ہر دو کے محرکات و عوامل یکساں ہوتے ہیں لہذا
غلط نہیں ہے کہ فن اور ادب ماحول کی صرف تخلیق ہی نہیں ہوتا خالق
بنتا ہے جس کا انحصار اس کو برتنے والے کی اہلیت اور شخصیت پر ہ
ا اگر اپنے فن کی تذلیل پر اتر آئے تو معاشرے کے لئے خطرناک مجرم
زیادہ ضرر رساں ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں ایسے ادیبوں کی تعداد
ہے جو پبلک کو ادب کے نام پر زہر ہلاہل اور افیون کی گولیاں تقسیم
پھر رہے ہیں۔ ذوق عامہ کی تباہی اور اخلاقی گراوٹ کی ذمہ داری
حد تک اسی طبقے کے سر ہے۔

اس طبقے کی روز افزوں مقبولیت صحت مند ادب کے لئے
خطرہ بن چکی ہے اور ناشرین کے لئے سنسنی خیز ادب کی اشاعت
مقول بہانہ بن گئی ہے کیوں کہ خالص ادبی چیزوں کی اشاعت
ین کوئی منفعت بخش کاروبار نہیں ہے۔ جدید اصول تجارت کے
ناشرین کو صرف "چالو مال" درکار ہوتا ہے اور اس میں بھی
س" پرانے اور بڑے" کی ہے کیوں کہ نئے کی سرپرستی بھی
گھاٹے کا سودا ہے۔

یہ ہے سرسری جائزہ موجودہ رفتار ادب کا جس میں اگر ہمارے
ملکی ہیرو پرستی۔ گروہ بندی۔ نظریاتی کش مکش اور عصبیت کے
ساتھ سستی شہرت کی بے پناہ خواہش کو بھی شامل کر لیا جائے تو
شاید مکمل ہو جائے گی۔

صحت معاشرہ اور ادب لازم و ملزوم ہیں لیکن مندرجہ
الف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب کی موجودہ پستی کا ... ...
انحصار معاشرے کے انحطاط پر اتنا نہیں ہے جتنا خود ادیب کی
خیالی اور پست کرداری پر ہے تقسیم کے بعد ضرورت تو اس امر

کی تھی کہ ہم اپنے قدیم سرمائے کا جائزہ لے کر اسے جدید نظریات سے
ہم آہنگ کرتے۔ موجودہ ضروریات کے تحت اپنے ملی شعور کی
تشکیل اور افکار کی تنظیم کی طرف متوجہ ہوتے جو وسیع۔ توانا اور
ہمہ گیر ادب کی تخلیق کے لئے راہیں نکالتیں لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہمارے ادیب کچھ بھی تو نہ کر سکے بجز ایک دوسرے کے خلاف نبرد
آزما ہو کر اپنی صلاحیتیں ضائع کرنے کے۔ فکری وحدت کے فقدان
اور کسی صحت مند آئیڈیل کی عدم موجودگی نے انہیں علاقہ واریت
اور گروہ بندی کے تاریک غار میں محبوس کر دیا۔ یہی وجہ ہے جو ہر
دو ممالک میں صرف پارٹی باز اور علاقہ وار متعصب ادیب نظر
آتے ہیں اور کوئی ایسی شخصیت نہیں دکھائی دیتی جس پر خالص
پاکستانی یا خالص ہندوستانی ادیب ہونے کا اطلاق ہو سکے۔ یہ صورت
حال یقیناً بڑی افسوسناک ہے اور ہر دو ممالک کے ادیبوں کے
لئے باعث فکر ہے۔

اب جدید ادب کی طرف آئیے اور موجودہ نسل کے ذہنی
رجحانات کا جائزہ لیجئے اس نسل نے دوسری عالمی جنگ کے ہولناک
نتائج بھگتے ہیں (اور اب تک بھگت رہی ہے۔) تقسیم کے سلسلے
میں ہونے والے کشت و خون کے المناک ہنگاموں سے
ہے اور اب دو طاقت ور بلاکوں کی باہمی چپقلش کا شکار ہو کر اس
منزل تک آ پہنچی ہے جہاں تیسری عالمی جنگ کے بھیانک سائے
ہر لحظہ گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نئی نسل کے ذہن نے ان
تمام حالات کا اثر قبول کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو جدید ادب میں
طبقاتی کش مکش۔ ذہنی انتشار۔ ناآسودگی اور اضطرابی کیفیات
کے نمایاں اثرات ملتے ہیں۔ یہ ادب اقبال کے عہد پر حالی۔ اقبال یا تقسیم
سے پہلے کے ادب سے مختلف ہے ہر دو کا موازنہ کرتے وقت

ہیں ان دونوں نسلوں کی رومانی وجذباتی بلندی وپستی کے فرق کو ملحوظ
رکھنا پڑے گا۔ یہ دو ذہنوں کا فرق ہے جو ہمیں نمایاں دکھائی دیتا ہے
اس انتشار اور ذہنی تفاوت کا پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ جدید
ادب میں نظریات کی بہتات ہے اور نظر کا فقدان۔ شعر ہو یا ڈرامہ
افسانہ ہو یا ناول یہ صورت حال ہر جگہ ملے گی جس کی پرکھ کے لئے
ابھی تک کوئی خاص معیار مقرر نہیں ہوا۔ موجودہ ادب بالخصوص تنقید کی
گمراہی اور بے راہ روی کا بڑا سبب یہی ہے۔ پرانی قدریں نئے حالات
کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں لیکن نئے پیمانوں کا سرے سے وجود ہی نظر
نہیں آتا۔ ادھر ہمارے ادیب پرانی روایات کو تبدیل کر ڈالنے کا جنون
تو رکھتے ہیں لیکن خود ان روایات سے کما حقہ آگاہ نہیں ہیں دوسری
جانب مغربی ادب کی روایات سے بھی واقفیت سطحی ہے۔ مغربی
ادیب اور نقادوں کے پختہ و ناپختہ خیالات۔ مہمل اور غیر مفہم شدہ
نظریات جدید تنقید کا تمام سرمایہ ہے لہٰذا ایسی صورت میں نقادوں
سے کسی ایسے منضبط اور مبسوط نظریۂ تنقید کی توقع رکھنا فضول ہے
جو ہماری تمام روایات۔ رجحانات اور میلانات کا احاطہ کر سکے۔
ہمارے بیشتر ادیب اور نقادوں کی کیفیت ان کسانوں کی سی ہے جو
کاشتکاری کا جنون تو رکھتے ہیں لیکن طریق کاشت سے واقف
نہیں ہوتے انہیں نہ تو پودوں کے مزاج سے شناسائی ہوتی ہے اور
نہ ہی زمین کی خاصیت کا علم ہوتا ہے۔

سرقہ توارد اور زبان کی بحث کے سلسلے میں بھی رفیق صاحب
نے مندرجہ بالا گروہ کے خیالات کی نمائندگی کی ہے۔ موصوف کو شاید
یاد نہیں رہا کہ کسی بھی فن پارے کو اس کے مخصوص ماحول، روایت
اور تہذیبی پس منظر ہی میں رکھ کر پرکھا جاتا ہے۔ کسی جگہ کے ادب کا جائزہ
قطعاً نامکمل ہوگا اگر وہاں کے بسنے والوں کے تاریخی تہذیبی اور ذہنی
ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے (خود ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ ہی کو لے

لیجیے بعض میں روایات سے صرف انحراف ہی [illegible]
بھی ملتا ہے) ٹیکنیک کو مکمل فن سمجھنے پر اصرار کرنا مہمل سی بات
لیکن اسے فن کا کوئی جز نہ سمجھ کر سرے سے نظر انداز کر دینا بھی کم
کی دلیل ہے۔ ہماری تنقید میں عروض وصنعت کی اہمیت مسلم ہے
سے انکار کا مطلب یہ ہے کہ ہم آنے والی نسل کے لیے غلط اور ناق
زبان چھوڑ جائیں گے اور یہ صورت حال بجائے خود زبان کی ت
کے لیے جس قدر مضر ہوگی، اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نئے میلانات اور جدید نظریات کی اپنی اپنی اہمیت
کس کو انکار ہوگا۔ لیکن اس ضمن میں بھی یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے
ہر نیا رجحان خواہ کیسا ہی قوی کیوں نہ ہو روایت بن جانے کی ص
نہیں رکھتا۔ رجحان روایت صرف اسی وقت بنتا ہے جب اس
جڑیں قومی شعور اور ذہن کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ جو رجحانا
ہماری ذہنی تاریخ اور تہذیبی روح سے علاقہ نہ رکھتے ہوں وہ
نہیں بن پاتے۔ عبدالعزیز خالد کی ناکامی کا بڑا سبب یہی ہے
ان کے تجربات اپنی ندرت کے باوجود ہمارے قلب وروح
کوئی مناسبت اور یگانگت نہیں رکھتے۔ دور از فہم استعار
غریب تشبیہات۔ خیال ومضمون کی اجنبیت نے انہیں اس ملک
اب تک اجنبی بنا رکھا ہے۔ - - - - -
- - - - - ۔آخر ایسے اجتہاد سے زبان واد
کو کیا فائدہ؟ ـــــ ادبی روایات اور قومی شعور کی اہم
کا اندازہ لگانے کے لئے عبدالعزیز خالد کے مقابلے میں صرف فیض
راشد اور تصدق حسین خالد کے اجتہادات کی مثالیں پیش کرنا
ہے۔ ارباب نظر خود اندازہ لگا لیں گے۔

یہ ہے صورت حال جس پر غور کئے بغیر ادب کی تشکیل نو
بابت سوچنا ہی فضول ہے۔ [illegible]

ہوجایا کرتی ہے۔ کیوں کہ تشکیل کسی معین قاعدے یا خارجی قانون کی تابع نہیں ہوا کرتی اس کے اسباب و محرکات بالعموم داخلی ہی ہوتے ہیں لکھنے والے لکھتے رہتے ہیں اور اسلوب و ہیئت کے تجربے کرتے رہتے ہیں روایتیں تبدیل بھی ہوتی رہتی ہیں اور ان میں اضافے بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ تمام تر عمل ایک تاریخی تسلسل کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور اپنے فطری ارتقا کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ کچھ خطوط بنا دیئے جائیں اور کچھ اصول و ضوابط مقرر کر کے ادیبوں کو ان کی تعمیل کی ہدایت کر دی جائے۔ چند قوانین وضع کر کے ان کی پیروی ہر کس و ناکس کو ضروری قرار دے دی جائے۔ صحت مند معاشرے میں ایک باشعور ادیب کا قلم جب حرکت میں آتا ہے تو ان قوانین اور خطوط کی پروا نہیں کیا کرتا۔ اپنے خطوط خود معین کرتا ہے اور خود اپنے راستے کا تعین کرتا ہے۔ یہ راستہ اگر عوامی شعور کے قریب سے ہو کر گزرتا ہے تو خود بخود عام شاہ راہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ بصورت دیگر مغربی پگڈنڈیوں اور راہوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ان راہوں کے نقوش دھندلا کر رفتہ رفتہ خود ہی مٹ جاتے ہیں۔ یہی ہر ادب کی ارتقائی کہانی ہے۔ رفیق صاحب و دیگر معزز اہل قلم خواہ مخواہ قلمی لڑائیوں میں مصروف ہیں تشکیل کا مسئلہ ان جنگوں سے حل نہیں ہوتا۔ ان نعروں کی حیثیت ادبی شگوفہ کاری سے قطعاً مختلف نہیں ہے

بقیہ :-

## حیاتِ جاوید

(بسلسلہ صا۳)

سرسید کے خطاب سے یاد کیا مثلاً صفحہ ۳۲ میں لکھا ہے " ۱۸۴۶ء میں سرسید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے دلی آئے" مگر ۱۸۴۶ء میں "سرسید" کا وجود کہاں تھا۔ سید احمد خاں تو البتہ موجود تھے۔

(۳) ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب نے ہمیں (ادیبانہ پہلو سے) نہایت مایوس کیا اور طرز عبارت جسے انگریزی میں اسٹائل کہتے ہیں اور صفائی زبان میں یہ ہرگز ایسی تصنیف نہیں ہے جس کی مولانا حالی کے سے مشاق استاد سے توقع تھی۔

(۴) مولانا نے بلا ضرورت کتاب میں جا بجا کثرت سے انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے کتاب اردو خواں جماعت کے لئے مغلق ہوگئی ہے اور عبارت کا روکھا پن غیر مانوس اور غیر مستعمل انگریزی الفاظ کی بھرمار سے اور بھی بڑھ گیا ہے۔

ان اعتراضات کے سوا اور بھی متفرق اعتراض کئے ہیں جن پر ہم بھی متفرق طور پر بحث کریں گے۔

(نوٹ :- جولائی سنہ ۱۹۰۱ء تک اس رسالے کے شمارے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں آزاد نے اس کے متعلق بحث نہیں کی ہے۔ اس لئے مضمون کو یہیں ختم سمجھا جائے)

نصیر الدین ہاشمی

# خواتین حیدرآباد دکن کی
# اردو مطبوعات

(گذشتہ سے پیوستہ)

**یوسف** دکن میں نواب سالار جنگ کے حالات اور تذکرہ خاصان خدا میں چند صوفیا کے حالات درج ہیں مصطفائی بیگم نے شائع کیا ہے۔

صغرا بیگم ہمایوں مرزا نے بی بی فاطمہ کے مختصر حالات قلم بند کئے ہیں حیات ز۔خ بش کی مولف انیسہ بیگم شروانی ہیں۔ اس کتاب میں جو (۲۳۶) صفحات پر حاوی اور بارہ باب پر مشتمل ہے۔ زاہدہ خاتون شروانی کی سیرت درج ہے۔ زاہدہ خاتون علی گڑھ کے شروانی خاندان کی ایک ممتاز قابل فخر خاتون تھیں جن کا جوانی میں انتقال ہوگیا۔ زاہدہ خاتون اپنی اچھی قابلیت اور سیاسی معلومات کے لحاظ سے تمام ہند میں شہرت رکھتی ہیں۔ نثر نگار بھی تھیں اور شاعرہ بھی۔

انیسہ بیگم نے اس کتاب میں زاہدہ خاتون کی سیرت کو بڑی کامیابی سے اجاگر کیا ہے اس کتاب سے ان کی زندگی کا ہر پہلو سامنے آجاتا ہے۔ ان کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

نیا روس۔ یہ کتاب مسز نہا نے لکھی ہے اس مختصر رسالے میں زار روس کے بعد روس کی ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے اور عام فہم زبان میں موجودہ روس کی ہر ایک ترقی کو اجاگر کیا ہے۔

---

## سفر نامے

سفر نامے کی کتابیں بعض دوسرے فنون سے زیادہ ہیں۔ ان میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کے سفر ناموں کی تعداد زیادہ ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | سفر نامہ یورپ | صغرا بیگم |
| ۲۔ | سیر بنگال | ” |
| ۳۔ | سفر نامہ پونا | ” |
| ۴۔ | سیاحت جنوبی ہند | ” |
| ۵۔ | رہبر کشمیر | ” |
| ۶۔ | دنیا عورت کی نظر میں | بیگم سربلند جنگ |
| ۷۔ | آسٹریلیا کی جھلک | تاج یسین علی خاں |

صغرا بیگم نے اپنے سفر ناموں میں مشہور مقامات اور قابل دید عمارت کے علاوہ مشاہیر سے ملنے اور اپنے روز مرہ کاموں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں سفر نامہ یورپ جو دو حصے پر مشتمل ہے زیادہ قابل قدر ہے۔ انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی۔ سوئزرلینڈ۔ اٹلی۔ وغیرہ ممالک کی سیاحت کا تذکرہ ان سفر ناموں میں ہوا ہے۔

بیگم سربلند جنگ نواب سرور الملک کی صاحبزادی تھیں اپنے سفر حجاز۔ عراق اور یورپ کا تذکرہ "دنیا عورت کی نظر میں"

کے نام سے لکھا ہے اپنے نقطہ نظر سے ان ممالک کے حالات بڑی چابک دستی سے قلم بند کئے ہیں۔ دل چسپی کے ساتھ معلومات آفریں سفر نامے ہیں۔

"آسٹریلیا کی جھلک" تاج یٰسین علی خان کا سفر نامہ آسٹریلیا ہے جو کئی امور کے لحاظ سے قابل تذکرہ ہے اول تو یہ کہ یہ آسٹریلیا سے متعلق اردو کا پہلا سفر نامہ ہے۔ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد اب تک کوئی سفر نامہ آسٹریلیا سے متعلق شائع نہیں ہوا ہے دوسری خصوصیت اس کا انداز بیان ہے جو بڑا دل کش ہے اس میں بڑے دل آویز انداز میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ آسٹریلیا کے مشہور مقامات آثار قدیمہ۔ تفریح کے مقام۔ وہاں کے سماجی۔ اخلاقی۔ معاشرتی امور کا اظہار نہایت تفصیل سے کیا گیا ہے۔

تاج یٰسین علی خان کے اس سفر نامے سے نہ صرف آسٹریلیا کے حالات کا انکشاف ہوتا ہے بلکہ اردو ادب اور مزاح اور طنز کا جو بیش بہا سرمایہ اس سفر نامے میں موجود ہے وہ صرف دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے اس کی خوبیوں کو گنانا دشوار ہے۔

## نفسیات

نفسیات میں حیدرآباد کی ایک طالبہ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے یعنی فاطمہ شجاعت صاحبہ، انھوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے پہلے ایک بلند معیار کی کتاب شائع کی جو "ابتدائی سماجی انسانیات" سے موسوم ہے۔ یہ کتاب کئی باب پر تقسیم ہے جس میں سماجی انسانیت کا مفہوم، اس کی وسعت افادیت اور اہمیت کا تذکرہ ہے۔ انسان کے ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انسانی نسلوں اور ان کے تمدن۔ تمدن کی ترقی، مذہب اور آرٹ کا تذکرہ ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اردو کے لئے ایک جدید فن ہے اس لئے اس کو دل چسپ طریقے سے قلم بند کرنا نہایت دشوار تھا مگر فاطمہ شجاعت صاحبہ نے ایک طرف زبان کی دل چسپی کو قائم رکھا ہے اور دوسری طرف فن کی پوری نمائندگی کی گئی ہے کسی بحث کو تشنہ نہیں رکھا ہے۔

## مذہب اور اخلاق

اس عنوان کے تحت جو کتابیں ہم کو معلوم ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ تفسیر قرآن
۲۔ درس قرآن
۳۔ بھگوت گیتا
۴۔ کلید معرفت
۵۔ سفینۂ نجات
۶۔ گلزار اولیا
۷۔ حمایت الاسلام
۸۔ مجموعہ نصائح

تفسیر قرآن محمود النساء بیگم دختر مولوی سید یوسف الدین صاحب (اہل خانہ مولوی عبد اللہ) کی تالیف ہے۔ یہ تفسیر عام فہم اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے جہاں تک معلومات ہیں قرآن شریف کی یہ پہلی تفسیر ہے جو کسی خاتون نے لکھی ہے۔

(۲) درس القرآن۔ ابو محمد مصلح صاحب کی دختر صبحۃ اللہ بیگم نے لکھی ہے اس میں قرآن کے متعلق آسان اسلوب میں پڑھنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۳) بھگوت گیتا۔ مسز برکت رائے نے مرتب کی ہے اس میں بھگوت گیتا کے چند اشلوک کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

(۴) کلید معرفت۔ مس منیر بانو کا دس جی کی لکھی ہوئی ہے اس میں ایران کے مصلح زردشت کے اقوال اور نصائح اردو میں لکھے گئے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

عبدالقوی دسنوی

# مولانا ابوالکلام آزاد اور "حیاتِ جاوید"

"حیات جاوید" کے شائع ہونے پر مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور شیخ عبدالقادر صاحب نے اس پر ریویو شائع کئے، مولانا آزاد اس وقت "ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی" کے نام سے "لسان الصدق" کلکتہ کے اڈیٹر تھے۔ یہ تبصرے ان کی نظر سے بھی گزرے۔ تبصرے کے بعض حصے مولانا آزاد کو پسند آئے خصوصاً آزاد کی رائے پر انہوں نے مسرت کا اظہار کیا! لیکن مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی اور شیخ عبدالقادر صاحبان کے بعض اعتراضات انہوں نے پسند نہیں کئے اور ان کے اعتراضات کے جواب تفصیل کے ساتھ لسان الصدق فروری ۱۹۰۴ء اور اپریل ۱۹۰۴ء کے شمارے میں دیئے۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی، لیکن اس عمر میں بھی بڑا اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے اور جدید سوانح نگاری کے فن سے آشنا تھے، زبان بھی سادہ اور سلیس ہے۔ ذیل میں آزاد کے اس مضمون کی دونوں اقساط درج ہیں"۔ عبدالقوی دسنوی

## حیات جاوید

(سر سید احمد خاں کی لائف)

گو کہ حالیؔ اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا در اصل قوم پر اور قوم کی زبان پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے برسوں کی جانکاہ محنت سے "حیات جاوید" جیسی بیش بہا کتاب طیار کر کے اردو زبان میں ایک علمی اضافہ کیا۔ اس کتاب کا ہیرو جیسا ایک مہتم بالشان شخص ہے ویسا ہی اس کتاب کا جامع بھی ہندستان کا مسلم عالی دماغ مصنف ہے۔ اس لئے ایسی مہتم بالشان کتاب پر ملک کے لائق اہل قلم کو توجہ کرنی تھی اور منصفانہ انتقاد سے کتاب کے حسن و قبح کو قوم پر ظاہر کرنا تھا۔ برخلاف اس کے نہایت تعجب سے یہ بات دیکھی گئی ہے کہ تمام اخبارات خاموش رہے اور ریویو لکھنے کے لئے کسی نے قلم نہیں ا[ٹھایا] ہمارے نزدیک اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ اخبارات میں آ[ج کل] ان ہی کتابوں کا ریویو ہوتا ہے جو اس غرض سے ایڈیٹر کے پا[س] بھیجی جاتی ہیں اور ان میں ابھی یہ علمی مذاق پیدا نہیں ہوا ہے [کہ] ضروری کتابوں کو اپنے صرف سے منگوا کر ان پر ریویو کریں تو [یہ] جماعت جن سے کچھ اس کی توقع ہو سکتی ہے اپنے مشاغل میں ایسی [مصروف] ہے کہ ان کو ایسی ضرورتوں کا احساس ہی نہیں ہے تو یہ تعجب نو[ر] ہو سکتا ہے۔ مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی کتاب شہرت کے لئے کسی ر[یویو کی] محتاج نہیں ہے کہ اس کے سیکڑوں نسخے صرف ریویو کے لئے با[نٹے جائیں]

اخبارات میں تقسیم کئے جاتے۔ پبلک کی توجہ کے لئے کسی کتاب کے
ٹائٹل پیج پر صرف "مصنفہ حالی" کا ہونا کافی ہے۔

اس تقریباً دو سال کے عرصے میں صرف تین ریویو ہماری نظر
سے گزرے ہیں جن میں سے پہلا ریویو، مولوی وحید الدین صاحب سلیم
پانی پتی ایڈیٹر کا لکھا ہوا معارف میں شائع ہوا تھا، جو غالباً "علی گڈھ
انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ دوسرا ریویو مولوی
حبیب الرحمن خاں صاحب بھیکم پوری نے تحریر فرمایا تھا جو انسٹی ٹیوٹ
گزٹ میں شائع ہو کر ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ تیسرا ریویو
حال میں ہمارے مکرم دوست شیخ عبد القادر صاحب بی اے نے مخزن
نمبر ا جلد ۶، اور مخزن نمبر ۲ جلد ۹ میں مسلسل شائع کیا ہے جس میں انہوں
نے نہایت صفائی سے اپنی اصلی رائے ظاہر کی ہے اور کرٹسزم کے طریقے
سے اکثر موقعوں پر کام لیا ہے۔ اس ریویو کے دیکھنے سے ہمیں بڑی مسرت
ہوئی کہ قوم میں اب آزادی رائے پیدا ہونے لگی ہے اور "اپنی رائے
ظاہر کرتے ہوئے مخاطب کا، گو وہ کیسا ہی مشہور اور باعظمت کیوں نہ
ہو کچھ خیال نہ کرنا" قوم نے سیکھنا شروع کر دیا ہے جس کا عمدہ نمونہ شیخ
صاحب کا یہ ریویو ہے جس میں انہوں نے فی الواقع اس عزت اور
عظمت کی جو خود اون کے اور ہر ایک اہل علم دوست کے دل میں مولانا
کی موجود ہے کچھ پرواہ نہیں کی ہے اور "حیات جاوید" پر دل کھول کر
اعتراضات کئے ہیں۔ بے شک اسی کا نام شخصی تنقید ہے اور یہی
وہ اصلی ریویو ہے جس کی "لسان الصدق" قوم سے تمنا رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ ساتھ ہی اس کے ہم شیخ صاحب کے اعتراضات تسلیم
نہیں کر سکتے اونہوں نے اکثر اعتراضوں میں سخت زیادتی کی ہے۔
جس کا گو انہیں احساس نہ ہوگا مگر ہماری نظریں محسوس کر رہی ہیں۔
اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمارے دوست نے آزادی سے
حیات جاوید پر تنقید لکھی ہے ویسے ہی ہم بھی اپنی اصلی رائے بلا کم و
خیال کے ظاہر کریں۔ امید ہے کہ شیخ صاحب اسے اوسی نظر سے
ملاحظہ فرمائیں گے جس منصفانہ نگاہ سے ایک تنقید کو دیکھنا چاہئے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم شیخ صاحب کے انتقاد پر انتقادی
نظر ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت "بھیکم پوری" کی تنقید
پر ایک منصفانہ نظر ڈالی جائے اس لئے کہ ان کے اعتراض شیخ صاحب
کے اعتراض سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ شیخ صاحب کا دعویٰ ہے کہ
"حیات جاوید" ایک مکمل لائیف کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس کی طرز عبارت
اور عبارت بہت کچھ قابل اصلاح ہے کہ ان کے اعتراضات بیان
واقعات اور ادب اردو سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حضرت بھیکم پوری کے
تمام تنقیدات کا ماحصل یہ زور و شور کا اعتراض ہے کہ "سرسید کی مذہبی
حالت پر نظر ڈالتے ہوئے مولانا حالی نے ان کی سخت پاسداری کی ہے
اور ہر جگہ اون کی رائے کو معقول دکھلانا چاہا ہے اور ان کی تعریف میں
سخت مبالغہ سے کام لیا ہے"۔ چونکہ یہ اعتراض ایک مصنف لائیف
نویس پر واقعی سخت الزام ثابت کرتا ہے اگر شیخ صاحب کے اعتراضات
سے مولانا لائیف نویسی اور لائیف کے طرز بیان میں ناقص ثابت ہوتے
ہیں تو حضرت کے اعتراضات سے وہ ایک سخت سرقہ کے جوابدہ
ہوتے ہیں۔ بیشک! ہیرو کے محاسن بیان کرنے میں ایسا انہماک!
کہ اوس کی غلطیوں کے چھپانے میں کوشش کی جائے لائیف نویس کے
حق گوئی سے خاموشی ثابت کرتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے حضرت
بھیکم پوری کے اس الزام پر نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ اس
الزام دینے میں کہاں تک فاضل شیروانی نے سچائی سے کام لیا ہے۔ مولانا
نے "حیات جاوید" کے دیباچہ میں لائیف نویسی کے متعلق خود یہ رائے
ظاہر کی ہے کہ سرسید مرحوم جیسے نقاد شخص کی لائیف میں جن کی تمام عملی
زندگی انتقاد عقلی و مذہبی میں گزری ہے یہ ضروری بات ہے کہ ان
کے واقعات زندگی پر بھی ویسی ہی تنقیدی نظر ڈالی جائے اور جو کچھ

عیب ظاہر کرنے میں کچھ تامل نہ کیا جائے چنانچہ وہ . . . طبع اول میں لکھتے ہیں کہ "ہم [illegible] ایک مصنفوں کا حال آپ سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں، ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی، لیکن اول یسی "بایو گرافی" چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی س کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی! اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے ان سب نے بھلا جانا، کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی برائی سے کچھ سروکار نہ تھا! وہ کہیں نہیں بھولے، کیوں کہ انہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں ادھر ادھر قدم نہیں رکھا لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے بڑے بڑے علماء و مفسرین کو ٹوکا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا ہے اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے؟ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن کھوٹ بجا کے دیکھا جائے وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لئے نامناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے۔"

مولانا نے اس عبارت میں ظاہر کر دیا ہے کہ انہوں نے یہ لائف کس قدر احتیاط سے لکھی ہے۔ اس عبارت کو دیکھنے والا فی الحقیقت حضرت سیکم پوری کی تنقید دیکھ کر محو حیرت ہوگا کہ جو شخص دیباچہ میں یہ دعوا کر رہا ہے جس شخص نے یہ مضمون لکھ کر ناظرین کو اس پہلو پر خود توجہ دلائی ہے وہ آگے چل کر لائف نویسی کے اعلیٰ اصول سے اس قدر بھٹک جائے! اور ہیرو کی محبت میں ایسا محو ہو جائے کہ اسے دیباچہ کے اس دعویٰ کا "جسے وہ خود اپنے ہاتھوں غلط ثابت کر رہا ہے" کچھ خیال نہ رہے اور بقول حضرت سیکم پوری کسی مقام پر وہ ہیرو کی غلطی کا اقرار نہ کرے لیکن جب وہ "حیات جاوید" کی ورق گردانی کرے گا اور متعدد موقعوں میں ایسے مضامین دیکھے گا جس میں سرسید کی غلطیاں اور بالخصوص مذہبی غلطیاں صاف لفظوں میں سختی کے ساتھ ظاہر کی گئی ہیں تو وہ کبھی حیات جاوید پر نظر ڈالے گا اور کبھی حضرت سیکم پوری کی قوت ایمانی پر، اور تعجب سے پکار اٹھے گا کہ جسے حضرت سیکم پوری ظلمات کا دیو ثابت کر رہے ہیں وہ ہی نورانیت کا مقدس فرشتہ نظر آرہا ہے!!

واقعی ہمیں تعجب پر تعجب ہوتا ہے جب ہم غور کرتے ہیں کہ حضرت سیکم پوری کے کانشنس نے انہیں کیوں کر اس صاف غلط گوئی کی اجازت دی اور ان کی اعلیٰ درجہ کی ایمانی قوت کیوں اس بیجا جرأت سے مانع نہیں ہوئی کہ انہوں نے بلا تامل دعوا کر دیا "مولانا حالی نے اس لائف میں سرسید کی بے جا طرفداری کر کے ان کی مذہبی غلطیوں سے چشم پوشی کی ہے!" کیا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ میرے اس لکھنے کو لوگ صرف میرے تقدس کی وجہ سے تسلیم کر لیں گے؟ کیا انہیں یہ خیال نہیں کہ سیکڑوں نسخے "حیات جاوید" کے تعلیم یافتہ جماعت میں منتشر ہوئے ہیں اور جو ان کے پیش نظر ہیں؟ کیا وہ اپنی قوت ممیزہ کی مدد سے اس امر کا خود فیصلہ نہیں کر لیں گے کہ حضرت کا دعوا کہاں تک سچا ہے؟!!

غالباً حضرت سیکم پوری نے جوش مخالفت میں ان اوراق پر نظر ہی نہیں ڈالی ہے اور حیات جاوید کا ایک [illegible] کی تنقید

کے لئے قلم اٹھایا ہے ورنہ کیا یہ دیانت داری کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ
دانستہ ایسا خلاف دعوا کرکے عوام کو بدظن کیا جائے؟ اس پر زیادہ افسوس
اس امر کا ہوتا ہے کہ اگر حضرت بسکیم پوری نے تنقید کے لئے کتاب کا
سرسری مطالعہ کافی سمجھا ہے تو غالباً تنقید یا ریویو پر انہوں نے غور ہی
نہیں کیا اور اس کے اصلی ضروری اصول سے مطلع ہی نہیں ہوئے
ورنہ وہ اپنی ریویو میں اس سرسری مطالعہ کا پتہ نہ دیتے ۔

حضرت بسکیم پوری کا دعوا اور مولانا حالی کا دعوا ، دونوں
آپ پڑھ چکے ہیں اب ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں حیات جاوید کے
وہ مختلف مقامات دکھلاتے ہیں جہاں سرسید کی مذہبی خدمات پر بحث کرتے
ہوئے مولانا نے سرسید کی غلطیوں کا اقرار کیا ہے یا ان کی رائے تسلیم
نہیں کی اس سے معلوم ہو جائے گا کہ حضرت کا دعوا صحیح ہے یا مولانا کا۔
اور مولانا نے سرسید کی بیجا طرف داری کی ہے یا جن باتوں کو وہ اپنی
تحقیق میں غلط سمجھتے تھے انہوں نے نہایت صفائی سے ظاہر کرکے لائف
نویسی کا فرض ادا کیا ہے ۔

حیات جاوید میں تفسیر القرآن پر دو مقام پر بحث کی ہے
پہلے حصہ میں اجمالی طور پر صفحہ (۲۲۲) سے صفحہ (۲۲۳) تک اور
دوسرے حصے میں مفصل بحث صفحہ (۲۰۹) سے صفحہ (۲۳۹) تک کسی
قدر بسط کے ساتھ کی گئی ہے اس کے سوا سرسید کی مذہبی حیثیت پر
متعدد مقامات میں بھی بحث کی ہے اس لئے انہیں مقامات سے
ہم دو تین عبارتیں یہاں نقل کرتے ہیں ۔

(۱) " اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصے میں بحث کریں
گے یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں
جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے رکیک
لغزشیں ہوئی ہیں بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک
نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں " (حیات جاوید حصہ اول صفحہ ۲۲۲)

(۲) دوسرے حصہ میں جہاں اس تفسیر پر نہایت تفصیل سے
بحث کی ہے اور اس کی اکثر خصوصیتیں خاص طور پر دکھلائی ہیں ۔
مولانا اس امر کو صاف لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید نے غلطیاں
کی ہیں چناں چہ وہ لکھتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ (تفسیر القرآن میں)
کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے تفسیر کی خوبی زائل
نہیں ہو سکتی" (حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۲۳۹)

(۳) یہ تو صرف سرسید کی مذہبی تحقیق کے متعلق تفسیر پر بحث
کرتے ہوئے رائے ظاہر کی ہے ، اس کے سوا ایک اور موقع پر اس سے
زیادہ سختی کے ساتھ سرسید کے متعلق لکھتے ہیں کہ " بایں ہمہ اس بات
سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ
ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حد اعتدال سے بڑھ گیا تھا بعض آیات
قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا ، کہ
کیوں کر ایسا عالی آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے
ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح
اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے ۔ کالج کے متعلق بھی اخیر زمانہ
میں ان سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جن کو لوگ تعجب سے دیکھتے
تھے " (حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۵۲۲)

ان مقاموں کو دیکھنے کے بعد غالباً اب تو ہر شخص خود فیصلہ
کر سکتا ہے کہ مولانا نے اپنے قول کے مطابق واقعی منصفانہ طریقے سے
لائف لکھی ہے یا انہوں نے بقول حضرت بسکیم پوری بد دیانتی سے
کام لیا ہے ؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ سرسید نے اپنی تفسیر کی بنیاد جس
اصول پر رکھی ہے اس سے مولانا متفق ہیں اس لئے یہ کیوں کر
ہو سکتا تھا کہ مولانا حالی حضرت بسکیم پوری یا ان کے ہم خیال اور
علماء متقدمین کو خوش کرنے کے لئے اصولاً بھی سرسید سے اختلاف
ظاہر کرتے ؟ سرسید کی (فی الحقیقت بقول مولانا) ایک ایسی ذات

ہے جسے ایک جماعت نے اگر مذہب کے لحاظ سے صدیق کہا ہے، تو دوسری جماعت نے اسی لحاظ سے زندیق کا خطاب دیا ہے، ایسی حالت میں اگر اس جماعت کا ایک شخص جو سرسید کو صدیق سمجھتا ہے سرسید کی لائف لکھے گا تو ضرور ہے کہ وہ اسے صدیق ہی دکھلائے گا، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اس خیال سے کہ "لائف نویس کو ہیرو کے عیوب اور مسامحات بھی دکھلانے چاہئیں" خواہ مخواہ ہیرو کو زندیق ثابت کرے؟ یا یوں سمجھئے کہ اگر ایک شخص جو سرسید کو زندیق خیال کرتا ہے حیات جاوید لکھتا تو کیا اس پر حالی اعتراض کر سکتے تھے کہ سرسید کو اس میں زندیق ثابت کرنے کی کیوں کوشش کی گئی ہے؟ اس لئے کہ لائف نویس یہی رائے رکھتا ہے اور اسے اپنی رائے پر کامل اعتماد ہے۔ یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت حکیم پوری سرسید کو تفسیر لکھنے کا استحقاق نہیں دینا چاہتے اور مولانا حالی حیات جاوید میں سرسید کو سب سے بڑا مستحق اس کا ثابت کرتے ہیں، ایسی حالت میں حضرت تو جبھی خوش ہوتے جبکہ مولانا بھی یہی خیال لائف میں ظاہر کرتے لیکن مولانا کو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ جس امر کو وہ حق سمجھتے ہیں اسے کسی مولوی یا مولانا کے خوف سے ظاہر نہ کرتے اور ان کے خوش کرنے کے لئے لکھ دیتے کہ سرسید کو تفسیر لکھنے کا کوئی حق نہ تھا۔

## دوسری قسط

اس مضمون کے پہلے نمبر کو پڑھ کر تم نے جو رائے قائم کی ہوگی اگر واقعی تمہاری طبیعت انصاف پسند ہے، اگر واقعی تم سچائی کے عاشق ہو تو بے شک! وہ حضرت حکیم پوری کے موافق نہ ہوگی۔ تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ان کی تنقید کس پایہ کی ہے؟ اور کس انداز سے لکھے گئے ہو لیکن باوجود اس کے تم تعجب سے سنو گے کہ ہمارے مکرم دوست جناب شیخ عبدالقادر صاحب اس تنقید کے مداح ہیں! اور ان کے خیال میں "حیات جاوید" کے مذہبی مباحث پر جس قسم کی تنقید کی ضرورت تھی اسے حضرت کی یہ تنقید پورا کر رہی ہے۔ چناں چہ وہ اپنی تنقید نمبر ا میں لکھتے ہیں کہ "ایک قابل قدر تنقید الخ" اگرچہ شیخ صاحب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ "اس سے گو ہمیں پورا اتفاق نہ ہو" لیکن ساتھ ساتھ ان کا یہ فرمانا کہ "یہ فرض حضرت شیروانی بخوبی ادا کر چکے ہیں" تعریف کا ایسا جملہ ہے جس سے بہتر لکھا نہیں جا سکتا۔ ان کی اس مدح سے ظاہر ہوتا ہے کیا انہوں نے حضرت حکیم پوری کی تنقید ملاحظہ نہیں کی اور صرف ان کی ذاتی قابلیت کی بنا پر تعریف کر دی ہے یا اگر دیکھی ہے تو اسے تنقیدی نظر سے نہیں دیکھی جس پر وہ ملک کو توجہ دلا رہے ہیں۔ بہرکیف اب ہمیں اپنا اصل مضمون شروع کرنا چاہیے۔

## جناب شیخ عبدالقادر صاحب (بی اے) کی تنقید

سنہ ۱۹۰۱ء میں اردو علم و ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ یعنی مولانا الطاف حسین صاحب حالی جیسے مشہور مصنف کے قلم سے سرسید احمد خاں مرحوم جیسے نامور محسن ملک و قوم کے حالات زندگی ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوئے جس کا نام "حیات جاوید" تھا۔ یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس سے موزوں تر نام ایسی کتاب کے لئے ملنا مشکل ہے، اس ملک میں اور زمانۂ حال میں اگر کسی مسلمان سے ایسے کام بن پڑے ہیں جن کے سبب وہ جاودانی زندگی کا مستحق ہو اور اس کا نام قائم رہے جب تک کہ مسلمانان ہند قومی حیثیت زندہ ہیں تو وہ سرسید احمد خاں تھا۔ اور اس کی حیات کے سوانح کو "حیات جاوید" کہنا بالکل حق بجانب ہے یہ کتاب شائع ہوتے ہی مقبول ہوئی بلکہ شاید یہ کہہ دینا داخل مبالغہ نہیں کہ چھپنے سے پہلے مقبول ہو چکی تھی لوگ اس کے منتظر تھے اس کا مطبع سے نکلنا تھا کہ قبول استقبال کو دوڑا اور ہر دلعزیزی نے قدم لئے۔ دام بھی حجم ا اور حسن طبع کے لحاظ سے

یادہ نہ تھے ہاتھوں ہاتھ بک گئی بعض بڑھیا قسم کی جلدیں تو بہت جلدی
تم ہو چکیں اور جو باقی تھیں وہ رفتہ رفتہ بکتی جاتی ہیں گو اس کامیابی
جو کسی ایسے مصنف کی کتاب کو جس میں کسی ایسے یگانہ روزگار کے حالات
سج ہوں انگلستان جیسے ملک میں ہوتی تو توقع ہی یہ تھی مگر اس ملک کے
بارسے جس قدر کی نگاہ سے اس کتاب کو دیکھا گیا اور جو کامیابی اسے
سل ہوئی وہ بہت غنیمت ہے ۔

کسی شخص کے حالات کا لکھنا " نہایت قدیم فن ہے مسلمانوں نے
ہ زمانۂ عروج میں اس فن کو بہت ترقی دی اور بالخصوص "علم الروایۃ"
ضروریات نے علم الرجال کی بنا ڈال کر اسے نہایت وسیع کر دیا لیکن
ج کل جو اصول سوانح نگاری کے یورپ نے مقرر کئے ہیں درحقیقت
سے ہماری قدیم تذکرہ نویسی کو کوئی نسبت نہیں ہے ایک قدیم تذکرہ
ر کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ ہیرو کے سال ولادت اور سال وفات
بعض کمالات کا تذکرہ کر دے ۔ لیکن برخلاف اس کے جدید بائیوگرافی
صل عنصر یہ ہے کہ ہیرو کی ابتدا سے آخر تک حالت بیان کر کے پھر
کے اخلاق و عادات، طرز معاشرت، مخصوص کمالات ترقی و
ل کے اسباب پر کافی بحث کی جائے تاکہ ہیرو کی بولتی چالتی تصویر
ھنے والے کے سامنے موجود ہو جائے ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قدیم
ید طریقے میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔

اب سے پہلے اردو زبان کا دامن اس قدر خالی تھا کہ اس
قدیم روش کی سوانح عمری بھی کوئی مبسوط نہیں لکھی گئی تھی ۔ اردو
ں کے لٹریچر میں جب انقلاب شروع ہوا اور یہ جدید علمی اثرات
متغیض ہوئی تو بعض طبیعتوں میں مغربی طریقوں پر کتابیں تصنیف
ے کا خیال پیدا ہوا ۔ ان سب میں مولانا حالی کا نام خاص طور پر لئے
ے کا مستحق ہے جنھوں نے سب سے پہلے شیخ سعدی شیرازی کی لائیف
یا اردو زبان کو بھی جدید بائیوگرافی سے آشنا کیا ۔ اس کے بعد اردو
زبان میں گویا اس کی داغ بیل پڑ گئی اور اس طریقے پر اکثر کتابیں لکھی
گئیں ۔ خود مولانا نے "یادگار غالب" میں مرزا اسداللہ خاں غالب
کے حالات کو جدید طریقے پر لکھنے کی کوشش کی ۔ مگر سب سے زیادہ
قابل قدر کتاب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائیف "حیات جاوید" ان
کے قلم سے نکلی ہے جو واقعی اردو زبان میں لائیف کا صحیح مفہوم ادا
کر سکتی ہے اور جو اس وقت ہمارے زیر بحث ہے اس کتاب پر اعتراضات
کئے جاتے ہیں کہ "کتاب مکمل لائیف کا دعوا نہیں کر سکتی ۔ واقعات
ضروری چھوڑ دیئے گئے ہیں بچپن کے زمانے کے حالات زیادہ بہم نہیں
کر سکے بعض مضامین فضول بھر دیئے جن کی کوئی ضرورت نہیں تھی"۔

لیکن افسوس ہے کہ جن مشکلات کا سامنا مصنف کو تصنیف
کرتے ہوئے ہوا ہوگا اور واقعات کو جمع کرتے ہوئے جن باتوں
کی کمی مجبور کر رہی ہوگی اس کا کوئی اندازہ نہیں کرتا اور اعتراضات
نہایت وسعت کے ساتھ کئے جا رہے ہیں ۔

جناب شیخ عبدالقادر صاحب کے اعتراضات میں بھی سب سے
اہم اعتراضات اسی قبیل کے ہیں چناں چہ انہوں نے اپنے دو نمبروں
میں اہم اعتراضات صرف یہ کئے ہیں :-

(۱) حیات جاوید ایک مکمل لائیف کا دعوا نہیں کر سکتی ۔ اس لئے
کہ اس کا بیشتر حصہ سرسید مرحوم کی بیرونی زندگی اور رفاہ کے مسائل
ان کے تعلقات کے بیان کے ساتھ گھرا ہوا ہے اور ان کے بچپن کے
حالات کا کافی سراغ نہیں لگایا ہے ۔

(۲) بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک کے زمانے میں
ضروری تفریق کرنے اور اس کے مدارج ترتیب وار دکھانے کی اہمیت
کا پورا اندازہ نہ کرنے کے باعث مولانا حالی ایک اور باریک سی غلطی میں
پڑے ہیں اور وہ یہ کہ انہوں نے ابتدائی زندگی کے حالات لکھتے
ہوئے بھی سید احمد خاں مرحوم کو

( باقی ص۲۳ پر )

# نقد و نظر

## مستحصلاتُ الجفر

مولف : سید سرفراز علی رضوی
ناشر : ادارۂ روحانیات
قیمت : تین روپے
پتہ : سید سرفراز علی رضوی محلہ رسول آباد ہاؤس نمبر ۵/۹ ۱۴ فقیر محمد درّانی روڈ۔ کراچی نمبر (۱)

علم الجفر جسے اہل لغت نے 'ف' کے سکون سے ضبط کرکے جَفْر لکھا ہے غیبی علوم میں بہت بلند مقام رکھتا ہے یہ اہلِ فن کی متفقہ رائے ہے کہ اس علم کے ذریعے جو احکام صحیح طور پر مرتب کئے جاتے ہیں ان میں بہت کم خطا ہوتی ہے۔ خود امام علی رضا رضی اللہ عنہ نے کیف امر الرضا مع المامون کا سوال قائم کرکے اس علم سے جو جواب حاصل کیا تھا اتنا واضح اور حقیقت سے اتنا مطابق تھا کہ یہ ایک تاریخی واقعہ بن کر رہ گیا ہے اس کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں صحیح حل کے ساتھ مل جائے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس علم کا مقام جتنا بلند ہے اتنے ہی اس کے جاننے والے بہت کم ہیں۔ اور جتنے لوگ بہت محدود تعداد میں اس کے جاننے کے مدعی ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو اس علم کو علم سینہ بنا کر رکھنے کے قائل ہیں اور اسے علم سفینہ بنانے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔

جناب سید سرفراز علی رضوی نے اس کتاب میں سب سے بڑا اور مفید کام یہ کیا ہے کہ علم جفر کے اصول و قواعد بہت آسان انداز تفہیم میں بیان کئے ہیں اور متعدد سوالات قائم کرکے ان کے باقاعدہ حل درج کئے ہیں جنھیں سامنے رکھ کر اسی سے ملتے جلتے تمام سوالات کا حل نکالا [illegible]

اس کتاب میں سبب تالیف خصوصیات، اصطلاحات [illegible] و تاریخ علم جفر وغیرہ کے علاوہ اس علم کے تمام ضروری پہلوؤں پر [illegible] شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ مستحصلہ اور فلسفہ مستحصلہ بیان کر[illegible] بعد اعداد حروف، جدول نظیرہ، نقشہ حروف ہم آواز، زبر و بینہ [illegible] و تنزل کے تمام اقسام کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد مستحصلہ رضویہ، مستحص[illegible] مستحصلہ بدوح ملین وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس نوع کے تما[illegible] کی فہرست ۱۵۲ صفحات پر ختم ہوئی ہے اور (۶۹) عنوانات پر مشت[illegible]

غرض رضوی صاحب نے یہ کام جس سیر چشمی اور فراخ د[illegible] سر انجام دیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامل نہیں [illegible] اردو زبان میں اس نوع کی یہ ایک بے لاگ اور بے مثال کوشش ہے [illegible] کہ طالبان فن اس کتاب کو اپنے لئے بہت مفید پائیں گے۔ اور رض[illegible] کی یہ کوشش مزور بار آور اور مشکور ہوگی۔ (۱۹۶۰)

(محمد زکریا مائل)

## معاشیات کے نظری مسائل

مولف : عظمت اللہ خان، استاد معاشیات انجمن ترقی اردو [illegible]
صفحات : ۴۷۰ قیمت سات روپے [illegible]
ناشر : مکتبہ فریدی، اردو کالج، اردو روڈ۔ کراچی

علامہ اقبال کی تالیف "علم الاقتصاد" (جو اردو [illegible] سے متعلق پہلی کتاب ہے) کی اشاعت کے زمانے سے لے کر [illegible]

ت کے عملی اور نظری پہلوؤں پر اردو میں ان گنت کتابیں شائع ہو چکی
بدہ زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے پیش نظر علم معاشیات کی
یں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کا کوئی بھی
شہری اس علم سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ زیر نظر کتاب اگرچہ طالب علموں
کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن عام قارئین بھی جو اس
سے دلچسپی رکھتے ہوں استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ فاضل مصنف
، یہ موضوع اردو میں پڑھانے کا خاصہ تجربہ ہے، بڑی خوش اسلوبی سے
ت کے نظری مسائل کو آسان اور سادہ زبان میں بیان کر دیا ہے۔
، آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں علم معاشیات کی تعریف کہ معاشی
تجزیئے کے علاوہ صرف دولت، پیدائش دولت، قدر و تقسیم، زر
ں، بین الاقوامی تجارت اور مالیات عامہ پر تفصیل بحث کی گئی
مد اصطلاحات کے مقابل جا بجا انگریزی مترادفات دیئے گئے
سے کتاب کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے مصنف نے اس
ل نیادی میں تقریباً تمام اہم ماہرین کے نظریات اور تصانیف
فادہ کیا ہے اور اپنے موضوع کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ امید
اب علمی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔ (۶۹۰)

## ماہنامہ "سات رنگ"

"سات رنگ" کے پانچ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مختصر
ے میں اس رسالے نے ادبی حلقوں میں اچھا خاصا مقام پیدا کر لیا
یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک میں ایسے سنجیدہ ادبی رسائل گنتی ہی کے
س رسالے کے معیاری ہونے کے لئے یہی ایک مثال بہت ہے کہ اس
ارے میں اردو کے ممتاز نقاد محمد حسن عسکری کا ایک مضمون ضرور
، عسکری صاحب کے علاوہ ہند و پاکستان کے دوسرے نمایاں
ں کا تعاون بھی "سات رنگ" کو حاصل ہے۔ اس رسالے کی دوسری

اہم خصوصیت اس کے بے لاگ تبصرے ہیں ہمارے رسالوں میں "تبصرہ
نگاری" محض ایک روایتی چیز بن کر رہ گئی ہے، یہ خوشی کی بات ہے کہ
"سات رنگ" کے ادارے نے اس طرف بطور خاص توجہ دی ہے۔
یہ رسالہ اطہر صدیقی صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے جو اچھے شاعر تو ہیں ہی
ادیب اچھے مدیر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں قیمت سالانہ آٹھ روپے فی پرچہ ۱۲ ار
ملنے کا پتہ ۱۔ اکبری منزل۔ پیر الہی بخش کالونی۔ کراچی

## سہ ماہی "دانشور"

کچھ عرصہ قبل کراچی میں "انجمن دانشوران ادب" کے نام سے
ایک علمی مجلس کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ جس کے صدر شیخ عبد الخالق
عبد الرزاق صاحب ہیں اور سکریٹری جناب تنزیل الرحمٰن ــــ
ارکان میں الطاف گوہر، رازق الخیری، شاہد احمد دہلوی، رئیس امروہوی
رفیق خاور اور دوسرے نامور اہل قلم کے نام شامل ہیں "دانشور" اسی
انجمن کی طرف سے شائع کیا گیا ہے جس کی ادارت کے فرائض رئیس امروہوی
اور تنزیل الرحمٰن صاحب کے سپرد ہیں۔ اب تک اس رسالے کے دو
شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے دوسرا شمارہ ہے
ادارے کی طرف سے ابتدا میں اس رسالے کے اجرا کا مقصد ان الفاظ
میں واضح کیا گیا ہے "دانشور کا مقصد اشاعت یہ ہے کہ وہ ادب و شعر
اور ذہنی تخلیقات کے ذریعے وہ شعور پیدا کرے جو ایک پاکیزہ معاشرے
کی ذہنی اور روحانی خصوصیت ہونا چاہیے۔ ..... (اور) ....
اردو زبان کے ادبی ذخیرے میں تخلیقی و تحقیقی و تنقیدی مضامین کا اضافہ کیا جائے"
اس میں کوئی شک نہیں کہ فاضل مرتبین نے بڑی حد تک اس مقصد کو سامنے
رکھ کر رسالہ مرتب کیا ہے اور کئی ایک فکر انگیز مقالے شائع کئے
ہیں جن میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کا مقالہ "فتح اللہ
گردیزی" خواجہ حمید الدین شاہد کا مقالہ "اردو کی قدیم منظوم بیاض"

اور تنزیل الرحمان کا مضمون "جدید فارسی ادب پر انقلاب کے اثرات"
خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ
اس میں صرف علمی و ادبی مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ دیگر اصناف ادب
(نظم، غزل افسانہ وغیرہ) سے اجتناب کیا گیا ہے اس وجہ سے ممکن
ہے عوام میں یہ رسالہ مقبول نہ ہو سکے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ
علمی حلقوں میں اس کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوگی۔ قیمت درج نہیں
ملنے کا پتہ: ۱۲ ۔ بنک ہاؤس ۱ تیسری منزل حبیب اسکوائر کراچی

## سمندر کے نیچے

مصنفہ: سلطانہ آصف فیضی

صفحات: ۱۱۶ ، قیمت سوا دو روپے

ناشر: رائٹرز ایمپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ، پیپلز بلڈنگ،
سر فیروز شاہ مہتا روڈ۔ بمبئی ۱

یہ بچوں کے لئے ایک معلوماتی کتاب ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے
کہ سمندر کے نیچے جو دنیا آباد ہے وہ کن عناصر پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس
قسم کی کتابیں اردو میں پہلے سے بھی ہیں (مثلاً پیارے لال شاکر میرٹھی
کی ایک کتاب تقریباً بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی اور یونیسکو کی امداد
سے لاہور کے ایک ادارے نے بھی تین سال قبل ایسی ہی کتاب چھاپی تھی)
لیکن زیر نظر کتاب اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ زبان
نہایت آسان اور سادہ ہے بلکہ پیرایۂ بیان بھی کہانیوں کا سا ہے، جو
بچوں کی نفسیات کو ملحوظ خاطر رکھ کر اختیار کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے نہایت
چابک دستی سے بچوں کو سمندر کے نیچے کی دنیا کی سیر کروائی ہے۔ اگرچہ یہ
فنی کتاب ہے لیکن افسانوی انداز ایسا ہے کہ بچے اس کو دلچسپی سے
پڑھیں گے۔ جا بجا تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کی افادیت
میں اضافہ ہوا ہے۔ ناشر نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے (ح۔ا)

## داستان سے افسانے تک

مصنف: وقار عظیم

صفحات: ۳۰۲ (بڑا سائز) قیمت دس روپے

ناشر: اردو اکیڈمی سندھ۔ بندر روڈ۔ کراچی

ہمارے نقادوں میں وقار عظیم صاحب اس لحاظ سے ممتاز
ہیں کہ افسانوی ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور انھوں نے اس شعبہ
کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع سے متعلق ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی
جن کی وجہ سے وہ افسانوی ادب پر استنادی کی حیثیت رکھتے ہیں "داستان
سے افسانے تک" ان کی تازہ ترین تالیف ہے جس میں انھوں نے اردو داستانوں
ناولوں اور افسانوں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے ایسے مضامین کا
مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ تقریباً تمام مضامین
ناول اور افسانے سے متعلق ہیں، داستانوں کے بارے میں بہت کم لکھا گیا
صرف پہلے مضمون ("داستان سے افسانے تک" جو کتاب کا نام ہے)
میں پانچ چھ صفحات داستانوں کے بارے میں ہیں ——
ناول اور افسانے کے بارے میں وقار صاحب نے خوب تفصیل سے کام لیا
ہے اور کسی اچھی یا بری چیز کو نظر انداز نہیں کیا، ادب کی رفتار پر
بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں اور معمولی سے معمولی چیز بھی ان کی نظر سے نہ
چھپی۔ اس مجموعے کے دو مضامین "اردو ناول کا ارتقا" اور
"مختصر افسانے میں زندگی اور فن کا امتزاج" فاضل مصنف کے غور و فکر
کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اگر اس کتاب میں
یہی دو مقالے ہوتے تو کتاب کی مجموعی قدر و قیمت میں کسی قسم کی کمی نہ
ہوتی۔ فن کاروں میں پریم چند اور منٹو پر علاحدہ مضامین بھی ہیں۔ اسی
طرح حالی کی "مجالس النساء" کا مطالعہ بھی علاحدہ مضمون کی صورت
میں کیا گیا ہے۔ (باقی ص ۲ پر)

I. S. No 1138 Phone: 32784

tnightly **QUOMI ZUBAN** Karachi

## مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

خطبات عبدالحق۔

بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے یہ کتاب انجمن نے دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی تھی مگر وہ ایک مدت سے ختم ہو کر کمیاب ہوچکی ہے، اور اس کے نسخے بمشکل دستیاب ہوتے ہیں، چنانچہ ملک میں اس کی بہت مانگ تھی اس بنا پر یہ نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مطبوعہ خطبات کے علاوہ بعد کے خطبات اور بعض تقریریں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے۔ ۳۰۰+۲۱ صفحات، لکھائی چھپائی خوش نما کاغذ اعلیٰ قسم کا لگایا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ساڑھے چھ روپے۔

سب رس۔

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ء اس کا سنہ تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جست و جو کے بعد خاص اہتمام او صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

تلخیص الاردو۔

انجمن ترقی اردو کے رسالہ "اردو" کے سی سالہ پرچوں سے بہترین مضامین کا بہترین انتخاب ہے جسے انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی کی یادگار میں مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے اور سب کے سب کارآمد اور عمدہ معلومات سے پر ہیں۔ کتاب کی جان دو مضامین ہیں: (۱) رومی نطشے اور اقبال از ڈاکٹر عبدالحکیم (۲) نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی اور کچھ میری زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

**اردو اکیڈیمی سندھ۔ مولوی مسافر خانہ۔ بندر روڈ کراچی**

قاری عبدالوحید منیجر انجمن پریس نے چھاپ کر دفتر انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ کراچی سے شا

بابائے اردو

# اخــــلاق

انسان کی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و وقعت ہے۔ اخلاق سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے۔ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی دیانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار، انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلا ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے، اپنے بھائیوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھے۔ ایسا نہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔ اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم تعلیم نہیں رہی، ہماری تعلیم گاہیں دکانیں ہیں جن میں دساوری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمائشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے اور ذہن تک ہوتی ہے۔ اخلاق، صرف و نحو، منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں رٹائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ان بزرگ اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنہوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لئے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے ان کی قربانیوں صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کئے بغیر نہیں رہیں گے۔

(چند ہم عصر ص ۴۳۳)

کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا پندرہ روزہ ترجمان
قیمت چار آنے

## نظیر حسین

اپنی ہستی کا پتہ پایا ہے
جب ترے درد کو اپنایا

آپ کی یاد میں کیسے کیسے
دل بے تاب کو بہلایا ہے

کوئی وعدہ ہے نہ کوئی امید
کس نے اے دل تجھے بہکایا ہے

ار ساقی ہے مقدر اپنا
ن نگاہوں نے یہ سمجھایا ہے

ور تک راستے ویراں ویراں
ذبۂ شوق کدھر لایا ہے

ک ترے غم کا بھرم رکھنے کو
م نے ہر درد کو ٹھکرایا ہے

ے وعدوں کا یہ دانستہ فریب
ر بھر تیری قسم کھایا ہے

## اختر سکندروی

دل و نگاہ کی افسردگی نہ پہچانے
وہ آنکھ کیا جو غم زندگی نہ پہچانے

یہ میرا حال پریشاں یہ میری شان وطن
خدا کرے کہ مجھے کوئی بھی نہ پہچانے

وہ جن کی آنکھ میں بادہ بھی ہے سرور بھی ہے
مرے لبوں کی وہی تشنگی نہ پہچانے

مری ہنسی میں جھلکتا ہے خون حسرت دل
یہ اور بات کہ دنیا ہنسی نہ پہچانے

تمام عمر تری دوستی پہ ناز کیا
تمام عمر تری دوستی نہ پہچانے

حیات اشک کے شعلوں سے کھیلتے گزری
ہم اپنے دل کی لگی آپ بھی نہ پہچانے

انجمن ترقی اردو پاکستان کا
پندرہ روزہ

# قومی زبان

نگران: بابائے اردو

جلد ... ۱۷
شمارہ ... ۹

یکم نومبر ۱۹۶۰ء


اس شمارے میں:



# قائد اعظم کی آرزو

اردو یونی ورسٹی کی تحریک کا آغاز ہوا تو خاتون پاکستان محترمہ فاطمہ جناح نے اسے قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور پوری قوم کی آرزوؤں کی تکمیل سے تعبیر کیا اور اس تجویز کو استحکام پاکستان کی راہ میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ ہمارے یہاں رسم ہے کہ جب کوئی نئی بات شروع کی جاتی ہے تو اکابر قوم سے پیغامات حاصل کر کے شائع کیے جاتے ہیں۔ ان پیغاموں میں لفظوں کی فراوانی ہوتی ہے لیکن روح خلوص مفقود! لیکن اردو یونی ورسٹی کے لیے محترمہ فاطمہ جناح نے جو پیغام ارسال کیا ہے وہ حجم الفاظ سے گراں بار نظر نہیں آتا۔ اس کی سادگی، اس کا خلوص اور مقصد سے اس کی ہم آہنگی ان الفاظ کو رسمی پیغامات سے ممتاز و نمایاں کرتی ہے۔ محترمہ نے چند الفاظ میں ایک بہت بڑی بات کو سمیٹا ہے۔ ایک ایسی حقیقت بیان کی ہے جو تاریخی صحت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دس کروڑ نفوس کے دلوں کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہے۔

اردو یونی ورسٹی کی تحریک سے محترمہ فاطمہ جناح کی وابستگی ہمارے لیے خوش آیند ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنے برادر مرحوم و مغفور کی طرح پاکستان کے عوام کی سچی نبض شناس اور ان کے دلی خیالات کی ترجمان ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان و قلم کو کبھی کسی ایسے مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جو پاکستان اور اس کے باشندوں کی فلاح و بہبود سے مغائر ہو۔ ان کی بیعت ... ن کے ہم کیا، پاکستان کے دس کروڑ عوام قایل ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ قوم کی سچی ہمدرد، اور عوامی رجحانات کی بہترین موید سمجھی جاتی ہیں ان کا یہ فرمانا کہ "اردو یونی ورسٹی استحکام پاکستان کی راہ میں ایک سنگ میل ثابت

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

# گرد و پیش

## آدم جی ادبی انعامات کا اعلان

# اردو کا انعام شوکت صدیقی اور غلام عباس میں تقسیم کر دیا گیا

## بنگالی انعام کے مستحق روشن یزدانی اور برش رشنا قرار دیئے گئے!

کراچی ۲۸ اکتوبر۔ یوم انقلاب کے پرمسرت موقع پر آدم جی انعام کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اردو اور بنگالی کی بہترین کتاب کا انعام دو مصنفین میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اردو کی بہترین کتاب پر پانچ ہزار روپے کا انعام شوکت صدیقی کو ان کی کتاب "خدا کی بستی" پر اور غلام عباس کو ان کی کتاب "جاڑے کی چاندنی" پر اور بنگالی کی بہترین کتاب پر پانچ پانچ ہزار کا انعام جناب روشن یزدانی کو ان کی کتاب "خاتم النبیین" پر اور سید عبدالستار برش رشنا کو ان کی کتاب "کبیتا" پر دیا گیا انعامات کی تقسیم آئندہ مہینے ایک جلسے میں ہوگی جس میں ہندوستان اور برطانیہ کے کئی ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔

آدم جی ادبی انعام کا اعلان آدم جی کے خاندان کی طرف سے اس سال کے شروع میں کیا گیا تھا اس انعام سے پاکستان میں ایک خالص ادبی اور دانشورانہ عہد کی حوصلہ افزا ابتدا ہوتی ہے اس کا مقصد تخلیقی فطانت کی حوصلہ افزائی کرنا ہے انعامات کا فیصلہ کرنے کے لئے اردو اور بنگالی کے لئے علاحدہ علاحدہ دو بورڈ بنائے گئے تھے۔ اردو بورڈ کے صدر ڈاکٹر عبدالحق تھے اور اراکین میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، اور مس قرۃ العین حیدر شامل تھیں۔ بنگالی بورڈ کے صدر ڈاکٹر شہید اللہ تھے اور اراکین میں ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین مسٹر محمود عالم اور حکیم یوسف جلال شامل تھیں۔ مسٹر جمیل الدین عالی اس مقابلے کے سکریٹری تھے۔ انعامی مقابلے میں صرف تخلیقی کتابوں کو شامل کیا گیا تھا اور یہ کتابیں ایسی تھیں جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۳۰ جولائی ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع ہوئی تھیں مقابلے میں اردو کی ۴۳ کتابیں اور بنگالی کی ۷۰ کتابیں شریک تھیں۔

## مشہور محقق مولانا عرشی کراچی میں

کراچی، ۲۶ اکتوبر۔ مشہور محقق مولانا امتیاز علی عرشی آج یہاں پہنچے ہیں۔ وہ ۳ نومبر تک کراچی ہی میں قیام کریں گے۔ موصوف رضا لائبریری رام پور کے نگران ہیں۔ آپ نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ رضا لائبریری کی وضاحتی فہرست مخطوطات عنقریب شائع کی جا رہی ہے۔

## اردو میں پہلی ٹیلی فون ڈائرکٹری

محکمہ ڈاک و تار نے اس سال ملتان ڈویژن کی ٹیلی فون ڈائرکٹری اردو میں شائع کی ہے پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلی ٹیلی فون ڈائرکٹری جو اردو میں شائع ہوئی ہے یہ ڈائرکٹری ۲۰۰ صفحات پر ٹائپ میں چھاپی ہے امید ہے آئندہ دوسری ڈویژنوں کے ڈائرکٹری بھی اردو ہی میں شائع ہوں گی

## راچی میں یوم سرسیّد منایا گیا

اچی، ۱۷ اکتوبر: آج یہاں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
سرسید کالج میں یوم سرسید منایا گیا جس کا افتتاح بابائے اردو
رت کے فرائض مشہور ہندوستانی عالم پروفیسر ہارون خان
نجام دیئے۔ بابائے اردو نے اپنی تقریر میں فرمایا: "پاکستان کی
ے سلسلے میں سرسید احمد خاں کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا
تعمیری کام کا آغاز کیا پاکستان اسی کا نتیجہ ہے" — انہوں نے
متحدہ ہندوستان میں اکثریتی فرقے نے اردو زبان کی مخالفت
سید احمد خاں نے اسی وقت یہ سمجھ لیا کہ مشترکہ قومیت کا خواب شرمندۂ
سکتا اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے علاحدہ رہ کر ہی اپنی حالت
ی۔ اس کے بعد سرسید احمد نے اپنی توجہ کا مرکز صرف مسلمانوں کی فلاح
دیا اور اسی مقصد کو زندگی بھر سینے سے لگائے رہے۔

بابائے اردو کے بعد پروفیسر ہارون خان شیروانی اور سید الطاف علی
جلسے کو خطاب کیا۔

## ی آرتھر شوپن ہاور کی سو سالہ برسی

رمن فلسفی آرتھر شوپن ہاور — ([illegible])
[illegible] — کی سو سالہ برسی کے سلسلہ
جرمن فورم نے ۲۱ ستمبر کو پاکستان جرمن ثقافتی مرکز،
ب جلسہ منعقد کیا جس میں فلسفے سے دلچسپی رکھنے والے پاکستانی
زات نے شرکت کی۔ ڈاکٹر اطہر رشید نے شوپن ہاور کے فلسفے
پڑھا جس میں اس کے فلسفہ قنوطیت کے محرکات پر اور اس
لوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ مقالے کے بعد مباحثہ ہوا جس میں
حب، صدر فورم، مسٹر جولیوم اور بعض دوسرے حضرات نے

## برصغیر کے بارے میں برنارڈ نیومین کی تازہ تصنیف

انگلستان کے مشہور مصنف لیکچرار اور سیاح مسٹر برنارڈ نیومین،
پاکستان، ہندوستان اور فارموسا کے وسیع دورے کے بعد ان ممالک
کے بارے میں ایک سفرنامہ لکھ رہے ہیں۔

یہ کتاب ان متعدد سلسلہ وار کتابوں میں سے ہوگی جو مسٹر نیومین
انگلستان کے ناشر ہربرٹ جینکنس کے لئے لکھ رہے ہیں پاکستان اور
ہندوستان کے بارے میں ان کی کتاب سلسلہ وار کتابوں میں چھٹی ہوگی

مسٹر نیومین نے لندن کے ایک اخباری نمائندہ کو بتایا کہ میں نے دو ماہ
برصغیر پاک و ہند میں گزارے ہیں انہوں نے مزید بتایا کہ پاکستان میں میں نے
لاہور اور پشاور یونیورسٹیوں کے طلبا کے سامنے لیکچر دیے۔ علاوہ ازیں
میں والی سوات سے بھی ملنے گیا۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ میں اس موسم سرما
میں برطانیہ میں پاکستان اور ہندوستان کے بارے میں لیکچر دوں گا۔

## پنجاب یونی ورسٹی کے لئے نئے برطانوی پروفیسر

پروفیسر پی۔ اے۔ ڈبلیو۔ میکارتھی جو پنجاب یونی ورسٹی میں صوتیات
اور جدید انگریزی زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں پاکستان پہنچ گئے ہیں
پروفیسر میکارتھی کی خدمات برٹش کونسل نے حاصل کی ہیں اور وہ پنجاب
یونی ورسٹی میں پروفیسر این ڈینین کے جانشین مقرر ہوئے ہیں جیسے
پروفیسر موصوف کی خدمات لیڈز یونی ورسٹی سے مستعار لی گئی ہیں جہاں وہ
۱۹۴۸ء سے شعبہ صوتیات کے سربراہ چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے ڈبلن اور کیمبرج
میں تعلیم پائی اور ۱۹۳۸-۳۹ء میں یونی ورسٹی کالج لندن میں صوتیات سے
متعلق پوسٹ گریجویٹ مطالعہ کیا۔

## روداد جلسہ انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان

کراچی ۱۰ اکتوبر: بیگم محمد شریف صدر انجمن کی صدارت میں انجمن کا
ماہانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں ابتداء تلاوت قرآن پاک کے بعد بیگم محمد شریف صاحبہ نے اردو

یونی ورسٹی کی اہمیت پر ایک مدلل تقریر کی اور فرمایا کہ اردو یونی ورسٹی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ آپ نے خواتین سے اپیل کی کہ وہ اردو یونی ورسٹی کو ایک قابل مثال یونی ورسٹی بنانے میں بابائے اردو سے تعاون کریں اور دامے درمے امداد کرکے اس اہم قومی کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں تاکہ آئندہ نسلیں آپ پر فخر کریں۔ انجمن کی کئی اراکین نے بھی اردو یونی ورسٹی کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ترانۂ اردو کے بعد بیگم رابعہ اسمٰعیل جنرل سکریٹری انجمن نے دو تجاویز پیش کیں جو اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔ بیگم رابعہ اسمٰعیل

جنرل سکریٹری ترقی اردو خواتین پاکستان

## اردو یونیورسٹی کیلئے مغربی جرمنی سے پاکستانی کا عطیہ

### بابائے اردو کے نام دو پونڈ کا چیک

کراچی۔ ۲۰ اکتوبر۔ روزنامہ امروز کے بچوں کے صفحہ پر اردو یونیورسٹی فنڈ کے لئے جو مہم گذشتہ چھ ماہ سے جاری ہے اس سلسلہ میں بزم امروز کے اراکین کی جانب سے اس فنڈ کی پہلی قسط ۲۷۰ روپے اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لئے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمت میں پیش کئے جا چکے ہیں حال ہی میں بزم امروز کے نگراں اچھے بھیا کو مغربی جرمنی کے علاقہ ملشن سے الیف یزدانی کا بھیجا ہوا دو پونڈ کا چیک اس فنڈ کے لئے موصول ہوا یہ چیک بابائے اردو کے نام ہے اور بے مرشی وبرنرز بنک کی طرف سے آیا ہے یہاں یہ رقم لائڈز بنک پاکستانی کرنسی میں ادا کرے گا۔

## موجودہ حالات میں معدودے چند لوگ ہی اعلیٰ تعلیم پا سکتے ہیں

منٹگمری۔ پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس اے آر کارنیلیس نے دیہی علاقوں میں ذہین افراد کو سائنس اور آرٹ کی طرف راغب کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ وہ سائنس اور آرٹ کے میدان میں گرانقدر کامیابیاں حاصل کرسکیں گے۔

مسٹر جسٹس کارنیلیس نے کل منٹگمری کے ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں روٹری کلب کے ممبروں سے خطاب کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ دیہی اسکولوں کے طلبہ کے لئے ایسی کتابیں مہیا کی جائیں جن کے ذریعہ انہیں سائنس اور کیمسٹری کے بنیادی اصول آسان طریقے سے سمجھائے جائیں ان کے علاوہ بچوں کو ایسی کتابیں بھی پڑھائی جائیں جن سے وہ یہ سیکھ سکیں کہ سائنس اور کیمسٹری کے بنیادی اصولوں سے وہ عملی زندگی میں کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

انہوں نے موجودہ طریق تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دیہات کے اسکولوں میں بچوں کو فرسودہ طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے اور انہیں ایسے الفاظ اور جملے رٹا دیئے جاتے ہیں جنہیں وہ سمجھتے ہی نہیں۔ جسٹس کارنیلیس نے کہا کہ اگر موجودہ حالات کو قائم رہنے دیا گیا جن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں صرف چند لوگوں کو حاصل ہیں تو علم چند افراد تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ آپ نے کہا کہ کئی ملکوں کی تاریخ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ پریشانیوں میں گھرے ہوئے ملکوں نے اچانک سنبھل کر تیزی سے آگے کی طرف بڑھنا شروع کیا اور خوش حالی کی منزل تک جا پہنچے۔

## لاہور میونسپل کمیٹی کے اجلاس میں اردو کو ذریعہ تحریر و تقریر بنانے پر زور

لاہور۔ ۲۲ اکتوبر۔ لاہور میونسپلٹی کے اجلاس میں آج اردو کو ذریعہ تحریر و تقریر بنانے پر زور دیا گیا اور ایوان کے متعدد ارکان نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ ایوان کی کارروائی میں اردو سے مسلسل لاتعلقی کا اظہار کرکے قومی زبان کی سبکی کی جا رہی ہے۔ ایوان کی کارروائی اردو میں عمل میں لانے کے متعلق سب سے پہلے ملک محمد اکبر نے توجہ دلاتے ہوئے چیرمین مسٹر ایم مسعود کی ایک تقریر کے دوران پوائنٹ آف آرڈر پر لکا۔ اس وقت چیرمین اور ملک محمد اختر ایک قانونی نکتہ پر انگریزی میں بحث کر رہے تھے ملک امیر نے بتایا کہ ایوان کے ارکان کی اکثریت غیر ملکی زبان سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے ان کے خیالات سے آگاہ نہیں ہو سکتی۔ چیرمین نے رکن کو آگاہ کیا کہ وہ فائیلوں پر عام طور پر انگریزی میں ریمارکس لکھتے ہیں اس پر آغا بیدار بخت نے چیرمین کو مخاطب کرتے ہوئے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ وہ دفتری کارروائی کے دوران انگریزی استعمال کرتے

ہیں۔ آغا بیدار بخت نے کہا کہ چیرمین کو اس سلسلہ میں میونسپلٹی کی ایک سابقہ قرارداد کا مطالعہ کرنا چاہئے [illegible] نافذ ہو چکی ہے [illegible] اظہار رائے اور خط و کتابت کا ذریعہ [illegible]

# ہمارا فرض

پرسوں کے دن ہماری قومی تحریک کی تاریخ کی بڑے شاندار پیرائے میں تجدید ہوئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانان ہند کے بابائے تعلیم سرسید احمد خاں نے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کرنے کی غرض سے ایک زبردست تحریک شروع کی تھی۔ یہ ذہنی انقلاب صرف تعلیم ہی کے ذریعے ممکن تھا، چناں چہ سرسید نے علی گڑھ مسلم کالج کی بنا رکھی، ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی و تعلیمی انقلاب کا یہ گویا پہلا زینہ تھا، مسلمانان ہند کی بیداری کی یہ پہلی کروٹ تھی، نصف صدی کے بعد پاکستان کی تخلیق ہونے والی تھی۔ مسلمانوں کی ایک الگ اور مکمل آزاد و خود مختار مملکت معرض وجود میں آنے والی تھی۔ سرسید کا اب ضعیف العمری کا زمانہ تھا، ان کی عمر اسّی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ چنانچہ اب انہیں ایک ایسے نوجوان کی جستجو تھی جو ان کی تحریک کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھا سکے اور علی گڑھ کالج کو ایک عظیم الشان یونیورسٹی میں تبدیل کر دے۔

سرسید کی نگاہ دوررس نے سر آغا خان (مرحوم) کو اس عظیم تحریک کے لئے منتخب کیا۔ سر آغا خان جو مسلمانان ہند کی سیاسی معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے خلوص دل سے متمنی تھے، اس وقت محض انیس سال کے نوجوان تھے۔ اور سر آغا خاں (مرحوم) نے اس کالج کو ایک شاندار یونیورسٹی کے سانچے میں ڈھال دیا۔ سر آغا خاں نے گھر گھر گھوم کر اس عظیم قومی ادارے کے لئے لاکھوں روپے کا چندہ فراہم کیا۔ سرسید نے جو ایک خواب دیکھا تھا، سر آغا خاں کی کوششوں نے اسے حقیقت بنا دیا۔

ایک تاریخ کی تخلیق ہوئی، سرسید اور سر آغا خاں کے باہمی اشتراک و تعاون سے!

سرسید کے دور کی نمائندہ بیانوے سالہ بزرگ شخصیت ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور سر آغا خاں (مرحوم) کے لائق پوتے پرنس کریم آغا خاں (چہارم) نے کراچی میں پاکستان کے پہلے اردو دارالعلوم کے قیام کے لئے ایک شاندار تقریب افتتاح میں ایک دوسرے کی جانب دست تعاون بڑھایا۔

ان صفحات پر کراچی کے مشہور گجراتی اخبار "ملت" کے اداریہ کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو یونیورسٹی کی تحریک میں صرف وہی لوگ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں کہ جن کی مادری زبان اردو ہے بلکہ پاکستان کا ہر وہ باشندہ جو اپنی تہذیب اور قومی وقار کا تحفظ چاہتا ہے وہ بابائے اردو کا ہم آواز ہے ___ "ملت" کا اداریہ پاکستان کے تمام گجراتی بولنے والوں کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے!

## سر سید اور سر آغا خان

### ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور پرنس کریم آغا خان

تاریخ اور صرف تاریخ کا ایک شاندار اور نادر موقع !

اردو یونیورسٹی مجلس کے ناظم (فخر ماتری) نے اس موقع کے پیش نظر ٹھیک ہی کہا کہ " یہ ملاپ طلوع ہوتی ہوئی صبح اور ڈھلتی ہوئی شام کا ملاپ ہے ۔ یہ ملاپ روشنی کو جاودانیت عطا کرنے والا ملاپ ہے۔ ایک سر سید کا دور، دوسرا ایٹم کا دور .... امیدوں کی تخم ریزی کی تقریب!

ڈاکٹر عبدالحق نے کہا " چار سال قبل میں نے ایک تحریری پیشین گوئی کی تھی کہ اردو یونیورسٹی کی تشکیل ایک ایسے شخص کے ہاتھوں ہوگی جس کا میں انتظار کر رہا ہوں ۔ سر سید نے بھی چونسٹھ سال پہلے سر آغا خاں کے لئے ایسی ہی پیشین گوئی کی تھی ۔ عظیم انسانوں کے خواب بھی عظیم ہوتے ہیں ۔ یہ خواب حقیقت میں تبدیل ہو کر ہی رہتے ہیں ، پاکستان کی تحریک و تخلیق میں اردو زبان کو بہت ہی اہم مقام حاصل رہا ہے قائداعظم کا قول ہے کہ صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی ۔ ہمیں اس عظیم رہنما پر مکمل اعتماد تھا چناں چہ ہم نے بہ یک آواز کہا تھا ... پاکستان کا دوسرا نام اردو ہے .... اردو کے بغیر پاکستان کا تصور ہی ممکن نہیں ، اردو نہ ہوتی تو پاکستان بھی نہ ہوتا ۔ ہمارے اس معرکہ آرا فیصلے کو سن کر ہمارے دشمن سر تا پا جل اٹھے تھے ۔ دشمنوں کو اس طرح آتش زیر پا دیکھ کر ہمیں اپنی کامیابیوں کا احساس ہوتا تھا ۔ اس کے بعد ہمارا ملک تو موجود تھا لیکن قائداعظم ہم سے رخصت ہو چکے تھے ۔ اصول موجود تھے لیکن ان سے عدم توجہی برتنے والے زیادہ طاقتور رجحانات بھی موجود تھے ۔

انگریز گرچہ اس ملک کو چھوڑ گیا تھا لیکن ہمیں ایک عرصہ کے بعد تباہ کر دینے والا اپنی انگریزی زبان کا ورثہ بھی ہمیں ترکے میں دے گیا تھا ۔ انگریز کو ہم نے جانے دیا لیکن اس کی زبان کو ہم نے بڑی تندہی سے سینے سے چپکا لیا ۔ یوں ہم نے قائداعظم کی روح کو تڑپایا اور اس طرح ہم نے اپنی آزادی و خود مختاری کی تکمیل نہ ہونے دی ۔ وہی ملک حقیقی معنوں میں آزاد کہا جا سکتا ہے جس کے عوام اپنی ہی زبان میں غور و فکر کرتے ہوں اور اپنی ہی زبان میں کاروبار مملکت چلاتے ہوں ۔

چین ایک آزاد ملک ہے ، جاپان آزاد ہے ، مصر اور شام آزاد ہیں ۔ تھائی لینڈ ، ملایا ، فلپائن اور انڈونیشیا آزاد ہیں ، ہند چینی اور کمبوڈیا آزاد ممالک ہیں کیوں کہ وہ اپنا نظام مملکت اپنی قومی زبانوں میں چلاتے ہیں جرمنی غلامی کا جوا اتار کر پھینک سکتا ہے کیوں کہ جرمن قوم کو اپنی زبان بہت عزیز ہے ۔

چین یا جاپان کی سیاسی ، معاشرتی اور معاشی ترقی انگریزی زبان زبان کی مرہون منت نہیں ۔ جرمنی اور روس جیسے ممالک سائنس کے میدان میں آج پیش پیش ہیں ۔ ان کی یہ قابل رشک ترقی بھی انگریزی زبان کی منت کش نہیں ! ان ممالک نے اپنی اپنی قومی زبانوں میں سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے ۔

برطانیہ اور امریکہ دونوں ملکوں کی مادری و ملکی زبان انگریزی ہے لیکن سائنس کے میدان میں جرمنی اور روس ان سے کوسوں آگے ہیں ۔ قائداعظم نے یہ نکتہ ہمیں سمجھایا تھا لیکن آج اس "خاموش رہو" کے ماحول میں کیا اس بنیادی حقیقت پر بھی ہم کوئی متحدہ فکر نہ کر سکیں گے ؟ قوم کو مکمل طور پر بدیسی سانچے میں ڈھلنے سے نہ روک سکیں گے ۔ ہمارے اہل حکمرانوں میں انگریزی گفتگو کو اپنا تہذیبی و تمدنی عروج سمجھا جا رہا ہے ۔ ہوٹل ، بازار جلسے اور قومی و ملکی تقریبوں میں ہر جگہ انگریز کی انگریزی زبان ہی کا دور دورہ ہے ، انگریز تو رخصت ہوا لیکن اس کی اس زہریلی دم کو ہم زبان نکال نکال کر چاٹتے جا رہے ہیں ۔ بھارت میں گزشتہ بارہ سال میں اردو کی کمر توڑ دی گئی ہے ۔ پاکستان میں پچھلے چار برسوں میں اردو کی دو ٹانگوں میں سے ایک ٹانگ توڑ دی گئی ہے جس کے لئے قوم آمادہ پیکار ہو گئی تھی جس کے لئے

زمان فتح پوری

# اُردو کی ایک گمنام مثنوی

# سعد وسلمیٰ

۱۲۸۶ھ میں "علی" تخلص کے کسی شاعر نے "سعد وسلمیٰ" کے نام سے ایک تاریخی قصہ نظم کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو میرے پیش نظر ہے خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ تقریباً ۴۵۰ صفحات اور ہر صفحہ پر ۱۵ اشعار ہیں اس طرح پورا منظوم قصہ کوئی (۶۵۰۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ سن کتابت درج نہیں ہے لیکن مصنف کے اس مصرع سے

خم کدہ اہل عشق کا ہے عجب

۱۲۸۶ھ

اور ان کے دوست عبدالاحد کے اس مصرعے سے

شعلہ زار کلام نعت نبی

۱۲۸۶ھ

تصنیف کا سال ۱۲۸۶ھ نکلتا ہے۔ قصہ مثنوی کی صورت میں ہے۔ لیکن ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ ہر واقعے اور داستان کا عنوان نثر کے بجائے شعر میں دیا گیا ہے۔ عنوانات کے اشعار بحر و وزن میں یکساں ہیں لیکن مثنوی کی بحر سے مختلف ہیں۔ قصہ فی نفسہٖ زیادہ طویل نہیں ہے لیکن حمد و نعت سے لے کر ہیرو اور ہیروئن کے حسن و شباب ان کی صفات، سراپا، رنج و خوشی اور وصل و فراق کے معاملات کو اس قدر مبالغے اور طوالت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے کہ مثنوی خاصی طویل وضخیم ہوگئی ہے تفصیل کے لحاظ سے سحرالبیان سے مشابہ ہے لیکن نفس مضمون میں نہ وہ رنگا رنگی ہے اور نہ زبان میں لطافت وشیرینی اور اثر انگیزی جو میرحسن کا طرہ امتیاز ہے صنعو کے اہتمام، نادر تشبیہات واستعارات کے استعمال۔ رعایت لف کے التزام اور فارسی ترکیب کی کثرت اور محاورہ بندی کی بر کے اعتبار سے اس میں گلزار نسیم کا رنگ بھی صاف جھلکتا ہے لیکن رنگینی وحسن آفرینی اس میں نظر نہیں آئی جو نسیم کی شہرت کا سبب قصہ بھی سحرالبیان وگلزار نسیم یا اردو کی دوسری مثنویوں سے مختلف ہے، اس میں جن وپری یا دیو یا کسی مافوق فطرت عنصر کا د نہیں ہے بلکہ تاریخ اسلام کے ایک خاص واقعے کو عاشقے کے مذہبی رنگ میں نظم کیا گیا ہے۔ بعض تاریخی حقائق اور مذہبی عقائد سہارے قصہ آگے بڑھتا ہے لیکن بیان میں اس قدر غلو سے کام ل ہے کہ واقعات کی فطری صورتیں بعض جگہ مسخ ہوگئی ہیں۔ نتیجۃً وعقیدے کے باوجود داستان ہمارے ذہن ودل پر کوئی گہ نہیں چھوڑتی۔ داستان کا خلاصہ یہ ہے۔

مدینے میں سعد نامی ایک خوب صورت نوجوان حضور ا صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں تھا۔ سعد ایک دن شکار کو

اور راہ بھٹک گیا۔ اور کسی دوسرے شہر میں جا پہنچا۔ یہ شہر دراصل سعد کے چچا کا تھا اور اسی کی بیٹی سلمیٰ سے سعد کی نسبت بچپن ہی سے طے پا چکی تھی پہلے تو سعد دل ہی دل میں شرمایا لیکن آخر چچا کے گھر کے سوا کہیں اور پناہ کی صورت نہ دیکھی۔ چچا نے سعد کا پرجوش خیر مقدم کیا اور آسائش و آرام کا ہر سامان مہیا کیا۔ چند دن بعد سعد و سلمیٰ کی شادی ہو گئی، اور دونوں عیش و آرام کی راحت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن سعد حب رسول کے نشے میں کچھ ایسا چور تھا کہ مدینے کی واپسی اور حضور کی قدم بوسی کا شوق رہ رہ کر اسے مضطرب و پریشان بنا دیتا تھا۔ اس لئے وہ سلمیٰ کو لے کر مدینے کی سمت روانہ ہوا اور سلمیٰ کے والدین کو غم فراق میں تڑپتا چھوڑ گیا۔ مدینے پہنچ کر سعد نے اسلامی لشکر کے ساتھ خیبر کا رخ کیا اور سلمیٰ تنہا انتظار کی گھڑیاں کاٹتی رہی۔ سعد اسلامی لشکر کے ہراول دستے میں تھا و جنگ خیبر میں شہید ہو گیا لیکن فتح و نصرت کا علم مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ سعد کی شہادت کی خبر سے سلمیٰ پر قیامت گذر گئی لیکن وہ شوہر کی وفادار تھی۔ اسلام کی شیدائی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں میں تھی صبر و شکر کا مجسمہ تھی اس لئے حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ اللہ اور اس کے محبوب نے سلمیٰ کو صابر و شاکر پایا تو اس کو اپنے عاشق سے دوبارہ ملنے کی صورت پیدا کر دی حکم الٰہی سے سعد نے از سر نو زندگی پائی اور سلمیٰ نے اپنے چاہنے والے کو دوبارہ گلے سے لگا لیا۔

یہ ہے مختصر قصہ جسے طول دیکر نظم کیا گیا ہے تقریبًا نصف مثنوی اسلامی لشکر کی روانگی اور واپسی کے واقعات سے تعلق رکھتی ہے، حضرت علی حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت ابوبکر صدیق

ہر ایک کی واپسی کا حال علیحدہ علیحدہ عنوان کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ سعد و سلمیٰ کا سراپا کئی موقعوں پر نظم کیا گیا ہے اور ہر جگہ غیر معمولی طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ قصہ اگرچہ اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر مذہب کا گہرا رنگ چھایا ہوا ہے لیکن عام مثنویوں کی تقلید میں سعد و سلمیٰ کے وصل و ہم آغوشی کے واقعات ایسی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں کہ کہانی جنسی چٹخارو ں سے پاک نہیں رہ سکی۔ دراصل اسی قسم کی بعض بے اعتدالیاں ہیں جو اس منظوم قصے کی سطح کو زیادہ بلند نہیں ہونے دیتیں ورنہ شاعر کی خلاقی اور قادر الکلامی میں شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ مثنوی کے بعض اجزا و اشعار بڑے خوب صورت و دل کش انداز میں سلمیٰ کا سراپا ایک جگہ یوں نظم ہوا ہے۔

پیکر دلبری میں بدر منیر    کشور مہوشی میں حور نظیر
ناز کے کارواں میں صوت جرس    حسن کے آئینے میں سحر نفس
فتنہ در خرمن نگہ بے تاب    حشر در دامن مژہ در خواب
دیر حیرت میں نالۂ ناقوس    بزم فطرت میں شعلۂ فانوس
خوش ادائی میں بوستان شمیم    دلربائی میں کاروان نسیم
مہر و عصمت میں مریم ثانی    ناز و خوبی میں ماہ کنعانی
سایۂ قاب زلف بوئے شراب    تکیۂ خواب ناز روئے گلاب
آفتاب جمال سلمیٰ نام    ہوش لیتا جھا زسے تا شام

~~~~

یہ منظوم قصہ دراصل ایک قسم کی طویل نعت ہے جس میں حب رسول صلعم کی برکتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بقول مصنف یہ روایت نعتیہ قصائد اور مولانا جامی کی مثنویوں میں پہلے سے موجود تھی اور انہوں نے اسے ثواب دارین کی خاطر اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔

حسن سعد و جمال سلمیٰ کا    گل کھلا نعت میں تمنا کا
جوہری کرامت صدیق    جس کے راوی ہیں مظہر تحقیق
خاص صدیق کی ولایت میں    شہرت انگیز ہر روایت میں
مختصر دفتر شواہد میں    جلوہ گر نعتیہ قصائد میں
قدس اللہ سرہ السامی    جس کے راوی ہیں حضرت جامی

جو لکھا میں نے قصہ سعدین
ہو صلہ بھی سعادت دارین

~~~~

# سر سیّد کے خواب کی تعبیر

(اداریہ روزنامہ "پاسبان" ڈھاکہ)

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

اگر جل گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

خیر پاک و ہند میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) نے عملاً یہ ثابت
یا تھا کہ میڈیکل سائنس اور انجینئرنگ تک کی ماہرانہ تعلیم اردو کے
یہ دی جا سکتی ہے زمانے کے دست برد نے اردو کے اس عظیم گہوارہ
سے چھین لیا ہے اس طرح بھارت میں اور جہاں جہاں اردو کے
چھوٹے گہوارے ہیں، وہ گردش روزگار کے شکار ہو چکے.
لیکن اردو کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس کا معاملہ تناسخ کا سا رہا
ایک قالب سے نکل تو دوسرے قالب میں سما گئی کبھی دلی میں پلی پھولی
دکن میں چمکی اور جب ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے طوائف الملوکی کا بازار
یا تو اردو نے لاہور کراچی اور ڈھاکہ میں گرمی محفل کا سامان بہم پہنچا
یہی لیکن کہیں قرار نہ ملا تو اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں مکین ہوئی۔

اردو کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے اپنے وطن سے بے وطن کیا جاتا
رہا۔ اس کی بہت بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ انتہائی ناساعد حالات میں
سے زیادہ برومند ہوئی۔ سب سے زیادہ پھیلی۔ اس صدی کا
ایک معجزہ یہ ہے کہ اردو ازروئے آئین ہنوز کسی ملک کی قومی زبا

نہیں ہے اس کے باوجود یہ انگریزی اور چینی زبان کے بعد تیسری
بڑی زبان ہے جسے انسانی آبادی کی ایک عظیم اکثریت بولتی اور سمجھتی
ہے۔ یہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اقوام متحدہ کی رپورٹ سے اس کی
شہادت ملتی ہے اسکی ایشیائی بین الاقوامیت کا ایک بین ثبوت
یہ ہے کہ پنڈت نہرو جب افغانستان یا ایران کا دورہ کرتے ہیں تو وہ
وہاں کے عوامی جلسوں کو اردو میں خطاب کرتے ہیں اور نہ صرف
خطاب کرتے ہیں بلکہ اپنے ملک واپس جا کر برملا یہ کہتے ہیں کہ بہت سے
ایشیائی ممالک سے رابطہ استوار کرنے کے لئے اردو ہی واحد ذریعہ
بن سکتی ہے۔ ان کے حقائق کے پیش نظر کیا یہ بیسویں صدی کا ایک
معجزہ نہیں ہے کہ اردو آج تک ازروئے دستور کسی ملک کی قومی زبان
نہ بن سکی۔ قومی زبان تو کجا ہمیں پاکستان میں اس کی توفیق بھی نصیب نہیں
ہوئی کہ ہم ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرتے جہاں اعلیٰ ترین ماہرانہ
تعلیم اردو کے ذریعہ دی جاتی ۔

جی چاہتا ہے کہ ہم بابائے اردو کے بارے میں ہم وہی بات
کہیں جو اکبر الہ آبادی مرحوم نے سر سید احمد خاں رح کے بارے میں کہی
تھی یعنی یہ کہ ان سے کسی کو لاکھ اختلاف ہی لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ
وہ کام کے آدمی ہیں وہ اپنی دھن کے پکے ہیں ۔ اردو کی ترقی کا خیال

نے ہوش سنبھالتے ہی اپنا مشن بنالیا، اور آج جبکہ ان کی عمر نوے سال سے اوپر ہو چکی ہے، پیرانہ سالی کے باوجود اپنی جواں ہمتی اور قوت کارکردگی کے اعتبار سے جوانوں کے جوان ہیں اور رجحان بھی ایسے کہ بڑی بڑی مہمات سر کرنے کا جذبہ رکھنے والے اور اقبال کے اشعار پڑھ پڑھ کر جھومنے والے نوجوانانِ قوم بھی شرما جائیں۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ بابائے اردو نے اللہ کا نام لے کر "اردو یونی ورسٹی" کا منصوبہ بنایا۔ قوم کو بتایا کہ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے" اس کا تفصیلی خاکہ پمفلٹ کی شکل میں چھاپ کر ملک کے طول و عرض میں پھیلادیا اور ملک کے صاحبِ استطاعت " اردو پرستوں " کو یقین دلایا کہ اگرچہ اس منصوبے پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوں گے لیکن سر دست پانچ لاکھ روپے بھی فراہم ہو جائیں تو اردو یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آجائے ، موصوف نے کتنے درد بھرے انداز سے کہا کہ :۔

" میں نے سر سید احمد خاں رح کی آنکھیں دیکھی ہیں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور فیض حاصل کیا لیکن افسوس کہ میں ان سے چندہ مانگنے کا گُر نہ سیکھ سکا جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں "

سچی بات تو یہ ہے کہ جذبہ جب صادق ہوتا ہے تو کام رک نہیں سکتا۔ ہمارا عقیدہ ایمان ہے کہ کام اسباب و وسائل سے نہیں ہوتا بلکہ جذبۂ صادق سے ہوتا ہے۔ اگر کسی مقصد کی حقیقی لگن موجود ہو تو اسباب و وسائل فراہم ہو ہی جاتے ہیں جو لوگ کام اس طرح کرتے ہیں کہ پہلے اسباب و وسائل فراہم کریں پھر کام کا نقشہ بنالیں، پھر کام شروع کریں اور ہر وقت ڈرتے رہیں کہ لگ کہیں بیچ منجدھار میں ساتھ نہ چھوڑ جائیں وہ دنیا میں کچھ نہیں کرسکتے۔ مردانِ کار کی سیرت یہی بتاتی ہے کہ کام کی ابتدا ہمیشہ جذبۂ صادق سے ہوتی ہے۔ یہی جذبۂ صادق ہوتا ہے جو دوسروں کو تعاون پر اکساتا ہے اور نامساعد سے نامساعد حالات میں گویا یہی سلامتی پہنچاتا ہے۔ سرسید کی زندگی بھی ہمیں یہی سبق دیتی ہے۔

بابائے اردو کی زندگی سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ چناں چہ یہ کل ہی کی بات تھی کہ بابائے اردو نے پورے اخلاص اور پورے جذبۂ صادق کے ساتھ "اردو یونی ورسٹی کی تجویز کا اعلان کیا، بظاہر حالات سازگار نہ تھے لیکن قدرت نے "آغاخان" کی شکل میں غیب سے وہ امداد بہم پہنچادی جو یونی ورسٹی کی بنیاد ڈالنے کے لیے ضروری تھی۔ اردو پر "آغاخان" کا احسان رہتی دنیا تک رہے گا کہ انہوں نے اردو یونی ورسٹی کے قیام کو اپنے عملی تعاون سے ممکن بنادیا۔

آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سر سید نے جو خواب آج سے تقریباً سو سال پہلے دیکھا، اور حیدرآباد میں پچاس سال بعد جس کی ادھوری تعبیر ہوئی تھی آج کراچی میں اس کی از سر نو تعبیر ہو رہی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ حیدرآباد میں اردو جامعہ اور دارالتر[جمہ] کا کام جہاں تک ہوا تھا ہم اس سے آگے کی منازل طے کرسکیں گے

( ۵ راکتوبر ...

---

گردو پیش :۔

## یوم انقلاب پر ادیبوں کی خدمات کا اعتراف

یوم انقلاب کے موقع پر صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ڈاکٹر سید عبداللہ، امتیاز علی تاج اور الطاف گوہر کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں تمغے عطا کئے ڈاکٹر سید عبداللہ کو قابل فخر خدمات کے صلے میں "تمغۂ صد... ملا ہے۔ امتیاز علی تاج کو "ستارۂ امتیاز" اور الطاف گوہر کو "تمغۂ امتیاز"۔

میں گمشدہ ہوں مرا فن ہے دائمی لیکن
چراغ بجھ گیا باقی ہے روشنی لیکن

حسین آپ، حسین زندگی، حسین دنیا
حسیں تریں ہے مرا ذوقِ شاعری لیکن

چلو یہ ٹھیک ہے، میں کشتۂ شراب سہی
نظر تمہاری بھی ہے کچھ جھکی جھکی لیکن

جناب واقعی شہزادۂ بہاراں ہیں
حضور! آپ کی آنکھوں میں ہے نمی لیکن

تمہاری آنکھ میں کوثر کی لہر۔ خلد کا نور
ہم اس کو کہتے ہیں موجِ شراب بھی لیکن

حیات دردِ مسلسل ہر، آپ کہتے ہیں
اسی تڑپ میں وہ ہلکی سی نغمگی لیکن

مجھے یہ زعم کہ میں دردِ حسن چھو تو سکا
انہیں یہ ضد کہ مرا غم بھی ہے یہی لیکن

میں جانتا ہوں یہ کم بخت ایک ناگن ہے
بہت حسین نظر آتی ہے زندگی لیکن

سلام! مجھکو تو جیسی بھی ہے بہت ہے حیات
اداس ہے نئی دنیا کا فلسفی لیکن

# اردو یونیورسٹی کے قیام کی تحریک

(ہفتہ وار "ایشیا" لاہور)

اقوام متحدہ کے ایک رسالے "کوریر" کی رپورٹ کے مطابق چینی اور انگریزی زبان کے بعد اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والے سب سے زیادہ ہیں۔

ماہرین لسان کے خیال کے مطابق اردو میں بین الاقوامی زبان بننے کی پوری پوری صلاحیتیں موجود ہیں۔

اردو ادب نے ترقی کی جو منازل طے کی ہیں ان کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ :۔

"اردو ادب کا شمار اب دنیا کے عظیم ترین اور اعلیٰ ترین ادبیات میں ہوگا" (مشہور عالم اور مستشرق پروفیسر اے آربیری لندن میں تقریر ۷ مہ ۱۹ء)

اردو نہ صرف یہ کہ ایک ترقی یافتہ زبان کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اس میں ترقی پذیری کی غیر معمولی استعداد موجود ہے اور اس کے ذریعہ تمام علوم و فنون کی تعلیم بخوبی دی جا سکتی ہے کیونکہ "اردو میں سو اسو سال پہلے بھی اعلیٰ درجوں میں ذریعہ تعلیم بننے کی صلاحیت تھی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں بھی تیس سال تک ادب سائنس، معاشیات قانون، ڈاکٹری، انجنیری اور جملہ نظری و تجربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعہ ہوتی جاتی رہی۔

برصغیر پاک و ہند کے عظیم شاعروں، ادیبوں اور مفکروں نے اردو ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے چنا۔ غالب، حالی، اقبال، شبلی، ابوالکلام، ابوالاعلیٰ مودودی، پریم چند اور جوش کی عظمت سے انکار کی جرات کون کر سکتا ہے۔

شعر و ادب اور فلسفہ و تاریخ کی کتنی ہی اردو تصانیف کے تراجم انگریزی، عربی، ترکی، روسی اور متعدد دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند سے باہر سنگاپور، ملایا، بورنیو، برما لنکا، ایران، عدن، عراق آپ کہیں بھی چلے جائیے آپ کو اردو بولنے اور سمجھنے والے ملیں گے۔ برما میں اردو کے متعدد اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔ عراق کی لائبریریوں میں تقریباً ۵ فیصد کتابیں اردو کی ہیں۔

اردو میں ایک کامیاب، ترقی یافتہ، مکمل اور جامع زبان کی تمام خوبیاں موجود ہیں زبان کا اوج، روانی و سلاست اور جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کی صلاحیت، دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کرنے کی استعداد، لطیف احساسات کو ادا کرنے کی خوبی، کیا چیز اس میں نہیں پائی جاتی؟

اردو ایک عرصہ تک برصغیر پاک و ہند میں عدالتی زبان کی حیثیت سے رائج رہی ہے۔

عربی، انگریزی، فارسی، فرانسیسی کتابوں کے بے شمار تراجم اردو میں کئے جا چکے ہیں۔ فلسفہ، تاریخ، ادب لطیف، اسلامیات

پر جو کتابیں لکھی گئیں یا ترجمہ کے ذریعے اردو میں منتقل ہوئیں ان کا شمار مشکل ہے لیکن ان ناقابل تردید حقائق کے باوجود بڑے سے بڑا اردو کے بدترین نقاد بھی حرف گیری کی جرات نہیں کرسکتے، اردو کو اس کا جائز مقام اب تک نہ مل سکا، اردو ـــ درہ خیبر سے راس کماری تک چالیس کروڑ انسانوں کی زبان تقسیم ہند کے بعد بھارت سے اس لئے جلاوطن کردی گئی کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے اسے پاکستان جانا چاہیے لیکن پاکستان میں مغرب زدہ دماغوں کی تنگ نظری، خود غرضی اور تعصب کے باعث نہ اسے قومی زبان کا درجہ دیا گیا اور نہ ذریعہ تعلیم بننے دیا گیا۔

آزادی حاصل ہوئے تیرہ برس ہوگئے مگر پاکستان میں ایک "اردو یونی ورسٹی" تک قائم نہ ہوسکی اور اب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے جو اپنی عمر کی ۹۰ منزلیں طے کرچکے ہیں، اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لئے ملی حمیت کو آواز دی ہے اور اپنے بوڑھے ہاتھ ہی خواہان ملک و ملت کے آگے پھیلائے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو اور ملی غیرت اور قومی افتخار کا نشان "اردو یونی ورسٹی" کی شکل میں قائم ہو۔ تاکہ قومی صلاحیتوں کا وہ ضیاع رکے جو ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے کے باعث عرصہ دراز سے ہو رہا ہے اور ملت کے ذہنی ارتقا کے راستے سے وہ چٹان دور ہو جائے، جس کے باعث ذہانت، فطانت، رعنائی فکر اپج اور عبقریت کے سوتے خشک ہوتے جارہے ہیں اور جس کا نتیجہ ہے خیرہ مذاقی، بے علمی، اپنی روایات سے بیگانگی، تعلیم یافتہ اور مہذب افراد کی قلت اور کور مغز، بے بصر اور علم و دانش سے تہی دامن لوگوں کی کثرت۔

★

مدت ہوئی ایک انگریز اہل نظر کو جو پاک و ہند کے دورے پر آیا ہوا تھا جب یہ معلوم ہوا کہ یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہے تو اس نے بڑی صفائی سے کہا تھا:۔

"اس طرح تو تمہارا ملک قیامت تک ترقی نہیں کرسکتا"

اور یہ واقعہ ہے بقول بابائے اردو:۔

"جب ہر مضمون اور علم کا سیکھنا کسی ایسی غیر زبان کے ذریعہ لازم قرار دیا جائے جو بالکل اجنبی ہے تو وہ ایک عذاب ہو جاتا ہے۔ قوائے جسمانی و ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں اور جدت و جودت مفقود ہو جاتی ہے ایک قوت تو خود زبان سیکھنے کی ہے اور دوسری اس کے ذریعے سے مضمون سمجھنے کی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ مضمون پر، اور وقت دگنا بلکہ کئی گنا صرف ہوتا ہے اور عمر کا سب سے عزیز حصہ اسی الجھن میں بیکار جاتا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جو اس مخمصے میں مبتلا ہو۔

دوسرا بڑا عیب یہ ہے کہ انتہائی تعلیم تک ہر مضمون انگریزی زبان اور انگریز یا دوسرے یورپی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ پڑھنے سے طلبہ کے طرز فکر و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہے اور غیر محسوس طور پر وہ اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں نقالی اور تقلید غالب آجاتی ہے۔ اس ذہنی نکبت کی وجہ سے وہ بے لاگ غور و فکر سے عاجز رہتے ہیں اور ان میں اور ان کے ماحول میں مغائرت پیدا ہو جاتی ہے جو قومی ترقی اور نشوونما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ

ہے اس باطنی کیفیت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہے۔"

لئے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا یہ استدلال ناقابل تردید ہے کہ:۔

" ایک ایسے ملک کے لئے جو علم میں پسماندہ بھی ہے اور
مفلس بھی، ایک اجنبی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا نہایت
مضرت رساں ہے۔"

اردو میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کی جو صلاحیت ہے اس کا تجربہ سوا سو برس
قبل دہلی کالج میں کیا جا چکا ہے جہاں تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم اردو
زبان کے ذریعہ دی جاتی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں یہ کالج ختم
ہو گیا۔ اس کے ۶۰ برس بعد حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونی ورسٹی قائم ہوئی
جس میں تمام علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کی
کامیابیوں کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے فارغ التحصیل
طلبہ نے یورپ کی بڑی بڑی یونی ورسٹیوں سے علوم و فنون کی اعلیٰ
ڈگریاں اعزاز کے ساتھ حاصل کیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق غیر منقسم ہندوستان
کی فیڈرل کورٹ کے سابق چیف جسٹس سر ماریس گوئر نے کہا:۔

" عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ طبعیات، ریاضی اور
علم الحیوانات جیسے مشکل مضامین میں بھی امتیاز حاصل
کرتے تھے۔"
طبعیات اور ریاضی کے شعبوں میں جو اعلیٰ نتائج
حاصل ہوئے، ان کا مجھے علم ہوا ہے اور حیوانیات میں
جو نادر تحقیقات اور تجربے ہو رہے ہیں ان کو میں نے
خود دیکھا ہے اور انہوں نے دور دراز کے ماہرین
سائنس کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔"

(خطبہ تقسیم اسناد عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۴۱ء۔ از سر ماریس گوئر)

بابائے اردو نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ:۔

" انگریزی ذریعہ تعلیم کی لعنت صرف برصغیر پاک و
ہند میں ہے، ورنہ فن لینڈ، ڈنمارک وغیرہ جیسے
چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تمام علوم اور سائنس کی
تعلیم ملکی زبانوں میں دی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ
سبق آموز مثال اسرائیل کی ہے جہاں کی یونی ورسٹی
کے تمام مدارج میں جملہ علوم و فنون اور سائنس کا ذریعہ
تعلیم عبرانی ہے۔ جو صدیوں سے مردہ ہو چکی تھی، اور
اب دفتر، عدالت اور کاروبار میں ہر جگہ رائج کر دی
گئی ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ وہاں عبرانی کے سوا
کوئی دوسری زبان استعمال کرے، اور تو اور
انڈونیشیا جسے حال میں آزادی ملی ہے وہاں تعلیم
اور دوسرے کاروبار سب اپنی زبان میں ہوتے
ہیں اور سابق آقاؤں کی زبان ولندیزی کو ملک
بدر کر دیا گیا ہے۔"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا پاکستان ہی وہ بدقسمت ملک ہے جہاں
قومی زبان کے ارتقا کی ساری راہیں مسدود ہیں اور کیا ہمیں غلامانہ
ذہنیت کی بندشیں اتنی کڑی ہیں کہ انہیں توڑا نہیں جا سکتا ——
زنگیت سے مرعوبیت، اندھی نقالی اور مغربی تہذیب کا افسوں
توڑنے کے لئے بھی اردو یونی ورسٹی کا قیام ناگزیر ہے۔

(انیس احمد ہاشمی)

تبسم کاشمیری

# سرسید کے قیامِ لندن کا ایک طویل خط

انیسویں صدی کے اخبار و رسائل کی تحقیق کرتے ہوئے راقم کو سرسید کا ایک نادر مکتوب ملا ہے یہ خط سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے نام لندن سے ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو لکھا گیا تھا اور اس کی اشاعت "اتالیق پنجاب" لاہور (مطبوعہ نومبر ۱۸۶۹ء) میں ہوئی ہے۔ اس خط کا ذکر حالی نے "حیات جاوید" (صفحہ ۲۱۳ مطبوعہ اکادمی پنجاب لاہور) میں بھی کیا ہے۔ سرسید کو سائنٹفک سوسائٹی سے خاص دلچسپی تھی اور انہوں نے اس سوسائٹی کی بنیاد سائنسی کتابوں کی اشاعت اور جدید علوم کی ترقی کے لئے رکھی تھی وہ اس سوسائٹی کے ذریعہ مغرب کے ترقی یافتہ تعلیمی اثرات ہندوستان پر ڈالنا چاہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سوسائٹی نے انیسویں صدی کے ہندوستان میں زبردست اصلاحی اور تعمیری کردار ادا کیا ہے۔

سرسید کے زیر نظر مکتوب میں ان احساسات کی گہری جھلکیاں ہیں جو سفر لندن نے ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا کئے تھے مغرب کے ترقی یافتہ نظام حیات اور اس کی بلند اقدار کا جائزہ لینے سے وہ یکدم حیران ہو گئے تھے۔ یہاں کی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور معاشی نظام کی زندگی جس پیش روی نے انہیں بے حد متاثر کیا تھا وہ زندگی کے ایک ایسے تماشے کو دیکھ رہے تھے جو نہایت تیزی سے منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں انہیں ہندوستان کا خیال آ رہا تھا، جہاں زندگی کی ہر قدر تھک کر چور ہو چکی تھی۔ جہاں کی تہذیب کی رگوں کا خون مدت سے خشک ہو چکا تھا۔ اس میں اب زندگی کی کوئی حرارت نہ تھی، اسے نئے خون کی ضرورت تھی جو اس کے مردہ جسم میں دوڑے اور توانائی کا احساس پیدا ہو۔ سرسید انیسویں صدی کے غالباً سب سے زیادہ ذہین انسان تھے کہ جنہیں یہاں کی مردہ تہذیب میں توانائی پیدا کرنے کا احساس نہایت شدت سے ہوا اور اسی احساس میں انہوں نے زندگی کا ایک ایک لمحہ گزار دیا۔

سرسید کے اس خط سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں ان کے قیام لندن کے بہت سے پوشیدہ گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور اس خط کے مطالعے کے بعد مکمل طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ سرسید وہاں کس قسم کی زندگی گزار رہے تھے۔

اب آپ خط ملاحظہ فرمائیے:۔

جناب عالی سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، دام اقبالہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۹ ستمبر ۱۸۶۹ء میرے پاس پہنچا۔ آپ جو بسبب نہ پہنچنے حال سفر کے ناراض ہوئے ہیں اس کی معافی میں آپ سے چاہتا ہوں اور اپنے قصور کا اقرار کرتا ہوں مگر میں نے سنا تھا کہ آپ کی سوسائٹی کے بعض ممبر میری آزادانہ تحریر کو ناپسند کرتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ

جو کیفیت اس سفر میں میرے دل پر گزرتی ہے اور جو سچائی کہ میرے دل میں آتی ہے اس کو آپ کی سوسیٹی کے ممبروں کے ذریعے چھپاؤں اور جس گناہ کا الزام میں اپنے ہم وطن ہندوستانیوں پر دیتا ہوں خود بھی اس گناہ کا مرتکب ہوں۔ اس لئے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا لکھنا ہی موقوف کر دیا جائے اگر آپ میری آزادانہ رایوں اور باتوں کو چھپنے سے اپنی سوسائٹی کا کچھ نقصان نہیں سمجھتے اور کچھ ممبروں کی بلکہ سوائے خدا کے اور کسی کی ناراضی کا اندیشہ نہیں کرتے تو مجھ کو تمام حالات کے بھیجتے رہنے اور یہاں کے عجائبات کے لکھنے اور نصیحت آموز اور عبرت خیز باتوں کے بیان کرنے میں کچھ عذر نہیں ہے۔

اگر آپ بجنسہ میرے اس نیاز نامہ کو اپنے اخبار میں چھاپ دیں گے اور امر مذکورہ بالا کی نسبت صاف صاف اپنی رائے لکھ دیں گے تو میں بدستور سابق ہمیشہ ایک پرچہ بھیجتا رہوں گا۔ بالفعل بطور تلافی مافات چھ مہینے کے سفر کا جو اب تک نتیجہ ہوا ہے وہ میں آپ کو لکھتا ہوں۔ مجھ کو یہاں آئے ہوئے چھ مہینے کے قریب ہوئے اس عرصہ میں اگرچہ بسبب تنگی روپیہ بہت سی چیزوں کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، مگر بایں ہمہ کچھ نہ کچھ دیکھا۔ میں لارڈ اور ڈیوک کی مجلسوں میں بھی گیا ان کے ہاں بڑے بڑے کھانوں اور مجلسوں میں شریک ہوا اور ان سے کم درجہ کے بعض امیروں سے بھی اسی طرح ملا۔ متوسط درجہ کے رئیسوں اور اشرافوں سے جو گویا ہمارے ہم چشم یعنی ہمارے سے درجہ اور رتبے کے تھے دوستانہ ملا اور مکانوں میں بھی شریک ہوا ہر موقع پر لیڈیوں اور اشراف اور قابل تربیت یافتہ عورتوں کو بھی دیکھا۔ ان کے امیروں اور متوسط درجہ کے بھلے مانسوں اور غریب اشرافوں بلکہ بعض نہایت کم درجہ کے لوگوں کے گھروں کو اور ان کے رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے کے طریقے کو بھی دیکھا۔ بڑے بڑے سوداگروں، ان کے کارخانے اور متوسط درجہ کے سوداگروں کی دکانیں اور ان کے اسباب رکھنے اور سودا بیچنے اور خریداروں کے ساتھ پیش آنے

اور گفتگو کرنے کے طریق کو بھی دیکھا۔ یہاں کے کاریگروں اور قلیوں کو بھی دیکھا۔ بڑے بڑے عالی شان مکانات اور میوزیم بھی دیکھے۔ انجینیروں کے کارخانے اور جہاز بننے کے کارخانے۔ توپوں کے بننے کا کارخانہ۔ تار برقی بننے کا کارخانہ جو سمندر میں ڈالا جاتا ہے اور ایک دنیا کو دوسری دنیا سے ملا دیتا ہے۔ جنگی جہاز (جن میں سے ایک جہاز پر کئی میل سفر بھی کیا) اور گریٹ ایسٹرن کو دیکھا بعض سوسیٹیوں کے میٹنگ میں بھی شریک ہوا اور بعض کلبوں کے جلسوں اور کھانوں میں بھی شریک ہوا، اور ان سب باتوں کا جو نتیجہ حاصل ہوا وہ یہ ہوا کہ ہم ہندوستان میں انگریزوں کو ایک نہایت بداخلاق کا ملزم ٹھہراکر (اگرچہ میں اب بھی ان کو اس الزام سے بری نہیں کرتا) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں۔ یہ ہماری غلطی تھی وہ ہم کو سمجھتے ہی نہیں تھے بلکہ درحقیقت ہم ایسے ہیں۔ میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے، جیسے نہایت خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو قابل تعظیم یا لائق ادب کے سمجھتے ہو۔ کچھ اس کے ساتھ اخلاق اور بداخلاقی کا خیال کرتے ہو ہرگز نہیں کرتے۔ پس ہمارا حق کچھ نہیں ہے (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانوروں کی طرح سمجھیں

اگرچہ میرے ہم وطن میری اس تحریر کو بہت سخت سمجھیں گے اور وہ تعجب کریں گے کہ کس چیز کی ہم میں کمی ہے اور کس چیز کی انگریزوں میں فوقیت ہے جو میں نے ایسا لکھا ہے مگر ان کا تعجب کرنا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے وہ یہاں کی کسی چیز سے واقف نہیں ہیں اور جو کچھ یہاں ہے وہ حقیقت میں وہم و خیال سے باہر ہے جو کچھ میں نے یہاں دیکھا، اور

دیکھتا ہوں۔ امکان نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں وہم و گمان میں بھی آسکتا ہے۔ جو کوئی میرا ہم وطن، میری اس تحریر کو دیکھے اور واقعی حقیقت نہ سمجھے تو آپ یقین کیجئے کہ اس کی مثال مینڈک اور مچھلی کی ہے[1]۔ ایک مادر زاد اندھا آپ کی وحشت میں سورج کی روشنی کی کیفیت یا چاندنی کی خوشنمائی کی فرحت سمجھ سکتا ہے، یا خیال میں لاسکتا ہے[2]

میں ان باتوں پر مطلق خیال نہیں کرتا جو بسبب خاصیت ملک کے ایک دوسرے میں مختلف ہیں، بلکہ میں صرف اخلاقی اور تعلیمی اوصاف نفسانی اور صفائی اور خوش سلیقگی اور ہنر و کمال کا ذکر کرتا ہوں جو تعلیم و تربیت سے علاقہ رکھتا ہے۔

تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہئیں وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ دینی خوبیوں سے میرا مطلب یہ ہے کہ جس دین کو وہ لوگ حق سمجھتے ہیں اس کو کیا خوبصورتی اور عمدگی سے اس کے تمام تعلقات کو پورا کرتے ہیں اور انجام دیتے ہیں۔ کسی ملک میں اور کوئی مذہب والے اس خوبی و خوش اسلوبی و سلیقے سے نہیں کرتے یہ تمام نتیجہ ہے زن و مرد کے عموماً تعلیم یافتہ ہونے کا اور تمام قوم کا ان امور کی طرف متوجہ ہونے کا۔ اگر ہندوستان کے لوگ بھی عموماً تربیت پا جائیں تو ہندوستان بسبب اپنے بعض قدرتی اوصاف کے انگلستان سے زیادہ نہیں تو تحقیقی اس کے قریب قریب گلزار ہو جاوے۔ جو درخواست میں نے آپ سے اس نیاز نامہ میں کی ہے اگر آپ اس کو منظور کر لیں گے تو میں اپنے سفر کا حال تو لکھا ہی کروں گا، مگر تھوڑا سا حال اپنی پرائیویٹ لائف کا جو یہاں لکھتا ہوں اور غالباً دلچسپ ہوگا اور میرے ہم وطنوں کو یا تعجب میں ڈالے گا یا مجھ پر ہنسوائے گا یا ایک اور تیر ملامت ان کے ہاتھ آوے گا

جب میں لندن پہنچا تو میں چار روز چیرنگ کراس ہوٹل میں ٹھہرا میرے پاس نہ اتنا روپیہ تھا نہ مجھ کو ایسا مقدور تھا کہ میں ایک علیحدہ مکان کرائے پر لے کے اس میں رہتا اور تمام اسباب خریدتا اور نوکر رکھتا اس لئے میں نے سلاجنگ کرایہ پر لیا سلاجنگ کے یہ معنی ہیں کہ جس

---

[1] ایک زندہ مچھلی اتفاقاً ایک مچھلی والے کے پاس سے ایک کنوئے میں گر پڑی اس کنوئے میں مینڈک رہتے تھے انہوں نے ایک نیا مسافر گورے گورے رنگ چاندی سی چمک کا دیکھ کر اس کی خاطر کی اور پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں گنگا جی کی رہنے والی ہوں۔ مینڈکوں نے پوچھا تمہارا ملک بھی ایسا ہی ہے۔ ہمارا یہ آبی ملک ہے۔ اس نے کہا ہاں ایسا ہی ہے مگر نہایت روشن ہے نہایت عمدہ ہے، لطیف ہوا اس پہ چلتی ہے۔ بڑی بڑی موجوں کی ایسی لہریں آتی ہیں کہ ہم ان میں جھولے کی طرح جھولتے ہیں اور خوشیاں کرتے ہیں اور نہایت وسیع اور چوڑا چکلا ملک ہے جس میں ہم تیرتے پھرتے رہتے ہیں۔ یہ سن کر ایک مینڈک کنوئیں کی دیوار سے ہاتھ بھر الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور کہا اتنا وسیع جتنا کہ میں اور کنوئیں کی دیوار، اس نے کہا اس سے بھی زیادہ وہ مینڈک ہاتھ بھر اور ہٹ گیا اور پھر پوچھا، اس نے کہا اور بھی زیادہ، وہ اور ہٹ گیا اور پھر پوچھا، اس نے کہا اور بھی زیادہ، وہ اور ہٹتا گیا اور پوچھتا گیا اور مچھلی یہی جواب دیتی گئی کہ اور بھی زیادہ، یہاں تک کہ مینڈک کنوئے کی دوسری دیوار سے جا لگا اور پوچھا کہ اتنا بڑا۔ جب مچھلی نے کہا کہ اس سے بہت زیادہ تو مینڈک نے کہا جھوٹ اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ اتنے میں ایک شخص نے ڈول ڈالا اور پانی ہلا۔ مینڈک نے پوچھا کہ ایسی ہی لہریں آتی ہیں۔ وہ مچھلی ہنسی اور کہا۔ اس چیز کو جس کو تم نے کبھی نہیں دیکھا تم کو اس کا خیال میں

[2] میں لانا ممکن ہے اور وہ چیز بغیر دیکھے بتائے بھی خیال میں نہیں آسکتی تو اس کو کیوں پوچھتے ہو۔

مکانوں میں صاحب مکان ہے اس کے چند کمرے وہ کرایہ پر دیدیتا ہے مکان کو اسباب مزدوری سے یہاں تک کہ سونے کے پلنگ اوڑھنے اور بچھونے سے مرتب کر دیتا ہے مکان والا لینڈلارڈ اور اس کی بیوی لینڈ لیڈی کہلاتی ہے۔ کھانا بھی وہی پکوا کر کھلاتی ہے نوکروں کا بندوبست وہی کراتی ہے۔ ہر ہفتہ ایک بل دے کر جو خرچ ہوتا ہے وہ لے لیتی ہے اور نہایت آرام سے گزرتی ہے۔

اس سے آپ خیال کریں گے کہ ایسے لوگ جو اپنے رہنے کے مکانوں میں اوروں کو بھی کرایہ پر رکھ لیتے ہیں لندن کے غریب آدمی ہیں گر اخراف ہیں مگر باعتبار دولت وہ ویسے کہ نہایت غریب ہیں۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ مسٹر لڈلم کے قبضہ میں ہے۔ اس کی ایک بی بی مسز لڈلم ہے اور مسز لڈلم کی دو بہنیں ہیں مس الن وسٹ اور مس فانی وسٹ۔ وہ بھی کبھی کبھی بطور مہمان اپنی بہن کے پاس آتی ہے اور دو تین ہفتہ رہ کر چلی جاتی ہیں۔ مسٹر جے لڈلم ایسا لائق و قابل آدمی ہے جیسے نہایت لائق اشراف کو ہونا چاہیے متعدد علوم سے واقف ہے اور ایسا شریف آدمی کہ جب فرصت ملتی ہے تو ان کو علمی[1] مجلسوں میں جہاں کیمسٹری یا بیالوجی یا تھیالوجی وغیرہ علوم پر لکچر ہوتے ہیں جاتا ہے چھ مہینے ہوئے مگر بجز اس کے کہ کبھی ملاقات ہوئی اور بات چیت ہوئی یا کمرے میں جانے نکلنے کے وقت اتفاقیہ صاحب سلامت ہوئی کبھی میرے کمرے تک اس کی آواز نہیں آئی۔ ہر وقت اس بات کا خیال رہتا کہ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کو تکلیف نہ ہو کیسی عمدہ اخلاق کی بات ہے کہ بہر حال میں مسٹر جے لڈلم کی ذاتی خوبیوں کو جتانا نہیں چاہتا کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے ایسا نہ ہوں بلکہ اس بیان سے یہاں کی عام تعلیم و تربیت کا نقشہ اپنے ہم وطنوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

مس لڈلم ایک ایسی قابل اور تعلیم یافتہ نہایت شائستہ نہایت پڑھی لکھی نہایت نیک بی بی ہے کہ اس کی خوبیاں مجھ سے بیان نہیں ہو سکتیں۔ تہذیب اور اخلاق اور ادب اور انسانیت سب چیز کی مجسم ہے۔ تمام کام اور تمام معاملات خانہ داری کے نہایت لیاقت سے خود کرتی ہے اور مسٹر لڈلم کو بجز آفس میں جانے اور اپنے علمی جلسوں میں شریک رہنے کے کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔

ان کی دو بہنیں بھی اسی طرح پڑھی لکھی قابل ہیں ان میں سے مس الن وسٹ کو کتابوں کے پڑھنے کا نہایت شوق ہے۔ ان دنوں میں ایک کتاب متعلق مذہب مسلمانوں کے لکھ رہا ہوں اور میں نے بہت سی انگریزی کتابیں جو مسلمانوں کے مذہب کے متعلق خواہ اس کی تائید میں خواہ اس کی تردید میں لکھی گئی ہیں اور نیز چند کتابیں نہایت لامذہبوں کی جو کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتے اور سب کی تردید کرتے ہیں جمع کی ہیں۔ چند روز ہوئے کہ مس الن وسٹ دفعتاً نہایت بیمار ہو گئی تھی، دوسرے دن بیماری کو آرام ہو گیا۔ انہوں نے مجھے کہلا بھیجا کہ جو کتابیں حال میں تم نے خریدی ہیں ان میں سے کوئی کتاب میرے پڑھنے اور دل بہلانے کو بھیج دو۔ میں نے کہا کہ میرے پاس اس قسم کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ مذہبی کتابیں ہیں اور وہ بھی جھگڑے اور رد و قدح کی۔ اس نے کہا کہ کچھ مضائقہ نہیں انہیں میں سے کوئی دو۔

---

[1] یہ مجلسیں اور اس قسم کی اور بہت سی لوگوں نے خود قائم کی ہیں اور جو لوگ وہاں جاتے ہیں اس سے دو دو آنے فیس کے لئے جاتے ہیں ان جلسوں میں اس قدر آمدنی ہوتی ہے کہ اس کے تمام اخراجات اور لکچر دینے والوں کی تنخواہیں اور آلات اور مکان غرض سب چیزوں کا خرچ اوس میں سے چلتا ہے اور عام لوگوں کو ایسی تربیت پہنچتی ہے جو ہندوستان میں کسی بڑے عالی خاندان کو بھی نہ تھی۔

چنانچہ میں نے ایک کتاب بھیجدی۔ دو دن میں اس نے اس کتاب کو پڑھ ڈالا اور جب اس کو بالکل صحت ہوئی اور باہر آئی تو چند باتیں نہایت عمدہ اس کتاب میں سے بیان کیں۔ بس اب سمجھنا چاہئے کہ متوسط درجہ سے کسی قدر کم درجہ کی عورتوں کی تو کیسی عمدہ تعلیم ہے۔ کیا یہ تعجب خیز بات نہیں کہ ایک عورت حالت بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلا دے آپ نے ہندوستان میں کسی امیر کسی نواب کسی درجہ کے کسی مرد اشراف کو ایسی خصلت کا دیکھا ہے۔

اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی۔ بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور بکمال نفرت اور بکمال حیرت ان کے خیال میں گذرتی ہے۔

آپ یقین جانئے کہ ہندوستان میں جس طرح انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ صرف وہ پولٹیکل گورنمنٹ سے مجبور ہیں جو ان کو ہندوستانیوں کے ساتھ ملنا اور ان کی خاطر داری کرنی پڑتی ہے اگر یہ نہ ہو اور فرض کرو کہ ہندوستانی اور انگریز ایک آزاد ملک میں اکٹھے بسائے جائیں اور بالفعل جو عادتیں اور طرز زندگی اور پرائیویٹ لائف ہندوستانیوں کی ہے وہ ویسی رہے اور جو انگریزوں کی ہے وہ ویسی رہے تو ہرگز انگریز ہندوستانیوں کے پاس بھی نہ کھڑے ہوں اور جانور سے زیادہ نہ سمجھیں۔ میں بے شک ہندوستان کے انگریزوں کو کہتا ہوں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ نہایت بد اخلاق ہیں۔ اور ان کو ایسا ہونا نہیں چاہئے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ باعتبار شایستگی کے میں ہندوستانیوں کو اس بات کا مستحق ٹھہراتا ہوں۔ بلکہ اس وجہ سے کہتا ہوں کہ انگریزوں کو خود اپنی شایستگی کے لحاظ سے ایسا کرنا خود اپنی تربیت اور شایستگی پر بٹہ لگانا اور حقیقت میں عام شایستگی کے پھیلنے کو سد راہ ہوتا ہے اور لاکھوں باتوں کو کروڑوں منافع عام کو نقصان پہنچاتا ہے؛

انڈیا آفس میں تمام ہندوستانیوں کی قوموں کی تصویریں معہ حالات و رسومات کی ایک کتاب ہے اور جس رسم کو اوس میں بیان کیا ہے اس کی بعینہٖ تصویر بھی ہے اور اکثر تصویریں فوٹوگراف کی لی ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عین اوسی وقت اور اوسی حالت میں لی گئی ہیں اور ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کیسی کچھ وحشیانہ ہیں، اور جانوروں سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے، جو ان انگریز جو سول سروس میں پاس ہونے کے بعد دو برس تک واسطے دینے بعض خاص امتحانوں کے یہاں رہتے ہیں وہ قریب اپنے زمانہ روانگی کے انڈیا آفس میں آتے ہیں اور ہندوستان کے حالات سے کچھ واقفیت بہم پہنچانی چاہتے ہیں وہ بھی اس کتاب کو دیکھتے ہیں اور وہ حالات پڑھنے اور تصویریں دیکھنے کے بعد جو عزت اور قدر و منزلت ہندوستانیوں کی ان کے دل میں آتی ہے وہ ایک ادنیٰ غور سے خیال میں آسکتی ہے۔

ایک دن میں اور حامد اور محمود انڈیا آفس میں گئے۔ محمود نے اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا اتنے میں ایک جوان انگریز شاید کوئی سول سروس پاس کئے ہوئے تھا آن کھڑا ہوا تھوڑی دیر بعد اوس نے محمود سے پوچھا کہ تم بھی ہندوستانی ہو۔ محمود نے اسی وقت بلا خیال کہا کہ ہاں مگر یہ کہتے ہی اوس کو ایسی شرمندگی ہوئی کہ اوس کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس نے کہا کہ I am of a foreign nation and not Indian.

میں ہندوستان کی قوم کا آدمی نہیں ہوں بلکہ پردیسی قوم کا ہندوستان میں آ گیا ہوں۔ پس خیال کرو کہ جب تک یہ کلنک کا ٹیکا ہندوستانی اپنے منہ سے نہ چھڑا دیں گے اوس وقت تک کبھی ان کی عزت اور قدر کسی تربیت یافتہ قوم کی آنکھ میں نہیں ہو سکی۔

میں نہایت خوش ہوں کہ ہمارے بنگالی بھائیوں نے اور پارسیوں
نے کسی قدر شائستگی میں ترقی کرنی شروع کی ہے مگر وہ ایسا دور نکل چلے
ہیں کہ جس سے گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ مگر ہمارے وطنی ہندو اور مسلمان
بھائی اب تک کونے جہالت میں پڑے ہیں، اور آئندہ مدت تک
پڑے رہیں گے اور شاید مسلمان تو اتنے دنوں تک پڑے رہیں کہ پھر وقت
اور زمانہ ان کی ترقی اور شائستگی کا باقی نہ رہے اور جو اب مرض ہے وہ
علاج پذیر نہ رہے کیوں کہ ان کو یعنی مسلمانوں کو جہل مرکب نے گھیر لیا ہے اپنے
باپ دادا کے قصے یاد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم سے بہتر کون ہے
اور حال میں جو باغ ان کے سامنے ہے اور گل پھول کھل رہے ہیں اسی
جہل مرکب نے ان کی آنکھوں کو اس کے دیکھنے سے اندھا کر رکھا ہے مگر
مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے بڑی خوشی ہے کہ گو ہمارے ہندوستان کے
مسلمان بھائی جہل مرکب میں مبتلا ہوں مگر اور ملکوں میں جو ہمارے
مسلمان بھائی ہیں انہوں نے تربیت و شائستگی میں ترقی کرنی شروع
کی ہے اور مصر اور ٹرکی یعنی سلطان روم کی عملداری کے مسلمان روز بروز
شائستگی میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ٹرکی کے
مسلمانوں میں سے وہ تعصب جس کی بنا حماقت اور جہالت پر ہوتی ہے
اور جس کا اخیر نتیجہ مذلت اور خواری ہوتا ہے روز بروز جاتا ہے بلکہ کہنا
چاہئے کہ معدوم ہو گیا ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے خدیو مصر کو انگلستان
میں دیکھا اور ایک ایسی قوم سے جن میں ایک زمانے میں باہم نفرت تھی
دوستانہ طور سے ملتا اور جلسوں میں شریک ہوتا ہوا دیکھا۔ سلطان روم
کو بھی اپنی ہمسایہ قوموں سے روز بروز محبت اور اتحاد اور دوستی بڑھتی
جاتی ہے۔ چند روز ہوئے کہ ایک بہت بڑا ثبوت جہالت کے تعصبات
کے جاتے رہنے کا سلطان روم کے فرانس اور لندن میں آنے اور باہم
دوستانہ ملاقاتیں کرنے اور کھانوں میں ایک میز پر شریک ہونے سے
ہو چکا تھا اور اب دوسرا بہت بڑا ثبوت امپریس آف فرانس یعنی شہنشاہ فرانس
کی ملکہ اور شہنشاہ آسٹریلیا کے روم میں جانے اور سلطان کے
ہاں مہمان ہونے سے ہوگا۔ ان دنوں میں مہمانداری کی روم میں بڑی
بڑی طیاریاں ہو رہی ہیں۔ سلطان خود امپریس آف فرانس کے استقبال
کو جاوے گا۔ اور یہ شہنشاہ آپس میں ایک ہفتہ تک برادرانہ محبت
و انبساط سے ملیں گے۔ اور جلسوں اور کھانوں میں شریک ہوں گے
اور پھر ساتھ سفر کریں گے، اور سلطان اپنے مہمانوں کو اپنے ساتھ
بیت المقدس کی زیارت کرانے لے جائے گا۔ ابھی چند روز ہوئے
کہ پرنس آف ویلز سلطان روم کے ہاں مہمان تھے اور تمام ترکی زبان
حال سے اس طرح پر ترانہ سنج تھے، ع

اے آمدنت باعث آبادی ما
ذکر تو بود زمزمۂ شادی ما

پس اس بات کے دیکھنے سے کہ آپس میں انسانوں کی روز بروز محبت
بڑھتی جاتی ہے اور جہالت اور وحشیانہ پن کم ہوتا جاتا ہے جو اصل منشا
نیچر کا ہے کس قدر خوشی حاصل ہوئی ہے۔

روم اور مصر دونوں میں روز بروز تعلیم کی ترقی ہے،
عورتیں بھی بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی جاتی ہیں۔ مصر کی ایک مسلمان
لڑکی میں نے سنا کہ سوائے عربی زبان کے جو اس کی اصلی زبان ہے اور جس
میں وہ نہایت فصاحت سے لکھتی پڑھتی ہے، فرنچ زبان بھی خوب
بولتی ہے اور لیٹن اس قدر جانتی ہے کہ جو مضمون یا شعر اس کے سامنے
رکھا جاوے اس کو پڑھ لیتی ہے اور مضمون سمجھ لیتی ہے۔ اس کے بھائی
نے فرانس میں تربیت پائی تھی، جب وہ اپنے گھر گیا تو اس کی بہن نے
جس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور اپنے کنبے کے بزرگوں سے اس نے
عربی میں بہت کچھ پڑھا تھا، اپنے بھائی سے لیٹن سیکھ لی۔

اب میں ایک نہایت دلچسپ مکان میں رہتا ہوں (یہاں
کے مکانات اور ان کے موقعوں کا حال پھر لکھوں گا) جو کمرہ اس مکان

کے ہم سے متعلق ہیں۔ چار تو بیڈ روم ہیں یعنی ہم چاروں کے سونے کے
لئے چار کمرے، حامد، محمود، مرزا خداداد بیگ کے سونے کے کمرے میرے
سونے کے کمرے سے کسی قدر زیادہ اچھے ہیں۔ اور ان میں فرنیچر بھی
کسی قدر زیادہ ہے اس لئے کہ وہ اس کمرے میں رات کو پڑھتے بھی ہیں اور
کتاب بھی دیکھتے ہیں۔ میرے کمرے میں صرف سونے کا سامان ہے گویا ایسا
ہے کہ میں نے ہندوستان میں نہیں دیکھا ہے، شاید کلکتہ و بمبئی میں ہو یا
نے دیکھا ہو۔ ایک کمرہ میرے لکھنے اور کتاب دیکھنے اور کتاب کے
تصنیف کرنے کا ہے اور اسی کمرے میں ہم کھانا بھی کھاتے ہیں اور چاء
بھی پیتے ہیں اور ایک بڑا کمرہ آراستہ ہے جو سٹنگ روم کہلاتا ہے۔ یعنی
ملاقات کا کمرہ، اس میں کبھی ہم سب مل بیٹھتے ہیں اور دل خوش کرتے
ہیں اور جب کوئی دوست ہم میں سے کسی سے ملاقات کو آتا ہے تو اس
کمرہ میں ملاقات ہوتی ہے۔

ہماری مہربان لینڈ لیڈی نے ہمارے کاموں کے انجام کے لئے
دو نوکر رکھے ہیں، ایک کا نام این سمتھ ہے اور دوسری کا ایلیز بیتھ
ماتھیوز، پہلی تو نو عمر لڑکی ہے، متفرق کام کرتی ہے اور پچھلی نہایت
ہوشیار اور لائق پڑھی لکھی خوشخط باسلیقہ ہے کتابیں پڑھ سکتی ہے
تمام ضروری مضمون لکھ سکتی ہے۔ اخبار پڑھ سکتی اور اس سے خوشی حاصل
کر سکتی ہے۔ اپنا متعلق کام اس خوبی سے انجام دیتی ہے کہ جیسے کوئی کل
یا گھڑی بلا تفاوت باقاعدہ اپنا کام کرتی ہے۔

ہم اپنے سونے کے کمرے میں سے بعد فراغ تمام ذاتی کاموں
کے پوری پوشاک پہن کر قریب ساڑھے آٹھ بجے کے اپنے لکھنے پڑھنے
کے کمرے میں آتے ہیں۔ اس عرصہ میں این اسمتھ دونوں کمرے صاف
کر رکھتی اور ہر چیز کیا چوکی اور کیا میز اور کیا الماری اور کیا تصویریں
کیا قلم دان اور کیا کتابیں غرض کہ تمام چیزیں جھاڑ پونچھ کر اور آراستہ
کر کر اپنے اپنے موقع پر رکھ دیتی ہے۔ آتشدان میں بقدر حالت سردی
کے آگ جلا رکھتی ہے۔ اگر کوئی چٹھی کسی کے نام کی آتی ہے تو اس نے ہر ایک
کا نام پڑھ کر ہر ایک نشست کی چوکی کے آگے رکھ دی۔ اگر کوئی اتفاقیہ
ہو آیا اس کو سب کے بیچ میں رکھ دیا کہ جس کا جی چاہے وہ اٹھا کر
پڑھے۔ غرض کہ ہم کمرہ میں آئے سب چیز کو آراستہ پایا۔ قریب نو بجے
کے وہ کمرے کے دروازہ پر آئی اور دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آنے کی
اجازت چاہی جب معمولی الفاظ سے اجازت ملی وہ اندر آئی اور کھانا
کی میز پر چادر بچھائی اور بریک فاسٹ - - - -
کا سامان سب مہیا کیا۔ تمام گفتگو نہایت شستہ، مودب اور باوجود
مودب ہونے کے خوش خو، اخلاق اور انسانیت سے بھری ہوئی، ہر
ایک سے سر کہہ کر بات کہی، حامد کو مسٹر حامد، محمود اور مرزا خداداد
بیگ کو مسٹر بیگ نہایت آداب آمیز طریقے سے کہا اور چونکہ وہ جان
گئی ہے کہ مرزا خداداد بیگ کا یہ پورا نام نہیں ہے ایک آدھ دفعہ
یہ بھی کہہ دیا ہے کہ سر پلیز پارڈن می یور فل نیم از ویری ڈفیکلٹ۔
sir please pardon me your full
name is very difficult.
یعنی آپ مجھے معاف فرمائیں جو میں نے آپ کا پورا نام نہیں یا آپ کا
پورا نام نہایت مشکل ہے۔ اب بڑا تماشہ ہو گیا ہے کہ ہم سب نے مرزا
خداداد بیگ کا نام مسٹر بیگ رکھ دیا ہے۔ غرض کہ اسی طرح تمام چیزیں
وقت پر موجود اور مہیا رکھتی ہے اور ڈنر اور سپر سب کا سامان اس طرح
خوبی اور درستی سے انجام دیتی ہے۔ آپ یقین جانئے کہ اگر یہ عورت
جو نہایت غریب آدمی اور ٹہل گیری کی نوکری کی محتاج ہے اور
دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہے، اگر ہندوستان میں
جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض
جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے یہ صرف نتیجہ
علم تعلیم و تربیت کا ہے۔

اس قدر ہوا کہ ایلیزبیتھ ماتھیوز کو دیکھو کر باوجود قلت تنخواہ
کے پیشوایان ہینی والے اخبار جس کا نام ایکو ہے مول لیتی ہے اور جب
کام سے فرصت ملے اس کو پڑھتی ہے کبھی پنچ اخبار کا کوئی پرچہ لے کر
اس میں جو تصویریں عورتوں کی کس طرح پر ہوتی ہیں ان کو دیکھتی ہے اور
اس کے ایڈیٹر کے کنایات اور اشارات کو پڑھتی ہے اور طبیعت خوش کرتی ہے
تمام سیدھے والوں کی مسکانوں کی پیشانیوں پر ان کے نام بڑے
خوشخط سنہری اور رنگین حرفوں میں لکھے ہوتے ہیں یہ تمام نوکریں
ہر ایک تحریر کو پڑھ لیتی ہیں اور تمام کام کر لاتی ہیں،
کیب مین ہونگے جو اپنی گاڑی کے نیچے کوئی اخبار یا کتاب دبا کے
رکھتے ہیں. ہماری سواری پہنچائی اور کیب یا اور جو سواری موجود کھڑی
کی اور انہوں نے اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کیا. خیال کر لیں کہ یہاں
کیب مین کی ایسی حیثیت ہے جیسی کہ بنارس میں وہاں کے یکہ کرایہ پر چلانے والوں
کی حیثیت. پس جب تک کہ اس قدر ترقی عام تعلیم کی نہ ہو شائستگی اور تربیت
کسی قوم میں آنی اور اس قوم کی عزت ہونی ناممکن ہے ۔

اس تمام ترقی کا باعث انگلستان میں صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں
تمام علوم تمام فن جو کچھ ہے اسی قوم کی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب عموماً کے
بولی جاتی ہے. گو اسی انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں
جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے مگر انگریزی زبان انگلستان میں
ایسی ہے جیسے ہندوستان میں علی الخصوص شمال و مغربی اضلاع اور صوبہ بہار
میں اردو جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی
ترقی اور بھلائی چاہنے والے ہیں وہ بیقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف
اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے کر ادنیٰ تک انہیں کی زبان میں ان کو
دیئے جائیں. میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت
بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگار رہنے کے لئے کھو د دیئے
جاویں۔ اگر تمام علوم ہندوستان کو انگریزی زبان میں نہ دیئے جائیں گے

کبھی ہندوستان کو شائستگی اور تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا۔ یہ جو
ہے ایسی سچ ہے جیسا سچ ہے۔ اس حالت میں گورنمنٹ کو نہایت مشکل
اور جب گورنمنٹ کی زبان ملکی زبان نہیں ہے تو لوگوں کو وہ نیکیر پر متوجہ
ہونے کا بہت کم موقع ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک ہندوستان میں
ڈگری کے لالچ کے کوئی شخص علم کی قدر سے علم کو تحصیل نہیں کرتا مگر اے ہندو
کے بھلائی چاہنے والو تم کسی سے توقع مت رکھو اور خود اپنے اپنے سر پر
اپنی کے چندہ سے اپنے ملک میں تمام علوم اعلیٰ درجہ سے ادنیٰ درجہ تک
اپنی زبان میں پھیلاؤ. جب تم علوم سے واقف ہو جاؤ گے اور شائستگی
و تربیت تک پہنچو گے. تب تمہاری نگاہ میں گورنمنٹ کی نوکریں
لالچ کی کچھ بھی حقیقت نہیں معلوم ہوگی امید ہے کہ کسی دن ایسا ہی ہو
ہو گا ہوگا۔

مجھ کو اس بات کے دریافت ہونے سے کہ حضور نواب لفٹنٹ
گورنر بہادر نے آپ کی سوسیٹی کی بڑی دستگیری کی ہے اور صاحب ڈائرکٹر
پبلک انسٹرکشن بہادر اضلاع شمال مغرب نے بھی بڑی اعانت اور پر
فرمائی ہے نہایت خوشی ہوئی اور خدا کا بہت بہت شکر کیا. مگر اے مائی
راجہ اپنی سوسیٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت دینا. ہر بات
تعلیم کی بھلائی اور برائی پر تمام ہندوستان کی زندگی اور موت منحصر ہے
نہایت غور کی مگر نہایت منصفانہ نگاہ سے اس کو دیکھتے رہنا، صرف سچائی
عام بھلائی کو اپنا دوست جاننا. مجھ کو سوسیٹی کے قرضہ کا بہت رنج ہے میں نے جو
سوسیٹی کیلئے نواں کا حرف طیار کرا کر بھیجا ہے اس کا حساب میں آپ کو بھیج آیا تھا اور
کئی سو روپے میرا فاضل ذمہ سوسیٹی بابت لاگت حرف نکلتا آپ نے جو حساب قرضہ
کا مرتب کیا ہے اس میں وہ رقم داخل ہے یا نہیں اگر داخل ہو تو میں چاہتا ہوں کہ بقایا
مذکورہ میری طرف سے ڈونیشن سوسیٹی کے حساب میں جمع کیجئے اور اس رقم کو قرضہ کے ادا
میں ڈال لیجئے مگر یہ کہ جس قدر میرا روپیہ بطور قرض بابت لاگت حرف سوسیٹی کے ذمہ لینا
جمع خرچ برابر کر دیجئے زیادہ نیاز فقط، راقم آپ کا تابعدار سید احمد۔ از مقام لندن
۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹

تسلسل

# ادب کی رفتار

(۱۹۵۹ء)

(گذشتہ سے پیوستہ)

## اقبال

| | | |
|---|---|---|
| ...رتصوف | آخری قسط (عبدالغنی نیازی) | اقبال، اپریل |
| ...کلام میں تصوف | (جگن ناتھ آزاد) | شاہراہ، " |
| ...لہجہ | | |
| ...رتصوف | سید محمد عبدالرشید | فاران، اگست |
| ...یاد میں | سرور صاحب | ہماری زبان، ۲۲ اپریل |
| ...راس کا علم | جگن ناتھ آزاد | نگار، مارچ |
| ...ل کا تعارف | اکبر علی خاں | نیا دور، " |
| ...چند نوادر | " | ماہ نو، اپریل |
| ...ت اقبال | " | صحیفہ، ۳، ۴ |
| ...کا ایک غیر مطبوعہ... | محمد عثمان | اقبال، اپریل |
| ...شرق | سر مالکم ڈارلنگ | ماہ نو، جولائی |
| ...اور اقبال | حسن مثنیٰ انور | علی گڑھ میگزین |
| ...ادیب کی | عابد رضا بیدار | ہماری زبان، ۸ مارچ |
| ...ت پر تبصرہ | | |

## آزاد

| | | |
|---|---|---|
| ...ل کی دھڑکن | سرور صاحب | ہماری زبان، ۱۵ فروری |
| آزاد | ع۔ د عارف | افکار، مارچ |
| ...زاد کا بچپن | فاطمہ بیگم | آج کل، ستمبر |
| دور حاضر، اسلام اور مولانا آزاد | حیات اللہ انصاری | قومی آواز، ۲۶ فروری |
| تذکرہ، صلوٰۃ اور لسان الصدق کا ایک شمارہ | (قاضی عبدالودود) | آجکل، جون |
| مولانا آزاد | مجاہد کمال خاں | " اپریل |
| مولانا ابوالکلام آزاد | رشید صاحب | علی گڑھ میگزین |
| مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ | سیدین صاحب | آجکل، اپریل |
| انڈیا ونس فریڈم | عتیق صدیقی | شاہراہ آزاد نمبر |
| مولانا آزاد کا ذہنی پس منظر | " | " " |
| چند یادیں | مولانا دریابادی | " " |
| ابوالکلام آزاد شائع کردہ وزارت اطلاعات پر تبصرہ | " | صدق جدید ۱۹ نومبر |
| کچھ مولانا آزاد کی تصنیف کے بارے میں | عابد رضا بیدار | تحریک، اپریل و اکتوبر |
| آزاد ایک صحافی۔ پیغام، کلکتہ | " | نگار، مئی |
| مولانا آزاد کی مستند سوانح عمری کا خاکہ | " | برہان، جولائی |
| آزاد ایک صحافی | " | " ستمبر |
| مولانا کے تین نادر خط | " | صبا، مئی |
| مولانا آزاد کی آپ بیتی (غلام رسول مہر) | | لیل و نہار ۱۰ اپریل |

~~~~~~
~~~~~~

## تنقید

| | | |
|---|---|---|
| معیدیہ کا ذہنی پس منظر | محمد حسن | سوغات-۳ |
| اردو غزل کا فکری پس منظر | " | ادب لطیف سالنامہ |
| تنقید اور عمل تنقید | عبادت بریلوی | شاعر-مئی |
| امریکا میں ادبی تنقید | مسعود حسین | ہماری زبان، ۸ فروری |
| اردو تنقیدی معیار | محمد حسن | شاعر-جون |
| اہل زبان دانوں کی نظر میں (شہاب جعفری، اثر لکھنوی) | | قند ۲-۴ |
| داغ کی غزل | سیدہ جعفر | ہماری زبان، ۱۵ مئی |
| تو بہ مجروح بسلسلہ شاد عارفی | | خیال، اکتوبر |
| سرسید کا احسان اردو ادب پر | عطاء الرحمن صدیقی | ساقی، اپریل |
| مزاح اور مزاح نگاری | احسن فاروقی | ساقی، مئی |
| تنقید اور تنقید نگاری | " | "، ستمبر |
| آل احمد سرور اور مارکسزم | ہنس راج رہبر | شاہراہ، جنوری |
| سرسید جمال الدین افغانی کی نظر میں | انور معظم | علی گڑھ میگزین |
| پریم چند کا تصور حیات | قمر رئیس | " |
| شاعری میں شخصیت | سرور صاحب | " |
| اختر شیرانی | (وارث کرمانی) | ادب لطیف، نومبر |
| میر باقر علی داستان گو | راز یزدانی | نیا دور، مئی |
| رحیم الدین حیا | " | "، نومبر |
| طلسم ہوشربا | " | آج کل، ستمبر |
| بوستان خیال | " | نگار، اگست |
| داستان حمزہ | " | "، ستمبر |
| طلسم ہوشربا | حافظ علی بہادر خاں | آج کل، مئی |

## سوانح اور خاکے

| | | |
|---|---|---|
| سید سلیمان | نجم الہدیٰ ندوی | معارف، نومبر |
| کرشن چندر | صہبا لکھنوی | افکار، ستمبر |
| سالک مرحوم | شفیع عقیل | ماہ نو، نومبر |
| آرزو لکھنوی | سید مظفر حسین زیدی | افکار ستمبر |
| اشک رام پوری | راز یزدانی | نگار، اپریل |
| رہوش صدیقی | عابد رضا بیدار | ہماری زبان، ۸ مارچ |
| فراق | ضیاء اللہ | سوغات ۱۱ |
| فراق | آل احمد سرور | ہماری زبان، ۲۲ مارچ |
| ذکر امجد | محمد عمر یوسفی | آج کل، مارچ |
| جگر | آل احمد سرور | غالب، ستمبر |
| ذکر مصحفی | نثار احمد فاروقی | برہان |
| گلکرائسٹ اور اس کی تصانیف | محمد عتیق صدیقی | آجکل، ستمبر |
| ڈاکٹر غلام یزدانی | عرش ملسیانی | " " |
| مولوی فیض آبادی | احمد اللہ شاہ (شفقت رضوی) | "، جولائی |
| چغتائی کی ایک خود شبیہ | عبدالرحمن چغتائی | " " |
| جناب سالک | محمد طفیل | نقوش ۷۶-۷۷ |
| چند اگلی صحبتیں | جوش | ماہ نو، مارچ |
| | | قومی زبان، یکم اپریل |
| خالدہ ادیب خانم | بابائے اردو | لیل و نہار |
| اختر جوناگڑھی | ممتاز حسن | العلم، جولائی |
| وحید الدین سلیم | انتظام اللہ شہابی | انجمن اسلامیہ میگزین، مئی |
| طیش امروہوی | سید صفی مرتضیٰ | نیا دور، جنوری |
| ادبی یادیں | صبغت اللہ شہید | " " |
| ذاکر حسین | سیدین صاحب | مسلم یونیورسٹی گزٹ ۱۵ دسمبر |
| پنڈت کیفی | حکیم امامی | قومی زبان ۱۶ جون و یکم جولائی |
| میر غلام بھیک نیرنگ | جعفر طاہر | " " یکم جولائی |

خلیفہ عبدالحکیم — عابد علی عابد — قومی زبان، ۱۵ مئی، یکم جون
مظہر علی خاں — ایم حبیب خاں — نوائے ادب، جنوری
محمد الف خاں حباب — سید حسن — آجکل، دسمبر
خود نوشت — امین زبیری مرحوم — اردو، جنوری
فانی — فیض الرحمن اعظمی — آجکل، دسمبر
مولانا ملیح آبادی — حفیظ الدین — ہماری زبان، یکم جولائی
میر مہدی مجروح — نزہت شاہجہانپوری — صحیفہ ۳: ۱
خلیفہ عبدالحکیم سمپوزیم (جسٹس ایس رحمان، بیگم خلیفہ، رفیعہ حسن
بشیر ڈار، حنیف ندوی، جعفر پھلواری
کے۔ بدر، محبوب صدیقی) صحیفہ ۳-۱
(رئیس احمد جعفری) ماہ نو۔ اپریل

## تحقیق اور متفرقات

تاریخی تحقیق کے بعض مسائل — ڈاکٹر نذیر احمد — علی گڑھ میگزین
یونیورسٹیوں میں اردو میں ہونیوالے تحقیقی کاموں کی فہرست — نوائے ادب، جنوری
اردو ڈراما پر ایک قدیم تحریر — اعجاز احمد — جوہر، یکم دسمبر
پنڈت ابر لکھنوی — عبدالماجد دریابادی — ہماری زبان، ۱۵ مئی
فضائل وحشت — جمیل مظہری — " یکم "
ہندو شعراء — نصیر ہاشمی — العلم، ستمبر
منشی سراج الدین احمد سرسید کے ایک ساتھی — وحید قریشی
سرو — سلیمان ندوی — معارف، مارچ
مالوہ کا ایک قدیم الشان شاعر۔ سید مبارک علی بلگرامی
حقیقت الحسن — معارف۔ جنوری
بہی — تمکین کاظمی — آجکل۔ اکتوبر
[illegible] (بشیر الحق دسنوی) معارف، جون

آتش سے ایک بہاری ادیب کی ملاقات (سید حسن) معارف، مئی
ٹونک کے دو قدیم کتب خانے (مسعود الحسن برکاتی) " اگست
جانشین شبلی — ایک عقیدت مند — فاران، جون
ادب، قوم پرستی اور لادینیت (جاوید اقبال) " مئی
اردو کی ایک قدیم مثنوی مصنفہ رنگین — " جنوری
طپش امروہوی — سید حسن مرتضیٰ — نیا دور " "
گوئٹے — [illegible] انصاری — علی گڑھ میگزین
عمر خیام کی صحیح تاریخ ولادت — شبلی بی کام — نگار، اگست
مولوی مدن کی سی — نثار احمد فاروقی — آجکل اپریل
کتب خانہ سالار جنگ میں اردو قلمی بیاضیں
اردو ادب کا ایک مجمل جائزہ (نصیر ہاشمی) ہماری زبان [illegible] ستمبر
مقدمہ اردو لغت — بابائے اردو — اردو جنوری
مکتوب محمد علی — چراغ راہ
تمثیل بر دوش فضا: ریڈیو ڈرا (عمیق حنفی) نیا دور، نومبر
لکھنؤ کے ادبی چوراہے — ناظم سیتاپوری — " مئی
بعض محاورات اور ضرب الامثال ([illegible] اثر) " جنوری
زحافات — شمس بریلوی — " مارچ
زبان اور تہذیب (احتشام حسین) " جنوری
الفاظ کا مزاج (غلام ربانی) اردو "
رومن اردو کے اصول املا (شان الحق حقی) انشا، جون
رسم الخط کی الجھن " " فروری
زبان کی بحث کا مسئلہ (عبداللطیف اعظمی) تحریک، مارچ
[illegible] (خفانی) ہماری زبان، ۱۸ اکتوبر

منیب قادری

# حکیم شریف خاں دہلویؒ کا ترجمہ قرآن

[illegible] ۱۹۶[illegible]ء میں مخدومی جناب [illegible] کیا تفسیر [illegible] نظر سے گزرا۔ جناب مرزا صاحب نے نہایت [illegible] غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے۔ [illegible] دہلوی کے ترجمہ قرآن کا ذکر کیا ہے اور [illegible] قرآن کا کوئی وجود نہیں ہے [illegible] اطلاع دی کہ [illegible] ہے کہ انہوں نے [illegible] کا ذکر کیا ہے جناب مرزا صاحب کو یہاں [illegible] مفتی صاحب [illegible] نہیں [illegible] ایک مفصل اور مسلسل [illegible] شائع ہو [illegible] میں حکیم شریف خاں کے ترجمہ قرآن کا نمونہ دیا گیا ہے یہ مضمون ۳۶-۱۹۳۵ء میں شائع ہوا [illegible] ریف خاں دہلوی کے ترجمہ قرآن کا ذکر پروفیسر حامد حسن قادری نے بھی اپنی کتاب "تاریخ داستان اردو" میں کیا ہے قادری صاحب لکھتے ہیں:[1]

"حکیم شریف خاں دہلوی نے ۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا تھا [illegible] کے سلسلے میں حکیم شریف خاں کا یہ کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے جو حضرت عبدالقادر دہلوی کے ترجمے سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے[2]۔ لیکن آج تک قلمی اور گمنام ہے۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی مرحوم (ف ۱۹۴۷ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا"

اس کے بعد قادری صاحب نے سورہ الحمد کی پہلی آیت کا ترجمہ بطور نمونہ درج کیا ہے اتفاق سے مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب نے بھی نمونہ میں اسی آیت کا ترجمہ دیا ہے مفتی صاحب کا مضمون قادری صاحب کی کتاب سے پہلے شائع ہوا ہے۔[3]

قادری صاحب کے بیان سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوئی کہ آیا انہوں نے حکیم محمد احمد مرحوم کے پاس ترجمہ دیکھا تھا یا نہیں لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے ایک گراں قدر مقالہ بعنوان "پرانی اردو

---

۱ تاریخ داستان اردو صفحہ ۱۴۴-۱۴۵ (طبع دوم آگرہ ۱۹۵۰ء)

۲ معلوم نہیں قادری صاحب نے یہ بیس سال پہلے کا اندازہ کس طرح قائم کیا ہے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں ہوا اس حساب سے حکیم شریف خاں کا ترجمہ ۱۷۷۰ء میں ہونا چاہیے اور یہ ترجمہ حکیم شریف خاں نے شاہ عالم ثانی کے حکم سے کیا ہے اور وہ ۱۷۷۰ء میں دہلی میں موجود بھی نہ تھا۔

۳ تاریخ داستان اردو کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں آگرہ سے شائع ہوا ہے۔

میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں" تحریر فرمایا ہے جو انجمن ترقی اردو کے علمی مجلہ "اردو" جنوری ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔ مولوی صاحب اس زمانے کے دوسرے ترجموں کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں "کہ اس زمانے میں ایک ترجمہ بادشاہ (شاہ عالم ثانی المتوفی ۱۸۰۶ء) کے ایما سے ہوا وہ دلی کے نامور طبیب حکیم محمد شریف مرحوم کا لکھا ہوا ہے یہ ترجمہ (قلمی) ہے اس وقت حکیم محمد احمد خاں صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے اور مولانا ابوالکلام صاحب کی وساطت سے ہمیں اس کی زیارت نصیب ہوئی۔ فاضل مترجم نے ترجمہ کے آخر میں جو عبارت تحریر کی ہے اس سے اس ترجمہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے" [1]

مولوی عبدالحق صاحب نے ترجمہ کی پوری عبارت نقل کی ہے جس میں حکیم محمد شریف خان نے لکھا ہے کہ میں نے یہ تفسیر قرآن (ترجمہ قرآن کی بجائے تفسیر قرآن لکھا ہے) شاہ عالم ثانی کے حکم سے لکھی ہے یہ ترجمہ فارسی عبارت میں لکھا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے پارہ الم کی ابتدائی آیات، سورۂ یونس کی ابتدائی آیات اور سورۂ فاتحہ کا مکمل ترجمہ بطور نمونہ نقل کیا ہے ہم بھی بطور نمونہ یہاں سورۂ الحمد کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

"ہر تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے، پالنے والا ہے تمام عالموں کو، بخشنے والا وجود کا آخرت میں، مہربان داخل کرنے بہشت کے سے، مالک دن قیامت کے کا، تصرف کرنے والا، اس دن جو چاہے گا کرے گا، خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں ہم اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں، اوپر بندگی تیری کے۔ دکھا تو ہم کو سیدھی راہ بیچ قول کے اور فعل کے اور اخلاق کے، راہ ان آدمیوں کی :۔۔۔ اور نہ اون گمراہوں کی" [2]

[1] "اردو" جنوری ۱۹۳۷ء ص ۲۲، [2] ایضاً ص ۲۴

اس ضمن میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ حکیم محمد شریف خاں دہلوی کی تاریخ انتقال میں بھی اختلاف ہے بعض نے ۱۲۲۲ھ م ۱۸۰۷ء [1] اور کسی نے ۱۲۳۱ھ م ۱۸۱۶ء تحریر کیا [2] لیکن یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں حکیم محمد شریف خاں کا انتقال ۱۲۱۶ھ م ۲-۱۸۰۱ء میں ہوا حکیم محمد شریف خاں کے مزار پر جو لوح کندہ ہے اس پر یہ کتبہ تحریر ہے [3]

ہذا مرقد شریف الحکما الحکیم محمد شریف خاں الدہلوی
دخل الجنۃ بلا حساب۔

حکیم محمد احمد خاں دہلوی نے حکیم محمد شریف خان کے انتقال کی تاریخ ۱۲۱۶ھ م ۱۸۰۱ء ہی مولوی عبدالحق صاحب کو بتائی جیسا کہ مولوی صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا ہے۔

[1] قاموس المشاہیر (جلد دوم) از نظامی بدایونی، حیات اجمل از قاضی عبدالغفار مراد آبادی اور نزہۃ الخواطر (جلد ہفتم)، از حکیم عبدالحی میں ۱۲۲۲ھ تحریر ہے۔

[2] تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمٰن علی میں ۱۲۳۱ھ تحریر ہے۔

[3] LIST OF MOHAMMADEN AND HINDU MONUMENTS OF DELHI VOL. III PP 42-43

آمنہ صدیقی

# مضمون نگاری

انیسویں صدی کے نصف آخر میں برصغیر ہند و پاکستان کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کے تحت جب "اعتدال، مصلحت وغیرہ" کو ترک کرکے "پیروی مغربی" کو مطمح نظر بنانے کا شیوہ عام ہوا تو آہستہ آہستہ زندگی کے تمام گوشوں [illegible] اس انقلاب کی روشنی کی کرنیں پھیل گئیں۔ مذہب سیاست تعلیم، ادب، غرض سماج کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اس انقلاب سے دوچار نہ ہوا ہو۔ پرانی قدریں متزلزل ہونے لگیں اور نئی روایات نے فروغ پایا۔ ان نئی روایتوں میں بڑا تنوع تھا۔ بڑی رنگارنگی تھی۔ یہ نئی روایات بھی زندگی کے کسی ایک شعبے یا حلقے تک محدود نہ تھیں بلکہ انھوں نے پوری سماجی زندگی کا احاطہ کر لیا تھا۔

ادب سماجی و سیاسی شعور کی تبدیلیوں کا ایک شفاف آئینہ ہوتا ہے۔ ایسا ادب نہ تخلیق ہوا ہے اور نہ تخلیق ہونا ممکن ہے جو براہ راست اپنے دور کے تجربات کا نتیجہ نہ ہو اور جس میں اپنے زمانے کا دل دھڑکتا اور انفاس زیر و بم ہوتے نظر نہ آتے ہوں۔ انیسویں صدی کے اس انقلاب کا ایک اہم اور نمایاں پہلو مغربی اثرات ہیں جو یوں تو آہستہ آہستہ اہل مغرب اور اہل ہند کے سیاسی اور تجارتی تعلقات کی بنا پر اٹھارہویں صدی ہی سے نظر آتے ہیں لیکن انگریزوں کے اقتدار اور ان کی فتوحات اور بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی کامیابی نے جب انہیں اس ملک کی قسمت کا مالک بنا دیا تو ان اثرات کا دائرہ عمل بھی وسیع ہو گیا۔ زبان، لباس، بود و باش اور افکار و نظریات سب ہی میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

مغربیت کے اثرات ہمارے ادب پر بھی پڑے اور اس طرح اردو زبان اور ادب نے ایک نئی منزل کا سراغ پایا۔ قدیم ادبی اصناف کا سختی سے جائزہ لیا گیا اور ان کو اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ ہمیشہ "گرمیٔ تغزل" کا رخ کرنے کے بجائے "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا پیغام دیا گیا۔ اس جائزے اور اس مشورے میں "خلوص" تھا۔ نیک نیتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ مشورے دینے اور جائزہ لینے والے بڑے زمانہ شناس تھے اور انہیں وقت کے تقاضوں کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ "مغربی افق" سے ہر لمحہ بڑھتی ہوئی "روشنی" کو بڑی امید کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ مشرق کی ترقی کا راز تقلید مغرب میں ہے کیونکہ مغرب نے ان بلندیوں کو چھو لیا تھا جنہیں بنی نوع انسان کی "معراج" کہا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ہمارا ادب "عشق و ہوس" کے تنگ و تاریک شبستانوں سے نکل کر "زمانہ شناسی" کی کھلی فضاؤں میں سانس لینے لگا اور انسانیت کی صحیح قدروں سے روشناس ہوا۔ یہ انقلاب یہ تغیر، یہ تبدیلی ادب کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں سے متعلق تھی۔ اس نے صرف ادب کے موضوعات (یا مواد) ہی کو متاثر نہ کیا بلکہ ادب کی ظاہری صورت، ٹیکنیک، اسلوب انداز یا طرز کو بھی بدل ڈالا۔ جہاں اظہار خیال کے قدیم سانچوں میں وسعت پیدا ہوئی وہیں کچھ نئے سانچے "مغربی ادب" سے بھی لے لئے گئے۔ ان نئی اصناف ادب میں سے کچھ کو جوں کا توں اور کچھ کو کسی قدر رد و بدل کے ساتھ اپنا لیا گیا۔ شاعری، تنقید، ناول، افسانے، ڈرامے وغیرہ پر مغربی ادب

کے مطالعے نے جو نگارشات [illegible] میں [illegible] زمانے [illegible] موقع نہیں
سردست تو اردو نثر کی اس نئی صنف کا ذکر کرنا ہے۔ جو مضمون یا ESSAY
کے نام سے رائج ہوئی اور جب [illegible] اس کا سہرا سرسید احمد خان کے سر
ہے جن کے اولین مضامین ESSAY رسالہ تہذیب الاخلاق
میں شائع ہوئے تھے۔

اردو میں ESSAY کے لئے کوئی ایک متعین لفظ
نہیں ہے۔ عام طور پر "مضمون" یا "مقالہ" کے الفاظ استعمال کئے
جاتے ہیں، جیسا کہ ظاہر ہے مقالہ کا جو مفہوم ہے [illegible] وہ لفظ
ESSAY کے مفہوم سے مختلف ہے۔ البتہ لفظ "مضمون" بڑی حد
تک قابل قبول ہے۔ دوسرے اردو کے پہلے باقاعدہ ESSAYIST
سرسید بھی اپنے ESSAYS کو لفظ "مضمون" ہی سے تعبیر کرتے
ہیں ہم بھی اس مقالہ میں لفظ "مضمون" کو انگریزی کے لفظ ESSAY کے
مترادف استعمال کر رہے ہیں۔ انگریزی لفظ ESSAY فرانسیسی زبان
کے ESSAI سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی "پہلی کوشش" کے ہیں۔
یہ لفظ پہلی بار فرانسیسی ادیب مونٹین MONTAIGNE نے اپنی
ایک خاص نوعیت کی تحریروں کے لئے استعمال کیا۔ مونٹین سولہویں صدی کا
ایک سیاست داں مفکر اور یار باش انسان تھا۔ سیاست اور یار باشی کے
ہنگاموں سے جب اس کی طبیعت اکتائی تو اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی
[illegible] یہاں آکر جب [illegible] اپنی تنہائی [illegible]
[illegible] ساتھی [illegible] یاد [illegible] تو اس نے وقت گزارنے
کے لئے [illegible] قسم کے [illegible] شروع کر دیے جن کو
[illegible] ESSAIS کا نام دیا۔ ان ESSAIS کی پہلی دو
جلدیں سنہ ۱۵۸۰ء میں شائع ہوئیں۔[1]

مانٹین سے پہلے بھی [illegible] کے نمونے ملتے ہیں۔ قدما میں یونانی
[illegible] اور [illegible] کے سیسرو کا نام اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے لیکن
ان لوگوں کی تحریریں مضمون نگاری سے قدرے مختلف ہیں۔ اس لئے یہ کہنا
[illegible] صحیح معنوں میں مضمون نگاری کی ابتدا مانٹین کے ہاتھوں ہی
ہوئی کیونکہ "مضمون" کا جو تصور آج دنیا میں رائج ہے اس کے اولین نقش
و نگار صرف [illegible] کے یہاں ملتے ہیں۔ مانٹین نے اپنے مضامین میں دنیا سے متعلق اپنے
مشاہدات و تجربات کو پیش کیا ہے اس کا نقطۂ نظر خالص انفرادی ہے اگرچہ
مانٹین [illegible] اس کے اپنے مضامین کوئی وقعت نہ رکھتے تھے اور وہ انہیں
[illegible] سمجھتا رہا لیکن [illegible] مضامین آگے چل کر لکھنے والوں
کے لئے نشان منزل ثابت ہوئے۔

اس ابتدائی خاکہ پر مستقبل میں جو عظیم الشان عمارتیں کھڑی کی گئیں وہ
دنیا کے ادبیات کا ناقابل فراموش حصہ ہیں ——— مانٹین تھا تو
فرانسیسی لیکن اپنے مزاج و ذہنی رجحانات اور ادبی تصورات کی بنا پر
وہ انگریزوں سے بہت زیادہ قریب تھا۔ اس خصوصیت کی بنا پر فرانس
سے زیادہ انگلستان میں اس کی [illegible] ادبی عبارت کی داد دی گئی انگلستان
کے علمی و ادبی حلقوں اور باشعور افراد نے مونٹین کی نگارشات کا بڑی خندہ
پیشانی سے استقبال کیا۔ بیکن انگلستان کا پہلا ادیب تھا جس نے مانٹین کے
مضامین کا گہرا مطالعہ کیا اور ان سے متاثر ہو کر خود بھی اس صنف میں طبع آزمائی
کی۔ بیکن کا پہلا مجموعہ مضامین مانٹین کی وفات کے صرف پانچ سال بعد
یعنی سنہ ۱۵۹۷ء میں شائع ہوا اور اس طرح فرانس اور انگلستان میں قریب
قریب ایک ہی زمانے میں مضمون نگاری نے رواج پایا۔ مانٹین اور
بیکن کے مضامین اپنے اپنے ملکی ادب کی تاریخ میں اولیت کا درجہ رکھتے
ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی ان کے مضامین خاص چیز ہیں اور ان دونوں ملکوں
میں ان کے بے شمار مقلدین پیدا ہوئے اور اس طرح مضمون نگاری نے ایک
باقاعدہ اور باوقار صنف ادب کی حیثیت اختیار کر لی۔ فرانس میں تو اس صنف

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں مضمون نگاری کی ابتدا کا سال ۱۵۷۱ء متعین کیا
ہے یعنی مانٹین نے اسی سال سے مضمون نگاری شروع کی [illegible] ESSAIS کی تین [illegible]

کی طرف اگرچہ کچھ زیادہ توجہ نہیں دی گئی لیکن پھر بھی وہاں لا بوائر اور اناطول فرانس جیسے عظیم مضمون نگار پیدا ہوئے۔ انگلستان میں مضمون نگاری کا عہد درخشاں اٹھارھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس صدی میں اسٹیل اور ایڈیسن۔ جانسن اور گولڈ اسمتھ جیسے ادیبوں نے مضمون نگاری کو نہ صرف یہ کہ ادبی لحاظ سے ایک بلند پایہ صنف ادب بنا دیا۔ بلکہ اس سے سوسائٹی کی اصلاح کے لئے بھی ایک موثر ذریعۂ اظہار کا کام لیا۔ انگلستان کے مضمون نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے جن مضمون نگاروں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ چارلس لیمپ، میکالے، لی ہنٹ اور ہیزلٹ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں جو مضمون نگاری کی حیثیت سے منفرد خصوصیات کے حامل ہیں۔ امریکی ادیبوں نے بھی اس طرف توجہ کی ہے اور ان میں بھی ایمرسن جیسے بڑے مضمون نگاروں کے نام ملتے ہیں۔

بادی النظر میں مضمون نگاری کا مفہوم کسی "موضوع" پر طبع آزمائی کرنا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی صحیح تعریف کے بارے میں کوئی بات دوٹوک طریقے سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ مختلف نقادان فن نے اس صنف ادب کی مختلف اور متنوع تعریفیں کی ہیں جن میں اکثر تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کے نزدیک مضمون ایک "ناپختہ" (UNDIGESTED) "غیر مرتب" (IRREGULAR) اور ذہنی اڑان ہے"۔ مرے (MURRAY) کی ڈکشنری میں مضمون کی یہ تعریف کی گئی ہے: "کسی خاص موضوع یا اس کے کسی پہلو کو مناسب طوالت کے ساتھ بیان کرنا۔" GRABB کی رائے ہے "مضمون ہر اس ادیب کے لئے موزوں ذریعہ اظہار ہے جس میں تحقیقات کو وسعت دینے کی لیاقت اور قوت موجود نہ ہو۔" ...... Bause کے نزدیک مضمون نگاری مشکل ترین لیکن دلچسپ صنف

ان مختلف اور متضاد نظریات سے صنف مضمون کی کوئی واضح اور جامع تعریف سامنے نہیں آتی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے اور ان تعریفوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون کے لئے پہلی شرط اس کا اختصار ہے اس پر تقریباً سب ہی نقاد فن متفق ہیں کہ مضمون کو مختصر یا "مناسب طوالت" کا حامل ہونا چاہئے اب یہ ظاہر ہے کہ کسی ادب پارے میں جس پر اختصار کی قید لگا دی گئی ہے کسی موضوع کا تفصیلی جائزہ لینا مشکل ہے، یا کسی موضوع کے ہر پہلو پر نظر کرنا اور اس کی جزئیات کو پیش نظر رکھنا ممکن نہیں۔ اس لئے کم الفاظ میں "مضمون" کی یہ تعریف کی جاسکتی ہے کہ "مضمون ایک ایسا ادب پارہ ہے جس میں اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے ادیب کسی بھی موضوع کے متعلق اپنے ان خیالات کا اظہار کرے جو موضوع پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالیں۔" لیکن مضمون کی اس تعریف کو بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں "موضوع" اور "اظہار خیال" کی نوعیت کی وضاحت نہیں ملتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس پر مفصل بحث کی جائے۔ ...... انسائیکلو پیڈیا میں مضمون نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا گیا ہے

"مضمون ایک مختصر نثری ادب پارہ ہے جس میں مکمل بحث کی بہ نسبت ذاتی آرا کو ترجیح دی جاتی ہے، محتاط جائزے کی نسبت تربیت یافتہ مشاہدے سے کام لیا جاتا ہے۔"

"ورلڈ لٹریچر" میں ایک اعلیٰ درجے کے مضمون کے لئے حسب ذیل خصوصیات ضروری قرار دی گئی ہیں۔

(۱) کسی اہم نتیجے کا حامل ہونا۔

---

World Literature Day ......

ب ۔ قاری کی ذہنی حدود کو وسیع کرنے کی خصوصیت۔
ج ۔ مضمون نگار کی شخصیت کی جاذب توجہ عکاسی ۔
د ۔ منفرد اسلوب، جو حسن کے متوازن احساس بذلہ سنجی، مزاح اور تخیل ۔ ۔ عبارت ہو۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے مضمون نگاری کی تکنیک اور اس کی حدود اور دوسری خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مضمون نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس کی شرط اولین ۔ اختصار ہے یہ ضروری ہے کہ مضمون مناسب طوالت کا ہو اگر وہ زیادہ طویل ہوگا تو پھر ممکن ہے وہ کتاب کی شکل اختیار کر لے ۔ اگر ایسا ہوگا تو مضمون نگار کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا ۔ اس اختصار کی قید کی وجہ سے کسی موضوع کا مکمل اور مفصل تجزیہ کرنا مضمون نگار کے لئے نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے کیونکہ تفصیلات و جزئیات کی طرف متوجہ ہونے سے مضمون کے حسن اختصار ۔ کا خون ہو جاتا ہے ۔ لہذا مضمون نگار کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ موضوع کا انتخاب کرتے وقت یہ خیال رکھے کہ مضمون اس کا احاطہ کر سکے گا کہ نہیں ۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مضمون کا کوئی بنیادی نکتہ یا خیال ہو جس پر پورے مضمون کی عمارت کھڑی کی جا سکے ۔ اگر ایسا نہ ہوگا یعنی بغیر کسی بنیادی نکتہ کو پیش نظر رکھے ہوئے قلم اٹھایا جائے گا تو اس صورت میں مضمون کا ۔ کامیاب مضمون ۔ بننا محالات میں سے ہے ۔ مضمون کا لکھنے والے کی شخصیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس میں عالمانہ بحث کی بہ نسبت ذاتی اظہار کو اہمیت دی جاتی ہے ۔ نیز مضمون نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں موضوع کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح قاری اور مضمون نگار کے درمیان دو دوستوں کی ۔ گفتگو ۔ کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے یوں بات مضمون کو عالمانہ سنجیدگی کے ماحول سے نکال کر کے بے تکلفانہ احساسات کے دائرے میں لے آتی ہے اسلوب کے لحاظ سے بھی مضمون کو انفرادیت کا حامل ہونا چاہئے ۔ عام تحریروں کے برعکس اس میں ۔ مکالماتی ۔ یا گفتگو کا انداز بے تکلفی کا ماحول پیدا کر دیتا ہے طنز و مزاح اور تخیل آرائی بھی بڑا کام دیتی ہے اور اسی طرح کے دوسرے ذرائع سے مضمون نگار کو اسلوب کے لحاظ سے ایک امتیازی شان پیدا کرنا ضروری ہے ۔

مختصر افسانہ نویسی اگرچہ مضمون نگاری کے بعد وجود میں آئی لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مضمون نگاری کی بہ نسبت مختصر افسانہ زیادہ مقبول صنف ادب ہے ۔ اردو کے افسانوی ادب کا ذخیرہ بھی مضمون نگاری کے مقابلے میں خاصا وسیع ہے تکنیک کے لحاظ سے یہ دونوں اصناف ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں ۔ جس طرح ایک مختصر افسانہ کسی خاص جذبہ واقعہ یا کردار سے متعلق ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح مضمون میں بھی یہ خواص پائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح ۔ وحدت تاثر ۔ بھی دونوں کے لئے بنیادی حیثیت اہمیت رکھتی ہے دونوں اصناف کسی موضوع کے تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہوتیں ۔ بلکہ وہ موضوع کے کسی ایک خاص پہلو سے متعلق ہوتی ہیں ۔ جس طرح مختصر افسانے کی بہت سی اقسام ہیں اسی طرح مضمون نگاری کو بھی موضوع اور مواد کے لحاظ سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ نقادان ادب نے مضمون کی بہت سی قسمیں بتائی ہیں ، مثلاً : ۔ ۔

۱ ۔ شخصی خاکہ ۔ کسی خیالی یا حقیقی کردار کی شخصیت ۔

۲ ۔ توضیحی مضمون ۔ (Descriptive Essay)
کسی مقام عمارت یا کسی اور چیز کی منظر کشی ۔ ۔

۳ ۔ ذاتی مضمون ۔ Familiar Personal Essay
جس میں انداز سے مصنف کا اپنی ذات کا اظہار ( لکھنے والا اپنی عادات خیالات اور پسند نا پسند کا بے تکلفانہ موضوعات پر خامہ فرسائی )

۴ ۔ فلسفیانہ مضمون Philosophical or Reflective Essay

مسائل حیات کا فکر انگیز بیان۔

۵۔ اداریے مضمون (Editorial Essay) صحافتی مضامین جو اکثر وقتی موضوعات پر لکھے جاتے ہیں، جو اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں محض خبروں پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ ان کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۶۔ تنقیدی مضمون (Critical Essay) ایسے مضامین جن میں کسی کتاب، فلم، ڈرامہ یا غنائی ترتیب کا جائزہ لیا جائے۔ اس میں مصنف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے زیرِ تبصرہ فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرے۔ فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں اس کا مقام متعین کرے اور اس جیسے دوسرے فن پاروں سے اس کا موازنہ کرے۔

۷۔ سائنٹفک مضمون۔ سائنس سے متعلق کسی موضوع پر غور و فکر کرنا یا محض اس کی تشریح پر اکتفا کرنا۔

۸۔ نیم بیانیہ مضمون (Semi Narrative Essay) ایسا مضمون جو زیادہ تر بیانیہ ہوتا ہے اس کا تعلق کسی قصہ وغیرہ سے نہیں بلکہ "خیال" سے ہوتا ہے۔

۹۔ سوانحی مضمون۔ کسی شخص کی زندگی کا جائزہ اس میں صرف واقعات کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی تشریح و توضیح کے ساتھ ان کے اثرات کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے

مضمون نگاری کی مندرجہ بالا نو اقسام کا اگر بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم بڑی حد تک غیر سائنٹفک ہے۔ کیونکہ ہر مضمون کے متعلق یہ فیصلہ صادر کرنا مشکل ہوگا کہ یہ کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر سرسید کے مشہور مضمون "امید کی خوشی" کا اگر مندرجہ بالا تقسیم کی رو سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بیک وقت بیک معروف یا ذاتی (Familiar Personal) فلسفیانہ (or Reflective) اور نیم بیانیہ (Narrative) مضمون نظر آتا ہے کیونکہ اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو متذکرہ تینوں اقسام کے مضامین میں ملتی ہیں لہٰذا اس مضمون کے لیے کسی ایک قسم کی تخصیص کرنا بہت مشکل ہے اسی طرح اردو میں بے شمار انگریزی اور اردو مضامین مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جو بیک وقت مضمون نگاری کی کئی اقسام کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اس بحث سے یہ مقصود ہے کہ مندرجہ بالا اقسامِ مضمون نگاری کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیتے ہوئے مضمون نگاری کی واضح اور جامع تقسیم کی جائے، جو پائیدار اور دوامی قدروں کی حامل ہو۔ مضمون نگاری کی بہترین تقسیم ورلڈ لٹریچر (World Literature) میں کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مرتب کے خیال میں مضمون تین طرح کے ہو سکتے ہیں:

ا۔ غیر رسمی (Familiar or Informal)

ب۔ رسمی (Formal)

ج۔ تنقیدی (Critical)

پہلی قسم کے مضامین یعنی غیر رسمی معلوماتی تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کا اولین مقصد تفریح یا دلچسپی کا سامان پیدا کرنا ہوتا ہے انہیں "دوستانہ گفتگو" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دوسری قسم کے مضامین یعنی "رسمی" کسی مسئلے یا موضوع کی تفسیر، تشریح، یا توضیح سے متعلق ہوتے ہیں یہ اکثر طویل اور مواد سے پُر ہوتے ہیں۔ سائنٹفک اور فلسفیانہ مضامین اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسری قسم تنقیدی مضامین کی ہے جو ادبی سرمائے کے تجزیے اور جائزے سے متعلق ہیں۔ مضامین کی اقسام کا یہ تجزیہ جامع ہے مندرجہ بالا اقسام ہر قسم کے مضامین کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ غرض مضمون نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو مصنف اور قاری کے درمیان افہام و تفہیم کی ایک خوشگوار فضا قائم کرتی ہے۔

نصیرالدین ہاشمی

# خواتین حیدرآباد دکن کی
# اردو مطبوعات

(آخری قسط)

علم خانہ داری میں سلیقہ شعاری اور خانہ داری کی مختصر صراحت کی گئی ہے علم خانہ داری دومسٹک سائنس کی فنی لحاظ سے پہلی کوشش ہے :-

من کی بیتا :- سلیقہ شعاری. خانہ داری پر مشتمل ہے. شمیم سوزن کاری اور گھریلو درزی میں سینے اور کشیدہ کرنے وغیرہ کا تذکرہ ہے

رسالہ جات دومسٹک سائنس : مسز فاطمہ صاحبہ کے چھ رسالے ہیں جو اسکول کے نصاب کے لئے مرتب کی گئی ہیں ۔

پہلے رسالہ میں جو پانچویں جماعت کے لئے ہے حفظان صحت وغیرہ کے ابتدائی مسائل ہیں اس کے بعد ساتویں آٹھویں نویں اور دسویں جماعتوں کے لئے چھ رسالے ہیں ۔ دومسٹک سائنس کے تمام مسائل پر حاوی ہیں ۔ اس میں آسان اور عام فہم زبان میں ضروری مسائل دومسٹک سائنس کا تذکرہ کردیا گیا ہے. حفظان صحت. خانہ داری. پرورش اطفال سیلون وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

## ادب اطفال

بچوں کے لئے حیدرآبادی خواتین نے اب تک جو کتابیں شائع کی ہیں وہ کہانیوں. افسانوں. تاریخ. عام معلومات وغیرہ پر مشتمل ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے :-

| کتاب | مصنفہ |
|---|---|
| ١- عرب اور عربستان | جہاں بانو نقوی |
| ٢- حیدرآباد | ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ |
| ٣- اشوک اعظم | سیدہ جعفری بیگم |
| ٤- میٹھی کہانیاں | خدیجہ بیگم |
| ٥- تاریخی کہانیاں | " |
| ٦- سائنس کی کہانیاں | " |
| ٧- نرالی کہانیاں | " |
| ٨- چاند بی بی ڈرامہ | " |
| ٩- ابوالحسن " | " |
| ١٠- نورجہاں " | " |
| ١١- دسرت " | " |
| ١٢- بچوں کے بتاشے نظم | مسز برکت رائے |
| ١٣- حکمران عورتیں | زینت ساجدہ |
| ١٤- محب وطن عورتیں | " |
| ١٥- الہ دین کا چراغ | نوشابہ خاتون |
| ١٦- سعید بلی | سعیدہ منظر |
| ١٧- عجیب ساتھی | عطیہ شوکت |
| ١٨- شہزادی | " |

یہ ہیں وہ اٹھارہ کتابیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں ان میں سے چار ڈرامے ہیں باقی کہانیاں اور تاریخی کتابیں وغیرہ ہیں۔ ڈرامے اسٹیج پر کرنے کے لئے لکھے گئے اور کامیابی کے ساتھ کئی دفعہ اسٹیج پر پیش بھی کئے گئے ہیں۔

## فنون مختلف

چند ایسی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن کو علاحدہ بیان کرنے کے بجائے ایک ساتھ بیان کرنا مناسب ہے۔ کتابیں حسب ذیل ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | اسرار سلیمانی | ام علی (طیبہ بیگم بلگرامی) |
| ۲۔ | سوتیلی ماں | رابعہ بیگم |
| ۳۔ | تحریر نسواں | صغرا بیگم |
| ۴۔ | اچھی لڑکی | راحت بیگم |
| ۵۔ | رنگین لباس | بیگم منیر الزماں |
| ۶۔ | انسداد گداگری | سارا بیگم |
| ۷۔ | تحفہ نمایش | حفیظ جمال بیگم |

صفحات بالا میں ایک سو سے زیادہ کتابوں کی صراحت کی گئی ہے۔ یہ ہیں وہ کتابیں جو گزشتہ پچاس سال کے عرصہ میں خواتین حیدرآباد نے لکھیں اور شائع ہو کر منظر عام پر پیش ہوئی ہیں۔

اس مقام پر وہ مقالے نظر انداز کئے گئے ہیں جو خواتین نے امتحان پی۔ ایچ۔ ڈی یا ایم اے اور ایم۔ ایڈ کے لئے مرتب کی ہیں مگر ہنوز وہ شائع نہیں ہوئے۔ البتہ جامعہ عثمانیہ سے جن خواتین نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ان کے مقالوں کا عنوان لکھ دیا جاتا ہے تاکہ ان مقالوں کے عنوان کا علم ہو جائے۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ | فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی نثر | جامعہ عثمانیہ |
| ۲۔ سیدہ جعفر | اردو انشائیہ | " |
| ۳۔ خالدہ یوسف | اورنگ آباد کے اردو شعراء | " |
| ۴۔ شریف النساء | ابوطالب کلیم کی حیات اور شاعری | جامعہ عثمانیہ فارسی |
| ۵۔ ناصرہ فضل اللہ | نقش ہندی خاندان | " فلسفہ |
| ۶۔ فاطمہ شجاعت | مولانا حالی | " عمرانیات |
| ۷۔ ثمینہ شوکت | چند قطب شاہوں کی حیات اور شاعری | " " |

شعبۂ سائنس کی جن طالبات نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہیں وہ یہاں نظر انداز کی گئی ہیں۔ کبھی آئندہ ان پر اظہار ہو سکتا ہے۔

گرو وپیش۔

## انڈو پاک مشاعرہ (ڈھاکہ)

۲۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو ڈھاکہ میں علی گڈھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک انڈو پاک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں ہندو پاک کے مقتدر اور مشہور و معروف شعرائے کرام نے شرکت کی۔ بھارت سے ستوز سکندر پوری۔ محرم لکھنوی۔ طرزی۔ زیدہ کاشانی۔ اور مغربی پاکستان سے راز مراد آبادی۔ ثاقب زیروی اے۔ ڈی۔ اظہر۔ اقبال صفی پوری۔ منظر ایوبی۔ ادیب بھارنپوری شان الحق حقی۔ سراج الدین ظفر۔ تابش دہلوی۔ اور رئیس امروہوی نے شرکت کی۔ بعد میں یہ تمام شعراء چاٹگام تشریف لے گئے اور وہاں ۲۴ اکتوبر کو مشاعرہ ہوا۔

# نقد و نظر

## غدار

کرشن چندر کا یہ نیا ناول ۱۹۴۷ء کے فسادات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ فسادات کا موضوع اب پرانا ہو چکا ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے" جیسی درجہ اول کی تصانیف کے علاوہ خود کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ "ہم وحشی ہیں" منظر عام پر آ چکا ہے جس کے دو افسانے "پشاور ایکسپریس" اور "امرتسر آزادی سے پہلے آزادی کے بعد" بالخصوص بہت مقبول ہوئے جو دوران فسادات میں لکھے گئے تھے۔ "غدار" بھی "امرتسر آزادی سے پہلے، آزادی کے بعد" کی ایک پھیلی ہوئی صورت معلوم ہوتا ہے جس کا مرکزی خیال یہی ہے کہ "ہم وحشی ہیں" جیسا کہ خود اس ناول کے خاص کردار بیج ناتھ نے ایک موقع پر کہا کہ

> "اس وقت میں اکیلا تھا اور جنگل میں ایک لٹتے جانور کی طرح اپنی جان بچانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اور اپنے آپ کو بے حد اناڑی پا رہا تھا۔ جنگل سے ناطہ تو کئی ہزار برس سے چھوٹ چکا تھا اور تہذیب کی پتلی جھلی کو میں نے کبھی کریدکر نہ دیکھا تھا۔ آج یہ جھلی اتفاق سے، حادثات سے، تاریخ کے کردار سے پھٹ گئی تھی اور اندر سے جنگل نکل آیا تھا۔"

ناول ادبی حیثیت سے قطع نظر کرکے، اپنے مقصد کے اعتبار سے (جس کی وضاحت افتتاحیہ میں کرشن چندر نے کر دی ہے) کامیاب ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لئے جن کی ذہنیت پست اور علم سطحی ہو اور جو اپنی جہالت اور تنگ نظری کے باعث ۱۹۴۷ء کی خوں ریز اور لرزہ خیز داستان کو ہر لمحہ دہرانے کے درپے رہتے ہیں، ان واقعات کی منظر کشی کرکے راہ راست دکھانے کی ایک مفید کوشش ہے لیکن ادبی حیثیت سے غدار کسی اہمیت کا حامل نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو اس کا کوئی پلاٹ ہے نہ کہانی، پورا ناول مارکاٹ، چیخ، پکار، اغوا، عصمت دری کے مناظر کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو لرزہ خیز واقعات کا شکار ہوتا ہوا پاکستان سے ہندوستان پہنچ جاتا ہے۔ چناں چہ ناول کا ہر باب ایک مختصر افسانہ ہے اور اس کو کہیں سے بھی پڑھا جائے کوئی خاص الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ کرداروں میں ایک کے علاوہ سارے کردار برائے نام ہیں۔ عام طور سے تو کردار ہیں ہی نہیں صرف MOB VIOLENCE ہے۔ مناظر کی عکاسی اپنے تاثر کے اعتبار سے خاصی کامیاب ہے البتہ شروع سے آخر تک جذباتیت کا ایک طوفان ہے جس کی رو کسی بعض وقت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ واقعات ناقابل یقین سے ہو جاتے ہیں مثلاً ایک قافلہ پر جب حملہ ہوتا ہے جس میں بیج ناتھ (ناول کا واحد اہم کردار) بھی شریک ہے اور مارکاٹ شروع ہو کر ایک آدمی اس کے سینے پر بھی بلم رکھ دیتا ہے تو یہ صرف اتنا کہہ کر بچ جاتا ہے۔

"کیا قسمت ہے ہماری بھی ساری زندگی کمیونسٹ
بن کر پاکستان کے لئے پروپگنڈا کرتے رہے۔
مسلمانوں کے حق آزادی کے لئے لڑتے رہے اور
آج جب پاکستان بن گیا تو یہ ظلم ہمارے ہی سینے
پر رکھا جا رہا ہے"

یہ بات MOB PSYCHOLOGY کے
[illegible] خلاف ہے۔ ایسے موقع پر کون کسی کی سنتا ہے
[illegible] طرح واقعات کی منظر کشی کرتے ہوئے مہاجر کیمپ میں ایک اغوا
[illegible] لڑکی کی عصمت دری کے لئے کیو کا ذکر اور کیو کے ایک شخص کا
[illegible] کہ یہاں SEX کا راشن ملتا ہے کچھ ایسی باتیں ہیں جو فسادات
[illegible] پیش نظر بھی قابل قبول نہیں۔

بعض مقامات پر ایک مخصوص نظریے کے پروپگنڈے کا
[illegible] بھی ہوتا ہے۔ المختصر یہ ناول خود کرشن چندر کے ناول "ایک
[illegible] ہزار پروانے" کے برابر بھی نہیں پہنچ سکا۔ (بدر عالم فاروقی)[۹۴]

# جاڑوں کی چاندنی

مصنف : غلام عباس

ناشر : سجاد اینڈ کامران۔ ۷/۱ ایچ بلاک۔ نمبر ۶
پی / ای / سی / ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹۔

"آنندی" کی اشاعت کے بعد بہت کم لوگ ہوں گے جو
[illegible] عباس سے واقف نہ ہوں۔ یہ افسانہ صرف انہیں کی اعلیٰ تخلیق نہیں
[illegible] اردو افسانے کی بھی آبرو ہے۔ "جاڑوں کی چاندنی" عباس صاحب
[illegible] تازہ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔

"جاڑے کی چاندنی" چودہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ غلام عباس
[illegible] انداز فکر دیگر افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔ وہ زندگی کی ان پوشیدہ
[illegible] کو بڑی فنکاری سے بے نقاب کرتے ہیں جن پر ہماری تہذیب

اور معاشرے نے پردے ڈالے ہوئے ہیں۔

انہوں نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے بلکہ بڑی
توجہ سے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں
کے لئے مخصوص قسم کے کردار منتخب کرتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت بھی
عجیب ہے کہ ان کے کردار ہمارے گلی کوچوں میں پھیرے والے لوگ
دفتروں میں بیٹھنے والے بابو، سڑکوں پر ٹھیلے لگانے والے معمولی آدمی
ہیں جن میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی اور جو کسی چونکا دینے
والی خصوصیت کے حامل نہیں ہوتے۔

عباس کے افسانوں کے پلاٹ بھی اپنے اندر یہ خصوصیت رکھتے
ہیں کہ ان میں "آپ بیتی" کا رنگ پایا جاتا ہے البتہ ان پلاٹوں
اور ان کرداروں سے وہ بڑا مفید کام لیتے ہیں کہ ان کے سہارے سماج
کے ناسوروں پر کچھ اس طرح سے نشتر زنی کرتے ہیں کہ اثر وقتی طور
پر نہ ہو بلکہ ہمیشہ قائم رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے افسانوں کا اختتام کچھ نامکمل
سا رہ جاتا ہے اور ایک قسم کی تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے در اصل
تشنگی کا یہ احساس ہی ان کے افسانوں کی تکمیل اور ان کی کاوشوں کا
مقصد ہے۔ افسانہ ختم کرتے ہی قاری کے ذہن میں کوئی نہ کوئی سوال
ضرور ابھرتا ہے، اور یہ سوال ہی درحقیقت وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو
عباس نے کہنا چاہا لیکن نہیں کہا۔ بھیئے والے کو جب محلہ سے پیٹ
کر نکال دیا جاتا ہے تو قاری اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کا گناہ
کیا تھا۔ بردہ فروش کو پڑھ کر ایک بڑا اہم مسئلہ سامنے آتا ہے کہ ریشماں
باوجودیکہ مجرمانہ زندگی سے بچنا چاہتی تھی کیوں نہ بچ سکی۔ "سایہ"
میں ٹھیلے والے کا غریب ذہن صرف اس لئے فکرمند ہو جاتا ہے کہ وہ سماج
کے غیر منصفانہ اقدام کے باعث پردے کے پیچھے ایک سائے کی زندگی
کو اجڑتا ہوا محسوس کرتا ہے چنانچہ محض انسانی ہمدردی کا جذبہ اس کی
رات کی نیند اچاٹ دیتا ہے۔ "بھنور" میں انہوں نے ایک انتہائی الم
انگیز مسئلہ کو چھیڑا ہے کہ ایک طوائف اگر اپنی گناہ گار زندگی سے بچنا بھی چاہتی

ہے تو سوسائٹی اسے کس کس طرح ناکام بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ غرض یہ کہ غلام عباس کا ہر افسانہ اپنے اندر ایک آرٹس اور تعمیری مقصد لئے ہوئے ہے۔ (۶۰؍) (بدر عالم فاروقی)

---

## مکتبہ جامعہ تعلیم ملی (ملیر سٹی کراچی) کی مطبوعات

جامعہ تعلیم ملی نے نوخواندہ بالغوں کے لئے کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے قابل تعریف کارنامہ ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) اردو نظمیں (مرتب سبطین احمد) یہ اردو کے مشہور شاعروں مولوی اسمٰعیل میرٹھی، مولانا حالی، نظیر اکبر آبادی، میر انیس، جوش ملیح آبادی، اکبر الہ آبادی، اختر شیرانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا شبلی اور آنند نرائن ملا وغیرہ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مرتب نے خاص طور پر ایسی نظمیں منتخب کی ہیں جن کی زبان آسان ہو۔ تاکہ نوخواندہ لوگوں کو ان کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ مشکل الفاظ کے معانی حواشی میں جا بجا دیئے گئے ہیں ہر نظم کی ابتدا میں توضیحی اشارات بھی ہیں جن سے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

۲۔ آثار قدیمہ (عبدالحفیظ خاں) یہ کتاب پاکستان کے آثار قدیمہ کے بارے میں ہے۔ متعلقہ معلومات کو تو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے لیکن انداز بیان میں قدرے بے سلیقگی پائی جاتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ بعض جگہ غلط بھاری بھرکم "الفاظ" استعمال کئے گئے ہیں بلکہ فارسی اشعار بھی کئی جگہ درج ہیں۔ اگر حواشی میں معنی لکھ دیئے جاتے تو مناسب ہوتا۔ کتاب میں چند تصویریں بھی ہیں۔

۳۔ صحت خانہ (سید احمد علی) یہ کتاب مریضوں کی پرورش، ان کی بیماریوں اور علاج وغیرہ کے بارے میں ہے۔ مصنف نے ان کی ترتیب پر بڑی محنت کی ہے اور موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔

۴۔ خواجہ حسن نظامی
۵۔ شوکت تھانوی

یہ دونوں کتابیں سید ابوالخیر کشفی نے لکھی اور مرتب کی ہیں۔ ابتدا میں مصنفین کے حالات زندگی ہیں اور بعد میں ان کی تحریروں کا انتخاب۔

۶۔ قوموں کا بھائی چارہ (آغا محمد اشرف) یہ ایک دلچسپ سفرنامہ ہے جس میں آغا صاحب نے کراچی سے نیویارک تک کے سفر کی روداد بیان کی ہے اس میں کئی اہم ملکوں اور شہروں کے بارے میں ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو پڑھنے والے کی معلومات میں خاصہ اضافہ کرتی ہیں۔

۷۔ رسول پاک (عبدالحفیظ خاں) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مبارک بیان کئے گئے ہیں۔ جا بجا شعر کے استعمال اور شاعرانہ نثر نے اس میں ادبی حسن تو پیدا کر دیا ہے لیکن مقصد پورا نہیں ہوتا جس کے لئے یہ لکھی گئی۔ نوخواندہ لوگوں کو اس کے سمجھنے میں خاصی دقت ہوگی۔ حواشی میں مشکل الفاظ اور اشعار کے معانی لکھ دیئے جاتے تو بہتر تھا۔

۸۔ ہماری دنیا (شمس الضحیٰ) یہ دنیا کیسے بنی؟ اس کی حقیقت کیا ہے اس میں زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟ یہ اور اسی قسم دوسرے سوالوں کے جواب اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔ چند تصویریں بھی ہیں۔

۹۔ ہمارا جسم (عبدالحفیظ خاں) اس میں انسانی جسمانی نظام کی کیفیت کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

---

یہ تمام کتابچے اچھے کاغذ پر ٹائپ میں چھاپے گئے ہیں۔ کتابچہ آٹھ آنے کا ہے اور صفحات ۳۲ ہیں۔

بقیہ:

# اداریہ

(بسلسلہ صفحہ)

ہوگی ایک ایسی سچائی کا اعتراف ہے جس کے اظہار کی جرأت فی زمانہ کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔

تحریک پاکستان اور تحریک تحفظ اردو دراصل ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سے قومی انداز پر سوچنے والا طبقہ نہ صرف خود اس حقیقت کا منکر ہوا بلکہ قومیت اور زبان کے رشتوں کو مٹانے کی کوششوں میں مصروف رہا۔ ہم جانتے ہیں کہ نئی انقلابی حکومت نے اس قسم کے قوم کش رجحانات کا سختی کے ساتھ سدباب کیا ہے، اس رجحان کی موجودگی سے بھی یقیناً ہمارے قائد انقلاب صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں بالقابہ بے خبر نہ ہوں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اتحاد قومی کا یہ اہم وسیلہ (اردو زبان) اس دور عمل میں بے توجہی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس طرف توجہ دلانے میں محترمہ فاطمہ جناح نے پہل کی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صدا پر لبیک کہنے والی آواز کس گوشے سے بلند ہوتی ہے۔

---

بقیہ:-

# ہمارا فرض

(بسلسلہ صفحہ)

ایک نئی مملکت کی تخلیق کی گئی تھی، وہی اردو آج مولوی عبدالحق سے زیادہ نحیف و نزار اور معذور و مجبور بنا دی گئی ہے۔ ایسے خوفناک اور حوصلہ شکن حالات میں اردو یونیورسٹی کی بنیاد کی یہ افتتاحیہ تقریب ہزار غنیمت ہے! اسی لئے بابائے ملت کی عزیز بہن محترمہ فاطمہ جناح نے اس موقع کی اہمیت کے پیش نظر ایک خاص پیغام دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ:-

"اردو یونیورسٹی کے قیام کی تحریک شروع کرنے والوں کو میں اس موقع پر مبارکباد دیتی ہوں۔ انہوں نے قائد اعظم اور قوم کی ایک آرزو کو پورا کیا ہے۔ ہماری منزل آزادی کے سلسلہ کی یہ ایک عظیم تقریب ہے۔"

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر [illegible] سیف الدین نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ حقیقی جمہوریت کی جانب یہ ایک اہم قدم ہے۔ اس نامکمل کام کو پورا کرنے کے لئے، قائد اعظم کی امید کو بر لانے کے لئے، ملک کو آزادی کی صحیح راہ پر لانے کے لئے، آئیے ہم سب متحد ہو کر اردو یونیورسٹی کو کامیاب اور مستحکم بنائیں۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنی جدید تاریخ لکھیں۔ (روزنامہ ملت گجراتی ۳ اکتوبر ۶۰ء)

---

انجمن ترقی اردو پاکستان

خطبات عبدالحق

بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لیکچروں کا مجموعہ ہے پہلے یہ کتاب انجمن نے دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی تھی مگر وہ ایک مدت سے ختم ہو کر کمیاب ہوچکی ہے، اور اس کے نسخے بمشکل دستیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ملک میں اس کی بہت مانگ تھی اس بنا پر یہ نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مطبوعہ خطبات کے علاوہ بعد کے خطبات اور بعض تقریریں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے۔ ۴۰۰+۲۱ صفحات، لکھائی چھپائی خوش نما کاغذ اعلیٰ قسم کا لگایا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ساڑھے چھ روپے۔

سب رس۔

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ء اس کا سنہ تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جست وجو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

نقوش الاردو۔

انجمن ترقی اردو کے رسالہ' اردو کے سی سالہ پرچوں سے بہترین مضامین کا بہترین انتخاب ہے جسے انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی کی یادگار میں مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے اور ... اور عمدہ معلومات سے پر ہیں۔ کتاب کی جان دو مضامین ہیں (۱) ... نطشے اور اقبال از ڈاکٹر عبدالحکیم (۲) نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

اردو اکیڈیمی سندھ۔ مولوی مسافر خانہ۔ بندر روڈ کراچی

Regd. S. No 1138 — Phone: 327
Fortnightly **QUOMI ZUBAN** Karachi

## مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

**روایت کی اہمیت۔**

از ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ یہ کتاب اردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے ۔ اس میں روایت کی اہمیت ، اردو شاعری میں گل و بلبل کے اشارے ، دلی کا دبستان شاعری ۔ اردو شاعری میں حب الوطنی کی روایت اور اردو تنقید میں روایت اور تجربے کے ایسے پر مغز اور خیال افروز مقالات شامل ہیں جن سے اردو ادب کے تاریخی مد و جزر کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے مختصر الفاظ میں یہ تحقیقاتی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے ۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے ۔

**اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔**

موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام نے جو قابل قدر حصہ لیا اور اسے اس قابل بنایا کہ آگے چل کر وہ ایک مہذب زبان کی حیثیت حاصل کرسکے اس موضوع پر ایک معلومات افزا مقالہ ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خاص انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے تیسرا ایڈیشن ۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ۔

**کلیات ولی ۔**

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی گجراتی کا مکمل دیوان نسخوں سے مقابلہ کرکے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے مرتب کیا ہے مع مقدمہ و فرہنگ الفاظ ۔ تیسرا ایڈیشن قیمت پانچ روپے ۔

ملنے کا پتہ

**اردو اکیڈیمی سندھ ۔ مولوی مسافر خانہ ۔ بندر روڈ کراچی**

قاری عبدالوحید منیجر انجمن پریس نے چھاپ کر دفتر انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ کراچی سے شائع کیا
قیمت فی پرچہ :- چار آنے ۔ قیمت سالانہ :- پانچ روپے ۔
مدیر :- مشفق خواجہ

قومی زبان

27 DEC 1960

# سفینہ غزل

ارتضیٰ عزمی

◎

ے شیرازہ محبت کا بکھرنے نہ دیا
[illegible] اندیشۂ راحت بھی گذرنے نہ دیا

منزل کا نشاں ذوق سفر نے نہ دیا
دھوکا بھی کسی راہگذر نے نہ دیا

وحشت کی قسم تیرے تبسم کی قسم
حال دل بیتاب سنورنے نہ دیا

کل سے مرے دل پہ وہ عالم گذرا
سرا ساتھ ذرا میری نظر نے نہ دیا

کر ہو گئے ہم اور بھی ساحل سے قریب
ھوا جو ہمیں طوفاں نے ابھرنے نہ دیا

ون ہم نے کیا جس کے لئے دل کا لہو
تبسم بھی ہمیں اس گل تر نے نہ دیا

میری محبت میں بہت کام آئی
منزل کا پتہ مجھکو خضر نے نہ دیا

آئی وہاں آشفتہ بیانی میری
[illegible] کچھ عرض ہنر نے نہ دیا

[illegible] دیوار کی یاد
مرے دل نے کہیں مجھکو ٹھہرنے نہ دیا

[illegible] شہر میں کس کس عنوان سے آئے لیکن
[illegible] مژدہ کبھی دیوار نے در نے نہ دیا

[illegible] سارا جھگڑا
من کافر کی محبت ہی نے جینے نہ دیا

سرہ کرتے ہیں یہ میری غزل پر عزمی
[illegible] موضوع سخن [illegible] نظر [illegible] نہ دیا

[illegible] ریحانی

◎

[illegible] آیا نظر آبشاروں کا عالم
تو یاد آ گیا اشکباروں کا عالم

کہاں جا کے ڈھونڈیں متاع مسرت
ہر اک سمت ہے غم کے ماروں کا عالم

گلستاں میں ہم کو خیاباں خیاباں
دکھائی دیا دلفگاروں کا عالم

الگ ہر دو عالم سے ہے درحقیقت
ترے عشق کے وضعداروں کا عالم

نگاہوں میں وہ پیکر رنگ و بو ہے
کہ جس پر تصدق بہاروں کا عالم

ہر اک گام پر خواہش منزل نو
یہ ہے آپ کے بے قراروں کا عالم

ہر اک ذرہ ہے رشک مہر درخشاں
کبھی دیکھ تو خاکساروں کا عالم

کبھی جل نہ جائیں حجابات خلوت
مری آہ میں ہے شراروں کا عالم

دکھائی دیا مجھکو روے حقیقت
جو دیکھا کبھی ماہ پاروں کا عالم

کرشمہ ہے ریحانی ان کی ہنسی کا
بہاروں کے اندر بہاروں کا عالم

انجمن ترقی اردو پاکستان کا

پندرہ روزہ


# قومی زبان


نگران:- بابائے اردو

جلد ۔ ۔ ۔ ۱۷

شمارہ ۔۔ ۔ ۱۰، ۱۱ و ۱۲

۱۶ر نومبر تا ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۰ء


## اس شمارے میں



بابائے اردو

# مخالفت بھی باعثِ رحمت ہے

اس مرتبہ میں نے اردو یونیورسٹی کی تجویز پیش کی، تو اس کی تائید میں کسی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آئی، مجھے سب سے زیادہ توقع عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق طلباء سے تھی، ان کے سالانہ جلسے میں جو خالقدینا ہال کراچی میں مئی ۱۹۵۹ء میں میری صدارت میں ہوا تھا، میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں خاص طور پر ان کو اس طرف متوجہ کیا تھا اور کہا تھا،

"اے عزیزو اب تمہارا یہ فرض ہے اور غیرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تم نیم بسمل جامعہ عثمانیہ میں جو حیدرآباد دکن میں تڑپ رہی ہے نئی روح پھونک کر یہاں اسے زندہ اور توانا کر دکھاؤ، ایک ہندو علم دوست نے ساگر میں تن تنہا ایک ہندی یونیورسٹی قائم کر دی، تو آپ جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کی آغوش میں پرورش پا کر علم و دانش حاصل کی ہے اور آپ کے جامعہ کے ہمدرد جو یہاں سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں کیا ایک اردو یونیورسٹی قائم نہیں کر سکتے۔"

لیکن افسوس ہے کہ کسی نے میری تائید نہ کی اور اب تک اس جماعت نے اس اہم تجویز کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، اس کے بعد دوسری جماعت جس سے مجھے بڑی توقع تھی، وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ہے وہ بھی بالکل خاموش ہے۔

سب سے بڑی اور قوی جماعت طلبہ کی ہے اور میرا خیال تھا کہ مغربی پاکستان کے طالب علم اس تجویز میں میرا ساتھ دیں گے کیونکہ یہ یونیورسٹی خاص انھی کے لئے ہے لیکن مجھے سخت حیرت ہے کہ سوائے بزم اردو کے چھوٹے بچوں کے طلبہ کے کسی اور طبقے نے کچھ

نہیں کیا، ان چھوٹے بچوں نے دو سو بہتر (۲۷۲) روپے اپنے طور پر جمع کر کے
یونی ورسٹی کے لئے پیش کئے اسی طرح کوئٹہ کے چند طالب علموں کی ہمت قابل
تحسین ہے کہ انہوں نے از خود رضاکارانہ ایک ہزار ایک روپیہ جمع کر کے اردو
یونی ورسٹی فنڈ میں داخل کیا۔ کراچی جیسے عظیم شہر میں چالیس پچاس ہزار
طالب علم ہیں اگر وہ چاہتے تو ایک معقول رقم اردو یونی ورسٹی کے لئے جمع کر سکتے
تھے، اس بارہ میں مایوسی مجھے اساتذہ کی طرف سے ہوئی۔ اساتذہ کی جماعت
[illegible] وہ با اثر اور قدر دان علم و ہنر ہے، وہ اگر اس طرف توجہ کرتے تو
اب تک یونی ورسٹی کے لئے بہت کچھ کام ہو جاتا، صرف ایک استاد نے [illegible]
[illegible] با اور شریف انسان ہے، صاحب علم ہے مسلم
[illegible] ادب [illegible] ثقافت، انگریزی اور اردو میں اس کی
نظر وسیع [illegible] زبان سے محبت رکھتا ہے، ہماری قومی زبان کو ایسے
ہی بے لوث خادموں کی ضرورت ہے۔ اگر میری زندگی میں اردو یونیورسٹی
کا کام شروع ہو گیا تو سب سے پہلے میں اس کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور
اسے اپنے ہمراہ یونی ورسٹی میں لاؤں گا اور کہوں گا کہ اب آپ آزادی سے
یہاں کام کیجئے اور اس یونیورسٹی کے بنانے میں مدد دیجئے۔

ان حالات سے مجھے بہت مایوسی تھی لیکن جب ایک دوست نے
مجھے یہ خبر سنائی کہ ہماری یونی ورسٹیوں کے بعض فاضل پروفیسر جو اردو
زبان و ادب کے رہنما اور اس کی تعلیم کا فرض انجام دیتے ہیں، اردو
یونی ورسٹی کی تجویز کے مخالف ہیں[1]، تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور مجھے یقین
ہو گیا کہ اگر اب نہیں تو کچھ عرصہ بعد ضرور کامیابی ہوگی، بے التفاتی ایسی مہم
کے لئے بہت خطرناک ہوتی ہے، اگر ہم تقریریں کریں، مضامین لکھیں، پمفلٹ
اور کتابیں چھاپیں اور طرح طرح سے اپنے مقصد کی اشاعت کریں اور
کوئی توجہ نہ کرے تو ناکامی یقینی اور قطعی ہے لیکن اگر مخالفت پر کچھ لوگ آمادہ
ہو جائیں تو اس وقت کامیابی کی کچھ امید ہو جاتی ہے،

[1] ان میں سے ایک صاحب تو اخباری بیان بھی جاری کر چکے ہیں۔

کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی ہی
سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقویت کا راز بہت کچھ اس
کی مخالفت میں ہے، مخالفت بیدار کرتی ہے، عملی قوت کو ابھارتی ہے اور
انسان کے ان جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدتوں سے پڑے تھے، مخالفت [illegible]
امتحان ہے، تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص اور
استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی اور تحریک سرسبز اور کامیاب
ہوگی۔ مخالفت ہی نے پاکستان بنایا ورنہ کیا اتنی جلدی بن جاتا؟
اور مخالفت ہی کے طفیل اردو زبان کو ترقی نصیب ہوئی۔

میں اب ان فاضل حضرات کے خیالات کا منتظر ہوں جو میری
رہنمائی کریں گے اور پھر مجھے ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

---

## اردو دوستی کی ایک روشن مثال

بابائے اردو اس پیرانہ سالی میں اردو یونی ورسٹی کی جو تحریک لے کر
اٹھے ہیں، وہ ابھی ابتدائی مراحل اور اہمیت کے اعتبار سے اس لائق ہے
کہ اہل وطن ہر ممکن طریقے سے اس تحریک کو تقویت پہنچائیں۔ کیونکہ یہ مجوزہ یونیورسٹی
ہماری تہذیبی و سماجی قدروں کی محافظ ہوگی، اور قومی تعمیر میں اہم فریضہ
ادا کرے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے تقریباً تمام بہی خواہ اور
اردو دوست اس یونیورسٹی کے قیام کو وقت کا اہم تقاضا سمجھتے ہیں ---
لیکن یہ ہمدردی محض زبانی ہے، قوم کی طرف سے جس عملی تعاون کی توقع تھی
وہ ابھی پوری نہیں ہوئی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اردو یونی ورسٹی جیسے
مفید اور نیک مقصد ادارے کے قیام کے لئے ہماری قوم نے ابھی تک کچھ
نہیں کیا! لیکن ہم ان حالات سے مایوس نہیں ہیں کیونکہ بقول بابائے اردو

"اردو یونیورسٹی بن کے رہے گی یہ خود قضا و قدر کا
منشا ہے، سوال صرف دیر سویر کا ہے۔"

ہماری نئی پود نے اس تحریک میں جس طرح دلچسپی لی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابائے اردو کی یہ تجویز جلد ہی عملی تشکیل اختیار کر لے گی، کچھ مہینے ہوئے کہ کراچی کے بچوں کی ایک انجمن "بزم امروز" نے کچھ رقم جمع کر کے اردو یونیورسٹی فنڈ میں دی تھی یہ بزم اب بھی سرگرم عمل ہے، اور اس کے ارکان بڑی جان فشانی سے اس نیک مقصد کے لئے روپیہ جمع کر رہے ہیں، اسی طرح گذشتہ ماہ قصبہ کوٹری کے طالب علموں نے ایک ہزار روپے جمع کر کے یونی ورسٹی فنڈ میں داخل کئے، اور اب اس سلسلے کی روشن ترین مثال یہ ہے کہ مشرقی پاکستان سے ایک نوعمر طالب علم شفیع ادیبی نے پانچ پانسو روپے کی دو قسطیں ارسال کی ہیں اور لکھا ہے "ابھی اور رقم وصول کر کے بھجواؤں گا" ——— یہ نوعمر طالب علم ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے کہ اس نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اتنی رقم جمع کر لی، اس طالب علم نے اردو زبان سے محبت کا جو ثبوت پیش کیا ہے، وہ دوسروں کے لئے سبق آموز ہے، اگر اسی طرح دوسرے طالب علم بھی اپنے جذبہ خدمت کا عملی ثبوت دیں تو اردو یونی ورسٹی بہت جلد قائم ہو سکتی ہے، ہمارے طالب علم اس نیک مقصد کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں، مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ ان میں سے کتنے "شفیع ادیبی" ہیں!!!

---

# کویت میں اردو اسکول کا قیام

ہند و پاکستان سے باہر اردو زبان کی مقبولیت اب کوئی نئی بات نہیں رہی جس رفتار سے یہ زبان دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت جلد یہ زبان بین قومی اہمیت حاصل کر لے گی، جدید زبانوں میں اردو کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کے پیش نظر دنیا کی بہت سی یونی ورسٹیوں میں اس کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور جہاں ایسا نہیں ہے وہاں بھی بہت جلد اردو کے شعبے کھولنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ابھی حال ہی میں قاہرہ یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا ہے، توقع کی جا رہی ہے کہ مستقبل قریب میں دنیا کی تمام یونیورسٹیاں اس زبان کو اپنے نصاب کا جز بنا لیں گی۔ یونی ورسٹیوں کے علاوہ دیگر ادارے بھی اردو کی نشر و اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اردو دوستوں کے لئے یہ خبر انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ حال ہی میں کویت میں ایک اردو اسکول کا قیام عمل میں آیا ہے، کویت میں پاکستانی باشندوں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن وہاں ان لوگوں کے بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا، ہندوستانی بچوں کے لئے ایک اسکول ہے لیکن اس میں پاکستانی بچوں کو داخلہ نہیں ملتا، اس دقت کے پیش نظر محب وطن پاکستانیوں نے اپنا ایک علاحدہ اسکول قائم کیا ہے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے، اس اسکول کے قیام میں ایک پاکستانی شہری عبدالرحیم صاحب کی کوششوں کو بہت دخل ہے، بابائے اردو نے ان کو مبارکباد کا جو خط لکھا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

——— ٭ ———

مکرمی رحیم صاحب!

آج کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ آپ کی اور آپ کے احباب کی کوششوں سے کویت میں پہلا اردو اسکول قائم ہوا ہے اس خبر سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور اس کے لئے میں ان تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں جن کی کوششیں اس نیک کام میں صرف ہوئیں۔

آپ لوگوں نے اپنے ملک سے دور رہ کر بھی اپنی زبان کو فراموش نہیں کیا، یہ بہت بڑی بات ہے، ورنہ ہم لوگوں کی تو یہ روایت رہی ہے کہ دوسرے ملکوں میں جا کر اپنی تہذیب اور زبان کو بالکل بھول جاتے ہیں اور غیروں کی نقالی کو باعث فخر سمجھتے ہیں، آپ نے یہ اسکول قائم کر کے اس بات کا بین ثبوت پیش کیا ہے کہ ہم پاکستانیوں کا محبوب ترین ثقافتی ورثہ اردو زبان ہے، اس اسکول کے قیام سے جہاں ایک طرف

پاکستانی بچوں کو خود اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا وہیں دوسری طرف مقامی لوگوں میں بھی اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوگی، اور اس طرح یہ اسکول کریتے ہیں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔

اس سلسلے میں اگر کبھی انجمن ترقی اردو کے تعاون کی ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف انجمن آپ کے اسکول سے ہر ممکن تعاون کرنے کے لئے تیار ہے۔

خیر طلب عبد الحق

---

## میرا خیال ہے کہ ——

قومی زبان کے زیر نظر شمارے میں مندرجہ بالا عنوان سے آپ کو ایک مضمون نظر آئے گا، جو سلام مچھلی شہری صاحب نے لکھا ہے یہ مضمون ایک طویل سلسلے کی پہلی کڑی ہے، سلام صاحب نے ہماری درخواست پر قومی زبان کے ہر شمارے میں مذکورہ عنوان سے اپنے خیالات پیش کرتے رہنے کا وعدہ فرمایا ہے، اس مستقل عنوان کے تحت وہ مختلف موضوعات پر لکھتے رہیں گے، فنون لطیفہ اور خاص طور پر ادب کے بارے میں سلام صاحب نے جو کچھ پڑھا اور سوچا ہے اسے وہ اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں حوالۂ قرطاس و قلم کرتے رہیں گے، اس سلسلۂ مضامین میں تنقیدی اشارے تو جا بجا ملیں گے لیکن مجموعی طور پر یہ سلسلہ ایک فن کار کے ذاتی تاثرات کا آئینہ دار ہوگا۔ سلام صاحب ہمارے موجودہ شاعروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے زندگی کو ہر روپ اور ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ "میرا خیال ہے کہ" میں اسی روپ اور اسی رنگ کی ترجمانی ہوگی۔ امید ہے ہمارے پڑھنے والے اس سلسلے کو پسند کریں گے اور اس بارے میں اپنی رائے سے نوازیں گے۔

---

نذیر محسن

## غزل

(نذرِ غالب)

جذبۂ دل کا اثر یاد آیا
پھر میرا سوزِ جگر یاد آیا

سرِ مژگاں وہ ستارے چمکے
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

جل اٹھے کتنے امیدوں کے چراغ
جب وہ اندازِ نظر یاد آیا

بجلیو! اور بھی کاشانے تھے
کیوں یہ اجڑا ہوا گھر یاد آیا

بڑھ گئی تیرگیٔ شامِ فراق
آپ کا عزمِ سفر یاد آیا

دل کے تیور ہی کہے دیتے ہیں
غم بہ اندازِ دگر یاد آیا

سجدہ گاہِ دلِ شوریدہ نصیب ؏ پھر وہی آپ کا در یاد آیا

# گردوپیش

## اردو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ وراثت ہے

### ڈھاکہ میں بھارتی مشاورتی وفد کے لیڈر کی تقریر

ڈھاکہ ۴ دسمبر کل شام شاہ باغ ہوٹل میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے اطلاعاتی مشاورتی کمیٹی کے بھارتی وفد کے اعزاز میں جو استقبالیہ دیا گیا تھا اس موقع پر بھارتی صحافیوں کے وفد کے لیڈر اور انڈین نیوز اینڈ فیچرس الائنس کے چیف ایڈیٹر مسٹر درگا داس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ ورثہ ہے اور یہی ایک ایسی زبان ہے جو دونوں ممالک کے باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے انہوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوستان میں اس زبان کو ہر ممکن ترقی دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔

مسٹر درگا داس نے اردو زبان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے اس دورے سے ہم بہت متاثر ہوئے ہیں اور اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں سے مل رہے ہیں، اردو زبان سارے برصغیر کی زبان ہے ہم دلی والے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ دلی میں پیدا ہوئی لکھنؤ والے کہتے ہیں کہ اس کی پرورش لکھنؤ میں ہوئی حیدرآباد میں اس نے رہائش اختیار کی اور خاص مقام حاصل کیا خوشی کی بات ہے کہ یہ زبان ترقی کرکے یہاں تک پہنچ گئی۔ لکھنؤ کے اردو روزنامہ "قومی آواز" کے ایڈیٹر جناب حیات اللہ انصاری نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں کا تعین ہوتے ہی کچھ دماغوں کی سرحدیں بھی جدا ہو گئیں مگر یہ جدائی زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہے گی، خوشی کی بات ہے کہ بنگال میں اردو بنگلہ زبانیں مل جل کر پروان چڑھ رہی ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ ادب ناقابل تقسیم شے ہے، میر، غالب اور ٹیگور، شاہجہاں بادشاہ اور تاج محل کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں، ہم سب ان پر فخر کرتے ہیں، ادب کا تعلق صرف آج یا کل سے نہیں ہوتا۔ اس کی نظر ہزاروں سال کی تہذیب اور تمدن پر ہوتی ہے، ادیب کا ماضی اور مستقبل دونوں پر (دھیان) لگا رہتا ہے اس لئے ادیبوں پر ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں، اخبارات صرف آج اور کل تک کے لئے ہوتے ہیں پرسوں اور ترسوں ان کی نگاہ سے اوجھل ہوتی ہیں، مگر ادیب کی روشنائی ایسی ہے جو ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقت ور ہے جس نے ہیروشیما کو تباہ کیا تھا اس لئے کہ ادیب تاریخ اور تجربات کی وجہ سے صدیوں دور تک دیکھتا ہے اس لئے ہمیں اپنے ایک ایک نقطے پر نگاہ رکھنی چاہئے، بڑے بڑے ملک کے واقعات اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں ادب نے نفرت کی جگہ محبت کا پیغام دیا ہے۔

انصاری صاحب نے مزید کہا کہ ادبی شاہکاروں کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے کے ادیبوں نے امن کا پیغام دیا ہے ۱۹۴۷ء میں جو آگ لگی تھی اسے اب بجھ جانا چاہئے، اور پھر ہمیں پرامن طور پر بھائیوں کی طرح مل جل کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے امید ہے کہ اس کام کو دونوں ملک کے صحافی اور ادیب مل جل کر پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ بنارس کے معزز اخبار "آج" کے ایڈیٹر مسٹر جے پی چترویدی نے اس موقع پر اردو

میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آپ سے مل کر اور آپ کے خیالات سن کر اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اردو کی ترقی میں مصروف ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ اردو اپنی خود اعتمادی کی بدولت ہر جگہ پھیل گئی ہے اس کا ثبوت یہاں مل گیا ہے ۔

انہوں نے مزید کہا کہ کسی زبان کو جاننا زبان جاننے والوں کے لئے انتہائی مفید ہے اور اس کا تجربہ خود مجھے ہو رہا ہے افغانستان کی سرحد سے لے کر بنگال تک ہر جگہ اردو میرے کام آ رہی ہے ورنہ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ میں دل کھول کر آپ سے بات کر سکتا ۔ میرا تعلق اس علاقہ سے ہے کہ جہاں زبان برج بھاشا تھی اردو اور ہندی دونوں زبانیں برج بھاشا سے نکلی ہیں اور سگی بہنیں ہیں، خوشی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں دونوں بہنوں کو پھولنے پھلنے کا موقع مل رہا ہے اردو نظم جو آپ نے پیش کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے ماحول سے بے خبر نہیں ہیں اور یہی اس زبان کے ہمیشہ زندہ رہنے کا باعث ہے ۔

اس موقع پر ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر اور کئی ادیب اور صحافی موجود تھے ،

## ہیمبرگ یونی ورسٹی میں اردو کی تعلیم

تقریباً دو سال ہوئے کہ ہیمبرگ یونی ورسٹی کی فلسفہ کی فیکلٹی میں ایک اردو کا شعبہ قائم کیا گیا ۔ ایک پاکستانی لیکچرر اس کام پر مامور ہوئے کہ اپنی قومی زبان کی روحانی اقدار اور ادبی محاسن سے نوجوان جرمنوں اور غیر ملکی طلبہ کو روشناس کریں اگرچہ ابھی طلبا کی تعداد کم ہے لیکن پبلک کی دلچسپی جاری ہے جس سے یہ امید ہوتی ہے کہ طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوگا ۔

جرمنی میں پاکستانی سفیر میاں ضیاء الدین صاحب جب ہیمبرگ گئے تو انہوں نے وہاں کی یونی ورسٹی کو ۲۰۰ کتابوں کا تحفہ پیش کیا ان کتابوں کو حکومت پاکستان نے نہایت احتیاط سے منتخب کیا اور یہ اردو زبان و ادب کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہیں ، طلبا نے ان کتابوں میں بڑی دلچسپی ظاہر کی یونی ورسٹی کے اس شعبہ میں نہ صرف اردو زبان کے کورس اور سمینار کا انتظام ہے بلکہ نصاب میں پاکستان کی ثقافت ، روایات اور آئینی ترقی سے متعلق کورس بھی شامل ہیں ،

اگرچہ ہیمبرگ میں نیس دیگر زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی تعلیم صرف ۵۰ء میں شروع ہوئی لیکن جرمن یونی ورسٹیوں میں یہ پاکستانی زبان بالکل غیر معروف نہیں ہے ، سب گوٹنگن یونی ورسٹی کے پروفیسر شیڈر نے اپنے ہم وطنوں کو اس زبان کی ادبی اور لسانی پہلوؤں اور رجحانات سے آگاہ کیا ، انہوں نے اردو شاعری کی نامعلوم خوبیوں پر تحقیقات کی ، انہوں نے برصغیر ہند و پاکستان کے مشہور شعرا سے مثلاً غالب ، حالی اور اقبال جو پاکستان کے روحانی مقتدا اور فلسفہ خودی کے شاعر ہیں روشناس کیا ۔

جرمنی اور پاکستان کے درمیان جو خوشگوار تعلقات ہیں ہیمبرگ یونی ورسٹی کا شعبہ اردو ان کا محض ایک جزو ہے یہ شعبہ ان تعلقات کو ایک محکم بنیاد پر زیادہ پائیدار بنانے میں مدد دے گا ۔

## ماہنامہ ادیب کا حاصل مطالعہ نمبر

ماہنامہ ادیب ۱۹۶۱ء میں اپنا خاص نمبر " حاصل مطالعہ نمبر " کی حیثیت سے شائع کر رہا ہے یہ نمبر چار ڈی لٹ کی تصنیفات اور بارہ پی ایچ ڈی کے مقالات کی تلخیصات پر مشتمل ہوگا ۔ ہر تلخیص کے ساتھ تحقیق کے سلسلے میں اجمالی معلومات ، " تحقیق کے تقاضے " اور " اصول تحقیق " پر بھی چند مقالات شریک اشاعت ہوں گے ۔

یہ نمبر اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک اضافہ ہوگا اب تک ڈاکٹر نذیر احمد ( ڈی لٹ ) ڈاکٹر سید عبداللہ ( ڈی لٹ )

ڈاکٹر گیان چند جین (ڈی لٹ)، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر محمود الہٰی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر صابر علی خاں، ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر سلام سندیلوی وغیرہ اپنے تعاون کا وعدہ کر چکے ہیں، اردو میں تحقیقی ڈگری حاصل کر لینے والے ان اہل قلم سے بھی ہم تعاون کی استدعا کرتے ہیں جن سے اب تک ہم ربط قائم نہیں کر سکے یا جن کے پتے ہمیں معلوم نہیں ہے تاکہ اس منفرد نمبر کو ہم گراں قدر بنانے میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو سکیں، اس سلسلے میں ابن فرید مدیر ادیب علی گڑھ نے ہمیں اپنی توجہ فرمائی سے نوازا ہے۔

## اردو مجلس کا ادبی اجلاس

حیدرآباد ۲۰ نومبر۔ اردو مجلس کا ماہانہ اجلاس کل شام پانچ بجے اردو ہال واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعر مسٹر مرزا شکور بیگ (ایم اے) نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی، رائے جانکی پرشاد صدر اردو مجلس نے صدر جلسہ کی گل پوشی کرتے ہوئے خیر مقدمی تقریر کی۔

محترمہ منیرہ کاوس جی (ایم اے) نے اکبر آبادی کی شخصیت اور کلام کے زیر عنوان مقالہ سنایا اور کہا کہ اکبر کی شاعری صرف شیریں بیانی اور سلاست زبان کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے کلام میں سیاسی و سماجی محرکات کی کشمکش کے ساتھ ساتھ ظاہر و باطن، صداقت اور خلوص کے تہہ در تہہ گنجینے ملتے ہیں۔ اکبر پر اس سیر حاصل مقالہ کے بعد محفل شعر و سخن میں یسین علی خان، اسد انصاری، معین بزمی، بانو طاہرہ سعید، منوہر لال شارؔ، روحی علی اصغر، وحید مرزا، صادق نقوی، صلاح الدین نیر، عباس عابدی، اشرف رفیع اور کیف رضوانی کے علاوہ صدر نے بھی اپنے تازہ مزاحیہ اشعار سے داد پائی۔

مسٹر مرزا شکور بیگ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اکبر نے مشرقی تہذیب میں آنکھیں کھولیں، سر سید اور گاندھی جی کی تحریکات نے پورے ملک میں اپنا اثر و اقتدار قائم کر لیا، مگر اکبر ان تبدیلیوں اور قدروں کو قبول نہ کر سکے اشعار میں محض تبسم ہی نہیں ملتا، بلکہ جراحت دل کا سامان بھی مہیا ہے

اس موقع پر ممتاز علم دوست حضرات کے علاوہ سر برآوردہ شخصیتیں بھی کثیر تعداد میں شریک جلسہ تھیں، مسٹر محمد منظور احمد معتمد اعزازی اردو مجلس کے شکریہ پر یہ دلچسپ علمی اجلاس ½ ۷ بجے برخواست ہوا۔

## علامہ عرشی انجمن ترقی اردو کالج میں

کراچی ۳ نومبر آج شام اردو کے مشہور محقق اور ماہر غالبیات علامہ امتیاز علی عرشی کے اعزاز میں اردو کالج میں ایک دعوت ترتیب دی گئی جس میں کراچی کے نمایاں ادیبوں نے شرکت کی، اس موقع پر کالج کے پرنسپل کرنل عطاء الرحیم نے عرشی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے درمیان ہندوستان کے مشہور محقق علامہ عرشی موجود ہیں، آپ نے اردو ادب کی جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں اس کے لئے تمام اردو دنیا آپ کی ممنون ہے، عرشی صاحب نے اپنی تقریر میں بعض ادبی مسائل پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمارے موجودہ لکھنے والے تن آسانی اور سہل پسندی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اس لئے وہ ادبی تحقیق کی طرف توجہ نہیں کرتے، یہی نہیں بلکہ تحقیق کو اب دنیا سمجھا جانے لگا ہے۔"

جن لوگوں نے اس تقریب میں شرکت کی ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں:۔ جناب ممتاز حسن (صدر ترقی اردو بورڈ)، حفیظ ہوشیارپوری، ڈاکٹر معین الحق، کرنل خواجہ عبد الرشید، رفیق خاور، ابن انشا، جمیل الدین عالی، قرۃ العین حیدر، عبد العزیز خالد، ڈاکٹر شاہ علی، ضیاء الدین برنی، تابش دہلوی، ذکریا مائل، صہبا لکھنوی اور شمس زبیری۔

## علی گڈھ میں مولانا آزاد لائبریری کا افتتاح

نئی دہلی ، ۷ دسمبر وزیر اعظم نہرو نے کل علی گڈھ یونی ورسٹی میں مولانا آزاد لائبریری کا افتتاح کیا اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر نہرو نے نوجوانوں کو ہدایت کی کہ وہ تنگ نظری کی ذہنیت کے خلاف جد وجہد کریں جونکہ اس سے ذہنی گمراہی پیدا ہوتی ہے اور ملک کی ترقی رکتی ہے ، مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وزیر اعظم نہرو نے کہا کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی پرانی اور نئی اقدار کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش میں صرف کی ہے اس لائبریری سے ان کے نام کی وابستگی اس لئے ضروری ہے کہ انہوں نے واقعی ملک کی انقلابی تحریک آزادی پر اپنے دیرینہ اثرات چھوڑے ہیں اس سے پہلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بتایا کہ لائبریری کے لئے انہیں سبحان اللہ اور عبدالسلام کے مجموعۂ کتب سے متعدد قلمی نسخے ملے ہیں . فرنگی محل لکھنؤ کا پورا کتب خانہ دیا گیا ہے اور مولوی حاجی حبیب الرحمان خان شیروانی نے بھی اپنا مجموعۂ کتب لائبریری کو دے دیا ہے ،

## آغا خان اخبار نکالیں گے

نیویارک ۹ دسمبر امریکی رسالہ "ٹائم" نے اطلاع دی ہے کہ پرنس کریم آغا خان دنیا کے مختلف علاقوں سے اخبار جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ، ٹائم نے لکھا ہے کہ وہ کینیڈا کے مسٹر تھامسن کے ساتھ مل کر یوگنڈا کینیا اور ٹینگانیکا سے اخبارات نکالیں گے ۔

## کل پاکستان مسلم ثقافتی اردو کانفرنس

لاہور ۲۹ نومبر مولوی ابو الحسنات قادری نے بتایا ہے کہ جمعیۃ الاسلام کے زیر اہتمام کل پاکستان مسلم ثقافتی اردو کانفرنس آئندہ سال فروری میں ہوگی انہوں نے بتایا کہ مجوزہ کانفرنس منٹگمری میں جمعیۃ اسلامیہ میں اردو یونی ورسٹی قائم کرنے کا پروگرام طے کرے گی .

اختر انصاری اکبر آبادی

## غزل

کچھ تو دل کا خیال کر چلئے
دور گردِ ملال کر چلئے

رنگ قوسِ قزح کے مانند نہ ہوں
شوخ نظریں سنبھال کر چلئے

حسن ہر گام پر ہے دامن کش
پھر بھی دامن سنبھال کر چلئے

اک حسیں خارزار ہے دنیا
اپنے کانٹے نکال کر چلئے

رہنماؤں میں راہزن بھی ہیں
ہاں ذرا دیکھ بھال کر چلئے

چٹکیاں لے کے کہہ گیا ماضی
کچھ تو تعمیرِ حال کر چلئے

مضطرب خود ہے آپ کا اختر
بل جبیں پر نہ ڈال کر چلئے

## بابائے اردو کا مراسلہ

# پاکستان کے طالب علموں کے نام

کل پاکستان انجمن ترقی اردو

اردو روڈ، کراچی

۶ دسمبر ۱۹۶۰ء

عزیزی شفیع ادبی سلمہ اللہ تعالیٰ۔

آفرین صد آفرین ہے تمہاری ہمت پر۔ تم نے وہ کام کیا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جس وقت تم نے مجھ سے اردو یونی ورسٹی کے پمفلٹ اور رسید بہیاں طلب کیں تو میں نے خیال کیا کہ یہ تمہارا لڑکپن ہے جو مشرقی پاکستان سے اردو یونی ورسٹی کے لئے روپیہ وصول کرنا چاہتے ہو، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ سو پچاس روپے جمع کر کے بھیج دوگے اور جب میں نے سمندر کی طغیانی کی تباہ کاریوں کا حال اخباروں میں پڑھا تو میں سمجھا کہ اب تم دس روپے بھی وصول نہ کر سکوگے، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب تم نے ایک مہینے کے اندر پے در پے پانسو کی دو قسطیں روانہ کیں اور ابھی کچھ اور بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے تمہاری اس بے لوث اور ہمت آزما قدم سے یقین ہوگیا کہ تم باعزم نوجوان ہو اور اپنی قومی زبان سے سچی محبت رکھتے ہو۔

مجھے اس تحریک میں سب سے زیادہ طالب علموں سے مدد کی توقع تھی جب ان کی طرف سے کسی ہمدردی کا اظہار نہ ہوا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی لیکن "بزم اردو" کراچی کے چھوٹے بچوں اور قصبہ کوٹری کے چند طالب علموں اور خاص کر تمہاری رضاکارانہ کوشش نے مجھے ڈھارس دی اور یقین دلایا کہ اس جماعت میں ایسے کچھ ایسے نوجوان ہیں جو اپنی زبان اور تہذیب کی خاطر ایثار کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ مجھے قارون صفت سرمایہ داروں اور نام و نمود کے خواہاں دولت مندوں کی ضرورت نہیں جو دباؤ اور اثر سے عطیات دیتے ہیں، درحقیقت یہ عطیات نہیں ہوتے یہ سرمایہ داری کے سودے ہوتے ہیں یہ ایک ہزار دے کر دس ہزار اور دس ہزار دے کر ایک لاکھ کماتے ہیں۔ مجھے تم جیسے چند

شفیع ادبی صاحب مشرقی پاکستان کے ایک ہونہار طالب علم ہیں وہ شب و روز محنت کر کے اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لئے رقم جمع کر رہے ہیں۔ ان کی جمع کردہ رقم کی پہلی دو قسطیں وصول ہونے پر بابائے اردو نے یہ مراسلہ لکھا ہے یہ مراسلہ صرف شفیع ادبی صاحب ہی کے نام نہیں بلکہ پاکستان کے ان تمام طالب علموں کے نام ہے جو اس تحریک کو اپنا مقصد قرار دے کر اردو یونی ورسٹی کے قائم کرنے میں پورا پورا تعاون کریں گے، اس غرض سے یہ مراسلہ شائع کیا جا رہا ہے۔

باہمت نوجوانوں کی ضرورت ہے ۔ یہ یونی ورسٹی میں نہیں بناؤں گا تم اور
تم جیسے باعزم مجاہد نوجوان بنائیں گے ۔ مجھے اس کے لئے امیروں کی ضرورت
نہیں مجھے شفیع ادبی جیسے غریبوں کی ضرورت ہے جو بلند مقصد کے لئے
سب کچھ قربان کرسکتے ہیں ۔ ہماری قومی زبان و تہذیب کا یہ قلعہ جو میرے
پیش نظر ہے وہ تمہاری ذہانت کی سیمنٹ اور تمہاری ہمت کے فولاد سے
تعمیر ہوگا ۔

دولت مند ہماری مدد کریں یا نہ کریں ، حکومت ہمیں چارٹر دے یا
نہ دے ، یہ یونیورسٹی بن کر رہے گی اور ایسی بنے گی کہ ایک دنیا اس کی سند
تسلیم کرے گی ، کیونکہ اس میں کام کرنے والے تنخواہ کے لالچ یا نام و نمود کی
خاطر کام نہیں کریں گے بلکہ ان کے سامنے ایک بلند قومی مقصد ہوگا اور یہ
وہی بلند قومی مقصد ہے جو ہماری قوم کے مصلح اعظم سر سید احمد خان ، اور
پاکستان کے بانی قائد اعظم نے سمجھایا تھا ۔ اس یونیورسٹی کو قائم کر کے ہم ان کی
ارواح کو خوش کریں گے ۔ اس مقصد کے لئے مجھے بہت سے شفیع ادبی درکار
ہوں گے ، پاکستان میں طالب علم لاکھوں کی تعداد میں ہیں ، ان میں ضرور
ایسے جوہر قابل ہوں گے جو شفیع ادبی کی طرح اپنی قومی زبان اور تہذیب سے
محبت رکھتے ہوں اور اس کے لئے ہر وقت ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے
تیار رہ جائیں لیکن یہ تحریک ان تک پہنچی نہیں اس لئے نظر سے اوجھل ہیں
جب یہ آواز ان تک پہنچے گی تو وہ لبیک کہہ کر سامنے آئیں گے اور وہ کام
کریں گے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں گے ۔

یہ خط اگرچہ بظاہر شفیع ادبی کے نام ہے لیکن درحقیقت یہ پاکستان
کے تمام طالب علموں کے نام ہے میں اسے ہر طالب علم تک پہنچانے کی کوشش
کروں گا اور دیکھوں گا کہ پاکستان کے مدارس اور کالج اور یونی ورسٹیاں
مجھے کتنے شفیع ادبی دے سکتی ہیں ۔ یہ اردو یونی ورسٹی کے مجاہدوں کی جماعت
ہوگی جو اپنا وقت ، اپنی توانائی اور اپنی سمجھ بوجھ اس مقصد کے لئے وقف
کر دیں گے ۔

آخر میں میں اس قدر اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو کوئی اس دعوت
کو قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں وہ اچھی طرح اپنا امتحان کرے کہ وہ
اس کام کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں اور اس میں ان سختیوں کو برداشت
کرنے کی تاب ہے یا نہیں جو اس راستے میں پیش آئیں گی ۔

عبدالحق

---

بقیہ

# میرا خیال ہے ۔۔۔ !

( بسلسلہ ص ۱۴ )

کو بچھڑے ہوئے بہت دن بھی نہیں گزرے ) یا " عصمت " کا جنسی جادو
سر پر چڑھ کر کیوں نہیں بول رہا ہے ، قرۃ العین حیدر کیوں آگ کا دریا بہا
رہی ہیں ؟ " منٹو نے تو دلکش طریقے کے ساتھ یہ کہہ کر بھی ایک مذاق کیا تھا

*I am supposed to have nine brains and no heart. At my post-mortem the world may be shocked to find that I had nine hearts and no brains.*

اور اس کے اس مذاق کا جواب ارباب فکر و نظر نے اسے اتنی جلد بھلا کر دے دیا
(پتہ نہیں آپ نے وہ رپورٹ پڑھی ہے یا نہیں جس میں بڑی بے کسی کے ساتھ اس
مکان کو بند کر دینے کا اعلان کیا گیا تھا جس میں اس کی نگارشات کے نمونے
نمائش کے طور پر رکھے گئے تھے اور یہ امید کی گئی تھی کہ ادب نواز عوام کا ایک
سلسلہ ہوگا جو کبھی نہ ختم ہوگا ) ۔۔۔ !!

---

سلام مچھلی شہری

# میرا خیال ہے ———!

——— خود میرا خیال ہے کہ اگر میں تھوڑا بہت "ذہین" نہ ہوتا تو "اردو ادب" میں میری کوئی جگہ نہ ہوتی۔ اپنی "زندگی" کے بارے میں بھی میں یہی سمجھتا ہوں۔ حیات و فن کی ان منازل میں جن سے کہ میں گزر رہا ہوں، میری رفیق صرف میری "ذہانت" رہی ہے اور رہے گی لیکن میں ہی آج آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ "ذہانت" ہمیشہ میرا ساتھ نہ دے گی۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ادب میں ایک قلم کار کے لئے بعض ایسے نازک مقامات بھی آتے ہیں، جہاں ذہانت کا جادو نہیں چلتا۔ وہ مقامات شاعر سے براہ راست اس کی "عملی قابلیت" کے متعلق سوالات کرتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں میں خود کو بڑا مجبور سا پاتا ہوں ——— !

"آپ مسکرا رہے ہیں!"

یقین مانئے۔ میں نے یہ بات بڑے خلوص سے کہی ہے۔ میں قریب ایک برس سے یہ سوچ رہا ہوں کہ ؏

"خود اپنے تیر اپنے دل پہ برساؤں تو کیا ہوگا؟

اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اصل بات شروع کرنے سے پہلے خود اپنے فن اور اپنی ذات پر وار کرنا مناسب سمجھا ہے۔

——— یہ ٹھیک ہے کہ "ذہانت" ایک برکت ہے اور انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی بے حسی بلکہ کچھ جانتے ہوئے بھی قوت اظہار سے اس کی محرومی ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ "ذہانت" نے تہذیب و انسانیت کی آرائش میں بڑا نمایاں کام کیا ہے۔

اردو کے "ذہین" ادیبوں اور شاعروں میں جن سے میں ملا ہوں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور فراق وغیرہ ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ عروس ادب کو سنوارنے اور جوان حسین و عالم بنا دینے میں ان فن کاروں کا کتنا بڑا ہاتھ ہے مگر میری ناچیز رائے میں آج یہ اور ان کے ایسے دوسرے ادیب ایک بے حسی STILLNESS اور بے رنگی کے عالم میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ذہانت اب بھی کسی حد تک ان کا ساتھ دے رہی ہو، لیکن آج کے عہد راکٹ میں رہنے والے ادب کے طالب علموں (جن میں اردو کے طالب علم بھی شامل ہیں) کو وہ صرف اپنی جانی پہچانی "ذہانت" سے متاثر نہیں کر سکتے۔ (میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ مجنوں گورکھپوری یا فراق گورکھپوری پڑھے لکھے نہیں ہیں)۔ نہ جانے کیوں میں ان دنوں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم اردو کے ادیب اور شاعر پیشہ ورانہ طور پر ہمیشہ متعصب رہے ہیں اور ہیں یعنی ہم علم و فن کے دوسرے شعبوں میں کام کرنے والوں کو ہمیشہ اچھوت سمجھتے رہے ہیں۔ آج فراق ایسا ذہین شاعر بھی شاید یہ نہیں بتا سکتا کہ خود شہر الہ آباد کا سب سے بڑا ڈاکٹر، انجینئر، چترکار، مصور، رقاص، سیاست دان یا علم سائنس کا پروفیسر کون ہے؟ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اردو فن کار کے اس تعصب نے خود اردو ادب کو عالم گیری مسائل سے بہت دور کر دیا ہے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ ادب، زندگی اور اسی علم کے دوسرے مختلف شعبوں سے الگ کوئی چیز ہے۔

"بے شک تمہیدی گفتگو بہت طویل ہو رہی ہے۔"

تو یوں سمجھئے کہ میں اس وقت اردو کے کسی ادیب یا شاعر پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں، میں تو اس وقت انگریزی کے ایک عظیم تخلیق کار پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میں اسی ضمن میں اردو کے چند ادیبوں اور شاعروں پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔

شا نے ایک بار کہا تھا کہ۔

Shelley made ideas sing; I make them dance.

اس کا یہ شاعرانہ بیان [illegible] اس کی "ذہانت" کا ارتفاع ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا اپنے فن کے متعلق یہ خیال بہت پرخلوص ہے۔ خیالات کو زندہ کر دینا بھی [illegible] قوت بلکہ عظمت ہے لیکن بطور ڈرامہ نگار خیالات کو کبھی زندہ جاوید بنا دینا شا کے بس کی بات نہیں تھی اور شاید وہ یہ چاہتا بھی نہیں تھا وہ تو [illegible] عام رقص میں دیکھنا چاہتا تھا مگر [illegible] "دنیا کے عظیم تخلیق کاروں سے [illegible] ہوئی آموزا ہے

میرا خیال ہے کہ شا BORE اور [illegible] کبھی نہیں تھا اور یہ اس کے غیر معمولی طور پر ذہین ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس نے اپنی عمر کے ۹۴ برس طے کیے اور مسلسل لکھتا رہا اور کبھی بھی بے رنگ اور غیر دلچسپ نہیں ہوا۔ مگر صرف یہی خصوصیت اس کو غیر فانی بنا دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔

اردو کے ادیب "چونکا دینے والی بات" تو بیشتر کہتے رہے ہیں مجنوں (جگر "نئے شاعروں کے لئے ایک خطرہ ہیں" اور اب جگر کی وفات کے بعد ان کا بیان دیکھئے حالانکہ میرے خیال میں ان کی پہلی رائے صحیح ہے) اور فراق بھی کہتے رہے ہیں (اور ابھی تک کہتے رہتے ہیں) مگر صرف ذہانت کی بات غیر فانی اقدار نہیں رکھ سکتی۔ بے شک اردو کے یہ ادیب ایسی ذہانت کی باتیں کرنے میں پرخلوص بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں (شا تو میرے خیال میں اپنے عہد کا بڑا پرخلوص اور Frank مصنف تھا) اور یہی وجہ ہے کہ فن کی تجارت اور اس سلسلے میں انتہائی مقبولیت کو وہ خود زندگی اور فن کا ماحصل سمجھنے لگا تھا۔ (میں سمجھتا ہوں کہ یہی اس کا المیہ بھی تھا۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ:۔

"If I were not a gloriously successful person in England they would have dismissed me as an Irishman and in America as a socialist."

شا کے اس بیان میں اخلاص تو ہے مگر غور فرمائیے باہمہ اخلاص ایسا انتقامی خلوص ایک فن کار کی ابدیت کے لئے کہاں تک ضامن ہو سکتا ہے۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ شا "زندہ رہے گا" صرف اس لئے کہ وہ کبھی بھی غیر دلچسپ نہیں تھا اور غیر دلچسپ اور BORE نہ ہونا سب سے بڑا مجلسی حسن ہے ادب کے سلسلے میں۔

اردو کے "چونکا دینے والے" نئے شاعروں میں مجاز بھی ہے لیکن ان کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ صرف ذہین تھے اور بہت ذہین تھے (جیسا بھی ہوں سبط حسن بھائی مجھے معاف کریں) یہ صرف میں جانتا ہوں محض ذہانت کہاں کہاں اور کب کب ان کا ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔ ان کی ذہانت کو "ان کے لئے المیہ" میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں بڑے دکھ کے ساتھ ان دنوں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان کی نظمیں بہت دنوں تک زندہ نہ رہ سکیں گی۔ یہی ٹریجڈی فراق کے ساتھ بھی ہے خواہ وہ ان کا فن ہو یا خود زندگی۔ میں پوچھتا ہوں کیا آج اردو کا کوئی ایماندار نقاد یہ بتا سکتا ہے کہ اس زبان کا ذہین ترین افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اتنی جلد کیوں بھلا دیا گیا ہے یا میراجی کی جنسی نظموں کا ذکر ایک کیوں نہیں ہو رہا ہے (ابھی ا

مولانا صلاح الدین احمد

# پاک پنجابی کانفرنس پر ایک نظر

گذشتہ ماہ لاہور میں پاک پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی تھی
جس نے پنجابی کے سلسلہ میں چند مطالبات کئے تھے۔ مولانا صلاح الدین
احمد نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے

پچھلے دنوں لاہور میں جس پاک پنجابی کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا اس
کی اخباری روئداد پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے میں اس خبر سے چونک اٹھا کہ جن
صاحب نے ہماری پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم اور پنجابی
ثقافت کی تحقیق و تجدید کے لئے ایک پورے شعبے کے قیام کا مطالبہ کیا ہے اور
اس امر کی تحریک کی ہے کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پنجاب کے درمیان پنجابی زبان
سے متعلق تہذیبی اور ادبی وفود کا تبادلہ کیا جائے، نیز ارشاد کیا ہے کہ پنجابی زبان
میں لاہور سے کم از کم ایک روزنامہ جاری کیا جائے، جو پنجابی زبان کے
ادیبوں کی نگارشات کو عوام میں مقبول بنائے اور اس کے علاوہ تمام روزنامے
امروز کی طرح پنجابی زبان و ادب کی نشر و اشاعت کے لئے چند علاحدہ
صفحات ہر ہفتے شائع کیا کریں، یہ صاحب مشرقی پنجاب سے تشریف لائے
تھے جہاں کی یونیورسٹی میں وہ شعبۂ پنجابی کے صدر ہیں اور ایسے موقعے پر تشریف
لائے تھے جب ان کے ہاں پنجابی زبان کی بنیاد پر ایک علاحدہ پنجابی صوبے
کے حصول کے لئے سخت جدوجہد کی جا رہی ہے،

اس امر سے قطع نظر کہ فاضل پروفیسر صاحب کا پاکستانی پنجاب
یونیورسٹی سے کسی قسم کا مطالبہ کرنا کہاں تک جائز حق بجانب اور مناسب ہے
موجودہ حالات میں جب شمالی ہند کی فضا پنجابی زبان کے ہنگاموں سے گونج
رہی ہے ہمارے پرسکون اور اتحاد پرور ماحول میں اس قسم کی آواز بلند کرنا
نہ صرف ایک صدائے بے ہنگام بلکہ ایک ناپسندیدہ اقدام ہے،

ہم لوگ تفریق کی طرف نہیں بلکہ اتفاق کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں
ہماری قومی زبان اردو ہے یہی ہمارا مرکز اتحاد ہے اور آج سے نہیں بلکہ
اس وقت سے ہے جب پہلے پہل ہمارا قومی شعور بیدار ہوا، ہندوستان
جب ایک ملک تھا تو گلگت سے لے کر ڈھاکے اور رتنا وسے لے کر سول پٹم
تک مسلمان اردو کا کلمہ پڑھتے تھے پھر جب پاکستان بنا تو قائد اعظم نے اسے
ہماری قومی زبان قرار دیا اور ہم سب نے (جن میں پنجابی اور غیر پنجابی بھی
شامل تھے) ان کے اس ارشاد کے سامنے سر جھکا دیئے اور ہمارے دلوں نے
اس کی تصدیق کی، آج بھی درحقیقت اردو ہی ہماری اصل زبان ہے، اسی میں
ہم لکھتے پڑھتے ہیں اور اسی میں اپنے معاملے طے کرتے ہیں، جب صوابی کا کوئی
پٹھان داود کے کسی سندھی کو یا خود اپنے پہاڑی گاؤں میں اپنی دادی کو کوئی
خط لکھواتا ہے تو اسی زبان میں لکھواتا ہے، ایسی صورت میں اگر ہم اسی
کانفرنس کے ایک محرک صاحب کے ہم زبان ہو کر یہ مطالبہ کریں کہ ہمارے
بچوں کو پہلی جماعت سے پنجابی پڑھائی جائے وہ پنجابی جو حقیقت میں
اردو ہی کی ایک کمزوری اور ابتدائی صورت ہے اور جو ہمارے شہروں

میں اردو کے اسی فیصد الفاظ استعمال کرتی ہے تو یہ مطالبہ کہاں تک معقول اور درست ہوگا ؟ ۔

بادہ کشِ خالصہ کے لئے پنجابی اس کی مذہبی اور ثقافتی زبان ہے اور اگر آج وہ اس کی بنیاد پر ایک علٰحدہ صوبے کے مطالبے تک آن پہنچا ہے تو یہ بات قابلِ فہم ضرور ہے، یہ اور بات ہے۔ کہ وہ حیثیت کے اس فرق کو نہیں سمجھتا جو اس کی پنجابی اور ہماری پنجابی کے درمیان پایا جاتا ہے ہمارے ہاں یہ محض ایک بولی تھی جس نے صدیوں میں آہستہ آہستہ ترقی پاکر نہ صرف موجودہ اردو کی صورت اختیار کرلی، بلکہ جس نے پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے اطراف و اکناف سے حسن و جمال اور اظہار و بیان کی وہ مختلف کیفیتیں بھی جذب کرلیں جو آج اس کی زینت و قوت کا سرمایہ ہیں، ہم اہلِ پنجاب آج اس کی قدیم صورت سے چمٹے ہوتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ اس کی جدید صورت یعنی اردو خالصتاً ان کی اپنی زبان ہے جو دیس دیس کا پانی پی کر زیادہ مہذب، زیادہ شائستہ اور بہت زیادہ وسیع ہوگئی ہے اور انہیں ہرگز اس بات سے نہیں روکتی کہ وہ اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے فروغ کے لئے اسے بروئے کار لائیں پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ مدارس میں ابتدا سے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک بہتر اور مکمل ذریعہ اظہار کی بجائے ایک ابتدائی اور کمزور وسیلۂ بیان کا انتخاب کریں اور اس طرح اس تفریق و تجزیہ کی بنیاد رکھیں، جو قوموں کے لئے زہرِ ہلاہل سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا کرتی ہے، آج ہمیں دورنگی نہیں، بلکہ یک رنگی کی شدید ضرورت ہے اور یہ واحد رنگ محض اردو ہی کا رنگ ہو سکتا ہے اور اسی میں رنگے جاکر ہم انتشار و تفریق سے دامن بچاتے ہوئے اپنے موجودہ فوزِ کبیر تک پہنچ سکتے ہیں ۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

(بشکریہ "آفاق" لاہور)

---

خطیبۂ ہند سیدہ اختر

# زبان

زبان قوم کا سرمایۂ حیات بھی ہے
زبان قوم کی جاوید کائنات بھی ہے
زبان وجہِ فروغِ تمدن و تہذیب
زبان ہی میں ہر اک قوم کی نجات بھی ہے
اگر زبان ہے زندہ تو قوم ہے زندہ
ادب ادب ہے تو پھر مژدۂ حیات بھی ہے
زبان مسجد و محراب تک نہیں محدود
زبان زینتِ کاشی ہے سومنات بھی ہے
زبان جلوت و خلوت زبان غیب و شہود
زبان حاصلِ ذوقِ مشاہدات بھی ہے
زبان ربطِ محبت کا جاں نوازِ ثبوت
زبان روح فزائے تعلقات بھی ہے
زبان اساسِ قومی، زبان تعارفِ قوم
زبان ذات بھی ہے حاملِ صفات بھی ہے
جو دشمنی کو بھی تبدیل دوستی میں کرے
جو گھر دلوں میں بنالے وہ ایک بات بھی ہے
ہے التفات تو سب کچھ ... نہیں! تو کچھ بھی نہیں
زبان موت بھی ہے باعثِ حیات بھی ہے

غرض زبان ہے وہ دولتِ حیات اختر
کہ جس سے سرخوشیِ قوم کو ثبات بھی ہے

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

# تخلیق و تنقید

یہ مسلمہ ہے کہ کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ بغیر اتنے ہی بڑے تنقیدی شعور کے ظہور میں نہیں آتا۔ ہومر دنیا کا سب سے پہلا ادیب ہے اور اس کی نظم میں اس کے فن کے بابت وہ کلیے ملتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے تنقید کی بنیاد ہیں۔ درحقیقت شعوری فن کاری شروع ہوتی ہے اور اسے ہم تنقید میں بھی وہی درجہ دیتے ہیں جو شاعری میں۔ جوں جوں ہم جدید دور میں آتے جاتے ہیں یہ امر اور زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے کہ ہر بڑا فن کار پہلے اپنے فن پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے پھر اس کو تخلیق کا جامہ پہناتا ہے اس کلیہ کی لازمی شاخ یہ ہے کہ نئی تشکیل وہی کرتا ہے جو نئی تشکیل کا نعرہ بلند کرتا ہے، ہمارے یہاں حالی اس کی مثال ہیں "مقدمہ شعر و شاعری" میں انہوں نے نئی تشکیل کا نعرہ مارا اور مسدس میں نئی تشکیل کر دکھائی ان کے بعد سے ہمارے یہاں یا تو ان کے ایک آدھ پیرو ہوئے جیسے شبلی، مولوی عبدالحق اور یا پھر سوکھے ترے خالص نقاد الگ اور سوکھے ترے خالص ادیب الگ، ستم ظریفی یہ کہ افسانہ نگار یا شاعر نقاد ہونا اپنے دائرے سے الگ جانا سمجھتا ہے، نقاد کوئی تخلیق پیش کرنے کو جج کے درجہ سے اتر کر وکیل یا موکل کے درجہ پر آجانے کے برابر سمجھتا ہے۔ اگر کوئی افسانہ نگار تنقید لکھ دے تو کہا جاتا ہے "افسانہ ہی لکھے جائیں تنقید نہ لکھیں تو بہتر ہے" اگر کوئی شخص عالم ہے اور پہلے نقاد کی حیثیت سے نمایاں ہوا اور پھر ناول لکھے تو کہا جاتا ہے۔ تنقید ہی لکھتے رہتے تو اچھا تھا خواہ مخواہ ناول کے دائرے میں کود پڑے۔ اس عالم میں ایک طرف ہائے واویلا بھی ہے کہ جمود طاری ہے ترقی نہیں ہو رہی ہے، دوسری طرف کوئی ست تیر سکی کہہ کر کھڑا ہوتا ہے اور ایک مضمون جھاڑ دیتا ہے کہ سب مل کر تشکیل نو کرو باقی تالیاں بجا بجا کر کہتے ہیں ہاں کرو، ہاں ہو جائے ہم گلے گلے پانی ساتھ دیں گے" اور ہوتا کچھ نہیں۔

اب ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیے، چاندنی رات میں دو شاعر ایک جھیل کے کنارے بیٹھے ہیں وہ رسمی شاعری پر عمل کر چکے ہیں مگر تشکیل نو کرنا چاہتے ہیں، دونوں اس کام میں اپنی انفرادیت کے موافق حصہ بانٹ لیتے ہیں اور نظموں کا ایک مجموعہ پیش کرتے ہیں، پھر نئی شاعری کو سمجھانے کے لئے ایک مقدمہ بھی لکھ ڈالتے ہیں جو نظموں کے دوسرے ایڈیشن کے ساتھ چھپتا ہے، نظریہ اور عمل دونوں ایک ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ لوگ واویلا مچاتے ہیں، عام لوگ ہمیشہ نئی چیز سے سہم کر اول اول بکنے ہی لگتے ہیں مگر ایک گروہ نئی قیادت کو قبول کرتا ہے، ہر فرد اپنی اپنی طرح پر عامل ہوتا ہے، ایک فرد دوسرے فرد کی انفرادیت پہچانتا ہے، آپس میں مشورے ہوتے ہیں، ہمدردی سے غلطیاں نکل جاتی ہیں اور اصلاح کے راستے بنائے جاتے ہیں، یہ گروہ فرداً فرداً الگ ہے مگر بنیادی طور پر ساتھ، ہر ایک شاعر ہے اور نقاد بھی، اپنا آپ نقاد، اپنے ساتھیوں کا نقاد، تشکیل نو کہہ بھی رہے ہیں اور کر بھی رہے ہیں، سچ مچ تشکیل نو ہو جاتی ہے اور اس کے اثرات صدیوں چلتے ہیں، یہ سماں انگریزی ادب کے اس دور کا ہے جسے رومانی دور کہتے ہیں، یہی عالم دنیا میں ہر اس دور کا ہوتا ہے جو سچ مچ تشکیل نو کرتا ہے، کرنے والا

اپنے کام کے ہر پہلو کو سمجھتا ہے اپنے ساتھیوں کے کام کو سمجھتا ہے اور عمل پیرا ہوتا ہے دنیا میں ہر تحریک اسی طرح کامیاب ہوتی ہے، مذہب بھی وہی چلاتا ہے جو عالم باعمل ہو، علم و عمل جب الگ ہو جاتے ہیں تو مذہب یا کلامی ہو جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے، تنقید و تخلیق الگ ہو جاتی ہے تو ادب ختم ہو جاتا ہے"

دونوں متضاد تصویروں کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو محسوس ہو جائے گا کہ تشکیل نو ہو تو کیسے ہو، ضرورت ایک نائدکی ہے جو تشکیل نو کرکے یہ بتلائے کہ کیسے ہوئی، اس سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ یہ سوکھی اور ہوائی بحثیں جن میں کچھ نہ کرنے والے اپنی ٹر لگاتے ہیں ختم کر دی جائیں اگر کوئی تشکیل نو پر مضمون لکھے تو اس سے کہا جائے، میاں پہلے تشکیل نو کرکے لاؤ اور اس کے ساتھ یہ مضمون اسے سمجھانے کے لئے لاؤ، اگر لوگ اس کو دیکھ کر کہیں کہ تشکیل تو نہیں ہوئی تو ان سے کہا جائے کہ صاحب آپ کر کے دکھائیے کہ کیسے ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ تخلیق اور تنقید ایک ہی آدمی کا کام ہو یعنی ہر ادیب دونوں میں کامیابی کا برابر ثبوت دے، افسانہ نگار یہ بتلا سکے کہ اس نے کیا کیا، افسانہ عام طور پر کیا ہوتا ہے اور اس نے انفرادی طور پر اس میں کیا کیا ہے تنقید نگار اپنے عمل کو سمجھائے اپنے ساتھیوں کے عمل پر نکتہ چینی کرے۔ ایک ہی فن پر عمل کرنے والے آپس میں رایوں کا تبادلہ کریں اور اس سلسلے میں جو بحث ہو اس میں وہی حصہ لیں جو خود بھی عمل کر سکتے ہیں، یہ کیا لغویت ہے کہ معلوم نہیں ناول کی دم کدھر ہوتی ہے، اچھے برے ناول میں فرق کرنے کی تمیز نہیں مگر کالج میں ناول پڑھاتے ہیں اس لئے کچھ نوٹس بنا کر چھپوا بھی دیئے ہیں اور ناول کے نقاد مشہور ہو جاتے ہیں، یہ بھی تمیز نہیں کہ یہ نوٹس تخلیقی ادب میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں یا نہیں۔ حضرت یوسف پر جب بازار مصر میں بولی لگائی جا رہی تھی تو ایک بڑھیا بھی ایک روئی کی انٹی لئے ہوئے آئی کہ شاید یوسف اس کے بدلے مل جائیں، یہ بڑھیا اب بھی یاد کی جاتی ہے اپنے جذبے کی بنا پر مگر ساتھ ساتھ اپنی حماقت کی بنا پر بھی، آج کل کی کوئی بڑھیا ایسی حماقت نہ کرے گی، زمانہ ضرور ترقی یافتہ ہو گیا، ادب بھی ترقی یافتہ ہونا چاہئے، ترقی کے معنی یہ ہیں کہ جذبہ کے ساتھ شعور بھی کام کرے۔ اگر بڑھیا کو یوسف کے خریدنے کا شوق ہو تو یہ بھی شعور ہو کہ یوسف کی قیمت کتنی ہو سکتی ہے، ہمارے یہاں ادیبوں کا وہ طبقہ وجود میں آنا چاہیے جو تخلیقی قوتوں کو تنقیدی شعور سے برتتا ہو۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ہمارے یہاں ہر دور میں ایسا طبقہ ضرور رہا ہے، کسی دور کے وہ نام لے لیجئے جن کو آج بھی ہم اہم کہتے ہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کی تہہ تک پہنچے ہوتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے فن کا بھی صحیح اندازہ رکھتے ہیں، اس وقت بھی یہی ہونا چاہئے، ایک سلسلے میں تخلیقی ادب کی مانگ ہوئی، تیس مصنفین سامنے آئے، ان میں سے پچیس تو ادیب ہی کہلانے کے قابل نہیں، کسی نے بنیادی جمہوریت پر کتاب لکھی ہے وہ بھی اسے ادب ہی سمجھتا ہے اور کسی نے اقتصادیات کے اصول پر اسکول کی ٹیکسٹ بک لکھی ہے تو وہ بھی ادیب ہے کوئی فلسفیوں سے کچھ حالات چرا لایا ہے تو وہ بھی اپنے کو ادب گنوا رہا ہے ایک تہذیب یافتہ قوم کا فرد یہ نہ جانے کہ اس کی تصنیف تخلیقی ادب ہے کہ نہیں کیا ستم ظریفی ہے پھر ان پانچ پر نظر کیجئے جن کو ادیب کہنا ہی پڑتا ہے تو دو افسانہ نگار ہیں جنھوں نے کبھی افسانے کو تنقید کی نظر سے نہ دیکھا، ردی میں لکھ گئے ہیں، اور مقبول بھی ہو گئے ہیں مگر نہ ان کو خود کو معلوم کہ کیا لکھا اور نہ ان کے پڑھنے والوں کو معلوم کہ کیا تھا دو تنقید نگار ہیں جنھوں نے محض منشی گری کی ہے، فائلیں جمع کرتے رہے اور ڈرافٹ لکھ کر نقاد ہو گئے، ایک فرد ایسا ہے جو علم شعور اور تخلیقی قوت دونوں میں نمایاں کہا جا سکتا ہے مگر زمانہ جمہوریت کا ہے اسی ایک کو ڈھیلے مار کر مار ڈالنا ہی عوام کی رائے ٹھیرتی ہے۔ خیر مقصد یہ ہے کہ یہ ایک شخص جس کو ڈھیلے مار کر مار ڈالنا ضروری سمجھا گیا ہے وہی پیغمبر ہے جب تک اس کے پیرووں کا طبقہ نہ بنے گا اردو ادب تہذیب یافتہ ادب کے دائرے میں نہیں آئے گا۔

کیا ایسے فرد کا اس وقت ہمارے ادب میں امکان ہے، امکان ہی نہیں ایسے ادیب ہمارے یہاں موجود ہیں مگر کچھ ڈھرا ایسا بگڑ گیا ہے کہ ان پر ڈھیلوں کی بوچھار کرنا ہر احمق اپنا فرض سمجھتا ہے، اس سلسلے میں سب سے زیادہ مضرت رساں ہماری جدید تعلیم کا ڈھانچہ ہے۔ کالج اور یونیورسٹیاں ایسے نالائق معلمین سے بھری ہیں جو عہدہ پاکر ادب کے ٹھیکیدار بن گئے، یہ زیادہ تر

جاہل ہیں اور بری طرح احساس کمتری کا شکار ہیں، ان کی جہالت یہ ہے کہ کسی نئے
ادیب کو دیکھ کر سہم جاتے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہہ دیں، زیادہ تر
کو اچھے برے کی تمیز ہی نہیں، اکثر کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس پارٹی کی
مہر ہی لگا دینا چاہتے ہیں، کچھ سب پارٹیوں کو خوش کرنے کے لئے گول گول باتیں
کہنے کے عادی ہو گئے ہیں، کچھ نے سو سو صفحے سیاہ کرنے پر بھی کچھ نہ کہنے کا حق
اپنا لیا ہے، کچھ معلم چونکہ یہی باتیں پڑھا کر [illegible] پھرتے ہیں کہ
دائمی زندگی حاصل ہو گئی، صاحب رائے بنتے ہیں تو ان کی رائے کسی ادیب کے
تعارف کو غلط سمجھ کر مڑ دوڑی ہوئی رائے ہوتی ہے، ایسے اثرات میں پلے ہوئے
لڑکے اور لڑکیاں ایسی کچھ قسم نکلتی ہیں کہ ان کے لئے تنقیدی منشی گیری ہی سب
کچھ ہوتی ہے، جو دیکھے وہ تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ چھپوائے ہوئے آ رہا ہے
اس پر کسی مشہور نقاد کی مہر لگی ہوئی ہے اس لئے اس کو بھی تنقید ہونے کی
سند مل گئی ہے، غرض ضرورت ہے اس ڈھرے کو توڑنے کی، عہدے کی
پرستش سب سے پہلے ختم ہونا چاہیئے، اگر کوئی شخص کسی اثر کی بنا پر پروفیسر ہو گیا
ہے تو محض اسی بنا پر اس کی بات وقعت کے قابل نہیں ہونا چاہیئے، پھر محض سطحی
اور سنسنی خیز ادب کو اس کی مناسب جگہ ہی پر پڑا رہنے دینا ہے، کچھ عرصہ ہوا
کہ ایک پروفیسر نے اردو ناول نگاری پر ایک کتاب شائع کی اس میں سو فی صد
محض پوچ ناولوں کا ذکر ہے، اس کتاب کو پڑھ کر معمولی لوگوں کے ذہن میں
اچھی اور بری ناول کی تمیز مٹ جانا ضروری ہے، غرض اس قسم کے اثرات کو
توڑنا سچے ادیبوں کا پہلا فرض ہے اور جو شخص ایسا کرے وہ ہی اس مقام پر
بھی پہنچ سکتا ہے جہاں سے تشکیل نو کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے یہاں جو لوگ تنقید اور تخلیق دونوں میں [illegible]
ان کو آگے آنا چاہیئے، بہت سے لوگ شروع شروع میں اس طرح نمایاں ہوئے
مگر کچھ وجوہات سے اب معطل ہو کر رہ گئے ہیں، ان کے تعطل کا سبب دریافت
کرنا چاہیئے اور ایسا سامان کرنا چاہیئے کہ وہ سامنے آئیں اور اپنی اہمیت کو خود
منوائیں، یہ وقت مزید [illegible] ہے، ہر نئے قدم اٹھانے کے لئے
پہلے دنیا بالکل تاریک ہو جاتی ہے، لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آتا مگر پھر
سب سے بڑھ کر زیادہ مایوسی کے عالم میں بھی اپنا کام نہ چھوڑنے سے وہ اپنی جگہ
جاتا ہے، اس کے ساتھی پیدا ہوتے ہیں اور پھر وہ کامیاب ہوتا ہے، اس
وقت بھی ہمارے ادیبوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہہ کر آگے بڑھنا بھی چاہتے
ہیں، ہر دور میں ایسے لوگ چند ہی ہوتے ہیں، ان کے نام آئندہ دور میں ملتے
جاتے ہیں، ان ہی کی صفات سے ان کے دور کی خصوصیات کا تعین ہوتا ہے،
عام لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے دور کا ہر فرد ان ہی کی طرح کا تھا، ہمارا
کا دور بھی اپنے مخصوص انداز رکھتا ہے کہ ان سے زیادہ تر لوگ
عمل کرتے ہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

کس نہ دانست کہ من نیز بہانے دارم
آں متاعم کہ شود دست زد بے بصراں

مگر ان لوگوں کا ڈر جھجک شک ہی وہ چیز ہے جو ادب کو ہر طرح کی باتیں سنوا
ہے ان کو اس عالم میں آ جانا پڑتا ہے جس کا نقشہ مولانا روم یوں کھینچتے ہیں

ترس و نومیدیت دان آواز غول
می کشد گوش تو در قعر سفول

یہ بھی ایک مرحلہ ہے جو ہر قائد کو طے کرنا پڑتا ہے مگر اس کا ایک علاج ہے ا
وہ بڑا آسان علاج بھی ہے۔ "آواز غول" سے کان بند کر لئے جائیں ا
اپنے رستے پر آگے بڑھا جائے، ایک صاحب جنہوں نے ایک سے
بیس برس پہلے تنقید و افسانہ دونوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا اب ادب سے
بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لکھتے
مگر چھپواتے نہیں، ناقدوں اور نکتہ چینوں سے عاجز آ گئے ہیں، میں ا
کرتا ہوں کہ بس یہی ساری خرابی کی جڑ ہے، ہمارا بہترین ادیب [illegible]
چلا چھوڑ بیٹھا ہے کیوں کہ اس پر ہنستے ہیں، [illegible] ان کا مسلک بقول غا
یہ ہونا چاہیئے ؎ خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم راہروانست مرا

بدر عالم

# غلام عباس

(جنھوں نے آدم جی ادبی انعام برائے ۱۹۶۰ء حاصل کیا)

غلام عباس صاحب سے ملاقات کا اشتیاق تو بہت عرصے سے تھا لیکن جس وقت سے "جاڑے کی چاندنی" پر انعام کا اعلان ہوا یہ اشتیاق کئی گنا بڑھ گیا۔ عباس صاحب چونکہ دفتر سے رخصت پر ہیں اس لئے ان سے وقت لینے میں کئی دن لگ گئے۔ بالآخر ۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء کو ۱۰-۱۵ بجے ملاقات کا وقت طے ہوا۔ جس وقت میں نرسری کی چھوٹی لین میں چل رہا تھا دس بجکر دس منٹ ہو چکے تھے۔ ٹھیک سوا دس بجے میں اس دو منزلہ پیلی سی عمارت کے سامنے کھڑا تھا جس میں عباس صاحب رہتے ہیں، میں نے ایک خوبصورت اور بھولی بھالی بچی سے جو وہاں کھیل رہی تھی پوچھا، عباس صاحب ہیں، اس کے جواب دینے سے قبل ہی ایک کمرے سے آواز آئی "آئیے آئیے" میں کمرے کے اندر داخل ہوا تو ایک بڑے "عام" سے آدمی کو بیٹھا دیکھا جو اپنے پیروں پر چادر ڈالے گرم کوٹ پہنے سر پر سیاہ اونی گول ٹوپی لگائے بیٹھا ہوا تھا پاس ہی ایک حقہ رکھا تھا، یہ بات بہر حال سمجھی بوجھی سی ہے کہ جب کسی فن کار کو ہم پسند کرنے لگتے ہیں تو اپنے تخیل میں اس کا ایک بڑا پیارا مجسمہ بنا لیتے ہیں۔ جو ذرا عام انسانوں سے مختلف سا ہوتا ہے لیکن جب اس فن کار کو حقیقی دنیا میں دیکھتے ہیں تو اس کے "عام سے انسان" ہونے پر بڑی حیرت ہوتی ہے،

عباس صاحب نے میرا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا، میں ان کے برابر کرسی پر بیٹھ گیا، انہوں نے معذرت چاہتے ہوئے تکیہ کا سہارا لیا اور نیم دراز ہو گئے۔ دراصل انہیں سخت نزلہ ہو رہا تھا شاید کچھ بخار بھی تھا

چنانچہ گفتگو کا آغاز بیماری سے ہوا۔ گولڈ اسمتھ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ لندن میں جب لوگوں کے پاس کوئی موضوع گفتگو کے لئے نہیں ہوتا تو وہ موسم پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ کراچی میں ایک بڑا آرام یہ ہے کہ یہاں موسم کے علاوہ مختلف بیماریوں، حادثوں اور وارداتوں پر بڑی تفصیلی گفتگو کی جا سکتی ہے، ہماری گفتگو کا آغاز بیماری کے تذکرے سے ہوا تو کوئی ایسی تعجب خیز بات نہ تھی، یوں تو میں ملاقات کے لئے بطور خاص گیا تھا لیکن پہلے سے یہ سوچ کر قطعی نہیں گیا تھا کہ گفتگو کیا کروں گا، چنانچہ چند منٹ مجھے "فارم" میں آنے کے لئے چاہئیں تھے، ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ عباس صاحب کے چھوٹے چھوٹے اور پیارے پیارے بچے آئے۔ بھالو پر بڑھیا کے گانے والا گھنٹیاں بجا کر آواز لگا رہا تھا، بچے پیسے مانگ رہے تھے، عباس صاحب نے بڑے پیار کے ساتھ اپنی بچی سے پوچھا "کیا لوگی" "روپی" اس نے بڑی معصومیت سے کہا، عباس صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک روپیہ دیا، بڑی بچی نے سب کو چیز دلائی اور بڑے سلیقہ سے باقی پیسے، خرچ کی تفصیل کے ساتھ واپس کر دیئے، اس وقت اچانک عباس صاحب کو کچھ خیال آیا اور انہوں نے مجھے ایک سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "گھر پر تو میں حقہ پیتا ہوں" میں نے کہا "ضرور پینا چاہئے، یہ تو عین وضعداری ہے" کہنے لگے دراصل بات یہ ہے کہ جو تمباکو ہم استعمال کرتے ہیں وہ بے حد اسٹرانگ (Strong) ہوتا ہے، پھر انہوں نے

وہ تمباکو مجھے دکھایا۔ میں نے ہلکے ہی سے اسے سونگھا تھا کہ مجھے اس کی
تیزی کا احساس ہوا۔ اس کے بعد میں نے ان سے دو مہینے کی اس طویل
رخصت کا سبب پوچھا جس پر وہ آج کل ہیں۔ کہنے لگے، کم دن کی رخصت
لینے سے دوسرے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اس لئے میں اپنی رخصت
جمع کرتا رہتا ہوں اور پھر اکٹھی لیتا ہوں تاکہ اس عرصہ کے لئے دوسروں
کو کم از کم اتنے عرصے ہی ترقی پر کام کرنے کا موقع مل جائے۔" عباس صاحب
کے کردار کی بلندی کا یہ پہلا وہ نقش تھا جو میرے دل پر قائم ہوا۔ پھر
انہوں نے بتایا کہ جس وقت وہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی میں ملازم ہوئے
تو زمانہ وہ تھا جبکہ دلی اسٹیشن کی داغ بیل پڑی تھی اور عملہ بالکل نیا
بھرتی ہو رہا تھا۔ چنانچہ ابتدا میں ملازم ہونے والے لوگ کچھ اس درجہ
خائف سے تھے کہ برسوں میں بھی ایک دو دن سے زاید رخصت نہ لیتے تھے
اس خیال سے کہ مبادا ان کی عدم موجودگی میں کوئی دوسرا شخص اپنی قابلیت
سے افسران بالا کی نظروں میں چڑھ جائے اور یہ ملازمت سے ہاتھ دھو
بیٹھیں یا کم از کم اس کے درجہ میں تخفیف ہو جائے۔ یہاں مجھے موقع ملا،
اور میں نے عباس صاحب سے ان کی ملازمت نیز پرائیویٹ زندگی سے
متعلق بہت سی باتیں پوچھیں،

عباس صاحب کا آبائی وطن لدھیانہ ہے لیکن ان کی پیدائش
(۱۷ ستمبر ۱۹۰۹ء) تربیت و تعلیم لاہور میں ہوئی۔ کچھ نامساعد حالات
کی بنا پر تعلیم نامکمل چھوڑ کر عملی دنیا میں قدم رکھنا پڑا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق
انتہائی بچپن سے تھا ابتدا فری لانسنگ کا ارادہ کر کے کمسنی میں صحافتی
زندگی کا آغاز کیا اور رسالہ "پھول" کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں
اس پرچہ کے لئے انہیں مجبوراً کہانیاں لکھنی پڑتی تھیں چنانچہ کم و بیش تین
چار سو کہانیاں لکھ ڈالیں تقریباً نو برس اس سے وابستہ رہے "پھول" کے علاوہ
"تہذیب نسواں" سے بھی تعلق تھا۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے
وابستہ ہوئے اور "آواز" کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھال لیں، دلی
سے پاکستان بننے پر یہاں آ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ بی بی سی لندن گئے
جہاں ۱۹۵۲ء تک رہے۔ اور اب "آہنگ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے
فرائض انجام دے رہے ہیں۔ عباس صاحب نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز
(بچوں کی کہانیوں کے علاوہ) انگریزی ترجموں سے کیا۔ چنانچہ ان کا
پہلا سب سے اچھا ترجمہ ٹالسٹائی کی ایک کہانی کا "شاعر" ۱۹۲۵ء
میں "ہزار داستان" میں شائع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ
سال کی تھی۔ اس وقت دنیائے ادب میں ٹالسٹائی، آسکر وائلڈ، ٹیگور
پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ عباس صاحب بھی ان سے
بہت متاثر ہوئے، میرے اس سوال کے جواب میں کہ آپ نے پہلی طبعزاد
کہانی کون سی لکھی۔ عباس صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے ترجموں کے
علاوہ کچھ کہانیاں ایسی بھی لکھیں جن کے مرکزی خیال عموماً ماخوذ ہوتے تھے
اور اس طرح کہانی کا تقریباً ½ حصہ اصل تصنیف کا اور باقی ان کا ہوتا تھا۔
کچھ کہانیاں ایسی لکھیں جو مختلف ادیبوں سے متاثر ہو کر لکھیں۔ چنانچہ
اس طرح سے پہلی طبعزاد کہانی "مجسمہ" تھی جو "کارواں" میں شائع
ہوئی۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ "کارواں" عبدالرحمٰن چغتائی
نکالتے تھے، پہلے یہ ۳۳ء میں اور پھر ۳۳ء میں نکلا۔ پہلے ڈاکٹر
تاثیر نے بعد میں کرنل مجید ملک نے اس کی ادارت کی۔ اسی میں ایک اور کہانی
"محبت کا گیت" شائع ہوئی جو ٹیگور سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ "کارواں"
کی تعریف کرتے ہوئے عباس صاحب نے کہا کہ اس سے زیادہ حسین اور
معیاری پرچہ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہماری یہ گفتگو ہو رہی تھی
کہ مسز عباس تشریف لے آئیں وہ ... ... [illegible] کسی کام سے گئی ہوئی
تھیں۔ عباس صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ مسز عباس بڑے خلق
سے پیش آئیں، ان سے دو چار رسمی باتوں میں مجھے ان کی شگفتہ مزاجی
کا احساس ہو گیا۔ گفتگو کے دوران وہ مسلسل مسکرا رہی تھیں، ان کے
انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ عباس صاحب کو بہت چاہتی ہیں اور ان کے

حالیہ ادبی اعزاز سے بہت خوش ہیں۔ عباس صاحب نے ان سے
کافی لانے کے لئے کہا وہ کافی لینے چلی گئیں۔

اس کے بعد میں نے عباس صاحب سے پوچھا کہ آپ کو اپنی کون
سی کہانی سب سے زیادہ پسند ہے؟ وہ ذرا سوچ میں پڑ گئے، اس کے
بعد انہوں نے بتایا کہ اپنی جو چند کہانیاں انہیں پسند ہیں ان میں وہ
بالخصوص "کتبہ" اور "حمام میں" کے نام قابل ذکر سمجھتے ہیں،
انہوں نے ۴۰ - ۱۹۴۱ء کا ذکر کیا جب عسکری صاحب مصنفوں کی
بہترین تخلیقات جمع کر رہے تھے اور انہوں نے عباس صاحب سے
پوچھا تھا کہ کون سا افسانہ شامل کریں۔ عباس صاحب نے "آنندی" پر
(جو شائع ہو چکا تھا اور بے حد مقبول ہوا تھا) "حمام میں" کو ترجیح دی لیکن
عسکری صاحب "آنندی" کے حق میں رہے، میرے پوچھنے پر عباس صاحب
نے بتایا کہ "جاڑے کی چاندنی" میں جو افسانے شامل ہیں، ان میں سے
"سایہ" ان کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

عباس صاحب نے بتایا کہ انہوں نے خاصی تعداد میں دوسری
زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے اپنی طبع زاد کہانیوں کے متعلق انہوں نے
بتایا کہ ابتدا میں وہ اپنی تخیلی فردوس میں تصورات کے صنم تراشتے
تھے اور اپنی خیالی جنت کی رومانی فضاؤں سے ہی اپنی کہانیاں رچایا کرتے
تھے لیکن ۱۹۳۷ء میں جب وہ پہلی بار دلی میں بسلسلہ ملازمت پہنچے
تو وہاں کے کلرکوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ عباس
صاحب نے فرمایا کہ "ہر صبح پژمردہ سے چہروں کا ایک سیلاب امڈتا
ہوا سکریٹریٹ کی طرف آتا اور ہر شام اور بھی پژمردگی کے ساتھ
وہی سیلاب پلٹ کر جاتا ہوا نظر آتا" چنانچہ انہوں نے اپنی کہانی کتبہ لکھی
جس میں ایک کلرک کی آرزوؤں اور تمناؤں کا بڑا نفسیاتی تجزیہ کیا،
اور پہلی بار زندگی کی تلخیوں کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا۔ عباس صاحب
نے یہ محسوس کیا کہ خیالی پیکر تراشنے اور رومانی فضاؤں میں لطف اندوز
ہونے کی بجائے ایک ادیب کو سماج اور اس طبقے کا نمائندہ بننا چاہئے
جسے عوام کہتے ہیں اس طرح "کتبہ" نے ان کی ادیبانہ زندگی میں ایک
ذہنی انقلاب پیدا کیا اور انہوں نے موجودہ انداز کی افسانہ نگاری کو اپنایا
عباس صاحب کا خیال ہے ادیب کو سب کچھ خود ہی کہہ دینے کی بجائے
کچھ قاری کے لئے بھی چھوڑنا چاہئے۔ ان کا خیال ہے کہ "ہم اپنے دکھ آپس
میں بانٹ کر چلیں، میں کہانی اس لئے لکھتا ہوں کہ لوگ اس کو پڑھ کر
میرے ساتھ خود بھی ان مسائل پر کچھ فکر کریں جن کو میں اپنا موضوع بناتا
ہوں تاکہ ہم دونوں مل کر ان کا کوئی حل تلاش کریں" عباس صاحب کا
خیال ہے کہ اگر کہانی کو منطقی انجام تک پہنچا دیا جائے تو اس میں اتنا
تاثر باقی نہیں رہتا، میں نے عباس صاحب کی توجہ ایک مقامی پرچہ کی
طرف دلائی جس نے یہی اعتراض ان پر کیا ہے، اس پر انہوں نے نقوی آرٹ
کا نام لیا کہ اس کے تبصرے میں اسی اعتراض کا کسی قدر جواب موجود ہے۔

عباس صاحب نے        نامی مزاحیہ اداکار کا ذکر کیا،
جس کے مزاج میں بڑی سنجیدگی ہوتی تھی، انہوں نے بتایا کہ وہ ایک مرتبہ
اس بات پر اکتا گیا کہ لوگ کہانیوں کے انجام کے پیچھے پڑے رہتے ہیں،
لہذا اس نے ایک فلم کی کہانی لکھی جس میں ہیرو ہیروئن کی شادی ہوئی
پھر ان کے بچے ہوئے پھر بچوں کے بچے ہوئے غرض ایک طویل سلسلہ
چلتا رہا، پھر یہ دونوں بوڑھے ہوئے، پھر مر گئے اور قبریں بن گئیں۔

عباس صاحب نے مزید فرمایا کہ ہمارے یہاں صحیح معنوں میں
نقادوں کی بڑی کمی ہے، انہوں نے کہا "میری رائے میں ایک
نقاد کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہئے" اس دوران میں مسز
عباس کافی لے آئیں، دو دو لو کر ہوتے ہوئے وہ خود کافی لے کر آئیں
میں ان سے مخاطب ہو گیا، میں نے پوچھا کہ جب آپ نے عباس صاحب
کے اس اعزاز کی خبر سنی تو آپ کے جذبات کیا تھے۔ انہوں نے کہا مجھے بے حد
فخر محسوس ہوا، مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ عباس یقیناً اس کے مستحق تھے،

انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ وہ عباس کی کہانیاں نہیں پڑھ سکتیں، کیوں کہ وہ اردو بہت ہی کم جانتی ہیں تقریباً نہ جاننے کے برابر، حالانکہ ان کی بڑی تمنا ہے کہ وہ جلد از جلد اردو سیکھ جائیں اور عباس کی کہانیاں خود پڑھ سکیں۔ مسز عباس خود بھی ایک ادیبہ اور ایک بہترین آرٹسٹ ہیں

FOLK TALES OF PAKISTAN

انہیں کی تصنیف ہے، ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر دو مکھیاں اڑتی ہوئی آئیں اور میری پیالی میں ڈوب کر مر گئیں، یہ موقع میرے لئے بڑا نازک ہو گیا کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں، بہرحال چپ چاپ پیالی کو ٹرے میں رکھ دیا، چند منٹ بعد مسز عباس کی نظر اس پر پڑی اور وہ میرے انکار کے باوجود دوسرا کپ لے آئیں جب وہ چلی گئیں تو میں نے عباس صاحب سے چند ذاتی سوالات کرنے کی اجازت چاہی انہوں نے بڑی خوشی سے اجازت دی چنانچہ میں نے ان کی شادی کے بارے میں پوچھا عباس صاحب نے بتایا ان کی پہلی شادی دلّی میں ہوئی تھی دوسری لندن کے قیام میں، عباس صاحب ماشاء اللہ بہت سے چھوٹے بڑے بیٹوں کے شفیق باپ ہیں، اس طرح ذمہ داری کا بھاری بوجھ ان کے اوپر ہے، دونوں بیگمات ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔

اس کے بعد پھر ہماری گفتگو موجودہ ادب کے بارے میں ہونے لگی موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں انہوں نے عسکری صاحب کی بہت تعریف کی۔

انہوں نے کہا کہ آج کل کے لکھنے والوں میں ایک عام رجحان اس بات کا پایا جاتا ہے کہ جہاں کوئی لکھنے والا ذرا مشہور ہوا دوسرے لوگ اس کی پیروی کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، خود فکر کم کرتے ہیں اور سب سے بڑی چیز یہ کہ عموماً لوگوں کا مطالعہ بہت محدود ہے ان کا خیال ہے کہ دنیا کے بڑے لوگوں کو پڑھ کر ان کی پیروی کرنا چاہئے۔ عباس صاحب کو ٹالسٹائی، آسکر وائلڈ، ٹیگور، راموسیاں بہت پسند ہیں

اس سنجیدہ گفتگو کے بعد میں نے مسز عباس سے جب کہا کہ عباس صاحب آپ کی جو تمام عادتیں ہیں کیا آپ کیا کیجئے گا وہ بڑے زور سے ہنسے اور بولے بیٹی مجھ سے کتاب کا بل ادا کروں گا (کتاب جو انہوں نے خود چھپوائی ہے) مجھ سے مکان وغیرہ درست کراتی ہے، باقی بچوں کو دے دوں گا بس اور کیا کروں گا۔"

آخر کار ۵۰ منٹ کے بعد میں نے اجازت چاہی ان کی زحمت کا شکریہ ادا کیا، جب میں باہر نکل رہا تھا تو مسز عباس کو گود میں بچہ لئے ہوئے دیکھا اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ مغرب تو خاصہ مشرق کے سانچے میں ڈھل گیا لیکن مشرق، مشرق ہی رہا، کمرے سے عباس صاحب کے حقہ گڑگڑانے کی آواز آ رہی تھی جو دور ہوتی گئی، مجھے ایک اعلیٰ ادیب سے زیادہ ایک اعلیٰ انسان سے مل کر واقعی سچے دل سے مسرت ہوئی تھی۔

---

# اردو یونی ورسٹی

## اخبارات کی نظر میں

### روزنامہ رہنما سکر

کسی ملک کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی اپنی قومی زبان میں تعلیم دی جائے۔ بدنصیبی سے گذشتہ دور میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا جاتا رہا۔ اور اردو کو جو ہماری قومی زبان ہے اسے رائج کرنے میں ہمیشہ لیت و لعل سے کام لیا گیا۔ انقلاب کے بعد پہلی بار اردو کو سرکاری طور پر ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جارہی ہے آج جب کہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ہمارے دانش ور ملک کی تعلیمی اور ثقافتی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی تدابیر پر غور کر رہے ہیں۔ اردو یونیورسٹی کا قیام نہایت ہی مناسب ہے اگر ہم اس احساس کمتری میں مبتلا رہتے کہ اردو زبان ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ اس میں سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم دی جاسکے تو پھر شاید انگریزی ہی ہمیشہ ہم پر مسلط رہتی اس میں شک نہیں کہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں اردو ابھی بہت ہی پیچھے ہے لیکن اگر ہم بیٹھ کر اس کا رونا روتے رہتے اور اس زبان کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لانے کی کوشش نہ کرتے تو شاید ہمیشہ یہی صورت حال رہتی۔ چنانچہ اردو یونیورسٹی کا قیام ہی اس کوشش کی ابتدا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اردو یونی ورسٹی کے قیام کے بعد اردو زبان کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لانا آسان ہوجائے گا۔ اب یہ ہمارے ملک کے دانش وروں اور ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ اس موقع کو ضائع نہ ہونے دیں اور اردو کو ایک ترقی یافتہ زبان بنانے کی عظیم ذمہ داری کو پروقار طریقے سے سنبھالیں۔

(۹؍ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

### پندرہ روزہ نمود سحر سکر

اردو زبان ہمارے لئے صرف اتنی ہی اہمیت رکھتی کہ یہ ہمارے اپنے معاشرے میں پلی اور مدت ہائے دراز سے ہمارے لئے تبادلہ خیال کا ذریعہ بنی رہی بلکہ اردو کی اہمیت ہمارے لئے .. - - - - .. -- -- . یوں بھی ہے کہ ہمارے دینی اور ثقافتی خزانوں کی امانت دار ہے۔ اور ہم اسی لئے اسے اپنی قومی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ دنیا کی کوئی اور زبان سیکھنا چاہے ہمارے لئے کتنی ہی افادیت رکھتی ہو مگر ہم اپنی قومی زبان کے مقابلے میں اسے اہمیت نہیں دے سکتے، اب ایک قومی زبان ہی اس بات کی حقدار ہے کہ وہ ملک کی دفتری زبان ہو۔ درس گاہوں میں ذریعہ تعلیم ہو اور سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہو مگر یہ کس قدر افسوس اور بدقسمتی کی بات ہے کہ ہماری قومی زبان اردو اب تک اپنا یہ مقام حاصل نہ کرسکی۔

شمع اردو کے پروانے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہر قسم کے نامساعد حالات میں بھی اردو کو اس کا اصلی منصب و مقام دلانے کے لئے کوشاں ہیں اور آفریں ہے اس پیری پر جو جوانوں کی سی ہمت سے سرگرم عمل ہے۔

یہ طلباء پر بھی مزید ظلم ہے کہ اعلیٰ علوم کے پیچیدہ اور باریک حقائق کو سمجھنے اور ان پر اظہار خیال کرنے کے لئے ہم کسی پرائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائیں جو نہ صرف یہ کہ ہماری ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے بلکہ غیر اقوام کے لئے ہمارا ذہن مفلوج اور مطیع ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے ثقافتی رجحانات ہمارے ذہنوں پر مسلّط ہونے لگتے ہیں اور ان سے مرعوبیت اور ان کی تقلید کے روگ لاحق ہو جاتے ہیں۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کی تحریک کئی سالوں سے چل رہی ہے اور پچھلے ہفتے ہز ہائی نس پرنس آغا خان نے اردو یونیورسٹی کا افتتاح بھی کر دیا۔ مگر کس حال میں جبکہ نہ تو وہ زمین موجود ہے جہاں یونیورسٹی قائم ہوگی اور نہ ہی وہ آج کے دور کے اخراجات کے مطابق ایک بہت کم فنڈ جس سے اس ادارے کو چلانا ہے۔ اب اس میں یونیورسٹی کی تحریک چلانے والوں کی تو کوئی خطا نہیں، بلکہ یہ اس بے حسی کا نتیجہ ہے جو قومی زبان کے لئے عام طور پر پائی جاتی ہے گو یہ عظیم کام جسے خود حکومت انجام دیتی تو اس کے شایان شان تھا۔ چونکہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کی رو سے پندرہ سال کی مدت میں پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم اردو زبان ہونا چاہیے اور اگر کوئی کالج یا یونیورسٹی یہ یقین رکھتی ہو کہ بعض یا سارے مضامین کی تعلیم اردو زبان میں دی جا سکتی ہے تو وہ ابھی اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کا فرض تھا کہ وہ اس عظیم عمارت کی داغ بیل ڈالتی تاکہ پندرہ سال کے اندر اندر ایک عظیم حیثیت دینا ہے۔ بہرحال اردو یونیورسٹی کا افتتاح اپنی جگہ ایک اہم واقعہ ہے جو کئی عزائم اور فوائد کا حامل ہے لیکن یہ فوائد اس وقت تک حاصل نہ ہوں گے جب تک کہ اس تحریک کو پورے جوش و خروش اور تعاون سے نہ چلایا جائے اور جب کہ ایک فرد واحد نے اس عظیم کام کا بیڑہ اٹھایا ہے تو یہ قوم کا فرض ہے کہ وہ ایک بیدار، حساس اور باشعور قوم کی حیثیت سے اسے بھرپور زمین اور مالی تعاون بہم پہنچاتی رہے امید ہے کہ اردو یونیورسٹی کی تحریک چلانے والے بہت جلد ہمہ گیر پیمانے پر کام شروع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ دن جلد ہی آئے جب اردو یونیورسٹی سرگرم عمل ہو اور ملک میں اپنی قومی زبان اپنے صحیح منصب و مقام پر پہنچے، آمین۔ (۱۹ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

## ہفت روزہ شہاب لاہور

اردو زبان کی اہمیت ہماری نگاہوں میں صرف اتنی ہی نہیں کہ یہ ہمارے معاشرے میں پلی اور ہم اسے چند قرنوں سے ساتھ لیے چل رہے ہیں بلکہ اس کی اصل قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ ہمارے دین و ثقافت کے خزانوں کی امانت دار ہے اور اسی لئے ہم اسے اپنی قومی زبان کہتے ہیں۔ دنیا کی کسی دوسری جدید زبان کا سیکھنا ہمارے لئے کتنی بھی افادیت رکھتا ہو ہم اسے اردو کے مقابلے میں وزن نہیں دے سکتے اور قومی زبان کا حق یہ ہوتا ہے کہ وہ دفتری زبان ہو، سرکاری زبان ہو اور درس گاہوں میں ذریعہ تعلیم ہو اب تک اردو اپنا یہ مقام حاصل نہیں کر سکی۔

اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے اس کا حق دلوانے کے لئے جو بے چینی صدہا دلوں میں موجود ہے وہ سمٹ سمٹا کر ساری کی ساری شاید بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دل میں یکجا ہو گئی ہے۔ یہ دل مضطرب ہر قسم کے ناسازگار حالات میں برابر اردو کو اس کا مقام دلوانے کے لئے کوشاں رہا اور آج بھی اپنے بڑھاپے میں جوانوں کی سی ہمت سے وہ سرگرم سعی ہے۔ بابائے اردو اس وقت اردو یونیورسٹی کے خواب کو جامۂ تعبیر پہنانے کے لئے عمر کے آخری دور کو وقف کئے ہوئے ہیں جو دوسروں کے لئے آرام کا دور ہوتا ہے، حال ہی میں اردو یونیورسٹی کا افتتاح پرنس کریم آغا خان نے ایک شاندار تقریب میں کیا ہے۔

اردو یونیورسٹی کا تصور عثمانیہ یونیورسٹی (دکن) کے مشابہ ہے یعنی اس میں تمام جدید علوم (بہ شمول سائنس) کی تعلیم اردو زبان میں دی جائے گی اور جس طرح پہلے عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر اور ہر شعبے میں اعلیٰ درجے کے علماء و محققین تیار کر کے اس نظریہ کی صحت ثابت کر دی تھی کہ اردو بھی [illegible]

اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ انگریزی کی جگہ ذریعۂ تعلیم ہو سکے اسی طرح پاکستان کی یہ
اردو یونیورسٹی اپنے عملی وجود اور کام سے اس طرح کے مزعومات کا خاتمہ کر سکے گی۔

اعلیٰ علوم کے باریک حقائق کو سمجھنے اور پھر ان پر اظہار خیال کرنے
کے لئے پرائی زبان کو ذریعہ بنانا کسی قوم کے طلبہ پر ایک ظلم ہے اور یہ چیز ان
کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے پھر غیر زبان کے تفوق کے ذریعے غیر اقوام کے
لئے نئی نسلوں میں مرعوبیت اور تقلید کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں، اور
دوسروں کے ثقافتی رجحانات ذہنوں پر مسلط ہونے لگتے ہیں۔

یہ عظیم کام جسے حکومت خود سر انجام دیتی تو اس کے شایان شان
تھا اب ایک فرد تنہا نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ پوری قوم کی
طرف سے اسے بھرپور ذہنی اور مالی تعاون حاصل ہو۔

## روزنامہ "سنگباد" (بنگالی اخبار)

حال ہی میں ہز ہائی نس آغا خان نے کراچی میں اردو یونیورسٹی کا افتتاح
کیا ہے، ہم اردو یونیورسٹی کے بانیوں کے جوش و خروش کو تہ دل سے تعریف
اور مبارک بادی کے لائق سمجھتے ہیں۔ ایک زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں
اردو زبان کو سائنٹفک علوم و فنون سے بہرہ ور کرنے کی جو کوشش کی جا
رہی تھیں وہی طریق کار اس ملک میں بھی اختیار کرنے کی ضرورت تھی اس سے
کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے اردو یونیورسٹی کے بانیوں نے
جس جوش و خروش اور مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے
اردو زبان اور اردو بولنے والے عوام کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔

ایک بات اور کہنے کی ضرورت ہے، بنگلہ بھی پاکستان کی ایک
سرکاری زبان ہے۔ اشاعت و عظمت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بنگلہ بھی
دنیا کی ایک بڑی اور وسیع زبان ہے ہم سمجھتے ہیں کہ بنگلہ کے ذریعہ بنگلہ بولنے
والوں کی تعلیم کم و بیش ہو سکتی ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی کے سوا جدید
سائنسی علوم و فنون کی تعلیم کسی ملکی زبان میں نہیں دی جا سکتی وہ احساس کمتری
میں مبتلا ہیں اگر عزم ہو تو صرف انگریزی ہی کیوں ہم فرانسیسی، جرمنی، روسی
اور دوسری زبانوں سے بنگلہ میں ترجمے کر سکتے ہیں، ملک میں حوصلہ افزائی ہو تو
بنگلہ میں ایسی طبع زاد کتابیں بھی لکھی جا سکتی ہیں، انگریزی کی اجارہ داری
کے سبب ہماری مادری زبان گویا ایک کونے میں پڑی ہے، چند ناولوں افسانوں
اور اسکولوں کی نصابی کتابوں کے سوا اور کسی فن میں تصنیف و تالیف کی حوصلہ
افزائی نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ صورت حال ختم نہیں کی گئی تو جس طرح مادری
زبان کا کوئی مستقبل نہیں رہے گا اسی طرح ملک کا مستقبل بھی تاریک رہے گا۔
اس لئے کہ جو لوگ غیر ملکی زبانوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں سے بیشتر
بے قدر ہو کر رہ جاتے ہیں عملی زندگی میں ان کی تعلیم سے کوئی مفاد وابستہ
نہیں ہوتا اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اردو یونیورسٹی کی طرح اس ملک
میں ایک بنگلہ یونیورسٹی بھی قائم کی جائے، یہ کوئی جذباتی تجویز نہیں بلکہ ملک
کی ایک اہم ضرورت کی طرف اشارہ ہے ہمیں امید ہے کہ ملک کی حکومت اہل
علم اور عوام اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس سلسلے میں مناسب اقدامات
کریں گے۔ (۱۵ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

## ماہنامہ ثقافت لاہور

کل پاکستان انجمن ترقی اردو نے کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم
کر کے ملک کی صحیح تعلیمی ترقی کی طرف ایک نہایت اہم اور ضروری قدم اٹھایا
ہے پاکستان کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ تعلیمی مقاصد اور نظام تعلیم تبدیل کر کے ان کو
قومی ضروریات کے مطابق بنا دیا جاتا، اور انگریزی کی بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم
بنانے کے لئے موثر عملی تدابیر اختیار کی جائیں لیکن بارہ سال تک اس اہم قومی مسئلہ پر
کوئی توجہ نہیں کی گئی اور پاکستان کے مستقبل کی تعمیر میں تعلیم کی اہمیت کو صحیح طور پر ملحوظ
نہیں رکھا گیا اب تعلیمی کمیشن کی سفارشات میں اس اہم قومی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش
کی گئی ہے لیکن گذشتہ چند سال کے عرصے میں بعض خود غرض سیاست دانوں نے قومی زبان
کے مسئلہ کو کچھ اس طرح الجھا دیا ہے اور ایک محدود تعلیم یافتہ طبقہ نے جامد ذہنیت

کے محکمات سے قطعاً بے خبر ہے، خود اپنی لاعلمی کی اردو زبان کی خامی تصور کرتے ہوئے اس کو دفتری اور تعلیمی زبان بنانے کے سلسلہ میں کچھ ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں کہ تعلیمی زبان کے مسئلہ کو خاطر خواہ طور پر حل کرنا تعلیمی کمیشن کے لئے بھی دشوار ہو گیا۔

پاکستان میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت انگریزی کو اس غلط فہمی کی بنیاد پر برقرار رکھا گیا کہ اردو میں مختلف علوم کی تعلیم دینا ممکن نہیں اور اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا کہ ایک غیر زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے ہمارے قومی اور تعلیمی مقاصد کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔ طلبا کی ذہنی صلاحیتوں اور جدت پر اس کا کیا اثر پڑے گا اور قومی روایات اور تہذیب و ثقافت کے لئے اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد کے مطابق ہندوستانیوں کے لئے ایک نظام تعلیم وضع کیا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے لیکن سیاسی فہم و بصیرت رکھنے والے رہنما ہمیشہ محسوس کرتے رہے کہ یہ نظام تعلیم ہندوستان میں بسنے والی قوموں کے نقطۂ نظر سے انتہائی مضرت رساں ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے ہندوستان میں مختصر قیام کے دوران ہی اس حقیقت حال کو محسوس کر لیا تھا اور اردو کو مشترکہ قومی زبان بنانے اور اردو یونیورسٹی قائم کر کے اردو میں قدیم و جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم دینے کی اہمیت پر بہت زور دیا تھا اور سید احمد خاں نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا کہ جب تک جدید علوم کی تعلیم اردو زبان میں نہ دی جائے گی ہماری تعلیم ناقص اور غیر موثر رہے گی۔ ملکی زبان میں تعلیم دینے کی افادیت کا عملی تجربہ بھی اسی زمانے میں ہو گیا تھا کیونکہ دہلی کالج میں تمام جدید علوم کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور اس میں اس قدر کامیابی ہوئی تھی کہ خود انگریز ماہران تعلیم نے یہ اعتراف کیا کہ اردو میں جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا اپنے مضمون پر ان طلباء کے مقابلے میں زیادہ حاوی ہوتے ہیں جو یہ علوم انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ اگر ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم میں یہ کالج ختم نہ ہو جاتا تو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اردو زبان کی حالت بالکل مختلف ہوتی۔

موجودہ صدی میں جمال الدین افغانی اور سید احمد خاں کے تصورات کو حیدرآباد دکن میں عملی شکل دی گئی اور عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تھی جہاں اعلیٰ ترین مدارج میں بھی تمام علوم و فنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اس میں سائنس، انجینیری اور مغربی طب کی تعلیم بھی شامل تھی اور جدید نظری اور تجربی علوم کے جداگانہ شعبے قائم تھے۔ ہندوستانی یونیورسٹیاں تو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر جامعہ عثمانیہ کو عملاً تسلیم نہ کر سکیں لیکن برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں نے جامعہ عثمانیہ کو نہ صرف تسلیم کر لیا بلکہ اس کے اعلیٰ معیار تعلیم کا بھی اعتراف کیا۔ نیز برطانیہ اور ہندوستان کے ممتاز ماہرین تعلیم نے بھی اس کامیاب تجربے کو وسیع النظری اور عزم و ہمت کا ایک کارنامہ قرار دیا اور یہ تسلیم کیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا دوسرے طلبا کے مقابلے میں اپنے مضمون پر زیادہ عبور رکھتے ہیں اور مشکل مضامین میں بھی امتیاز حاصل کرتے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی قومی زبان میں تعلیم پاتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے آج یہ مطالعہ کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم دی جا سکتی ہے یا نہیں تعلیمی ترقی کی راہ میں یہ منزل تو بہت پہلے طے ہو چکی ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم دینے کے لئے گزشتہ کامیابیوں اور کارناموں سے فائدہ اٹھایا جائے اور اسی کام کو اس منزل سے آگے بڑھایا جائے جہاں عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کو تیس سال کی کامیاب جدوجہد کے بعد پہنچایا تھا۔

(نومبر ۱۹۶۰ء)

---

شوس (علیگ)

# غزل نما

ہوئی نہ وجہ سکوں چشم تر کی چارہ گری
رہی چھلک کے بھی مینائے دل بھری کی بھری

جو تم ملے تو کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
فغان نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری

ہزار خندۂ گل، ایک رقص برق و شرر
ہزار ضبط فغاں، اک نظر کی پردہ دری

ہزار سجدۂ دیر و حرم سے بہتر ہے
اک آہ نیم شبی، ایک گریۂ سحری

جس قدر غنچے کھلے تھے تو بہ تو
میری آنکھوں سے لہو برسا گئے

فسانہ ساز رہے گا نظر نظر کا سکوت
ترے حرم میں اگر سل گیا لب فریاد

کچھ جاگے سے کچھ کھوئے سے، یوں بیٹھے ہیں اس محفل میں
جیسے کوئی منزل کھو بیٹھے، جیسے کوئی رستہ بھول گئے

ہم ہی گر محفل سے اٹھ جائیں تو پھر محفل کہاں
نغمہ ہم، مضراب ہم، مے ہم، خم و پیمانہ ہم

میری حد سے ترے تبسم تک
راز تیرا ہی راز ہوتا ہے

نگاہ شوق رہی بردر دگار حسن رنگیں ہے
کبھی دریا، کبھی موج رواں معلوم ہوتی ہے

نظر پڑتی ہے جا کر جب مآل حسن رنگیں پر
کلی کھلنے سے پہلے خوں چکاں معلوم ہوتی ہے
مرے حساس دل میں درد ہے سارے گلستاں کا
مجھے ہر شاخ شاخ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کس کو فرصت ترے تصور سے ؛ ایک حرف غلط ہے تنہائی

ترے شہر میں وہ عالم بھی گزر گیا جنوں کا ؛ کوئی مجھ سے بات کرتا تو میں اشکبار ہوتا

حسن کی خامشی ارے توبہ ؛ کوئی جیسے کسی کو دے آواز
سو ہنگامے ایک سکوت ؛ رہ گئی دل ہی میں دل کی بات
موج و ہوا کی سمت نہ دیکھو ؛ جلتی رہے گی شمع حیات

(انتخاب از "نبض دوراں" مطبوعہ ۱۹۹۰ء - ناشر مکتبہ افکار - کراچی)

عابد رضا بیدار

(گذشتہ سے پیوستہ)

# ادب کی رفتار

(سن ۱۹۵۹ء میں)

احمد فراز
حرم و دیر جسے لائق تعزیر کہیں
ہم اسی جذبۂ سرکش کو خدا کہتے ہیں

آل احمد سرور
جہاں میں ہو گئی ناحق تری جفا بدنام
کچھ اہل شوق کو دار و رسن سے پیار بھی ہے

جذبی
اب یہی لے جو خندۂ یاراں کے خوف سے
برسوں ہمارے سینے میں طوفان سے رہے

حبیب احمد صدیقی
تہمت فتنہ گری اور ان آنکھوں پہ جنھیں
بہکا بہکا سا لب کی طرز کلام آتا ہے

حیرت شملوی
کھو چکا ہے جب سے کچھ پایا ہوا
آدمی پھرتا ہے گھبرایا ہوا

ان کی بیگانہ وشی سے دنیا
نہ بھی مرتی، ہو تو مر جائے گی

زلف کا ان کی سنورنا ہی کیا
جب سنواریں گے سنور جائے گی

خلیل الرحمن اعظمی
وہ رہا ہی سہی لیکن خبر لیتے رہو دل کی
دل آخر دل ہے کیا جانے کہاں جا کر بہل جائے

راہی معصوم رضا
اظہار تمنا پر کتنی تھیں پابندیاں جب
اس وقت کہاں تھے یہ انداز بیاں والے

روش صدیقی
ترا ملنا تھا دشوار لیکن
خلوص عشق نے مشکل بنایا

رشیدہ سلیم سیمیں
یار بار اپنی وفاؤں کی کہانی نہ کہو
ہم وفاؤں کے بیوپاری ہیں خریدار نہیں

زبیر رضوی
جب زندگی لطافت صہبا میں ڈھل گئی
دامن بچا کے گردش دوراں گزر گئی

شاعر لکھنوی
کبھی حرم کا ذکر آیا کبھی توبہ کا نام آیا
گذر کر کتنے ہنگاموں سے مجھ تک دور جام آیا

لفظ و معنی کی صداقت نہ بدل جائے کہیں
آج اپنوں سے مجھے بوئے دغا آتی ہے

محمود ایاز
کتنے رندان تری بزم سے اٹھتے ہی گئے
نہ چھٹے ہم سے پر آشفتہ مزاجی کے پیام

اب جہاں چاہے وہاں گردش دوراں لے جائے
میرے خوابوں میں سلامت مری یادوں کا وطن

وارث کرمانی
تری ادا سے بھی عظیم تر، ترے حسن سے بھی لطیف تر
مری زندگی میں کچھ اس طرح کے بھی حادثات گزر گئے

## نظمیں :-

| | | |
|---|---|---|
| ساحر لدھیانوی | میرے عہد کے حسینو | شاعر بمبئی |
| سردار جعفری | میری سوغات بھی دل | افکار [illegible] |
| اختر الایمان | یادیں | سویرا ۲۵ |

| | | |
|---|---|---|
| احمد ندیم قاسمی | یادوں کے کھنڈر | نیا دور ۔ پاک |
| فیض احمد فیض | حمد | ماہ نو ۔ مارچ |
| فیض احمد فیض | دل فگار چلو | افکار ۔ " |
| مہذب الرحمٰن | بغاوت | علی گڑھ میگزین |
| خورشید الاسلام | پیاس | ہماری زبان ۸ جون |
| محمود سعیدی | یادوں کا جزیرہ | آجکل، ستمبر |
| قمر رئیس | جرم آگہی | پگڈنڈی، نومبر |
| قمر رئیس | دام ہر موج | مشرق ۳-۱۳ |
| اعجاز احمد | رنگ و نور کی جلتی راہیں | افکار، جنوری |

## افسانے اور ڈرامے

| | | |
|---|---|---|
| احمد ندیم قاسمی | گھر سے گھر تک | ماہ نو ۔ اگست |
| کرشن چندر | اندھیرے کا ساتھی | سوغات ۳ |
| | دل کسی کا دوست نہیں | شاعر ۔ مئی |
| رام لعل | سنکٹ | صبا، مئی |
| حیات اللہ انصاری | نیا کھاتا | سویرا ۔ ۲۵ |
| | جھوٹی زنجیر | نقوش ۔ |
| | کرایہ | آجکل، اپریل |
| ابوالفضل صدیقی | خالی ہاتھ | نقوش |
| عصمت چغتائی | بچھو پھوپھی | نقوش |
| غلام الثقلین نقوی | شیرا نمبردار | ماہ نو، ستمبر |
| واجدہ تبسم | گھاؤ | نقوش |
| | خندق ۔ ڈراما | مشرق آزادی نمبر |
| | ڈائن ۔ " | قند ۔ ۴ |

اور نوید انجم اور جمیلہ ہاشمی کے افسانے

## انشائیے اور مزاحیے

مشتاق احمد (افکار، مارچ)، احمد جمال پاشا: ادب میں مارشل لا (علی گڑھ میگزین)، آوارہ: نانی اماں (نیا دور، ستمبر)۔ رنگے سیار (نیا دور، اپریل) ست پرکاش سنگر۔ اے دوست کسی

## صحافت پس

حسرت اور اردوئے معلّی (عبدالسلام خورشید) استقلال، یکم اگست

مرزا اشرف اور اشرف الاخبار (محمد عتیق صدیقی) پگڈنڈی ۔ نومبر

حیدرآباد کے چند قدیم علمی و ادبی رسالے (نصیر الدین ہاشمی) نیا دور، اکتوبر

طلسم لکھنؤ (فرحت فاطمہ) آجکل، دسمبر

پریس رجسٹرار کی تیسری رپورٹ (سردر صاحب) ہماری زبان ۔ یکم ستمبر

حیدرآباد کا پہلا ماہوار رسالہ (نصیر الدین ہاشمی) " یکم اکتوبر

---

## نئے پرچے جو ۱۹۵۹ء میں نکلنے شروع ہوئے

۱۔ ماہنامہ دانش رام پور (۲) ماہنامہ مجلس حیدرآباد
۳۔ ماہنامہ اردو وینچ لکھنؤ (۴) ماہنامہ شعور کراچی
۵۔ " جائزہ کراچی (۶) استقلال لاہور
۷۔ ہفت روزہ نصرت لاہور (۸) پندرہ روزہ آثار کلکتہ
۹۔ ماہنامہ میثاق " (۱۰) ماہنامہ نقش دیوبند
۱۱۔ پندرہ روزہ جوہر رام پور (۱۲) پندرہ روزہ غالب علی گڑھ
۱۳۔ ماہنامہ ساغر راولپنڈی (۱۴) سہ ماہی سوغات بنگلور

## ۱۹۵۹ء کے خاص نمبر

(۱) آجکل ڈراما نمبر: بچوں کے ڈرامے (اطہر پرویز)، عوامی سٹیج (جی ایل ادیب)، مصنفین ناٹک ساگر (حسن شاہ) جدید اردو ڈراما (احتشام حسین) پارسی اردو تھیٹر (راجندر ناتھ شیدا) ماڈرن اردو سٹیج کا پس منظر

(عبدالعلیم نامی) ہندوستان میں تھیٹر کے موجودہ ادارے (آر-جی-آنند) ہریانہ کا عوامی اسٹیج (راجہ رام شاستری) اردو ڈراما آزادی کے بعد (محمد حسن) ریڈیائی ڈراما اور اس کی تکنیک (ریوتی سرن شرما) ہندوستانی فلموں پر ڈرامے کا اثر (مقصد ۱۳۰) اردو ڈراما اور گلکرسٹ (محمد عتیق صدیقی)

(۲) الشجاع کراچی، عبدالحق نمبر (ذاکر صاحب، سرور، رضا حسین نصیر ہاشمی، محمود علی خاں جامعی اور بابائے اردو)

(۳) داستان گو لاہور۔ ناولٹ نمبر جلد ۲ شمارہ ۱۵-۱۶-جنوری فروری ۱۹۵۹ء صہ ۲۷۴ ۔

(جلاوطن (واجد تبسم) آتش رفتہ (جمیلہ ہاشمی) موم کی گلیاں (مہر شکاری) دجلہ (شفیق الرحمٰن) نور کیلنڈر کمپنی (خالد اختر) بیں خزاں میں آؤنگا (اے حمید) قصہ داستان گو کا (اشفاق احمد))

(۴) ادیب علی گڑھ انشائیہ نمبر

(۵) نیرنگ خیال سال نامہ

(۶) صنم پٹنہ بہار نمبر

(۷) ہمایوں سالنامہ

(۸) نیر نیمروز وحشت نمبر

(۹) چراغ راہ اسلامی قانون نمبر

(۱۰) البصیر شبلی نمبر

(۱۱) فروغ اردو لکھنؤ حالی نمبر

(۱۲) قند مردان افسانہ نمبر

(۱۳) افکار کراچی "

(۱۴) شاہکار الہ آباد ۱۹۵۷ء کا انتخاب نمبر

(۱۵) لیل ونہار لاہور استقلال نمبر

(۱۶) ساقی کراچی میر نمبر (انتخاب عسکری)

(۱۷) صبا ابوالکلام نمبر

(۱۸) ساغر بمبئی سالنامہ

(۱۹) علی گڑھ میگزین مرتبہ حسن مثنیٰ انور

(۲۰) الجمعیۃ آزاد نمبر

(۲۱) ادب لطیف ناولٹ نمبر

(۲۲) نقوش پطرس نمبر ۶۴ء

## لکھنے والے

ہیمر شولڈ، نیویارک ٹائمز۔ نیویارکر، بارنلی ہیمن، عبداللہ قریشی آغا بابر۔ شوکت تھانوی۔ پی، اے ہاشمی۔ سر ظفر اللہ خاں۔ سالک رشید احمد صدیقی، عصمت، مہر، صوفی تبسم، ذوالفقار بخاری کپور۔ ڈاکٹر حمید الدین۔ عبداللہ چغتائی۔ عشرت رحمانی حکیم یوسف حسن، احسن فاروقی، تمکین کاظمی۔ وزیر آغا۔ اثر لکھنوی۔ اور محمد طفیل۔

علاوہ ازیں پطرس کی مطبوعہ، غیر مطبوعہ اور غیر معروف تحریریں یکجا۔

## کتابیں

### ناول اور افسانوں کے مجموعے

نئی دھرتی پرانے گیت رام لعل ص ۲۰۹ لکھنؤ

کھنڈر گھنڈر بابل بابل۔ رشیدہ رضویہ ص ۲۷۹ کراچی (افسانے)

انیس سو چوراسی۔ جارج آرویل۔ مترجمہ ابوالفضل صدیقی ص ۴۶۱ اردو اکیڈمی سندھ (ناول)

زندگی کے کھیل صالحہ عابد حسین ص ۲۳۰ کتابستان، الہ آباد

کائنات تبسم، شوکت تھانوی علوی بک ڈپو

باتیں پتا نہیں سراج رضوی ۲۳۶

پت جھڑ تاب اسلم ص ۱۹۲ لاہور (ناول)

غم آنند رئیس احمد جعفری ص ۲۱۶ نفیس اکیڈمی کراچی (ن)

برگ حنا — احمد ندیم قاسمی ص۱۹۸ ناشرین لاہور (افسانے آٹھواں ایڈیشن)
بند دریا — سلیم پانڈے ص۲۳۰ لاہور (افسانے)
دیکھو کبیرا رویا — اکرام لدھیانوی ص۲۱۱ ادارۂ نو لاہور
انصاف — گالزوردی مترجمہ سید قاسم محمود ص۱۵۶
مکتبہ کائنات لاہور
قصص الحمرا — ارونگ مترجمہ سید وقار عظیم ص۲۳۲ آئینۂ ادب لاہور
اشک و تبسم — جبران مترجمہ حبیب اشعر ص۲۲ 〃 〃
ڈاکٹر ژواگو — پاسترناک مترجمہ یوسف صدیقی ص۳۰۶ کراچی (ناول)
بادل گرجے — یوسف السباعی مترجمہ امجد حسین سیدی ص۲۲۴
ناشرین لاہور (ناول)
اسلامی افسانے — نور احمد خاں زیدی ص۱۰۲ ملتان (افسانے)
چوپال — عادل رشید ص۱۲۵ ایشیا پبلشرز کراچی ناول
ڈوبتے سائے — 〃 ص۲۲۰ 〃 〃 〃
لب بام — 〃 ص۳۰۰ 〃 〃 〃
سنگ گوہر — صالحہ عابد حسین رام دیال الہ آباد 〃

## شعری مجموعے

دیوان غالب — سردار جعفری ایڈیشن (اردو۔ ہندی) ہندستانی بک ٹرسٹ بمبئی
دیوان غالب — امتیاز علی عرشی ایڈیشن۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ
قابل اجمیری کے سو شعر ص۶۴ ادارۂ ادبیات حیدرآباد سندھ
تیز ہوا اور تنہا پھول — منیر نیازی ص۵۶ مکتبہ کارواں لاہور
ارمان — مجید شاہد ص۲۷۶ گوشۂ ادب 〃
نذر خیام — راجہ مکھن لال حیدرآبادی کا منظوم ترجمہ
مرتبہ تقی الدین احمد حیدرآباد
تلخابۂ شیریں — حفیظ جالندھری لاہور
سوز و ساز — 〃 〃

تابش سہیل — اقبال احمد خاں سہیل مرتبہ افتخار اعظمی ص۲۰۳ لکھنؤ
حیدرآباد کے شاعر — مرتبہ حمید الدین شاہد ص۳۳۶ آندھرا اکیڈمی
کلام بے نظیر — بے نظیر شاہ وارثی مرتبہ اکبر الدین صدیقی ص۱۲۴
آب جو — اختر الایمان (گرداب بھی اس میں شامل کرلی گئی ہے) ص۱۰۰
نیا ادارہ لاہور
صدف — شہزاد احمد ادب محل لاہور
دیوان عیاں میرٹھی — مرتبہ سید محمد صفی راولپنڈی
آب و تاب — سعادت نظیر حیدرآباد
نبض دوراں — انور صابری ص۳۰۶ صابری بکڈپو دہلی
انجم کدہ — عزیز لکھنوی ص۱۴۴ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
سحر غزل — ساحر ہوشیارپوری ص۱۶۰ دہلی
رنگ برنگ — ریاست مدراس کے نمایندہ شعرا کی غزلوں کا انتخاب
ص۳۳۶ مرکز ادب مدراس
طاق ابرو — شہرت بخاری ص۲۲۴ کلاسیک لاہور
سنگ پیرہن — عمیق حنفی ص۹۶ جاوید پبلکیشنز بھوپال
حسرت کدا — شفقت کاظمی ص۱۲۶ علمی کتب خانہ مظفرگڑھ
معانی سخن — انتخاب کلام محمد علی قطب شاہ۔ مرتبہ محی الدین
ص۱۱۲ سب رس حیدرآباد
دیوان داؤد اورنگ آبادی — مرتبہ خالدہ بیگم ص۱۴۰ سب رس حیدرآباد
سرود رفتہ — سیفو مترجمہ عبدالعزیز خالد ص۱۴۰ مشرق، کراچی
۵۸ برکی بہترین نظمیں — اکادمی پنجاب
کلیات غواصی — مرتبہ محمد بن عمر
سب رس حیدرآباد

(باقی آئندہ)

محمد حسین خان زبیری

# مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

مجھے اس سال حج بیت اللہ اور زیارت روضہ رسول اللہ صلعم کی سعادت نصیب ہوئی۔ حجاج کا جو عام راستہ ہے اس طرف سے میں نہیں گیا بلکہ پہلے عدن گیا اور وہاں سے جدہ اور پھر مکہ معظمہ و مدینہ منورہ، عدن اور جدہ میں کافی دن ٹھہرنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، چند باتیں ایسی مشاہدے اور تجربے میں آئیں جو قارئین قومی زبان کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی اس لئے انہیں قلم بند کر کے پیش کرتا ہوں۔

عدن میں حالانکہ انگریز کی حکومت ہے لیکن میں نے دیکھا بازار میں تمام دوکانوں پر جو بورڈ لگے ہیں ان پر عربی میں نام لکھے ہوئے ہیں، انگریزی میں اگر نام ہے تو اسے ثانوی حیثیت حاصل ہے اور قلم خفی ہے، مثلاً "دار الکہربا" (ریڈیو اور بجلی کی دوکان)، "بیت المفروشات" (فرنیچر ہاؤس) "صالون الامرا" (حجام کی دوکان) "مطعم النصر" (کھانے کی دوکان) ...ازیں سڑکوں پر جہاں آپ "نو انٹری" لکھتے ہیں وہاں "الدخول الممنوع" اور "نو پارکنگ" کی جگہ "الوقوف الممنوع" کا بورڈ لگا ہوا ہے، دوکاندار عرب، ہندو، بوہرے، یہودی ہیں یہ سب بلا تکلف عربی میں بات چیت کرتے ہیں، مقامی انگریز بھی جب دوکان میں آتا ہے تو عربی میں گفتگو کرتا ہے،

جدہ میں تمام دوکانوں اور سڑکوں کے بورڈ بالکل ہی عربی میں ہیں یہاں مجھے کئی بڑے تاجروں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان کے دفاتر میں جنہیں وہ مکتب کہتے ہیں (مثلاً پوسٹ آفس مکتب البرید ہے) حسابات بالکل جدید طریقے پر رکھے جاتے ہیں، لیجر اور کیش بک بالکل جدید طرز کے ہیں، جیسے کسی بڑی انگریزی یا پاکستانی فرم میں لیکن تمام حساب کتاب عربی ہندسوں میں لکھا جاتا ہے، ٹائپ رائٹر عربی کے موجود ہیں اور جمع جوڑ کی مشین بھی ہے لیکن اس میں بھی عربی ہندسے ہیں ٹیلیفون ڈائرکٹری عربی زبان میں ہے، ٹیلیفون پر ہندسے عربی ہیں، جدہ میں جن صاحب کے مکان پر قیام تھا وہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر ہیں میں ان سے اپنے لڑکے کی معرفت بات چیت کرتا تھا۔ میرا لڑکا اس لوکل میں ڈینٹل افسر ہے اور فر فر عربی بولتا ہے، ان تاجر صاحب کا ایک لڑکا جو اسکول میں پڑھتا ہے مجھ سے ملوایا گیا اور باپ نے کہا کہ اس سے آپ انگریزی میں بات کیا کریں، میں نے اس سے گاہ بگاہ باتیں کیں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جیسے ہمارے اسکولوں کے طالب علم بولتے ہیں جواب دے دیتا تھا، ایک دن میں نے اس سے کہا کہ تم انگریزی میں بات چیت کیا کرو تو بولنی آجائے گی کہنے لگا ہم اپنی زبان کو چھوڑ کر انگریزی کیوں بولیں یہ تو اس لئے پڑھتا ہوں کہ دوکان یا دفتر میں کام آئے گی میں اس کے اس قومی جذبے سے بے حد متاثر ہوا۔

ہمارے اپنے ملک میں ہماری اردو زبان کی جو گت بن رہی ہے، اسے آپ جانتے ہی ہیں، کراچی میں جتنے صوبائی اپنا پرانا وطن ترک کر کے آئے

ہیں وہ سب سویٹ میٹ مرچنٹ بن گئے ہیں، بکر قصاب نے مٹن شاپ کھولی
ہے اور بڑا گوشت بیچنے والے نے بیف شاپ، جراح نے مرہم ہاؤس بنایا ہے
جن لوگوں نے نئے مکان بنوائے ہیں انہوں نے "ولا" "کاٹیج" "مینشن" اور
"پیلس" وغیرہ بنوائے ہیں اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگ بنگلے انگریزی نام
اپنے مکانوں کے رکھ لئے ہیں، دروازے پر مکین کا بورڈ بھی انگریزی میں ہے،
دوکانوں کے سارے بورڈ انگریزی میں ہیں اردو یا گجراتی بنگالی کو ثانوی
حیثیت حاصل ہے، آپ گھر میں جھانک کر دیکھیں تو ابا اماں غائب ان کی جگہ
ڈیڈی اور ماما نے لی ہے، چچا کی جگہ انکل اور چچی کی جگہ آنٹی براجمان
ہیں، مردوں کو تو چھوڑیے خواتین بڑے فخر سے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں
سے انگریزی میں بات چیت کرتی ہیں، میرے علم میں ایک صاحب ہیں جن کا
معصوم بچہ ان کے ہاتھوں خوب پٹا محض اس بات پر کہ اس نے ڈیڈی
کی بجائے کچھ اور کہہ دیا تھا۔

پاکستان کی مرحوم حکومتوں کے دور میں کئی مرتبہ یہ امید بندھی تھی کہ کراچی
کی سڑکیں مسلمان ہو جائیں گی لیکن انقلاب سے کچھ قبل کارپوریشن نے سمنٹ کے بورڈ
بنوا کر گڑوا دیئے اور پرانے نام بدستور قائم رہے، فریر صاحب، نپیر صاحب،
اور لارنس صاحب وغیرہ نے ہمارے ملک اور قوم پر اتنے احسانات کئے ہیں
کہ ان کی یادگار قائم رہنی ضروری ہے، خیر صاحب رہنے دیجئے لیکن آپ
حیران ہوں گے کہ فریر روڈ پر ایک مارکیٹ تعمیر ہوئی ہے پہلے تو اس کے
دروازے پر موٹا سا ایوب مارکیٹ لکھا ہوا تھا لیکن ایک دن جو ادھر سے
گزر ہوا تو اب بجائے ایوب کے فریر لکھ دیا گیا۔ ہمارا کوئی نہ لیڈر رہے نہ قائد
ہے، ہم جب کوئی نئی پبلک عمارت بناتے ہیں وہ بھی انگریز کے نام پر، اس
سے بڑھ کر بھی قومی بے غیرتی کی کوئی مثال کسی ملک میں آپ کو ملے گی۔

کراچی میں جتنی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں وہ سب کالونی کے
نام سے موسوم ہیں، یہاں سرکاری ملازموں کی بھی ایک بہت وسیع و عریض
بستی ہے جتنی وہ وسیع و عریض ہے اتنا ہی طویل اس کا نام ہے، میری مراد
"پاکستان ایمپلائیز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی" سے ہے یہ تعلیم یافتہ
لوگوں کی آبادی ہے اسے مختصراً PECHS کہتے ہیں، ایک جرمن
دوست سے ملنے کا اتفاق ہوا دوران گفتگو میں ان سے پوچھا، آپ رہتے کہاں
ہیں کہنے لگے میں "پیچ" میں رہتا ہوں پہلے تو ایک دم سمجھ میں نہ آیا، ذرا
دماغ پر زور دیا تو پتہ چلا کہ PECHS کی بگڑی صورت ہے، کراچی والوں
کا چونکہ براہ راست یورپ و انگلستان سے تعلق ہے انہیں گلبرگ اور سمن آباد
سوجھتے ہی نہیں، نہ باغ جناح اور گلستان فاطمہ کی بھینی بھینی خوشبو کا ان پر
اثر ہوتا ہے، یہاں تو گاندھی گارڈن، برنس گارڈن جیسی چیزیں ہیں، یا شاید
یہاں کے باشندے اس کے منتظر ہیں کہ اس کے لئے بھی مارشل لا کا کوئی
آرڈیننس جاری کیا جائے۔

کراچی میں ہر سال تعلیمی دوکانیں کھلتی رہتی ہیں، میری مراد رجسٹرڈ
اسکولوں سے ہے ان میں بیشتر تعداد ایسے اسکولوں کی ہوتی ہے جن کا ذریعہ تعلیم
انگریزی ہوتا ہے اور جہاں قوم کے معصوم بچے دھوبی کے کتے گھر کے نہ گھاٹ
کے بنائے جاتے ہیں، ان نام نہاد "کے جی" اسکولوں میں وہی بابا بلیک شیپ !!
بچوں کو رٹوایا جاتا ہے ان مدرسوں کے استادوں کو نہ مولوی محمد اسمٰعیل کی نظم
کا پتہ ہے نہ حفیظ جالندھری کا "بندر والا آیا" انہیں معلوم ہے مگر وہ بیچارے
کیا کریں جیسے گاہک ویسا مال، ہر پاکستانی کی خواہش ہے کہ اس کا بچہ فر
فر انگریزی بولنے لگے اور اپنی اور اپنی ماں کی زبان بھول جائے، ان تعلیمی
دوکانوں میں بیشتر ایسی ہیں کہ جن پر کسی نہ کسی عیسوی سینٹ کا سایہ ہے یعنی ان کے
نام سینٹ پاک میری اسکول جیسے نام ہیں حالانکہ اس کے مالک مسلمان
ہیں، جوشن کے اسکول ہیں وہاں معصوم بچوں کو تصاویر کے ذریعہ بائبل کی
تمام تاریخ ذہن نشین کرادی جاتی ہے، گرامر اسکول میں پڑھنے والے طلبا کے سر
پرستوں سے لکھوا کر دے رہے ہیں کہ انہیں بائبل پڑھاؤ ہمیں کوئی عذر نہیں،
حکومت نے دو قسم کے اسکول منظور کئے ہیں ایک وہ جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے
وہ جہاں اردو ہے اول الذکر میں پڑھ کر نکلیں گے وہ ملک کے حاکم ہوں گے اور آخر الذکر والے محکوم

جدہ کے دوران قیام میں ایک بات ایسی ہوئی کہ میں ندامت کے مارے سر نہ اٹھا سکا۔ ایک صاحب فرمانے لگے، صاحب اب تو آپ آزاد ہیں انگریز کی غلامی تو ختم ہوئی، یہ پاکستان سے ریڈیو پر جو خبریں ہوتی ہیں، ان میں تو انگریزی ہی کو اولیت حاصل ہے، خبریں پہلے انگریزی میں نشر ہوتی ہیں پھر اردو میں، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اردو میں پہلے نشر ہوتیں اور غیر ملکی پروگرام میں انگریزی میں ہوا کرتیں اور اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ ساتھ ساتھ سول پھر بھی اپنی ملکی عوامی زبان کو اولیت ہونی چاہیے۔ بات پتہ کی تھی میں تو شرمندہ ہو گیا ممکن ہے ریڈیو کے کارکنان کے پاس اس کا کوئی جواز ہو،

یہ جو کچھ میں نے خامہ فرسائی کی ہے کہنے کو تو یہ بہت معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے قومی جذبہ کی جو پرورش ہوتی ہے وہ بہت مفید ہے اور ان سے دور رس نتائج برآمد ہوتے ہیں، ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اب شادی بیاہ میں دعوتی رقعے بھی انگریزی میں طبع کراتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے حالانکہ دور غلامی میں اردو ہی کا استعمال ہوتا تھا۔

کاش زبان کے معاملہ میں ہماری قومی غیرت بیدار ہو اور ہماری مہربان حکومت بھی ہر شخص پر اردو پڑھنا لازمی کر دے، اس وقت انگلش میڈیم مدارس میں جو اردو پڑھائی جاتی ہے، اس کا پڑھانا اور نہ پڑھانا برابر ہے اس سے اردو زبان بھی نہیں آتی چہ جائیکہ اردو ادب کا ذوق، دنیا کے کسی ملک میں یہ بے غیرتی نہیں ہے کہ ذریعہ تعلیم غیر زبان ہو،

---

رشید احمد ارشد

# عربی ادب میں منظوم داستانیں

عرب قوم کا تعلق سامی نسل سے تھا اس لیے عربی ادب میں منظوم داستانوں، ناول اور ڈراموں کا رواج نہیں ہو سکا لہٰذا اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت کا جو ادبی سرمایہ ہمیں دستیاب ہوا ہے اس میں کسی منظوم داستان یا قصے کا پتا نہیں چلتا۔ گو عرب کے بہت سے قبائل بت پرست تھے مگر انہوں نے یونانیوں کی طرح اپنے دیوتاؤں کی داستانیں منظوم نہیں کیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل عرب جذباتی تھے اور جذبات سے متاثر ہو کر اشعار کہتے تھے اس لیے ان میں صرف غنائیہ شاعری رائج رہی۔

[illegible] زمانے میں عربی شاعری میں نئے عناصر شامل ہوئے سیاسی گروہ بندی کی وجہ سے ایک قسم کی سیاسی شاعری عالم وجود میں آئی اور عربی غزل نے بہت ترقی کی مگر تاریخی اور خیالی منظوم داستانوں کا اس زمانے میں بھی رواج نہیں ہو سکا۔

عہد عباسی [illegible] عجمی اثرات سے متاثر ہوا تو اس زمانے کہیں کہیں قصیدہ [illegible] کا ثبوت ملتا ہے مگر [illegible] عام کا شرف حاصل [illegible] طرح [illegible]

[illegible]

[illegible] کتاب کلیلہ و دمنہ کی داستانیں مختلف شعراء نے منظوم کیا [illegible] قدیم [illegible] کتاب کے منظوم ترجمے [illegible] منظوم ترجمہ مشہور [illegible] کے حکم سے کیا۔ چونکہ عربی ادب میں یہ نیا کارنامہ تھا اس لیے وزیر یحییٰ بن خالد نے اسے دس ہزار دینار اور اس کے بیٹے فضل بن یحییٰ نے پانچ ہزار دینار انعام میں دیئے شاعر موصوف خاندان برامکہ کے بچوں کا اتالیق تھا اور غالباً اس نے انہی بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں یہ کتاب منظوم کی ہوگی۔ بہرحال اس کتاب کے چودہ ہزار اشعار تھے یہ کتاب آج کل ناپید ہے۔ تاہم مشہور ادیب صولی نے اپنی کتاب الاوراق میں اس کے [illegible] اشعار نقل کئے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شاعر مذکور کے ہم عصر اور مشہور نجومی سہل بن نوبخت نے بھی کلیلہ و دمنہ کو برامکہ کے لیے منظوم کیا اور اس کتاب کو اندلس کے سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے پاس بھی بھیجا۔ علاوہ ازیں ملکہ زبیدہ کے سکریٹری علی بن داؤد اور بشیر بن المعتمد نے بھی اس کتاب کو منظوم کیا تھا مگر ان کے نسخوں کا پتا نہیں چلتا۔

اس کے بعد ابن الہباریہ المتوفی ۵۰۹ھ نے کلیلہ و دمنہ کو دو ہزار اشعار میں منظوم کیا اور اس کا نام نتائج الفطنۃ فی نظم کلیلہ و دمنہ رکھا اس کے متفرق مخطوطات [illegible] ہندوستان کے [illegible] خانوں میں موجود ہیں [illegible] ۱۳۰۲ھ میں ایک پریس میں طبع کرایا گیا تھا [illegible] کی [illegible] شاعر مذکور کا منظوم ترجمہ لبنان [illegible] ۱۹۰۱ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

مذکورہ بالا شاعر ابن الہباریہ نے کلیلہ و دمنہ کے جواب میں اسی طرح کی خود اپنی طبع زاد داستانیں تصنیف کیں اور انہیں منظوم کر کے اس کتاب کو الصادح والباغم کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب بیروت، مصر اور بغداد

ہو کر شائع ہو چکی ہے اور ۲۲۰ ابواب میں ہے اور اس میں بھی کلیلہ و دمنہ کی باتصویر کی داستانیں منظوم کی گئیں۔

اس کے بعد ساتویں صدی ہجری کے ایک عربی شاعر عبدالمومن بن الصاغانی نے بھی کلیلہ و دمنہ کا منظوم ترجمہ کیا ہے اس کا نام "دُرَرُ الحکم فی امثال الہنود والعجم" ہے اس کے مخطوطات وائنا اور میونخ (جرمنی) کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

بعد ازاں سلطان صلاح الدین ایوبی کے سیکرٹری قاضی الاسعد بن مماتی نے کلیلہ و دمنہ کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد نویں صدی ہجری میں بھی جلال الدین [illegible] نے منظوم ترجمہ کیا اس کا ایک مخطوطہ بیروت کے یسوعی پادریوں کے کتب خانے میں اور دوسرا مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ [1]

چونکہ منظوم داستانوں اور منظوم قصوں کے سلسلے میں کوئی تحقیقاتی کام نہیں ہو سکا اس لئے ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ عباسی دور میں منظوم داستانوں کا اور کوئی ذخیرہ ہے یا نہیں؟ تاہم یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کلیلہ و دمنہ کی طرح دیگر داستانوں کو جن میں الف لیلہ کی داستانیں بھی شامل ہیں، منظوم کیا گیا ہوگا کیونکہ اس زمانے میں بچوں کی تعلیم کے لئے مختلف علوم و فنون کی اہم کتب اور ان کے مسائل کو عربی میں نظم کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ اور اخلاق و نصیحت کے لئے چھوٹی چھوٹی حکایتوں کو بھی منظوم کیا جاتا تھا جیسا کہ مشہور شاعر طغرائی نے "چغل خوری کی نحوست" کے عنوان سے "بھیڑیا اور لومڑی" کی حکایت منظوم کی تھی۔ سیرت نبوی اور سلاطین کے تاریخی واقعات کے منظوم ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ مثلاً مشہور عباسی شہزادہ عبداللہ بن المعتز نے خلیفۃ المعتضد کے عہد کے اہم واقعات کو نہایت عمدہ پیرائے میں منظوم کیا ہے اور دوسری طرف اندلس کے مشہور شاعر ابن عبد ربہ مصنف "العقد الفرید" نے اندلس کے بادشاہ عبدالرحمن الناصر کے اہم واقعات کو منظوم کیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی منظوم کتابیں عربی ادب کی شاہکار نہیں سمجھی گئیں اس لئے نہ تو مقبول ہو سکیں اور نہ بعد کے شعراء نے ان کی تقلید کی اس وجہ سے عربی ادب کی تاریخ میں انہیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں ہو سکا۔

## دورِ جدید

موجودہ دور میں جبکہ مغربی اثرات سے عربی ادب میں نئے نئے اصنافِ سخن شامل کئے جا رہے ہیں، منظوم داستانوں کو اہم حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ دورِ جدید میں نہ صرف عربی، ناول، مختصر افسانے اور عربی ڈرامے بکثرت لکھے جا رہے ہیں بلکہ منظوم تاریخی اور خیالی داستانوں کو شائع کرنے کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

دورِ جدید میں سب سے پہلے شوقی نے نہ صرف تاریخی واقعات کو منظوم کیا بلکہ اس نے منظوم ڈرامے کی بھی بنیاد ڈالی اس نے ان ڈراموں کا پلاٹ عرب کی قومی داستانوں سے اخذ کیا چنانچہ ان میں سے مشہور ڈراموں کے نام مندرجہ ذیل ہیں (۱) مجنون لیلیٰ (۲) عنترہ (۳) علی الکبیر (۴) قمبیز (۵) مصرع قلوپطرہ۔ ادبی حیثیت سے شوقی کے ان ڈراموں اور ان کی داستانوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ ڈرامے اپنی سلاست و روانی اور غنائیہ عناصر کے لحاظ سے عربی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔

شوقی کے علاوہ بیروت کے خلیل یازجی نے غالباً سب سے پہلے حنظلہ اور نعمان کی تاریخی داستان کی بنیاد پر ایک منظوم ڈرامہ "المروءۃ والوفاء" کے نام سے تحریر کیا تھا جس کے ایک ہزار اشعار تھے اسے ۱۸۷۶ء میں بیروت میں اسٹیج پر پیش کیا گیا اور ۱۸۸۴ء میں کتابی صورت میں چھاپا گیا۔

شوقی کے بعد ابوشادی نے "اپولو جماعت" کے نام سے عربی شاعری میں ایک جدید مکتبِ فکر قائم کیا تو اس نے فرانسیسی ادب کے طرز کے منظوم ڈرامے تحریر کئے ان میں اس نے مغربی انداز کی بہترین صلاحیت کا ثبوت دیا ان میں سے اس کا تاریخی ڈرامہ "الزباء" (زنوبیا) زیادہ مشہور ہے

---

[1] مجلہ "الاستاذ" جلد نمبر ۱۰، ۱۹۶۲ء بغداد (عراق) مضمون کلیلہ و دمنہ انشاء و تفسیر کمال ابراہیم۔

جو عرب کی قدیم ترین ملک زنوبیا کے رزمیہ کارناموں پر مشتمل ہے ۔ [1]

موجودہ زمانے کے زندہ شعراء میں عزیز اباظہ کے منظوم عربی ڈرامے زیادہ مقبول ہو رہے ہیں اس نے شوقی کے غنائیہ ڈراموں کو پھر زندہ کر کے عرب کے بادیہ نشینوں کی قدیم داستانوں سے کام لیا اور یہ ڈرامے اسٹیج پر بھی پیش کئے گئے اور عوام نے اس کے ڈراموں کو بے حد پسند کیا ان میں یہ ڈرامے زیادہ مشہور ہیں (۱) قیس ولبنیٰ (۲) العباسہ (۳) شجرہ الدر (۴) قصہ شہرزاد (۵) غروب الاندلس ۔ [2]

ڈراموں کے علاوہ خالص منظوم رزمیہ یا بزمیہ داستانیں بھی جدید عربی شعراء نے تحریر کی ہیں جن میں سے بعض طبع زاد اور بعض منظوم تراجم ہیں چنانچہ جب الحمرا اسے جو مغربی ناولوں کے مترجم کی حیثیت سے بھی بہت مشہور ہیں "شہیدۃ الحب" کے نام سے منظوم قصہ لکھا عثمان بک جلال المصری نے جو عامی زبان میں ڈرامے لکھتا تھا مشہور فرانسیسی ادیب لافونتین کی اخلاقی کہانیوں کا منظوم ترجمہ کیا ۔ مگر سب سے بڑا قابل فخر کارنامہ قدیم یونانی شاعر ہومر کے شاہکار ایلیڈ کا منظوم عربی ترجمہ ہے جسے معرب کر کے "الالیاذۃ" کہا جاتا ہے یہ منظوم ترجمہ سلیمان البستانی نے کیا ہے اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اصل کتاب میں وزن، بحر اور شاعری کی جملہ خصوصیات کو برقرار رکھا گیا ہے بلکہ یہ ترجمہ اپنی سلاست وروانی اور خوبی کے لحاظ سے عربی شاعری میں ایک مستقل لافانی ادب شاہکار تسلیم کیا گیا ہے ۔

ایلیڈ کے طرز پر مشہور مصری شاعر احمد محرم نے بھی اسلامی واقعات کو عربی زبان میں منظوم کیا ہے اور اس کا نام "الالیاذۃ الاسلامیہ" یعنی "اسلامی ایلیڈ" [illegible] [illegible]

---

[1] الرشاہی (انگریزی) از ڈاکٹر اسمٰعیل احمد ادھم
ہیلڈ ہیبرگ (جرمنی) ۱۹۳۶ء

[2] فی الادب الحدیث از عمر الدسوقی
مطبوعہ مصر

---

ایلیڈ اور دوسری قدیم رزمیہ داستانوں کی طرز پر ان مہاجر عرب ادیبوں نے جو شمالی اور جنوبی امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے ہیں کافی منظوم داستانیں تحریر کی ہیں جو ملاحم کہلاتی ہیں ۔ ان میں خیالی داستانیں رزمیہ انداز میں تحریر کی گئی ہیں بعض نظموں میں قصہ گوئی کا انداز ہے مگر ان میں شاعر اپنے خاص فلسفے اور مخصوص پیغام کو پیش کرتا ہے اس قسم کے امریکی شعراء میں ایلیا ابو ماضی ۔ جبران خلیل ، الشاعر القروی ۔ فوزی المعلوف شفیق معلوف قابل ذکر ہیں ۔ بالخصوص فوزی معلوف کی دو رزمیہ داستانوں نسابط الریح اور ملحمۃ عبقر نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے ۔ [1]

---

[1] ادبنا وادباؤنا فی المھاجر الامریکیۃ از جورج صیدح ۔
مطبوعہ جامعۃ الدول العربیہ مصر

---

گرد و پیش :۔

## اورنگ زیب پر ریسرچ کی جائے گی

لاہور ۔ ۵ ردسمبر : انجمن حمایت اسلام کے صدر مولانا غلام محی الدین قصوری نے اعلان کیا ہے کہ انجمن اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی پر ریسرچ کرائے گی اور دیندار شہنشاہ کی ایک صحیح سوانح عمری شائع کرے گی مولانا قصوری انجمن کے ۷۶ ویں سالانہ اجلاس کے دوسرے روز پہلی نشست میں مولانا علم الدین سالک کی تجاویز کا جواب دے رہے تھے جنھوں نے اپنی تقریر میں انجمن کی توجہ عالمگیر اورنگ زیب کی سوانح کی جانب مبذول کرائی تھی ، سالک صاحب نے اورنگ زیب کی بے تعصبی اور مذہبی رواداری کی متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا تھا کہ غیر مسلم مورخوں نے ایک عالی ظرف اور عادل حکمران کو بدنام کر دیا اور ان کے بے بنیاد پروپیگنڈے نے مسلمانوں کو بھی متاثر کیا ۔

## مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

عبدالحق۔

بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لیکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے یہ کتاب انجمن نے دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی تھی مگر وہ ایک مدت سے ختم ہو کر کمیاب ہوچکی ہے، اور اس کے نسخے بمشکل دستیاب ہوتے ہیں، چنانچہ ملک میں س کی بہت مانگ تھی اس بنا پر یہ نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مطبوعہ خطبات کے علاوہ بعد کے خطبات اور بعض تقریریں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے۔ ۵۵۴+۱۲ صفحات، لکھائی چھپائی خوشنما کاغذ اعلیٰ قسم کا لگایا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ساڑھے چھ روپے۔

س۔

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۶ء اس کا سنہ تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جست و جو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

الاردو۔

انجمن ترقی اردو کے رسالہ' اردو کے سی سالہ پرچوں سے بہترین مضامین کا بہترین انتخاب ہے جسے انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی کی یادگار میں مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے اور سب کے سب کارآمد اور عمدہ معلومات سے پر ہیں۔ کتاب کی جان دو مضامین ہیں: (۱) رومی، نطشے اور اقبال از ڈاکٹر عبدالحکیم (۲) نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

اردو اکیڈیمی سندھ۔ مولوی مسافر خانہ۔ بندر روڈ کراچی

R. S. No 1138 Phone: 327
Fortnightly **QUOMI ZUBAN** Karachi

## مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

**روایت کی اہمیت ۔**

از ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ یہ کتاب اردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے ۔ اس میں روایت کی اہمیت ، اردو شاعری میں گل و بلبل کے اشارے ، دلی کا دبستان شاعری ۔ اردو شاعری میں حب الوطنی کی روایت اور اردو تنقید میں روایت اور تجربے کے ایسے پر مغز اور خیال افروز مقالات شامل ہیں جن سے اردو ادب کے تاریخی مد و جزر کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے مختصر الفاظ میں یہ تحقیقاتی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے ۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے ۔

**اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔**

موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام نے جو قابل قدر حصہ لیا اور اسے اس قابل بنایا کہ آگے چل کر وہ ایک مہذب زبان کی حیثیت حاصل کرسکے اس موضوع پر ایک معلومات افزا مقالہ ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خاص انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے تیسرا ایڈیشن ۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ۔

**کلیات ولی ۔**

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی گجراتی کا مکمل دیوان جو کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے مرتب کیا ہے مع مقدمہ و فرہنگ الفاظ ۔ تیسرا ایڈیشن قیمت پانچ روپے ۔

**ملنے کا پتہ**

**اردو اکیڈیمی سندھ ۔ مولوی مسافر خانہ ۔ بندر روڈ کراچی**

عبدالوحید نے انجمن پریس سے چھاپ کر دفتر انجمن ترقی اردو پاکستان ، اردو روڈ کراچی سے شائع کیا
قیمت فی پرچہ :- چار آنے ۔ قیمت سالانہ :- پانچ روپے ۔
مدیر :- مشفق خواجہ